جلد 46 • شمارہ 03 • مارچ 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول۔ مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

عزیزانِ من... السلامُ علیکم!

تنقید اور تنقیص دنیا کا آسان ترین کام ہے اور ہمارے رہنما شب و روز یہی کر رہے ہیں... مقتدر رہنما جانے والوں کو ہر خرابی کا ذمے دار قرار دیتے ہیں... حزبِ مخالف ایوانِ اقتدار کو ہر خامی اور برائی کا ذمے دار قرار دیتی ہے... اس تماشے کی انتہا اس وقت دیکھنے میں آئی جب اسمبلی اور اخبارات میں رہنماؤں نے ایک دوسرے پر الزام تراشی اس دعوے کے ساتھ شروع کی کہ ان کے پاس اپنے حریف کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں۔ دوسری طرف سے جب اسی شدت کے ساتھ جوابی الزام آئے تو یک لخت دونوں طرف سکوتِ مرگ سا طاری ہو گیا۔ اگر کسی عام شہری کے پاس کسی جرم کے ٹھوس ثبوت موجود ہوں اور وہ اسے حکام کے علم میں یا منظرِ عام پر نہ لائے تو وہ اس جرم کا شریک اور سہولت کار قرار پا سکتا ہے لیکن ان واقعات پر قانون حرکت میں آیا نہ بجائے باہمی کے مذموم سمجھوتوں پر کسی نے انصاف کے دروازے پر دستک دی۔ سب باری باری لیلائے اقتدار کے قرب سے عیش کرتے ہیں اور مزے میں رہتے ہیں۔ عوام چیختے چلّاتے، مرتے کھپتے رہتے ہیں۔ ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ ملک میں قحط الرجال نہیں ہے۔ سیاست سے باہر ایک سے بڑھ کر ایک جوہرِ قابل موجود ہے، عالی دماغ پروفیشنل حبِ وطن کے نت نئے بیج بو رہے ہیں لیکن وہ اپنی عزت و ناموس کی خاطر سیاست کو اپنے لیے شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ سیاست کو خدمت اور عبادت کا درجہ دینے کا تصور ہمارے یہاں سرے سے مفقود ہے اور یہ تماشے نصف صدی سے زیادہ سے جاری ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارا پیارا ملک خلائی دوڑ میں بہت پیچھے ہے ورنہ اس بحران کا آسان ساحل یہ ہوتا کہ تمام کرپٹ رہنماؤں کو ایک خلائی جہاز میں بھر کر آسمان کی بیکراں وسعتوں میں کسی بے نام منزل کی طرف روانہ کر دیا جاتا... روئے زمین پر تو دساور میں بھی کوئی اس مال کو نہیں پوچھے گا... اور اب خلا سے برسرِ زمین، اپنی محفل کی طرف...

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی تبصرہ نگاری ”سب سے پہلے میں تعزیت کرنا چاہتا ہوں محی الدین نواب صاحب کی وفات پر، ان کے لواحقین، ادارے اور ان کے لاتعداد چاہنے والوں سے۔ الفاظ کا دیوتا جہانِ فانی سے کوچ کر گیا اور فرہاد علی تیمور کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ دوسری اہم بات یہ کہ ہردلعزیز مصنف کاشف زبیر صاحب بھی علالت کے سبب اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ تمام قارئین اور ان کے چاہنے والوں کی ڈھیروں دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ فروری کے جاسوسی کی خاص بات یہ تھی کہ حیرت انگیز طور پر بہت جلد مل گیا تھا۔ چونکہ تبصرہ بھیجا ہوا تھا اس لیے فوراً محفل کی طرف چھلانگ لگائی اور سرورق پر ذرا بھی نہیں اٹکے۔ اتنا صاف نکل جانے پر پڑوسن سے بھی ستائشی نظروں کی داد وصول کی تھی۔ اس ماہ کا اولین تبصرہ احسان سحر صاحب کا تھا۔ انتہائی احتیاط کے ساتھ لکھا ہوا تبصرہ جیسے ڈاکٹر نے زور سے لکھنے سے منع کیا ہو۔ بہرحال اچھا تبصرہ تھا کیونکہ موصوف مصنف بھی ہیں۔ اس لیے الفاظ کا مناسب استعمال کر لیتے ہیں۔ بلقیس خان صاحب یا صاحبہ یقین کریں آپ کا اس ماہ کا تبصرہ مجھے وہم میں مبتلا کر گیا ہے۔ الفاظ آئینہ ہوتے ہیں اور مجھے ان الفاظ میں کوئی لطیف شبیہ ہرگز نظر نہیں آئی۔ ویسے میں پرائے تو کیا اپنے جھگڑوں سے بھی دور رہتا ہوں اور زویا اعجاز ادارے سے ناراض ہرگز نہیں، وہ صرف آج کل لکھنے لکھانے کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ معراج محبوب عباسی ’میری پڑوسن‘ کے متعلق آپ کی بات کو خوش گمانی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بالکل جیتی جاگتی حیات ہیں اور تاحال میری پڑوسن ہیں۔ مرحاگل آپ کا شکریہ، آپ نے یاد رکھا۔ شفقت محمود صاحب کا تبصرہ بہت اچھا لگا اور فیصل آباد سے سیف الرؤف کی پہلی حاضری کافی جاندار رہی۔ امید ہے آئندہ بھی لکھتے رہو گے۔ سید عبادت کاظمی اور محی الدین اشفاق کے اختصاریے بھی عمدہ رہے۔ باقی تمام دوستوں نے بھی مقدور بھر محفل کی رونق میں اضافہ کیا۔ لیکن کچھ پرانے تبصرہ نگار جن میں تفسیر عباس بابر، ماما ایمان، بابا سمندر موج خان، دلنشین بلوچ، بابر عباس، اریبہ بخاری، زیروز یروزیڈ اور کاشف علی میراں جیسے لوگ شامل تھے، منظر سے بالکل غائب ہیں۔ ان سے درخواست ہے وہ محفل میں دوبارہ واپس آ جائیں۔ قسط وار کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی انگارے کی باری آئی۔ پردے والی سرکار کا اتنی عجلت میں قصہ تمام ہونا خوش آئند تھا۔ ورنہ لگ رہا تھا یہ بات کافی دور تک چلے گی۔ لیکن اب یہ ڈیرے سے نکل کر اس سے بھی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد نہایت عمدہ جا رہی ہے لیکن یہ قسط میرے نزدیک بہت عجیب و غریب رہی۔ ایک غیر ملکی انتہائی اہم جاسوس شہزاد احمد عرف شہزی کو بنا کسی پوچھ گچھ اور سرکاری اہلکاروں کی نگرانی کے بغیر سونپ دیا گیا، ایک جوا کھیلنے کے لیے۔ جس میں دوسری طرف کا ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا نہ تاج دین شاہ کو دیکھا نہ اس سے بات کی۔ صرف دعوے کی بنیاد پر اتنا بڑا رسک۔ ذاتی مقصد قومی مفاد سے بڑا نظر آیا۔ سرورق کے رنگوں میں اس دفعہ دونوں ہی رنگ پھیکے پھیکے نظر آئے۔ حسام بٹ کی کہانی اتنی فلیٹ تھی کہ سندر ویرا کا نام اور تعارف سامنے آتے ہی ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔ باقی کچھ خاص واقعات یا کردار نگاری بھی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے میری رائے غلط ہو لیکن محسوس یہی ہوا۔ کاشف زبیر کا دوسرا رنگ شامی اور تیمور کے سنگ۔ کہانی کا پلاٹ اور سسپنس بہت عمدہ تھا۔ لیکن اختتام میں بہت ساری باتیں وضاحت طلب رہ گئیں۔ اس لیے کہانی کی جو رفتار تھی اس لحاظ سے انجام بہت عامیانہ سا تھا۔ احمد اقبال کی اولین صفحات پر حاضری بہت شاندار تھی۔ شوبز اور اس کی سیاست میں چھپی غلاظت کا بہت اچھا نقشہ کھینچا۔ ایمن اور مہرین کا کردار جاندار رہا۔“

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی تشویش ”احسان سحر کا چہرہ دیکھ کر کرسٹل گرل کی آنکھوں میں وحشت سی اتری ہوئی نظر آئی۔ آپس کی بات ہے

کہ ان کا تبصرہ اچھا تھا۔ ساحر علی چکروں میں نہ پڑا کریں۔ نوال اینڈ مشال شادی مبارک۔ بلقیس خان دو نمبر کے بغیر ہمارے ملک میں کوئی بھی کامیاب نہیں ہے۔ سید شکیل حسین کاظمی اب سب آپ کی طرح فطین تو ہیں نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ دیکھیں۔ طاہرہ گلزار آپ نے بندۂ ناچیز کی کچھ زیادہ ہی تعریف کردی۔ سید عبادت کاظمی کا خط پڑھ کر ہمیشہ ایک خوش کن احساس ہوتا ہے۔ بارٹ کچر اور سیف الرؤف کا تبصرہ اچھا لگا۔ ابتدائیہ میں مدیرِ اعلیٰ کی پکی باتیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال اس بار کوئی خاص تحریر لے کر نہیں آئے۔ انگارے میں شاہ زیب نے بہت زور مارا اور پردے والی سرکار کا نہ صرف پردہ فاش کر دیا بلکہ ساتھ اس کا جھوٹا چہرہ بھی عوام کے سامنے کر دیا۔ اختتامی لمحات میں خطرناک صورتِ حال پھر پیدا ہو چکی ہے۔ آوارہ گرد میں عابدہ پر فردِ جرم عائد ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ بلیو تکسی کے چیف کے ساتھ مڈبھیڑ میں کیل دادا بھی شہزی کے ساتھ ہے اور خبر کے کنارے زندگی اور موت کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔ تاہم زہرہ بانو کا اصل چہرہ سامنے نہیں آ رہا ہے کہ وہ اصل میں کیا چاہتی ہے۔"

جہلم سے مشال اینڈ نوال کی پسندیدگی "اس بار جاسوسی 6 فروری کو ملا۔ سب سے پہلے سرورق دیکھا، شام کا ٹائم تھا۔ ایک طرف جاسوسی، ایک طرف کام۔ سرورق دیکھا، لڑکی اچھی لگی اور جو صاحب تھے، وہ آدھا رخ دکھا رہے تھے۔ اپنی محفل میں انکل کو پڑھا تو وہ وہی کہہ رہے تھے جو آج کل ہمارے پاکستان میں ہو رہا ہے اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ پاک ہم پر رحم فرمائے، آمین۔ اس کے بعد دیکھا تو احسان سحر براجمان تھے، ان کا تبصرہ اچھا تھا۔ معراج محبوب عباسی آپ کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ ناصر علی ضروری نہیں کہ ہر مشرقی صنف اسمارٹ کے خوابوں میں ہی گم ہو۔ وہ بے چاری سردی سے بے ہوش بھی ہو سکتی ہے۔ مرحا گل آپ تو ہماری مشال کی طرح اچھلتے کودتے قلقاریاں مارتے پہنچیں، بہت اچھا لگا۔ بلقیس خان آپ ہمیشہ کی طرح بہت اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ شفقت محمود آپ کو جلدی ملا جاسوسی مُبارک ہو اور آپ کا تبصرہ جان دار تھا۔ مقصود احمد پہلی بار لکھنے پر خوش آمدید۔ محمد ادریس خان، محمد صفدر معاویہ، عبدالغفار فردوس، عدنان عالم، آپ کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ سید شکیل حسین کاظمی، طاہرہ گلزار آپ کے تبصرے بھی بہت اچھے لگے۔ کاشف زبیر کو اللہ پاک صحت عطا فرمائے، آمین۔ اس کے بعد ہم اپنی موسٹ فیورٹ انگارے پر پہنچے۔ اس بار انگارے بہت زبردست تھی۔ پردے والی سرکار کا مرجانا ہی بنتا تھا۔ ہمارے ملک میں جھوٹے پیر بہت ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ دین کے نام پر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اللہ پاک ان سے بچائے اور سب کو ہدایت عطا فرمائے آمین۔ اس کے بعد اپنے شہزی کو دیکھا، وہ بھی اس بار لڑائی میں مصروف تھا۔ اپنے باپ کے لیے۔ ٹھیک کہتے ہیں ماں باپ کے لیے انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے بعد شامی، تیمور کو دیکھا۔ اس بار فولاد خان کا عشق کامیاب نہیں ہو سکا۔ پہلا رنگ زیرِ وزبر میں اپنا ہی برا نکلا۔ پھر چہرہ در چہرہ پڑھی۔ اچھی رہی۔ شیطانی انڈا میں قاتل کو تلاش کرلیا گیا۔ آخر کار شکار کوئی اور تھا۔ بھرم ہمارے معاشرے کی عکاس کہانی تھی کہ کچھ لوگ کیسے ہوتے ہیں جو اپنے والدین کو بھول جاتے ہیں۔ احساسِ جرم، خودگرفتہ بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ نگرانی اک عام سی کہانی تھی۔ لاحاصل میں جو برا تھا، وہ بچ گیا اور بے گناہ کو سزا ملی۔ فرار اچھی کہانی تھی۔ میرا سایہ اور ناخلف بھی اچھی ہی تھیں۔"

سندیلیانوالی سے ابرار وارث کی شمولیت "فروری کا شمارہ 5 تاریخ کو لاہور سے ملا۔ دوشیزہ سرورق کی آنکھیں اور یاقوتی ہونٹ دل میں چبھ سے گئے۔ خلوط کی محفل میں پہلے ایڈیٹر صاحب کی سنی اور بے اختیار ان کی اتحاد و یگانگت اور اخوت والی بات پر آمین کہا۔ جلدی جلدی سب کے تبصرے پڑھے۔ محبت و پیار اور احترام کے جذبوں سے بھرپور۔۔۔ کمالیہ والے بھائی شفقت آپ کے تبصرے سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ آخر گلہ کس چیز کا کر رہے ہیں۔ مثل انکل واقعی محبتوں کے سفیر ہیں ہر جگہ محبتوں اور ہجر و وصال کی زبردست تحریریں دی ہیں۔ سب سے پہلے کہانیوں میں طاہر انکل کی انگارے ہی شروع کی۔ حیرت مجھے ہوئی کہ میں نے 55 منٹ میں ساری کہانی پڑھ لی۔ اس دوران کتنے سنسنی خیز موڑ کہانی نے لیے کہ بتانے سے قاصر ہوں۔ ہر قدم پر انگارے ہی انگارے بکھرے ملے اور شاہ زیب کی دلیرانہ باتوں نے سب کو ہمت دی کہ انگاروں سے نکلنا تو ہے۔ رضوان کی انٹری زبردست طریقے سے ہوئی شاہ زیب کی رضوان نے بہت مدد کی۔ ایسی منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ سازی، انوکھا اور اچھوتا انداز طاہر انکل کا ہی خاصہ ہے۔ کاشف زبیر کی اندھے راستے آخری صفحات کا بھرم رکھ گئی۔ حسام بٹ کی زیرِ وزبر نہایت فضول لگی۔ احمد اقبال کی چہرہ در چہرہ نہایت اعلیٰ درجے کی کہانی تھی۔ ایمن کو اس کی ایک نیکی نے فرش سے عرش پر بٹھا دیا۔ اس نے لالچ نہیں کیا تھا جس کا اجر قدرت نے اسے دیا کہ ایک پیار کرنے والی فیملی مل گئی۔ خیر سچ ہی کہتے ہیں چہروں سے کب پتا چلتا ہے کہ اندرونِ خانے کیا چھپا ہے۔ نسرین کو ماں مل گئی، اچھا انجام ہوا۔ بھرم اور میرا سایہ مجموعی طور پر اچھا تاثر دے گئیں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کا شکوہ "جاسوسی اس بار خلافِ توقع 3 تاریخ کو مل گیا جس نے اسلام آباد کی شدید روایتی سردی میں کچھ حرارت بخش دی۔ سرورق اچھا تھا مگر مشرق میں ایسی آنکھیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ خلوط کی محفل میں سرِفہرست اس ماہ میانوالی کے احسان سحر رہے۔ مبارک ہو۔ بھائی ناصر علی، بی بی نوال اینڈ مشال، بھائی یوسف ساتول، بی بی بلقیس خان، بھائی شفقت محمود، بھائی شکیل کاظمی، بی بی طاہرہ گلزار، ان سب کا بے حد شکریہ کہ مجھے یاد رکھا۔ میرے دل پسند مصنف کاشف زبیر کی علالت کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ شمارے کی اولین کہانی احمد اقبال کی، چہرہ در چہرہ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ ایمن کا کردار بے حد متاثر کن تھا۔ مثل صاحب کی انگارے تیز رفتار ہوتی جا رہی ہے۔ شاہ زیب نے اس بار بھی کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے پردے والی سرکار کو مار ڈالا اور درگاہ سے نکل آیا ہے گو کہ چاچا رزاق کی قربانی دینی پڑی۔ دیسی کہانیوں میں منظر امام کی میرا سایہ اچھی تھی اور مغربی کہانیوں میں ایس۔ انور کی ناخلف بہتر رہی۔ سرورق کی پہلی کہانی زیرِ وزبر بس گزارے لائق تھی۔ فوزیہ کو امید نہیں تھی کہ اس کا بھائی سندر ایسے کردار کا مالک ہوگا۔ دوسری کہانی اندھے راستے کاشف زبیر کی روایت لیے ہوئے ایک شاندار کہانی تھی۔ لطف آ گیا۔ شامی اور تیمور کے کردار زبردست ہیں۔ کوشش کریں کہ ان کی کہانیاں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ اس ماہ پورے رسالے میں کارٹون کی کمی محمد عمران کی کترنوں نے پوری کردی۔"

سرگودھا سے اسد عباس کی تعریف "6 فروری کی صبح کا آغاز ایک بری خبر کے ساتھ ہوا۔ سوشل میڈیا کے توسط سے معلوم ہوا کہ جناب محی الدین نواب صاحب اب ہم میں نہیں رہے۔ بلاشبہ دنیا فانی ہے۔ ہم سب کو ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے مگر کچھ لوگوں کا بچھڑنا ایک خلا پیدا کر دیتا ہے۔ نواب صاحب بلاشبہ بہت بڑے لکھاری تھے۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں حاضری دی تو کاشف زبیر صاحب کی بیماری کا پتا چلا۔ اس سے پہلے سوشل میڈیا پر بھی ان کی صحت کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ کاشف صاحب بلاشبہ ایک نہایت نفیس انسان ہیں۔ اکثر ان سے بات ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں احسان سحر براجمان تھے۔ خطوط میں اس بار ریگولر تبصرہ نگار زیادہ تھے۔ کاظمی صاحب کی توپوں کا رخ اس بار طاہرہ گلزار کی طرف تھا، ویسے طاہرہ آنٹی، کاظمی صاحب کی بات تو ٹھیک ہے کہ اگر دو بچے آپس میں لڑ رہے ہوں تو آپ جیسے بڑوں کا کام ہے کہ ان میں صلح کروائیں۔ کہانیوں میں اس بار آخری رنگ سے ابتدا کی۔ ابتدا میں تو کہانی زبردست تھی۔ مگر اینڈ مایوس کر گیا۔ مجموعی طور پر کہانی بور رہی۔ لگتا ہے کاشف صاحب نے جلدی جلدی کہانی ختم کی تھی۔ انگارے حسب سابق شاہ زیب کی کارروائیوں کی بدولت تیزی سے اوپر جا رہی ہے۔ احمد اقبال اپنے روایتی انداز کے ساتھ پہلے صفحات پر براجمان تھے۔ ایمن کی ایک چھوٹی سی نیکی اسے بلندیوں تک لے گئی۔ اندازہ تھا کہ ایمن ابراہیم شاہانی سے شادی کرے گی مگر یہاں بھی رائٹر نے ہمارے اندازوں کو غلط ثابت کیا۔ انگریزی تراجم اس بار بہت اچھے رہے۔ مختصر کہانیوں میں نگرانی، فرار اور خود گرفتہ بازی لے گئیں۔"

جتوئی سے محمد سرفراز کی سرفرازی "اس ماہ کا جاسوسی 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق میں جاسوسیت اتنی ہی تھی جتنی سیاست دانوں میں شرافت یعنی نہ ہونے کے برابر۔ اس ماہ کی محفل نئے اور پرانے ساتھیوں کا مکسچر تھی۔ کچھ نئے چہرے نظر آئے تو کچھ سینئرز کی آمد خوش آئند تھی۔ احسان سحر جنہیں میں عرصہ دراز سے خاتون سمجھتا آیا ہوں، یہ تو بھلا ہوا اپنے رضوان تنولی کا جنہوں نے اس غلط فہمی کو دور کیا۔ خیر محفلِ یاراں میں زبردست تبصرہ تھا۔ دوسرا تبصرہ معراج عباسی کا تھا۔ ان کے تبصرے دھیمے دھیمے انداز کے ہوتے ہیں مگر اس مرتبہ محفل کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر انہوں نے بھی کچھ چٹکیاں شگفیاں لیں۔ نوال اینڈ مشال سسٹرز سے جنہیں سسٹرز کی یاد آگئی۔ خاصے تیکھے تبصرے ہوتے تھے ان کے۔ مرحا گل صاحبہ مسلسل حاضریاں لگوا کر شاید اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑنا چاہتی ہیں۔ یوسف سانول صاحب! چکر تو چکر ہوتے ہیں۔ سات ہوں یا آٹھ، بس اس چکر میں گھن چکر نہ ہو جانا۔ بلقیس خان صاحبہ پہلی خاتون ہیں جنہیں خود کو ناقص العقل تسلیم کرتے ہوئے حیرت سے زیادہ عجیب بھی لگا۔ امید ہے اگلے تبصرہ میں اس کی تصحیح ضرور کر دیں گی۔ ایک چیز جو میں نے نوٹ کی ہے شاید باقی ساتھیوں نے بھی نوٹ کی ہو۔ وہ چند ایک تبصرہ نگاروں کے مزاج کی تندی اور خود پسندی ہے۔ یہ چیز روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے جبکہ پہلے ایسا کچھ نہیں تھا۔ جن دنوں 2003ء میں، میں نے تبصرہ لکھنا شروع کیا، ان دنوں نوک جھوک عروج پر ہوتی تھی۔ آج کل تو ان دنوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتی اور کوئی بھی تبصرہ نگار نہ تو اسے خود پر لیتا تھا اور نہ ہی برا مناتا تھا جبکہ اسے خوب انجوائے کیا جاتا تھا مگر آج اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے جو کہ نہیں ہونا چاہیے۔ (آپ نے بالکل درست کہا ہے اپنے ہی تبصرہ نگار دوستوں کی کہی بات دل پر لے جاتے ہیں) آگے بڑھے تو بارٹ کیچر کی نکتہ آفرینیاں بھی خوب رہیں۔ خصوصاً چرس پر ان کی ریسرچ مجھے قابلِ غور کے بجائے قابلِ گور لگی۔ سید عبادت کاظمی بھی موجود تھے۔ پچھلے دنوں ان کے والد صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ سے نوازے۔ انگارے کی موجودہ قسط کو زیر و زبر ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ پڑھا۔ ہر سطر پر دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہو جاتی۔ ایسا لگتا جیسے دل ابھی سینے سے باہر آن نکلے گا۔ یہی لکھنے کی مہارت مغل صاحب کا خاصہ ہے اور اس قسط میں یہ مہارت عروج پر نظر آئی۔ کاشف زبیر کا نام ہی معیار کی ضمانت ہے اور شامی سیریز تو سونے پر سہاگا والی بات ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی بیماری کا پچھلے دنوں سوشل میڈیا سے پتا چلا۔ ان کے اتنے چاہنے والے ہیں اور سب ہی دعا بھی کر رہے ہیں۔ اس رنگ کی چند ایک سطریں ہی پڑھی تھیں کہ بار بار کاشف زبیر صاحب کا خیال آ جاتا تھا بس تو پھر یہ رنگ بھی ان کی صحت یابی کے بعد پڑھوں گا۔ ابتدائی رنگوں پر حسام بٹ کا نام دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ کہانی کی ابتدا کی اور پھر اختتام تک کسی ٹوئسٹ کے منتظر ہی رہے۔ آخری صفحے پر ٹوئسٹ آیا تو سہی مگر جس طریقے سے آیا وہ پسند نہیں آیا۔ باقی انداز تحریر کے حساب سے تحریر فٹ تھی۔ ابتدائی صفحات احمد اقبال کے نام سے جگمگا رہے تھے۔ چہرہ در چہرہ نے ابتدائی صفحات کا بھرپور حق ادا کیا۔ سلیم انور کی شیطانی انڈا میں شکار کوئی اور تھا اور ہوا کوئی اور۔۔۔ بس یہی ٹوئسٹ اس تحریر کی جان تھا۔ تنویر ریاض کی احساسِ جرم نے بہت زیادہ گھمایا اور اچھی خاصی ذہنی مشقت کے بعد نتیجہ کچھ خاص نہ نکلا۔ خود گرفتہ میں سراغ رساں کا شرمندہ ہونا بنتا ہی تھا۔ سیر بنارازی کی ڈھال نے بھی اچھا ٹائم پاس کرایا۔ محمد انجم فاروق انجم کی بھرم دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ میاں بیوی کا رشتہ اعتماد اور بھرم پر ہی قائم ہے اور عذرا نے اپنی جان دے کر اس بھرم کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ تمکین رضا کی نگرانی بھی ٹھیک رہی۔ سراغ رسانی پر مبنی تحریریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔"

ہری پور ہزارہ سے محمد قاسم رحمان کی آمد "نئے سال کے جاسوسی کا دوسرا شمارہ بے شمار چکروں کے بعد چھ فروری کو مل ہی گیا تو دل کو راحت ملی۔ سرورق کی انیلی حسینہ کے گال واقعی گلنار ہو رہے تھے۔ سائڈ پر فولاد خان سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑ کر اپنے دل سے ناکام محبت کی حسرت نکالنے میں سرگرداں نظر آیا۔ فہرست رائٹرز کے خوب صورت ناموں کے ساتھ خوب صورت انداز میں سجی ہوئی تھی۔ مدیر صاحب کی سچائی سے بھرپور باتیں پڑھیں۔ میانوالی سے احسان سحر اپنی شبنمی باتوں سے وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے تھے۔ بہت مبارک باد بھیا۔ ہمارے ہم شہر معراج محبوب عباسی، جن کا ہیئر اسٹائل شاہ رخ خان سے ملتا جلتا ہے، اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ ویسے لگتا ہے کہ سانپ والی گیم آپ کی موسٹ فیورٹ ہے۔ ہاہاہا۔۔۔ جہلم سے نوال اور مشال نے بھی کافی جاندار تبصرہ نگاری کی۔ مشال آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ خدا کرے آپ کی خوشیوں کا پالنا ہمیشہ یونہی جھولتا رہے۔ مرحا گل آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی میک اپ عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔ لڑکیوں کے لیے نہیں اور بعض عورتیں ہی میک اپ کے بعد لڑکیاں بن جاتی ہیں۔ پشاور سے ناصر علی اور نور پور سے یوسف سانول کے تبصرے جاندار تھے۔ بلقیس خان آپ نے مجھے یاد رکھا ہوا ہے، جان کر خوشی ہوئی۔ میری بہت پیاری اور سویٹ سی آپی طاہرہ گلزار نے بہت اچھی تبصرہ نگاری کی کستوری لگا کر۔۔۔ سید عبادت کاظمی کا تبصرہ بھی جاندار

تھا۔ میرے پیارے دوست عاصم سعید کا تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ کاشف زبیر کی علالت کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔ رب تعالیٰ ان کو صحتِ کاملہ نصیب فرمائے، آمین۔ کہانیوں کا آغاز خلافِ معمول سرورق کے رنگوں سے کیا۔ حسام بٹ کے قلم سے نکلا سرورق کا پہلا رنگ زیروز بر واقعی جاسوسی کے رنگوں کے شایانِ شان تھا۔ ڈاکٹر جامی نے سکندر کی مدد کر کے اس کو تو بچا لیا لیکن اس کی جگہ خود مصیبت مول لی۔ شاید اسی وجہ سے آج کے دور میں بہت کم لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مجھے تو سندر پر پہلے ہی شک ہو گیا تھا۔ سندر جیسے لوگ واقعی کتے کی دم کے مانند ہوتے ہیں جو کبھی سدھر نہیں سکتے۔ دوسرے رنگ میں کاشف زبیر نے شامی اور تیمور سے ملاقات کروائی۔ ان کا مذکورہ نیا کارنامہ بھی سسپنس اور ایکشن سے بھرپور تھا۔ تاہم فولاد خان کی محبت کے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا ہاہاہا۔۔۔۔ احمد اقبال کی ابتدائی صفحات پر جلوہ افروز چہرہ در چہرہ آنکھوں سے پڑھی اور دل میں اتر گئی۔ واقعی یہ بات سولہ آنے درست ہے کہ ہم ایکٹریس کے مداح بنے ان کے پیچھے گھومتے ہیں۔ آٹو گراف لینے کے لیے گھنٹوں ان کا انتظار کرتے ہیں لیکن دل میں ان کی عزت کوئی نہیں۔ انگارے نے بھی کروٹ بدلی ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ شیطانی انڈا میں سراغ رساں راجر گرین نے بہت ہوشیاری سے برتھا ایلسن کو مجرم کی صورت میں بے نقاب کیا۔ تنویر ریاض کی احساسِ جرم پڑھ کر بھی خوب لطف اندوز ہوئے۔ محمد فاروق انجم کی بھرم بھی حقیقت سے قریب تر نظر آئی۔ اولاد نافرمانیوں پر نافرمانی کرتی جاتی ہے لیکن والدین اپنا بھرم نہیں توڑتے، کچھ ایسا ہی پروفیسر صدیقی اور عذرا کے ساتھ ہوا۔ ناخلف، مغربی معاشرے کی ایک اور عبرت انگیز جھلک، جیرلڈ نے چند پیسوں کے لیے اپنے باپ رابرٹ کا خون کیا لیکن بدلے میں اس کے ہاتھ پھر بھی کچھ نہ آیا۔ آوارہ گرد کا ٹیمپو کافی تیز ہو گیا ہے۔"

پشاور سے ناصر علی کی مخلصانہ و معصومانہ کوشش "اس بار جاسوسی جلد یعنی 2 تاریخ کو ملا۔ اس بار سرورق کافی اچھا لگا۔ حسینہ کی آنکھوں میں سرخی تھی لگتا ہے رات بھر کسی کے انتظار میں سو نہ سکی۔ اس کے بعد محفل کا رخ کیا جہاں احسان سحر موجود تھے۔ معراج محبوب عباسی آپ کا خط لکھنے کا انداز بہت پسند آیا۔ نوال آپ بھی کوشش کر کے فلک شیر کی طرح لکھ سکتی ہیں۔ مرحا گل ویلکم کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ کافی اچھا لگا۔ محمد یوسف ساتول اللہ تعالیٰ آپ کے چچا کو جنت میں جگہ عطا کرے، آمین۔ طاہرہ گلزار باجی آپ کا تبصرہ زبردست رہا۔ سید عبادت کاظمی اور قاسم آپ دونوں کو جنم دن مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو لمبی عمر دے۔ چوہدری عاصم سعید آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ بارٹ کپچر لگتا ہے آپ نے آوارہ گرد پر کافی ریسرچ کی ہے۔ اس کے علاوہ شفقت محمود، ادریس خان، محمد صفدر معاویہ، عدنان عالم، سید شکیل حسین کاظمی اور سید محی دین اشفاق کے تبصرے پسند آئے۔ میرا اہم شہری وقار خان بلیک لسٹ میں تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ یہ قسط بہت ہی زبردست تھی، پڑھ کر مزہ آگیا۔ رضوان کا کردار کافی اچھا لگا۔ رضوان کافی اسمارٹ لڑکا نظر آیا۔ ایک بات نے حیران کر دیا کہ پردے والی سرکار پیر سائیں نکلا۔ شاہ زیب ہر قتل کا گواہ بن جاتا ہے۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بھی کافی سنسنی خیز تھی۔ مجھے لگتا ہے اگلی قسط ایکشن سے بھرپور ہوگی۔ اولین صفحات پر احمد اقبال صاحب کا ناول چہرہ در چہرہ کافی اچھا رہا۔ زیروزبر میں مجھے پہلے ہی پتا چلا کہ سندر اچھا آدمی نہیں ہے۔ کہانی عمدہ رہی۔ سرورق کا دوسرا رنگ اندھے راستے بھی کافی زبردست ناول تھا۔ شامی اور تیمور کافی اچھے طریقے سے کیس حل کرنے میں لگ گئے۔"

درابن کلاں سے مرحا گل اور رمنا گل کی گل کاری "ماہ فروری کا ڈائجسٹ 7 کو ملا۔ ٹائٹل گرل اپنی نیلی آنکھوں کی سرخی چھپانے کی ناکام کوشش میں نڈھال نظر آرہی تھی۔ ساتھ میں ایک خاکی رنگ کا سر شریف بھی لڑھک رہا تھا۔ محفل میں احسان سحر کی شبنمی باتوں کو پڑھ کر سحر زدہ رہ گئے۔ (کیوں؟) معراج محبوب عباسی کا تبصرہ پڑھا آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ کچھ باتیں ہر ایک کو سمجھ نہیں پاتا ویسے ہم تو ایک نہیں دو ہیں۔ ناصر علی کا تبصرہ زبردست تھا۔ مشال اینڈ نوال شادی کی مبارک باد۔ محمد یوسف ساتول اللہ تعالیٰ آپ کے انکل کو جنت عطا فرمائے۔ مقصود احمد کو جاسوسی کی محفل میں خوش آمدید۔ صفدر معاویہ کا اس دفعہ کا تبصرہ مانند رہا، مزہ نہیں آیا۔ جناب شکیل کاظمی۔۔۔ عرصے بعد تشریف لائے۔ کہیں آپ کی مصروفیات کچھ سنگین تو نہیں ہو گئیں۔ طاہرہ آپ بہت اچھا تبصرہ لے کر حاضر تھیں، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ارے یہ کیا عبادت جی، اپنی دوست سازی نبھا رہے تھے۔ عبادت جی ٹائٹل گرل کی تعریف کرتے کرتے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ دوست سازی نبھاتا تبصرہ اچھا تھا۔ سالگرہ کی مبارک باد۔ محی الدین اشفاق آپ نے سچ فرمایا کہ سرفراز جی عشق کے بخار میں مبتلا ہیں۔ لگتا ہے کہ بخار کچھ تیز ہو گیا ہے۔ چوہدری عاصم سعید تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ بارٹ کپچر کی مدح سرائی سے محظوظ ہوئے۔ اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی طبیعت ناسازی کے بارے میں پڑھا۔ رب تعالیٰ انہیں صحت عطا فرمائے۔ سب سے پہلے انگارے سے اسٹارٹ لیا۔ انگارے میں اب کچھ تیزی آگئی ہے۔ دو نئے کرداروں ڈاکٹر ارم اور رضوان کا اضافہ اچھا لگا۔ طاہر انکل کی ہر اسٹوری میں ڈاکٹر ہوتے ہیں جو بوقتِ ضرورت کام آتے ہیں۔ ہر نئی قسط میں کرداروں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آوارہ گرد میں اس دفعہ تیزی سے ہوتے واقعات اچھے لگے وہاں اول خیر اور کمیل دادا کی دوستانہ گفتگو بھی اچھی لگی۔ بھرم فاروق انجم کی ایک تکلیف دہ تحریر تھی۔ احمد اقبال بھی اس مرتبہ ایک زبردست تحریر لے کر حاضر تھے۔ سرورق کے پہلے رنگ میں کچھ خاص رنگ نہیں تھا۔ پرانا انداز ہے۔ دوسرا رنگ، شامی، تیمور کا کب سے انتظار تھا۔ شدید علالت کے باوجود بھی کاشف زبیر نے لکھا۔ اس کے بدلے کاشف زبیر کے لیے دل سے دعائیں نکلی ہیں۔ اس بار کہانی میں فولاد خان کو موضوعِ کہانی بنایا گیا تھا۔ پلیز اب شامی کی شادی کروا دیں۔ پھر شادی کے بعد (رنگ) میں بھنگ ہوگا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی پریشانی "سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کہوں پہلے تو سب سے پہلے جاسوسی پڑھنے کی جلدی ہوتی تھی لیکن اس دفعہ حالات موافق نہیں تھے۔ میرے پیارے ابو شدید بیمار ہیں۔ اس وقت میں سی ایم ایچ ملتان میں ہوں، ابو کی طبیعت تھوڑی سنبھلی تو بڑی مشکل سے ڈائجسٹ منگوایا کیونکہ یہاں سے مل نہیں رہا تھا۔ غم کے اداس لمحوں میں جاسوسی ہمارا دکھ درد بانٹنے آگیا۔ (اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو جلد از جلد صحت یاب کرے) سرورق بہت شاندار تھا۔ خط کے الفاظ تو میرے ہیں لیکن لکھائی ایک عزیز دوست کی ہے کیونکہ ان مشکل حالات میں مجھ سے خط لکھا نہیں جا رہا

تھا۔ اب سرورق پہ کچھ بات ہو جائے حسینہ ماہ جبین کو دیکھ کر دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح حسینہ کی آنکھوں اور ہونٹوں نے خوب متاثر کیا البتہ صنفِ مخالف کی مونچھیں تھیں بڑی غضب کی۔ محفلِ دوستاں میں احسان سحر کا خوب صورت انداز دل کو چھو گیا۔ احسان سحر ہمارے تبصرے کی طرح ہم بھی بہت میٹھے ہیں۔ (کیوں، کیا چینی کے کپڑے زیب تن کرتے ہیں) معراج محبوب عباسی بھائی آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا اور جناب گڈ نیوز یہ ہے کہ ہماری پڑوسن بہت چکر میں ہیں تو ہم ان کی ٹینشن نہیں لیتے۔ پشاور سے ناصر علی جناب شکیل کاظمی کی پڑوسن کو تو یاد کرنا اچھا لگتا ہے بھائی، پڑوسن جو ہوئی۔ ورا ابن کلاں سے مرحا گل اچھا لکھنے لگی ہیں۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ شفقت محمود کی آمد اچھی لگی۔ محمد ادریس خان آپ کے تبصرے پڑھ پڑھ کر تو ہم نے لکھنا سیکھا۔ عدنان عالم تمہارا سویٹ سا تبصرہ اچھا لگا۔ سالگرہ وش کرنے پر شکر گزار ہوں اور ایک عرصے کے بعد سید شکیل حسین کاظمی کی آمد اچھی لگی۔ وڈے شاہ جی آپ نے تو بہت سے قدردانوں کی پول کھول دی، اچھا لگا۔ طاہرہ گلزار، میں نازک مزاج نہیں، میری وہ بہت نازک مزاج ہے، آپ کو تو پتا ہے نہ سید محی الدین اشفاق جناب اداسی اکثر ساتھ دیتی رہتی ہے۔ عدنان عالم، طاہرہ گلزار، بلقیس خان، ناصر علی اور معراج محبوب عباسی کا تبصرہ بہت اچھا تھا اب ذرا کہانیوں پر بات ہو جائے۔ چہرہ در چہرہ اور احمد اقبال کے قلم سے ایک شاہکار مجسمہ تھا۔ کہانی نے آخر تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھا، انگارے اب ٹریک پر چل رہی ہے۔ تاجور اور شاہ زیب کو ملنا چاہیے۔ آوارہ گرد اب بور کر رہی ہے۔ کیونکہ کہانی سے عابدہ کا ذکر ہی ختم ہو گیا ہے۔ زیروز برا اچھی کہانی تھی۔ کاشف زبیر شانی اور تیمور کے ساتھ زبردست انداز میں چھا گئے۔ فرار، بھرم اور ڈھال اچھی کہانیاں تھیں۔“

سیف الرؤف کی گزارش ”حاضر ہوں دوستوں کی محفل میں۔ سب سے پہلے تو کاشف زبیر صاحب کی تندرستی کے لیے دعائیں۔ اس مہینے کا جاسوسی دو تاریخ کو ملا، ٹائٹل گرل تو لگتا ہے سر میں باریک کنگھی پھیرتی ہوئی ہی سامنے آ گئی۔ سب سے پہلے احسان سحر کا تبصرہ دیکھ کر ایسا لگا کہ اوپنر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نمبر سات کے بیٹسمین کو بلا پکڑا دیا گیا ہے۔ معراج محبوب عباسی اور ناصر علی کے تبصرے مناسب لگے۔ نوال اینڈ مشال کی تقریباً جائز شکایت اور مشال کو شادی کی مبارکباد۔ مرحا گل کا تبصرہ اچھا تھا۔ محمد یوسف سانول صاحب آپ کو چاہیے تھا کہ بم کا ڈی ایکٹیویٹ کوڈ اس وقت ان کو بتا آتے جب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ شفقت محمود کا تبصرہ اچھا اور نیک نیتی پر مبنی لگا۔ مقصود احمد کاکڑ صاحب نے دو سال فی لائن کے حساب سے لکھ ہی دیا تو چلیں جی خوش آمدید۔ محمد ادریس خان، محمد صفدر معاویہ، عبدالغفار کے مناسب تبصروں کو پار کر کے وڈے شاہ جی کا شاندار تبصرہ پڑھنے کے بعد طاہرہ گلزار کی رنگ برنگی ریزھی سے گزر ہی گئے۔ عمارت کاظمی بھائی ہمیشہ اچھا لکھتے ہو ویلڈن۔ پارٹ کچھ نے تو لگتا ایم اے جرسیات کر رکھا ہے۔ (آپ لوگوں نے تو بے چارے کا پیچھا ہی پکڑ لیا... بخش دو... وہ ان کی معلومات تھیں) کہانیوں کا آغاز حسبِ سابق انگارے سے کیا، یہ قسط بھی بہت شاندار رہی۔ زہی استاد مطلب شاہ زیب کو شاید کسی الیکٹرانک ڈیوائس سے احتیاط کی ضرورت پیش آئے۔ کاشف زبیر صاحب نے شامی اور تیمور کو عین موسم کے مطابق جلایا یا اتنی سردی میں ہڈیوں پر بڑھاپا ہی سوار رہتی ہے۔ مجموعی طور پر کہانی بہترین رہی۔ احمد اقبال اپنے مخصوص انداز میں ابتدائی صفحات پہ چھائے رہے اور ایلیٹ کلاس کی کرپشن کو خوب بے نقاب کیا۔ جاتے جاتے تمام لوگوں سے گزارش ہے کہ پاکستانی ٹیم کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔ اللہ کرے شاہد آفریدی کا آخری ورلڈ کپ خوشگوار یادیں دے جائے۔“

کراچی سے کاشف عبید کی مصروفیات ”اس بار جاسوسی ڈائجسٹ کراچی میں بھی جلدی مل گیا۔ سردی سے بھاگ کر کراچی میں تھا تو شمارہ بھی کیماڑی سے لیا۔ اس بار سرورق کی تیاری میں کینوس پر پہلے سے سفید رنگ تو تھا ہی زرد رنگ ڈاکرا انکل نے چھینک دیا تھا، شاید رنگ خانے میں اور قسم کے رنگ ختم ہو گئے تھے اور سرخ رنگ ڈبے میں شاید تھوڑا بہت تھا اس لیے عورت کے لبوں اور آنکھوں میں سرخی پیدا کرنے کے لیے سرخ رنگ لگاتے وقت کچھ رنگ نیچے اور کچھ دونوں طرف غلطی سے لگ گیا تھا لیکن پھر بھی اچھا تھا، فہرست معمول کے مطابق اور اداریہ غور طلب تھا، خطوط دلچسپی سے بھرپور تھے لیکن آخر میں ہمارے پیارے رائٹر کے بارے میں پڑھ کر کہ بیمار ہیں دلی افسوس ہوا، خدا جلد ہی صحت عطا کرے۔ خطوط میں اس بار عبدالغفار فردوس، منبع ہمارے علاقے کا تھا۔ جناب میں جب بھی سکرام سے ایبٹ آباد آتا ہوں تو نوال شہر میں بورڈ آفس کے بالکل قریب ہی رہتا ہوں، کبھی ملنے کی جسارت بھی کریں۔ خطوط میں مجھے طاہرہ گلزار اور معراج محبوب عباسی کے خطوط پسند آئے اور دوستوں کے خطوط بھی اچھے تھے، اس بار صرف چھوٹی تحریریں خطوط اور پہلی اسٹوری ہی پڑھ پایا ہوں۔ کیونکہ سیر کرنے میں مصروف ہوں۔ باقی رسالہ جب اپنے گھر جاؤں گا تب پڑھوں گا اور دوستو، ہماری واپسی 28 فروری کو ہو گی، کیا کریں ابو نے اتنی جلدی ٹرین کی ٹکٹ لی ہیں۔ میں کراچی میں ہی خوش ہوں مگر چند اہم کام کی وجہ سے اتنی جلدی واپس جا رہے ہیں۔ کوشش کروں گا کہ بھی جلد ہی کراچی آؤں کیونکہ کراچی بہت خوب صورت شہر ہے۔“

مری سے محمد کبیر عباسی کی تحریر ”نواب صاحب کے انتقال پُرملال اور کاشف صاحب کی علالت کے باعث اس بار دل پہ ایسی افسردگی چھائی ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے کا دل ہی نہیں چاہا۔ مگر نواب صاحب کے انتقال پر آپ سے تعزیت بھی کرنی تھی اور کچھ تجاویز بھی دینی تھیں۔ سو تبصرہ لکھنے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب بلاشبہ ایک لیجنڈ تھے۔ ان کی تحاریر نے ایک عرصے سے ایک عالم کو اپنا دیوانہ بنائے رکھا ہے۔ ان کے جانے سے دنیائے ادب میں جو خلا پیدا ہوا وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی آخرت کی منزلیں آسان کرے۔ کاشف صاحب سب کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ میری ان کے لاکھوں چاہنے والوں سے بھی عرض ہے کہ ان کی جلد صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ چینی نکتہ چینی میں، میں ہمیشہ طنز و مزاح کا حامی رہا ہوں مگر آج کل کچھ لوگ اس سلسلے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ فیک ناموں سے تبصرے لکھ کر دوسروں کا امیج خراب کر رہے ہیں۔ ہم کافی عرصے سے ادارے سے وابستہ ہیں سو ہمیں اس سے دلی لگاؤ ہے اور ہم اسے دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے عام ہونے سے مطالعے کی عادت میں مزید کمی واقع ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ اب انٹرنیٹ سے ڈائجسٹ فری میں ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ لیتے ہیں جس سے یقیناً ادارے کو کافی نقصان ہو رہا ہے۔ آپ سے پُرزور التجا ہے کہ آپ خود آن لائن کاپی کا اجرا کریں۔ نئے لکھاریوں

کے نہ آنے سے بھی ڈائجسٹ کا معیار کافی کم ہوا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی بھی کم ہوگئی ہے۔ آپ اگر کچھ صفحات نئے لکھاریوں کے لیے "ینگ رائٹرز کارنر" کے نام سے مخصوص کردیں تو آپ کو کافی اچھے نئے لکھاری مل سکتے ہیں۔"

گڑھ موڑ سے عذرا ہاشمی کی پیش گوئیاں "مسلسل دو ماہ سے انتہائی دیدہ زیب فہرست دیکھنے کو مل رہی ہے۔ اداریے میں ہر دردمند مسلمان کی گہری سوچوں کو زبان عطا کی گئی۔ احسان سحر شروع میں ہی براجمان تھے۔ بلقیس صاحبہ جب مزارات کے گدی نشین ہی اسمبلیوں میں موجود ہوں تو ان کے خلاف فیصلہ سازی کیونکر ممکن ہے۔ شفقت محمود صاحب، محی الدین اشفاق تبصرہ نگار ہیں اور محی الدین نواب سینئر رائٹر ہیں۔ آپ نے نواب صاحب کا تبصرہ کہاں پڑھ لیا؟ مقدر معاویہ بھی اس بار عمدہ تبصرہ لائے۔ عمدہ کی گردان بہت عمدگی کے ساتھ جاری رکھی۔ پرانے تبصرہ نگاروں میں سے مرحا گل، بلقیس خان، شکیل کاظمی اور جاوید بلوچ عرف ہارٹ کیچر کے تبصرے بہت پسند آئے اور نئے تبصرہ نگاروں میں سے چوہدری عاصم سعید اور سیف الرؤف کے تبصرے انتہائی شاندار تھے۔ سیف الرؤف صاحب آپ کا اندازِ تحریر بتا رہا ہے کہ آپ اس محفل کے آئندہ سپر اسٹارز میں سے ہوں گے بشرط بلاناغہ آمد۔ باقی سب دوستوں کی پیار بھری نوک جھوک بھی خوب رہی۔ فہرست میں اولین صفحات پر احمد اقبال صاحب کا نام دیکھ کر پہلے چہرہ در چہرہ پڑھی۔ کہانی کا پلاٹ آؤٹ اسٹینڈنگ نئی نسل کو منشیات کی لعنت میں جکڑنے والے منشیات فروشوں کی کتھا بے حد پسند آئی لیکن کہانی پر فکشن کی بلندیوں کو نہ چھو سکی شاید احمد اقبال صاحب سے ہماری توقعات بے جا حد تک بڑھ چکی ہیں۔ انگارے پڑھی۔ حسبِ سابق و حسبِ دستور مغل صاحب بصد احترام دوسرے تمام مصنفین کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کمالِ فن کی بلندیوں پر جگمگا رہے ہیں۔ انیق کے ساتھ ساتھ رضوان کا کردار بھی اچھا لگا۔ چاچا رزاق نے سپر ڈیفنڈر کا کردار نبھاتے ہوئے جان دے کر حقِ ولدیت ادا کردیا۔ آوارہ گرد کی مذکورہ قسط کمال تھی۔ زہرہ بانو کے کردار پر چھائے شکوک کے تمام بادل چھٹ گئے اور تیز رفتار ایکشن نے مزہ دوبالا کردیا۔ کبیل دادا اور اول خیر کے تعلق کی خوشگواریت نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ میں آوارہ گرد کے متعلق بھی پیش گویائی کی جسارت کروں گی کہ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بھابی کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کی کوششوں کی ابتدا کرے گا۔ سرورق کے رنگوں میں حسام بٹ کی زیروزبر اغوا برائے تاوان پر مبنی زبردست اسٹوری تھی۔ سندر شیطانی ذہانت کا مالک گھٹیا شخص ثابت ہوا۔ ایسے لوگ ہی رشتوں پر اعتماد کے خاتمے کی وجہ ہیں۔ بہت اچھے بٹ صاحب۔ اندھے راستے میں تیمور اور شامی کا ایڈونچر روٹین سے ہٹ کے تھا، کہانی آؤٹ کلاس تھی۔ فولاد خان کے پشتو لہجے میں اردو مکالموں نے لبوں پر مسکراہٹوں کے گلدستے کھلا دیے اور گلنار نے فولاد خان کے دل و جسم پر ایسی چوٹیں لگائیں کہ گلنار کردیا۔ فولاد خان کے اختتامی جملے نے بہت دیر تک قہقہے لگانے پر مجبور کردیا۔ بھرم دل کی گہرائیوں کو چھونے والی تحریر تھی۔ فاروق انجم کو سلام۔ شیطانی انڈا مس سنز ایسن کا انڈا شوہر کے بجائے سوتن کی موت بن گیا سپر اسٹوری۔ احساسِ جرم واحد کہانی تھی جو خاص پسند نہیں آئی۔ مجرموں کا اعترافِ جرم حلق سے نہیں اترا، کہانی کے اختتام نے بدمزہ کردیا۔ نگرانی کینٹ ویل کے احمقانہ طرزِ جرم اور سراغ رساں اوبرن کی بہادری پر مبنی پر اثر تحریر بہت اچھی لگی۔ میرا سایہ پرفیکٹ اسٹوری خرم خان جیسے بھیڑیے کا انجام ٹھیک ہوا۔ واقعی اللہ شرمین کے والد جیسا سایہ ہر لڑکی کو نصیب فرمائے۔ ناخلف میں جیر اللہ اپنے کیے کی وجہ سے اپنے باپ اور اس کے ترکے دونوں سے محروم ہوگیا۔ ایس۔ انور صاحب کی یہ کہانی اچھی لگی۔ ڈھال کشمیری پس منظر پر مبنی زبردست کہانی تھی، بہت پسند آئی۔ خود گرفتہ چھوٹی مگر لاجواب کہانی، میسز کی طرف تو ہمارا شک بھی نہیں گیا۔ شاندار جمال دستی صاحب۔ چونکا دینے والے انجام پر مبنی مجرم فریک ورتن کے فرار کی کہانی کو پال نے گرفتار کروا کر حیران کن اختتام دیا، زبردست اور دل پذیر کہانی تھی۔"

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کا صدمہ "جاسوسی کا یکم تاریخ کو ملنا کوئی عام بات نہیں۔ ٹائٹل پر موجود نازک اندام، معصوم اور بے ضرر سی لڑکی کو سلطان راہی نما بے ڈھنگی مونچھوں والا انسان دھمکائے ہوئے تھا۔ وہ انداز اس کے تھرڈ کلاس ولن ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ خنجر کی دھار سے لہو ٹپک کر ٹھوڑی پہ لگنا، مطلب چپ نہیں رہے گی اب زبانِ خنجر۔ ارے یہاں تو پردے والی سرکار، سوری، مطلب پردے میں ابھی دو عدد آنکھیں بھی ہیں یعنی سی سی ٹی وی کیمرا۔ یہ تو ہوگیا سرورق کا مارٹم کے بعد (پوسٹ) اب چلتے ہیں مدیر کے اداریے میں، اداریے میں جو سر چکرا رہا تھا اس کا حاصل اقبال کے اس سوال میں ہے کہ "تم سب کچھ ہو، بتاؤ مسلمان بھی ہو؟" میانوالی سے احسان سحر کی شبنمی باتیں واقعی شبنمی تھیں۔ احسان صاحب خوشبو کی خواہش جانے دیں۔ بلقیس خان! اب زیادتی کر رہی ہیں آپ، اچھے بھلے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے انسان کو یکسر نظر انداز کرکے چیز ہی بنا دیا۔ عبادت کاظمی آپ تو لگتا ہے شادی پہ بھی کارڈ چھپوانے کے بجائے جاسوسی میں خط لکھ کر فہرست چھپوا دیں گے مہمانوں کی۔ اس کے علاوہ کاشف زبیر کے لیے دعائے صحت اور ڈھیر سارے تبصرہ نگاروں میں صرف مرحا گل نے جنوری میں ہماری غیر حاضری نوٹ کی۔ تھینکس مرحا۔ کہانیوں میں اول پر کاشف زبیر کی اندھے راستے رہی۔ معروف کرداروں سے سجی اس تحریر نے بلاشبہ بہت مزہ دیا۔ ویلڈن کاشف زبیر، اینڈ ویلڈن شامی و تیمور۔ حسام بٹ کی زیروزبر میں سندر نے اپنے بھانجے کو بھی معاف نہیں کیا۔ دولت کے پجاریوں کی یہ داستان ہر دور میں اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ بس کردار، نام اور چہرے بدل جاتے ہیں مگر انجام سب کا ویسا ہی ہوتا ہے جو سندر کا ہوا۔ کیونکہ سچ چاہے دیر سے ہی سہی اپنا آپ منواتا ضرور ہے۔ آوارہ گرد اور انگارے کی اقساط بھی ہمیشہ کی طرح ٹاپ پہ تھیں۔ 24 جنوری کو ہماری دادی محترمہ ہمیں داغِ مفارقت دے گئیں اور اسی لیے جاسوسی جلد ملنے کے باوجود وقت کی شدید قلت کے باعث بڑی مشکل سے اتنا ہی پڑھ پایا اور لکھنے کا ٹائم بھی بمشکل نکالا۔" (اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے)

واہ کینٹ سے بلقیس خان کے جوابی حملے "ذاکر صاحب جب تھک جاتے ہیں تو تجریدی آرٹ کا شاہکار سرورق بنا ڈالتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی سمجھ سے باہر ہوتا ہے (کیا؟) پریشان کن اداریے نے اگلے ادوار میں پہنچا دیا جب کوئی قوم سرکش ہوجاتی ہے تو لگامیں کھینچ دی جاتی ہیں۔ اسرائیل حد سے بڑھے تو ان پر عرب مسلط کردیے گئے۔ ہماری خود غرضیوں اور دست درازیوں سے جب خدا تنگ آگیا تو اس نے روئے زمین پر چنگیز خان کو بھیج دیا۔ ہاں بے شک ہم دعا ہی کرسکتے ہیں اپنے بس میں اور ہے ہی کیا؟ آگے بڑھے تو احسان سحر کی سحر انگیزی کا شکار ہوئے۔ وزیر کے منصب پر

ہزارے والے تھے۔ پھر شکیل کاظمی کی طرف دوڑے۔ ارے، میں تو ان کو ٹھنڈے مزاج اور بڑے دل کا مالک سمجھتی تھی۔ کہتے ہیں کسی کا اخلاق جانچنا ہو تو اس کو غصہ دلاؤ۔ سید عبادت کاظمی پچھلے دنوں پریشان تھے اب اچھلتے کودتے اچھے لگے اور ہاں برادر کسی کی آمد سے منہ میٹھا نہیں ہوتا، آنکھیں ہوتی ہیں۔ ساگر تکو کر، حساب برابر...... آؤ...... اب سوچیں...... کہ عقل کا بسیرا کہاں ہے؟ مقصود احمد کا کڑ، جو غلطی نہیں کرتے، وہ کونسا تیر مارتے ہیں۔ سوائے دوسروں کو گرانے اور زک پہنچانے کے۔ کوشش جاری رکھو، جاسوسی کو آپ جیسے مخلص اور تازہ لنک کی ضرورت ہے۔ تیسرے چوہدری عاصم کی آمد خوب رہی۔ ادریس خان فل فارم میں نظر آئے۔ نوال، اتنا اچھا لکھتی ہو پھر بھی مطمئن نہیں ہو۔ مرحا گل، سیف الرؤف، طاہرہ گلزار اور محمد صفدر حسب سابق اچھے تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ عبدالجبار رومی، عائشہ خرم، اسد عباس اور جاوید کاظمی کا تعاون اچھا رہا۔ کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ انگارے سے آغاز کیا، اتنا علم تو تھا کہ پردے سے کوئی انوکھی شے برآمد ہوگی مگر پیر ساحا تو ذہن کے کسی حصے میں نہ تھا۔ طاہر بھائی کے دل میں جعلی پیروں کے لیے جو نفرت ہے وہ ساری کی ساری پیر ساحا کی شکل میں باہر نکالی ہے انہوں نے۔ اور یہ بھی گمان میں نہ تھا کہ یہ اوچھا اتنی جلدی انجام کو پہنچے گا۔ آوارہ گرد کا رخ گیا۔ 22 ویں قسط کا اختتام انتہائی سنسنی خیز تھا۔ ابتدائی صفحات پر اپنے احمد اقبال کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہاں ہمارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ کرتوت شاکر علی کے اور شک ہمیں آخر تک دستور پر رہا۔ منظر امام کی میر اسایہ میں خرم کو سایہ نے بہت ڈھیل دی۔"

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی ناپسندیدگی "لکیروں کے ہیر پھیر سے مزین فروری کا شمارہ عمدہ تاثر دے رہا تھا جس میں مرد کا سر تو یوں لگ رہا تھا جیسے تلوار مار کے اڑا دیا گیا ہو اور خاتون کی شعلہ بار آنکھیں کسی خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھیں۔ نکتہ چینی میں بات ہو رہی تھی امت کے رہنماؤں کی، خدا کرے انہیں ہوش آجائے اور وہ عملی طور پر امتِ مسلمہ کے لیے امن و آشتی اور فلاح و بہبود کے اقدامات کریں۔ واہ احسان سحر بھی خوش گوار یت میں کھوئے ہوئے ہیں، اچھی بات ہے۔ ناصر علی چکروں میں چکر تو نہیں آگئے تھے؟ اور مشال کو شادی مبارک۔ نوال نے بھی زبردست تبصرہ کیا ہے۔ جی مرحا گل آپ نے ٹھیک سنا ہے سفرہ حسین کی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی تھی، بہت اچھا لکھتی تھیں وہ۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ باقی آپ نے بھی عمدہ لکھا ہے۔ بلقیس خان تبصرہ تو آپ کا بھی کافی جوشیلا تھا، اچھا لگا۔ شفقت محمود کی گزارش بھی لائقِ تحسین رہی۔ مقصود احمد ویلکم۔ ایم ادریس خان اور سیف الرؤف تھینکس، چوہدری عاصم سعید، سید عبادت کاظمی اور علی عمران نے بھی اچھی تبصرہ نگاری کی ہے۔ شکریہ طاہرہ گلزار آپ بھی بہت اچھی ہیں اور جاندار تبصرے لکھتی ہیں۔ ایم صفدر معاویہ بھی محفل میں نمایاں تھے۔ زبردست جی اب چلیں آوارہ گرد کی طرف۔ بلیو تتسی کے ایجنٹ دھوکا کھا گئے اور شہزی اور کبیل دادا نے ان کا کام تمام کر دیا۔ شہزی کا زہرہ بانو کے لیے نرم گوشہ اچھا لگا۔ ماضی کے پیر ڈیفنڈر گول کیپر ریشمی کے باپ نے اینڈ پر اپنا کردار بخوبی احسن نبھایا اور قربانی دے کر سب کو بچا لیا۔ شاہ زیب نے ایک بڑا معرکہ سرانجام دیا۔ زیرو زبر بہت اچھی لگی۔ میر اسایہ بھی بہترین کہانی تھی۔ چہرہ در چہرہ رنگ بدلتے گئے۔ ایک طرف زبردستی نشہ کروایا گیا تو دوسری طرف ان کا علاج بھی ہوا۔ سب ایک فلمی سین کی طرح چلا اور آخر کار یہ فلم چہرہ در چہرہ بھی مکمل ہوگئی۔ ایمن، مہرین، ابراہیم، دستور سب ایک ایک تیلی کی طرح ہی تو تھے گھیر مکمل ہو گیا تھا اور کہانی بھی ایک دم سے زبردست رہی۔ سراغ رسانوں کی بروقت نگرانی بھی کام آئی اور اتفاق ایسے بھی ہو جاتے ہیں جس سے مقصد حاصل کرنا اور بھی آسان ہو جاتا ہے جیسے ڈونگر نے بہن کے گھر سے واپس آتے وین دیکھ لی اور پھر وہیں سے عادی مجرم ان کے ہتھے چڑھ گیا جو قتل میں بھی ملوث تھا۔ نگرانی بھی اچھی اسٹوری تھی۔ اس کے علاوہ شیطانی انڈا، احساسِ جرم، خود گرفتہ، مخالف سب ٹھیک ہی رہیں۔"

ماریہ جہانگیر کی کبیر والا سے جرأت و ہمت "جاسوسی ڈائجسٹ کو میں نے پہلا خط فروری 2015ء میں لکھا تھا اور اب فروری 2016ء کو لکھ رہی ہوں۔ یعنی ایک سال بعد (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے)۔ دراصل تعلیمی مصروفیات کے باعث خط لکھنے کا وقت نہیں نکال پائی۔ خیر فرق کسے پڑتا ہے۔ اب میرے پیپرز ہو چکے ہیں سو فی الحال فارغ ہوں۔ جاسوسی کے سبھی سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں۔ اس مرتبہ سرورق کے دونوں رنگ بہترین تھے۔ زیرو زبر میں مجھے پہلے ہی سندر پر شک ہو گیا تھا۔ آخر میرا شک درست نکلا۔ اندھے راستے بھی بہترین کہانی تھی۔ شامی اور تیمور پھر بال بال بچ گئے اور کیوں نہ بچتے، آخر ہیرو جو ٹھہرے۔ مختصر کہانیوں میں فرار، میر اسایہ اور بھرم اچھی تھیں۔ باقی ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔ سلسلے وار کہانیاں اب ساری اقساط اکٹھی ہی پڑھوں گی۔ ویسے جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے کی خاطر مجھے بہت سے لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں اور میں رضائی میں چھپ کر لیٹر لکھ رہی ہوں۔" (وڈی مہربانی ڈیئر)

وادیٔ سون خوشاب سے تحریم ملوکر کی شمولیت "جاسوسی کا ٹائٹل بہت منفرد، جاذبِ نظر اور دل کش لگا۔ 2016ء کے شروع میں آپ نے تو ٹائٹل پر پھول کھلا دیے۔ اب اللہ پاک کرے پورا سال پاکستان میں پھول کھلتے رہیں۔ پیار کی خوشبو چار سو پھیلتی رہے۔ ابتدائیے پر تبصرہ کرنا تو سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس لیے ابتدائیہ پر کوئی تبصرہ نہیں۔ انگارے بہت زبردست سلسلہ ہے۔ یوں لگتا ہے کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہوں۔ پردے والی سرکار جیسے کئی حقیقی کردار ہمارے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور ان کو پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ اشارہ آسمان کی بلندیوں میں موت کے درمیان اٹکا ہوا سفر دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ اتنی عمدہ کہانی۔ شفیع اللہ کی ایمانداری نے بہت متاثر کیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہمیں بھی ایسا ایمان اور جذبہ عطا فرمائے۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔
ایم اقبال، سینٹرل جیل میانوالی۔ سراج الحق چترالی، کراچی۔ ہارٹ کیچر، تحصیل علی پور۔ نادر سیال، میانوالی۔ محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ ادریس احمد خان، کراچی۔ احسان سحر میانوالی۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ سجاد خان، سینٹرل جیل میانوالی۔ ادریس احمد خان، کراچی۔

جزیرۂ ظلمات

محی الدین نواب

محی الدین نواب اس عالمِ فانی سے کوچ کر گئے... کچھ لوگ مرجانے کے بعد دلوں میں زندہ رہتے ہیں لیکن مرحوم اپنے لاکھوں پرستاروں کے دلوں کے ساتھ اپنی تحریروں میں بھی زندہ رہیں گے... وہ قلم اور لفظوں کے کھلاڑی تھے... انہوں نے اَن گنت موضوعات پر یادگار کہانیاں لکھیں... جیتی جاگتی زندگی سے انوکھے مضامین نکالے، تصور اور تخیل کی دنیا میں بلند پروازیں کیں... دیوتا کو وہ اپنے فکشن کا کمال تصور کرتے تھے... فخریہ کہتے تھے کہ میرے قارئین میرا نام دیکھتے ہی امید باندھ لیتے ہیں کہ انہیں اعلیٰ درجے کا فکشن پڑھنے کو ملے گا...اس رنگ میں انہوں نے متعدد کہانیاں لکھیں... زیرِ نظر کہانی غیر مطبوعہ ہے اور کچھ دنوں سے اپنی باری کی منتظر تھی... اب نواب ہیں، نہ ان کی تازہ تحریریں... ان کے ہنر اور کمال کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کی غیر مطبوعہ کہانی کو نذرِ قارئین کیا جائے... سو ذیل میں "جزیرۂ ظلمات" پیش خدمت ہے۔

جزیرۂ ظلمات میں رونما ہونے والے پراسرار حادثات و واقعات کا پرافسوں فسانہ

ہمارا بحری جہاز وانڈرلو تیزی سے سفر کرتا ہوا جزیرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ہم جزیرے کے قریب آچکے تھے۔ وہاں کے مشہور سن رائز ہوٹل کو واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ ہوٹل کے بڑے سے سائن بورڈ پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ ان شعاعوں کے باعث ہوٹل کا نام جگمگاتا ہوا اپنی طرف بلا رہا تھا۔

کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کشش پیدا کی جاتی ہے۔ اس سائن بورڈ میں بھی ایسی کشش پیدا کی گئی تھی لیکن اس سے پہلے لیزا اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ میرے قریب آگئی۔ اس کے بدن کی تپش ہلکی ہلکی آنچ دینے لگی۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ وہ سائن بورڈ پھیکا پڑ گیا تھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ کتنا خوب صورت جزیرہ ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں مگر یہ نہ بھولو، خوب صورت ہے مگر خطرناک بھی۔"

یہ آئی لینڈ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ سفید اور سیاہ ساحلی پٹی تھی۔ اس خوب صورت اور شفاف ساحل کے پیچھے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ جزیرے کی جنوبی ڈھلان کی جانب ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔ شمال کی جانب اونچی اونچی چٹانیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور شمالی پٹی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ہوٹل کے پیچھے ورڈ آئی لینڈ کا سب سے عظیم پہاڑ "ڈمبالاٹو" تھا۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’وائل اپنی فطری موت مرا ہے یا یہاں کے سکون اور خوب صورتی نے اس کی جان لی ہے؟ قتل ایسی پُرسکون جگہ پر ہو نہیں سکتا۔‘‘

لیزا اپنے دونوں بازو پھیلا کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ’’یہ جزیرہ لاس اینجلس سے بالکل مختلف ہے۔‘‘

ہوٹل کے قریب ہی آرام دہ اور خوب صورت کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ مقامی لوگوں اور مہمانوں کو لانے لے جانے کے لیے کار لفٹس کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہوٹل کے نزدیک ہی ساحل پر کشتیوں کے لیے سلپ بنائی گئی تھی۔ ان کشتیوں کو سیاح اور مقامی لوگ سمندر کی سیر اور مچھلیوں کے شکار کے لیے کرائے پر حاصل کر سکتے تھے۔ جنوب میں تقریباً ایک کلومیٹر دور بندرگاہ تھی جہاں کچھ ہی دیر میں ہمارا جہاز لنگر انداز ہونے والا تھا۔

یہ جزیرہ اور لاس اینجلس حقیقتاً مختلف تھے۔ دونوں علیحدہ علیحدہ سیاروں کے حصے لگتے تھے۔ لاس اینجلس میں ہملٹن بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر لیزا اسکاٹ انویسٹی گیشن کے نام سے ایک دفتر تھا اور لیزا اسکاٹ اس کی مالک تھی۔

اس نے اپنی زندگی میں انویسٹی گیٹر کے طور پر ایسے بہت سے کیس حل کیے تھے جن کے بارے میں یہ گمان کیا جانے لگا تھا کہ اب ان کی فائل بند کر دی جائے گی یا پھر کسی بے گناہ کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔

لیزا میرے بہت قریب تھی۔ میرا ایک بازو اس کی نازک اور پتلی کمر کے گرد حائل تھا۔ میں اسے کچھ اس طرح تھامے ہوئے تھا کہ کہیں وہ جہاز سے گر نہ پڑے۔ ہم دونوں ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ورڈ آئی لینڈ تمام جزیروں سے ہٹ کر تھا۔ وہاں کی بندرگاہ پر صرف ایک جہاز لنگر انداز ہوتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی مال بردار بھی یہاں کا رخ کر لیا کرتا تھا۔ صرف وانڈر ٹو ہی وہ جہاز تھا جو مہینے میں دو بار یہاں لنگر انداز ہوتا تھا اور بیرونی دنیا سے آمدورفت کا اہم ذریعہ تھا۔

امریکا سے جزیرے کے لیے روانگی سے قبل میں نے ورڈ آئی لینڈ کے بارے میں تمام معلومات حاصل کی تھیں۔ تاکہ جزیرے کے محل وقوع اور حالات کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکے۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں مل سکی تھیں۔

بنیادی طور پر یہ ایک پسماندہ علاقہ ہے۔ یہاں کالوں کی اکثریت ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں پر گوروں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ان میں سے ایک جان فارو بھی تھا۔ وہ سن رائز ہوٹل میں وائل کا پارٹنر تھا۔

جان فارو نے لیزا کو وائل کے پُراسرار قتل یا موت کا کھوج لگانے کے لیے اس جزیرے پر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیزا نے مجھے اپنے ساتھ اس کیس کو حل کرنے کی آفر کی، میں انکار نہ کر سکا، اور یہاں اس کے ساتھ چلا آیا۔ یہ موت کتنی اچانک اور پُراسرار تھی؟ میں نہیں جانتا تھا، لیکن ایک آدھ گھنٹے بعد ہماری جان سے ملاقات ہونے والی تھی۔

لیزا نے کہا۔ ’’سلمان! مجھے چھوڑو۔ میں باتھ لے کر فریش ہونا چاہتی ہوں۔‘‘

’’اور اگر نہ چھوڑوں تو...؟‘‘

’’تو میں اس بلا کو بلالوں گی جو مجھے راتوں کو جگائے رکھتی ہے۔‘‘

میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ’’کون ہے وہ، میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔‘‘

وہ میٹھی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے مجھے دیکھنے لگی۔ میں بے چین سا ہو کر اس کے اور نزدیک ہو گیا۔ وہ کسمسا کر مجھ سے الگ ہو گئی پھر پلٹ کر کیبن میں چلی گئی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ اسے راتوں کو جگانے والی بلا کون ہے؟

جہاز پر عملے کے علاوہ ہم صرف چار افراد تھے۔ میں کیبن میں پہنچا تو لیزا واش روم جا چکی تھی۔ میں نے بریف کیس میں اپنا سامان رکھنا شروع کر دیا۔ وانڈر ٹو بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے والا تھا۔

☆☆☆

میرا نام سلمان واحد ہے۔ میں جنوبی ایشیا کے ایک ملک بھارت کا رہنے والا ہوں۔ میں نے باقاعدہ جاسوسی کی تعلیم کسی ادارے سے نہیں بلکہ اپنے والد واحد علی خان سے حاصل کی ہے۔ میرے والد صاحب اپنے دور کے مانے ہوئے جاسوسوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی میں ایسے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے جن پر آج تک جنوبی ایشیا میں رشک کیا جاتا ہے۔

میرے دادا بھی اسی پیشے سے منسلک تھے۔ میرے اندر بھی جاسوسی کے جراثیم موجود تھے اس لیے والد صاحب نے بچپن سے میری تربیت انہی خطوط پر کی تھی۔ کچھ ان کی تربیت، کچھ میری لگن اور غیر معمولی صلاحیتوں نے مجھے بھی ہندوستان کے بڑے اور مشہور جاسوسوں کی قطار میں لا کھڑا کیا تھا۔

میں نے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ ایشیا کے دوسرے کئی ممالک میں بھی اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ نہ صرف قتل اور ڈکیتی کی سنگین وارداتیں بلکہ کئی دفاعی نوعیت کے کیسز بھی میرے کریڈٹ پر ہیں۔

میں ایک فری لانس انویسٹی گیٹر ہوں اور میرا آفس ممبئی کی ایک معروف شاہراہ پر باکس انویسٹی گیشن کے نام سے واقع ہے۔ میں نے اپنے آفس میں کچھ اس قسم کے انتظامات کیے ہوئے ہیں کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر پورے فلور کو بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔

میں نے آج تک کبھی مذہبی یا سماجی منافرت سے کام نہیں لیا۔ ہر ملک وقوم کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ میں اکثر اوقات یورپ اور امریکا میں ہوتا ہوں۔ ایک تو یہاں کام کرنے کا مزہ آتا ہے۔ دوسرے آمدنی بھی ڈالرز میں ہوتی ہے۔ میں مارشل آرٹ، یوگا اور کراٹے کا ماہر ہوں۔ جمناسٹک کے بڑے بڑے کرتب کرنا میرے لیے بچوں کا کھیل ہے۔ میرا نشانہ ٹارگٹ سے کبھی نہیں چوکتا۔ ان کمالات کے ساتھ ساتھ میری چھٹی حس بہت تیز ہے۔ میں آنے والے حالات اور خطرے کو پہلے سے محسوس کر لیتا ہوں۔ انہی صلاحیتوں کے باعث میرا شمار کامیاب جاسوسوں میں ہوتا ہے۔ میری ہر بات شک سے شروع ہوتی ہے اور وہی شک مجھے منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسروں پر اعتماد کرنا تو دور کی بات ہے... بسا اوقات میں خود پر بھی اعتماد نہیں کرتا۔

میں کئی بار امریکی سی، آئی، اے کی دعوت پر وہاں کے کیس حل کر چکا ہوں۔ میں نے امریکا میں ہی انویسٹی گیشن کے کئی اہم کورسز بھی کیے ہیں اور وہاں کی کئی ایجنسیز کو لیکچر بھی دیتا رہا ہوں۔ اس بار بھی امریکی سی، آئی اے سے طے شدہ معاہدے کے مطابق لاس اینجلس پہنچا تو وہاں ایک انتہائی خوب صورت دوشیزہ میرے نام کا پلے کارڈ اٹھائے بے چین نگاہوں سے مسافروں کو دیکھ رہی تھی۔

میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ”ہیلو! میں سلمان واحد ہوں۔“

اس نے دلفریب مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”ویلکم مسٹر سلمان! آئی ایم لیزا اسکاٹ!“

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ وہ بھی ایک انویسٹی گیشن کمپنی چلا رہی تھی اور پورے امریکا میں اس کی دھاک تھی۔ ایک ہی پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود لیزا سے بھی ملاقات نہ ہو سکی تھی مگر ہم دونوں کا ایک دوسرے سے غائبانہ تعارف رہا تھا۔

میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اپنے غیر معمولی حسن اور جسمانی کشش سے کسی بھی مرد کو اپنا دیوانہ بنا سکتی ہے۔ جسمانی نشیب و فراز کو اس طرح واضح کیا گیا تھا کہ وہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کو گستاخ بنا رہے تھے۔ وہ مغرورانہ انداز میں شانوں پر بکھرے سنہری بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر سلمان! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ امریکی سی، آئی، اے نے یہ مشن ہمیں مشترکہ طور پر حل کرنے کی آفر کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اس کیس میں آپ کو اسسٹ کروں گی۔“

”مجھے بھی تمہارے ساتھ کام کر کے خوشی ہو گی۔“ میں گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مشن تو بہت دلچسپ ہے مگر تمہارا ساتھ اسے مزید دلچسپ بنا دے گا۔“

وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

ہم دونوں وہاں سے چلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آ گئے۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

راستے بھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے آئندہ دنوں کی پلاننگ میں مصروف تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کن انکھیوں سے بار بار میری طرف دیکھ رہی ہے مگر میں صرف اور صرف اپنے کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میرا اصول ہے کہ کام کے دوران میں کسی دوسری طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔ اپنی تمام تر توجہ اپنے مشن پر مرکوز رکھتا ہوں، یہی میری کامیابی کا راز ہے۔

لیزا کے ساتھ مشن کے دوران کئی بار اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اسے یکسر نظر انداز کرتا رہا۔ کیونکہ کیس کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ یکسوئی کی بھی ضرورت تھی۔ کسی قسم کی ہلکی سی کوتاہی ہمیں موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی اور ہمارا مشن ناکام ہو سکتا تھا۔

میں موت سے نہیں ڈرتا مگر کیس کی ناکامی مجھے کسی صورت قبول نہیں۔ ہمارا مشن تقریباً نو دن جاری رہا۔ آخر کار ہم نے اپنی لگن اور محنت کے باعث اسے کامیابی

سے مکمل کرلیا۔ آخری شام میں اور لیزا امریکی سی، آئی، اے کے اعلیٰ افسران کو اس کی فائل بریفنگ دے کر ہوٹل پہنچے۔

میں نے صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔ ”اب میں ایک دن آرام کے بعد کل رات کی فلائٹ سے ممبئی روانہ ہو جاؤں گا۔“

وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آج تک میں نے ایسا مرد نہیں دیکھا جو میرے لیے دیوانہ نہ ہوا ہو۔ میں نو دن تک تمہارے ساتھ سائے کی طرح رہی مگر تم نے ایک بار بھی نگاہ بھر کر مجھے نہیں دیکھا۔“

وہ بڑے میٹھے انداز میں شکایت کررہی تھی۔ اس کا یہ انداز مجھے دیوانہ بنا رہا تھا۔ میں خود کو خوش نصیب تصور کررہا تھا کہ تنہائی میں ایک دلکش حسینہ میرے پہلو میں بیٹھی میری بے پروائی کی شکایت کررہی ہے۔ وہ بولی۔ ”میں سمجھ رہی تھی کہ تم بھی دوسرے مردوں کی طرح میری خوب صورتی کے جال میں پھنس جاؤ گے مگر میرا اندازہ غلط تھا۔ میں تو خود تمہارے جال میں پھنستی چلی گئی ہوں۔“

میں گزشتہ دنوں بے شک لیزا کو نظرانداز کرتا رہا تھا مگر اس کی کشش مسلسل مجھے اپنی طرف کھینچتی رہی تھی۔ میں بھی مکمل طور پر اس کے سحر میں کھو چکا تھا مگر ضبط نفس سے کام لیتا رہا تھا۔ اب چونکہ ایک دن کی فراغت میسر تھی۔ ایسے میں لیزا جیسی خوب صورت باربی ڈول کو نظرانداز کرنا بہت بڑی بے وقوفی تھی اور میرے جیسا شخص ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر اپنی طرف کھینچا۔ ”آج رات تمہاری تمام شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ گزشتہ نو دنوں سے میں بھی تمہاری قربت کے لیے ترستا رہا ہوں۔“

میں آگ تھا، وہ موم کی طرح میرے بازوؤں میں پگھلتی چلی گئی۔ میں اسے اپنے زاویوں سے ڈھالتا رہا، وہ بغیر کسی تردد کے ڈھلتی چلی گئی۔ میں حاکم کی طرح اسے جیتتا رہا، اور وہ محکوم کی طرح میرے ہر حکم کے آگے سر جھکاتی رہی۔

سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے بغیر دستک دیے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا شاید دوپہر ہو چکی تھی۔ لیزا باتھ روم میں تھی۔ میں نے کروٹ بدل کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد وہ واش روم سے باہر آگئی پھر آئینے کے سامنے زلفیں سنوارنے لگی۔ میں ادھ کھلی آنکھوں سے اس کے بھیگے حسن کا نظارہ کررہا تھا۔

وہ میری توقع کے مطابق مجھے سویا ہوا سمجھ کر سرہانے آکر بیٹھ گئی۔ میرے بالوں میں بڑے پیار سے انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں شعوری طور پر آنکھیں بند کیے اس کی نرم و نازک انگلیوں کی لطافت سے محظوظ ہونے لگا۔ اس نے میرے شانے کو بڑی نرمی سے جھنجوڑا۔ میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ میرے چہرے کے قریب آکر بولی۔ ”اٹھو، ہاتھ لے لو۔ میں ناشتا منگواتی ہوں۔“

اس کی قربت مسلسل سحر زدہ کررہی تھی۔ نہانے کے بعد وہ مزید نکھر گئی تھی۔ ایسے میں بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوری تھی، اٹھنا ہی پڑا۔ اس نے میری گردن میں باہیں ڈالتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔ ”جلدی سے واپس آؤ۔ ایک خبر سنانی ہے۔“

میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ ”کیسی خبر....؟“

”میں تمہارے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھی اور میری یہ آرزو پوری ہونے والی ہے۔ تم نہا کر آؤ پھر باتیں ہوں گی۔“

میں سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ انٹرکام پر ناشتے کا آرڈر دینے لگی۔ میں الجھا ہوا سا واش روم چلا گیا۔ کافی دیر تک شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ نیم گرم پانی جسم کی تھکن دور کررہا تھا لیکن ذہن لیزا کی بات میں اٹکا ہوا تھا۔

میں فریش ہو کر باہر نکلا تو وہ ناشتے پر میرا انتظار کررہی تھی۔ ناشتے کے دوران میں اس نے کہا۔ ”تم خبر سننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو گے؟“

”پہیلیاں بجھواؤ گی یا خبر بھی سناؤ گی؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بتاتی ہوں۔ جزیرہ آئی لینڈ کا ایک بہت ہی دلچسپ کیس میرے پاس آیا ہے۔ بہت ہی عجیب و غریب نوعیت کا مرڈر کیس ہے۔ اس کی تحقیقات کے لیے میں نے معاہدہ کرلیا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ ورڈ آئی لینڈ چلو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

وہ بڑے مان سے کہہ رہی تھی۔ لہجے میں اپنائیت گھلی ہوئی تھی۔ میں انکار نہ کرسکا، بے انتہا مصروفیت کے باوجود اس جزیرے پر جانے کی ہامی بھرلی۔

اس نے تشکرانہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں

نہیں جانتا تھا کہ اس کی محبت مجھے ورڈ آئی لینڈ لے جارہی ہے۔۔۔۔ یا میری موت۔۔۔۔!

☆☆☆

کچھ دیر بعد ہمارا جہاز لنگر انداز ہوگیا۔ میں نہیں جانتا تھا وہاں کیا ہونے والا ہے؟ وہاں کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا؟ یہ تو وقت آنے پر ہی معلوم ہوسکتا تھا۔ میری معلومات کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ یہاں لیزا کی رنگینیوں کے ساتھ انجانے خطرات کی سنگینیاں بھی منتظر ہیں۔

فضا میں پھولوں اور پھلوں کی خوشبو کے علاوہ ایک انجانی سی مہک بھی پھیلی ہوئی تھی۔ جہاز کے عرشے پر چند مقامی افراد کام کررہے تھے۔ ایک طرف ایک درجن کے قریب اسٹالز بنے ہوئے تھے۔ ان پر مختلف پھل اور سبزیاں بڑی تعداد میں خوب صورتی سے سجائی گئی تھیں۔

وانڈرٹو کے عرشے سے مجھے کیلے اور ناریل کے گھنے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ شمالی سمت پہاڑ انتہائی خوب صورت منظر پیش کررہے تھے۔ تقریباً ایک میل دور پام کے درختوں کے بیچ سن رائز ہوٹل سرابھارے آنے والے مسافروں کا منتظر لگ رہا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہوٹل تک ہمیں پیدل جانا ہوگا یا کوئی سواری بھی میسر آسکے گی؟

لیزا میرے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ میری کمر کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بناتے ہوئے بولی۔ ”اوگاڈ! یہ اتنی خوب صورت جگہ ہے کہ میں یہاں مرنا بھی پسند کروں گی۔“

”ایسا نہ کہو۔ یوں کہو کہ اتنی خوب صورت جگہ پر تو تمام زندگی گزاری جاسکتی ہے۔“

اس نے کپڑے تبدیل کرلیے تھے، وہ سفید رنگ کے بلاؤز اور منی اسکرٹ میں نازک سی گلابی پری دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے سنہری بالوں کو سمیٹ کر سر کی پچھلی جانب پونی ٹیل بنالی تھی۔

وہ چست بدن کی مالک تھی۔ اس کی سبز چمکتی ہوئی آنکھیں، گلاب کی پنکھڑی سے نرم و نازک سے ہونٹ مجھے دیوانہ کردیتے تھے۔ اس کی تمام ادائیں جنگلی تھیں اور انہوں نے مجھے بھی جنگلی بنانے میں کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

میں اس کے سنگ مرمر جیسے بدن سے نظریں ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”چلو۔۔۔۔ چلتے ہیں۔“

ہم عرشے کی جانب بڑھ گئے۔ ایک پُراسرار شخص ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ کسی بھوت کے مانند لگ رہا تھا۔ اس کے بدن پر موجود لباس نہ جانے زنانہ تھا یا مردانہ۔۔۔۔؟ وہ عجیب و غریب حلیے والا شخص مسلسل مجھے گھور رہا تھا اور میری ہی جانب بڑھ رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ شاید میں ان سب سے الگ ہوں اس لیے یہ مجھے یوں دیکھ رہا ہے۔ وہ پتھروں کے زمانے کا کوئی انسان لگ رہا تھا۔ اگر وہ لیزا کو یوں دیکھتا تو وہ دہشت زدہ ہوجاتی۔ میرا وزن دو سو چھ پاؤنڈ ہے اور میں چھ فٹ دو انچ کا قدآور جوان ہوں۔ میری سیاہ آنکھیں ہپناٹائز کرنے والوں کی طرح خطرناک حد تک پُرکشش ہیں۔ ان میں ماہرانہ چمک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

میری جسامت اور میرا تجربہ اتنا تھا کہ میں بھی اس شخص کو اسی کے انداز میں گھور سکتا تھا۔ سو میں نے بھی اسے ٹکٹکی باندھ کر گھورنا شروع کردیا۔ اس کا انداز مزید جارحانہ ہوگیا۔ شاید اسے میرا جوابی انداز میں گھورنا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر گیا تھا مگر میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں اس صورت حال سے تنگ آگیا۔

وہ شخص گہرے بھورے رنگ کا تھا۔ اس کے گھنگریالے بال جھاڑیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں پر گھنی سیاہ بھویں، پلکوں تک لٹک رہی تھیں۔ ناک پتلی اور خطرناک حد تک لمبی تھی۔ وہ افریقن اور میکسیکن کلچر کا مکسچر لگ رہا تھا۔

اس کے لباس کو چیتھڑے کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ سفید رنگ کی پینٹ گھٹنوں تک پھٹی ہوئی تھی اور میلی ہونے کے باعث سرمئی رنگ کی ہوگئی تھی۔ اس نے گہرے رنگوں کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ بھی جگہ جگہ سے شہید ہوچکی تھی۔ گلے میں چھوٹی بڑی سیپیوں کی مالا جھول رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں سانپ نما شکل کی ایک لمبی سی چھڑی تھی۔ اس کا نچلا سرا سانپ کی کھوپڑی کے مانند تھا۔

اس نے اچانک چھڑی کا کھوپڑی والا حصہ میری جانب بڑھایا۔ میں ایک دم سے گڑبڑا کر کچھ پیچھے چلا گیا۔ میں اپنے برابر کھڑی لیزا کو دیکھنا چاہتا تھا مگر اس بھوت نما آدمی پر سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ میں نے کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ہمارے آس پاس کافی تعداد میں لوگ جمع ہوگئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی شعبدے باز اپنے کرتب دکھا رہا ہے اور تماش بین محو ہوکر اسے دیکھ رہے ہیں۔

وہ چھڑی کو میرے چہرے کی جانب کرکے گول گول گھماتے ہوئے چلایا۔ ”آہی۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔ وا۔۔۔۔ چاں چا۔۔۔۔ یوم۔۔۔۔“

میں صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا تھا مگر وہ ایسا ہی کچھ کہہ رہا

تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں فرنچ، اسپینش اور افریقی ملا کر ایک نئی زبان تخلیق ہوگئی تھی اور اسے مقامی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ میں اسے نہیں جانتا تھا مگر یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ میرے لیے اچھے کلمات نہیں بول رہا ہے۔

اس نے چھڑی مسلسل میری طرف اٹھا رکھی تھی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت اور ناگواری کے تاثرات تھے۔

میں خود کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا یہ ڈراما کر رہا تھا۔ کبھی آگے پیچھے اچھلنا کودنا شروع کر دیتا اور کبھی زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔

وہ ایک بار پھر چلّایا۔ ''وا کی میورڈو، میورڈو.... ڈمبالا قائی جوکی....''

اس کی خوفناک آواز کانوں کے پردے پھاڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جیسے اچانک اس کے سحر سے نکل آیا۔ میں نے لیزا کی طرف دیکھا۔ وہ سہمی ہوئی سی اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''لیزا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ یہ سب میری برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ میں اس شخص کو دیکھ کر غصے سے چلّایا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے.... میری نظروں سے غائب ہو جاؤ.... ورنہ....''

میں نے جھک کر زمین پر سے ایک پتھر اٹھایا۔ اسے مارنے کے لیے سر سے اونچا کیا لیکن اچانک میری انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پتھر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میرے کندھے کو زخمی کرتا پیچھے گر گیا۔

اچانک وہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسری سمت گیا اور چند لمحوں بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا اور موٹا مردہ سانپ تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے چھڑی گھما رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے سانپ کو فضا میں لہرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دونوں ہاتھ نیچے کر لیے پھر فضا میں گھور کر حلق پھاڑ کر چلّایا۔ ''آئی ای ی....''

میں تنگ آ کر چلّایا۔ ''میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔''

میرے خیال سے اسے بھی میری زبان سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا، بڑبڑاتا رہا۔ میں نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کی۔ ایک دم آگے بڑھا، اس کی سانپ والی کلائی کو پکڑ لیا اور اس زور سے بل دیا کہ وہ پورا گھوم گیا۔ اس کا ہاتھ کمر سے جا لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دوبارہ اس کی کلائی گھمائی تو وہ پنجوں کے بل اوپر کی جانب اٹھتا چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ اتنی تکلیف کے باوجود اس کے چہرے پر کرب کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ اسی طرح بڑبڑائے جا رہا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہا لیکن غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟

اس نے دوبارہ سانپ کو فضا میں لہرایا، چھڑی کو میری طرف بڑھا کر چیخا۔ ''میورڈو ڈمبالا.... میورڈو ڈمبالا....''

وہ چلّاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ میں نے لیزا کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا مذاق ہے؟''

اس کا سحر ٹوٹا، وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی یہ سب کیا تھا؟ صرف اتنا جانتی ہوں کہ شاید میں پتھر ہو گئی تھی۔''

مجمع میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''وہ اپنی مخصوص زبان بول رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے، وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''اچھا.... بتائیے وہ کیا فرما رہے تھے؟''

اس نے کہا۔ ''وہ سینٹ وائٹس کا ڈانس کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ جن پانیوں پر آئے ہو، انہیں پر واپس چلے جاؤ۔ اس سرزمین پر کبھی نہ اترنا، اگر تم نے یہاں قدم رکھے تو واٹا اور ڈمبالا کی قسم.... تم بیمار ہو جاؤ گے اور یہیں مر جاؤ گے۔''

میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''اگر میری موت یہاں لکھی ہے تو آ کر رہے گی۔''

وہ شخص مجھے سمجھانے لگا۔ ''ان لوگوں کے منہ نہ لگو۔ یہ بہت طاقتور جادوگر ہیں اور اپنے جادو کے زور پر ہی یہاں حکومت کر رہے ہیں۔ تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ تمہیں منٹوں میں راکھ کر دیں گے۔''

وہ مجھے سمجھا رہا تھا مگر میں قائل نہ ہو سکا۔ اپنا سامان اٹھا کر لیزا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ چند قدم آگے بڑھتے ہی مجھے ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔ میری زبان سن ہو گئی، میرا ساتھ چھوڑنے لگی۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔

لیزا نے میری حالت دیکھ کر گھبرا کر پوچھا۔ ''سلمان! کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے۔ سلمان کچھ بولتے کیوں نہیں؟''

میں کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ زبان گنگ ہو گئی

تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خون نے رگوں میں دوڑنا چھوڑ دیا ہے اور وہ جمتا جا رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، کپکپی بڑھتی جا رہی تھی، اندھیرا مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دعویٰ تھا کہ مجھ پر جادو ٹونے کا اثر نہیں ہوتا لیکن اس بھوت نما شخص کی حرکتوں سے اندازہ ہوا کہ اس نے جادو کے زور سے میرے خون کو منجمد کرنے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔ مجھے اس صورتِ حال پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں یقین کرتا بھی تو کیسے؟

میں زور سے چلایا۔ لیزا پریشان ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو جمع کیا۔ جمناسٹک کے مخصوص کرتب کرنے لگا۔ کبھی ہوا میں قلابازیاں لگانے لگتا تو کبھی دونوں ہاتھوں کے بل الٹا چلنے لگتا۔ تاکہ جسم میں خون رواں ہو سکے۔ یہ سب کمالات کرنے کے بعد خون میں روانی محسوس ہونے لگی۔

میں دھیمی آواز میں بڑبڑانے لگا۔ ”وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا، میں کبھی اس کا غلام نہیں بن سکتا، وہ کوئی بھی ہتھکنڈا آزمالے مگر مجھے یہاں سے اس کیس کو حل کیے بغیر جانے پر مجبور نہیں کر سکے گا۔“

میں سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ جسم میں کچھ گرمائش محسوس ہونے لگی تھی۔ لیزا میرے قریب آکر پریشانی سے بولی۔ ”وہ شخص ہمیں موت کی دھمکی دے رہا تھا۔“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اس کا جادو اس وقت تک ہم پر اثر نہیں کرے گا، جب تک ہم اس پر یقین نہیں کریں گے، ہمیں اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔“

وہ پُرتشویش لہجے میں بولی۔ ”سلمان! یہ لوگ کالا جادو جانتے ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ کس طرح کر سکیں گے؟“

”اگر یہ لوگ کالا جادو جانتے ہیں تو کیا ہوا؟ میں ان شیطانی طاقتوں کا مقابلہ کروں گا۔ یہاں کیس میں کامیابی میرے لیے چیلنج بن گئی ہے، اگر تم ڈر رہی ہو اور یہاں سے واپس جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ مگر میں کامیاب ہو کر ہی واپس لوٹوں گا۔“

وہ رشک بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی تھی پھر میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے میٹھے لہجے میں بولی۔ ”سلمان! مجھے خوشی ہے کہ میں تم جیسے بہادر نوجوان کے ساتھ ہوں۔ ہم مل کر اس کیس کو کامیابی سے ہمکنار کریں گے اور ان تمام شیطانوں کا مقابلہ کریں گے۔“

مجھے اپنے پیشے سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ میں نے نہ جانے کتنے ہی خطرناک کیس کامیابی سے نمٹائے تھے؟ حقیقت میں یہ کیس لیزا کا تھا لیکن اس شخص کی وجہ سے اب میرے لیے چیلنج بن گیا تھا۔

☆☆☆

اس جزیرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے چند کتابوں کا مطالعہ کیا تو علم ہوا، وہاں پر ووڈوز کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ یہ کالے جادو جیسا ایک جادو ہے اگر اسے کالے جادو کی بہن کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس جادو کے ذریعے بہت سے مفید کام لیے جا سکتے ہیں مگر اس مذہب کے جادوگر اسے تخریبی کارروائیوں اور کرپشن کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لیزا چلتے چلتے ایک بار کے سامنے رک کر بولی۔ ”تم تو نہیں پیتے مگر اس وقت میرا موڈ ہو رہا ہے۔“

”میں بار کے ماحول سے گھبراتا ہوں۔ ایک عجیب طرح کی گھٹن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تم جاؤ.... میں کھلی فضا میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

وہ اندر چلی گئی۔ حجت نہیں کی، شاید اسے کچھ زیادہ ہی طلب ہو رہی تھی۔ میں آس پاس کے ماحول کی خوب صورتی کو سحر زدہ سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ بار سے آگے سڑک ویران پڑی تھی۔ میں یونہی بے مصرف آگے بڑھتا رہا۔

اچانک ایک اجنبی نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”مسٹر سلمان.....!“

اس پریشان سی آواز نے مجھے حیران کر دیا۔ اس جزیرے پر میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ یہ نسوانی آواز میرے دائیں جانب سے آئی تھی۔ دس سے پندرہ قدم کے فاصلے پر سرخ رنگ کی سیڈان کار کھڑی تھی۔ ایک قدآور شخص کسی لڑکی کو اس کار کی فرنٹ سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے جبراً ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

اس لڑکی نے پھر سے پکارا۔ ”مسٹر سلمان! پلیز میری مدد کرو۔“

میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ اس آدمی نے لڑکی کے دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑے ہوئے تھے۔ تکلیف کی شدت کے باعث اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

میں ان سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر بولا۔ ”رک

جاؤ۔"

اس شخص نے گردن گھما کر مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ مجھ سے پانچ انچ اونچا تھا۔ اس کی بڑی بڑی گول آنکھیں پتھر کی طرح تھیں۔ پتھر ساکت ہوتا ہے مگر وہ متحرک تھیں۔ اس کے چہرے سے سفاکی عیاں تھی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے مجھے سر سے پاؤں تک گھور رہا تھا۔

اس کی لمبی، پتلی ناک کسی عقاب کی چونچ کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ لمبے بالوں کو سختی سے کھینچ کر سر کی پچھلی جانب باندھا گیا تھا۔ میں تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "اس لڑکی کو چھوڑ دو۔"

وہ تیز لہجے میں بولا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔"

میں نے پھر کہا۔ "اسے جانے دو۔"

لڑکی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھوں کو ایک جھٹکا دیا۔ وہ اس جھٹکے کو برداشت نہ کر پائی، تڑپ کر چیخ پڑی۔ اس آدمی نے مجھے دھمکی دی۔ "آخری بار کہہ رہا ہوں.... دفع ہو جاؤ.... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

میں زندگی میں ایسے کلمات پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑا اور زور سے جھٹکا دیا۔ اس کا رخ میری جانب ہو گیا۔ میں نے پھرتی سے اچھل کر اس کے سر پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسی لمحے میں نے اس کے پہلو میں ایک زوردار کک ماری۔ وہ اچھل کر کار سے ٹکرایا لیکن دوسرے لمحے کمالِ پھرتی سے فوراً ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اچانک ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا لیے پھر انگلیوں کا رخ میرے چہرے کی طرف کرتے ہوئے مقامی زبان میں کچھ بڑبڑایا۔ اس نے اپنا منہ پوری طرح کھول دیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی اس کے تمام دانت مصنوعی تھے۔ سب کے سب اسٹیل کے بنے ہوئے تھے اور شام کے گہرے سائے میں چمک رہے تھے۔ وہ میری طرف بڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے ڈریکولا خون پینے کے لیے بڑھ رہا ہو۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا، میں نے خود کو جوابی حملے کے لیے مستعد کر لیا۔ اس نے جیسے ہی میری طرف چھلانگ لگائی۔ میں فوراً ہی اپنی جگہ سے اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پینترا بدل کر اس کے منہ پر ایک مکا رسید کیا پھر اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر دے مارا۔ وہ حلق پھاڑ کر چیخ پڑا، کراہتا ہوا میرے اور اس لڑکی کے درمیان زمیں بوس ہو گیا۔

اس جھگڑے کے دوران میں چند افراد ہمارے اطراف جمع ہو گئے تھے۔ وہ اپنی زبان میں زور زور سے کچھ بول رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آئی اووہ موورڈیکھ ..... موورڈیکھ ....."

ایک عورت اتنی تیزی سے میری طرف بڑھی کہ اس پر رکھا ہوا گھڑا غیر متوازن ہو کر نیچے گر کر ایک دھماکے سے پھوٹ گیا۔ وہ تمام افراد میری طرف دیکھ کر مقامی زبان میں کچھ بول رہے تھے۔ اب سب کے چہروں پر غصے اور ناگواری کے تاثرات نمایاں تھے۔ جیسے انہیں میرا لڑکی کو بچانے کا عمل بُرا لگا ہو۔

میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ کیا بکواس ہے؟ ایک تو میں نے تمہیں اغوا ہونے سے بچایا ہے اور یہ لوگ مجھے ہی الزام دے رہے ہیں۔"

وہ گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے بولی۔ "سلمان! فوراً یہاں سے چلیں..... جلدی کریں ....."

وہ مجھے گھسیٹتی ہوئی چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ایک جیپ کے پاس لے آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔ "بیٹھیں..... جلدی کریں....."

وہ کہتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ تمام افراد ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس لڑکی نے جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھا دی۔ ایسے ہی وقت کوئی سخت چیز جیپ کی باڈی سے آ کر ٹکرائی۔ شاید ان میں سے کسی نے ہماری طرف پتھر پھینکا تھا؟ وہ نشانہ چوک کر جیپ پر آ لگا۔ میں اس صورتِ حال کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ لوگ کون تھے؟ اور یہ لڑکی میرا نام کیسے جانتی ہے؟

میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ اور تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ سلمان واحد ہیں اور یہاں ایک کیس کے سلسلے میں مس لیزا اسکاٹ کے ساتھ آئے ہیں۔"

وہ میرے بارے میں جانتی تھی۔ میں حیران سا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مشرقی حسن سے بھرپور لڑکی میری پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟"

وہ میری حیرانی میں مزید اضافہ کرتی جارہی تھی۔ میں الجھ کر بولا۔ "جیپ روکو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو.....؟ اور میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہو؟"

اس نے جیپ روک دی اور ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں مشرقی کھنک واضح سنائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اس جزیرے کی باسی نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ "میرا نام نمرتا ہے۔"

"اچھا نام ہے۔ تمہارے نام سے اندازہ ہورہا ہے کہ تم ہندو ہو۔ کیا میں نے درست کہا؟"

"ہاں..... میری ممی انڈین تھیں۔ ان کا نام بھانومتی تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میری رگوں میں انڈین خون دوڑ رہا ہے۔"

وہ اپنے بارے میں بتارہی تھی۔ میں توجہ سے سن رہا تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دنیا سے الگ تھلگ اس پُراسرار جزیرے پر کوئی اپنے دیس کا بھی مل سکتا ہے۔ یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ وہ انڈین ہے، بہت خوشی ہورہی تھی۔

وہ بتارہی تھی۔ "میرے پاپا کا نام لیورن تھا۔ وہ پورے جزیرے میں پاپا لیورن کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ یہاں کے تمام ہنگنز کے سردار تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "ہنگنز.....؟"

وہ بولی۔ "ہنگن ووڈو میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے ووڈوازم کے تمام جادوئی کمالات پر دسترس حاصل ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس مذہب کا سب سے خطرناک جادو وہ ہے جس میں ہنگن اپنے تمام مریدوں کی آتماؤں کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ ان کا علاج بھی کرتا ہے اور انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔"

میں اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ جادوئی طاقتوں کے بارے میں سن کر حیران ہورہا تھا، وہ بولی۔ "اس جادو کے ذریعے پریت آتماؤں پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے اور انہیں کسی بھی انسان کے شریر میں داخل کرکے اپنی مرضی کا کام لیا جاسکتا ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں اس شخص کو موت کی دعوت دی جاتی ہے۔ کیونکہ جس انسان کے شریر میں آتما کو داخل کی جاتا ہے، وہ زندہ نہیں رہتا۔"

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک بچہ ہوں اور وہ مجھے کہانی سنا رہی ہے۔ میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ میں بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میری ماں اور میرے ماموں انڈیا سے بھاگ کر اس جزیرے پر آئے تھے۔ میرے ماموں بھاگیشور راؤ انڈیا کے بہت بڑے جادوگر تھے۔ وہ اپنے جادو کی بدولت وہاں کئی سنگین وارداتیں کرچکے ہیں اور انڈین حکومت کو مطلوب ہیں۔"

نمرتا نے بڑی اپنائیت سے میری طرف دیکھا پھر بولی۔ "میں اپنی گھریلو اور خاندانی باتیں کسی کو نہیں بتاتی۔ میرے ماموں نے ایسے ایسے کرتوت کیے ہیں کہ انہیں بتاتے ہوئے میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے لیکن نہ جانے کیوں پہلی بار ملاقات کرتے ہی دل تم پر اعتماد کرنے لگا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس ہورہا ہے کہ تم میرے لیے ضرور کچھ کرسکو گے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ پر اعتماد کررہی ہو۔ اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں تو مجھے اپنے حالات سے مکمل آگاہی دو۔"

وہ مسکرا دی۔ اپنے پُرکشش چہرے کا رخ میری جانب کرتے ہوئے بولی۔ "میرے نانا اور نانی کا ممی کے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت ماموں بہت چھوٹے تھے۔ ممی نے ہی ان کی پرورش کی تھی اور اکلوتا بھائی ہونے کے باعث ان سے بہت محبت کرتی تھیں، اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ اس جزیرے پر آگئیں۔"

پام کے اونچے اونچے درختوں کے نیچے ہم جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک دلکش اور حسین لڑکی تھی مگر اس وقت میرا سارا دھیان اس معلومات کی طرف تھا جو نمرتا مجھے فراہم کررہی تھی۔ میں بھاگیشور راؤ کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "یہاں آکر ماموں کو علم ہوا کہ اس جزیرے پر جادو کا راج ہے۔ انہوں نے پاپا لیورن کے بارے میں سنا تو فوراً ہی اپنے شیطانی ذہن میں ایک منصوبہ تیار کیا اور اس کے مطابق وہ پاپا لیورن سے ایک معتقد کی حیثیت سے ملے۔ انہوں نے خدمت اور اپنی چکنی چپڑی باتوں کے ذریعے ان کے دل میں گھر کرلیا۔ وہ پہلے ہی سے کالے جادو کے ماہر تھے۔ انہوں نے ووڈو علم جاننے کے لیے ان کا سہارا لیا اور بہت جلد سینکچری میں اہم مقام حاصل کرلیا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ سینکچری کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "سینکچری ووڈو کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔ ہنگن اسی عبادت گاہ میں رہتا ہے۔ لوگ اپنے مسائل

اور بیماریوں کے علاج کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ تمام تقریبات اور مذہبی تہوار سینکچری میں ہی منعقد ہوتے ہیں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''ماموں نے میری ممی کو پاپا لیورن سے شادی کرنے پر راضی کیا۔ یہ بھی ان کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ پاپا لیورن اچھے مخلص اور عظیم انسان تھے کہ کوئی بھی عورت ان کی بیوی بننے میں فخر محسوس کرتی اور یہ فخر میری ممی کو حاصل ہوا۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ جیپ کے ڈیش بورڈ سے پانی کی بوتل نکالی۔ چند گھونٹ حلق میں انڈیلے پھر بولی۔ ''اس طرح ماموں پاپا لیورن کے اور قریب ہوگئے اور پورے علاقے میں ان کے خاص چیلے کے طور پر مشہور ہوگئے۔ ماموں نے ان سے ووڈو ازم کے جادوئی کمالات سیکھنا شروع کردیے۔ اس طرح ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں ممی اور پاپا کے ساتھ بہت ہنستی کھیلتی زندگی گزار رہی تھی۔ چھ ماہ پہلے اچانک ممی کی حرکت قلب بند ہوگئی۔ ہم اپنی رسم کے مطابق دوسری صبح ان کی چتا جلانا چاہتے تھے لیکن اس رات بڑی تیز آندھی چلی۔ اس آندھی میں ان کی لاش کہیں گم ہوگئی۔

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''پاپا نے مجھے ماں، باپ دونوں کا پیار دیا۔ کبھی ممی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ وہ اپنی .... موت .... تک میرا اسی طرح خیال رکھتے رہے۔''

وہ موت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے پاپا کا انتقال کب ہوا؟''

وہ بولی۔ ''پاپا لیورن مرے نہیں تھے۔ انہیں مارا گیا تھا اور ممی کی لاش غائب کردی گئی تھی۔''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''انہیں قتل کیا گیا تھا۔ ان کے قاتل کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو بتانے کا فائدہ بھی نہیں ہے۔ کوئی یقین نہیں کرتا کیونکہ قتل فطری موت کی طرح کیا گیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان کا قاتل کون ہے .... اور تمہاری ممی کی لاش کس نے غائب کی ہے؟''

اس نے میری طرف دیکھا پھر ناگواری سے بولی۔ ''بھاگیشور راؤ۔''

میں چونک گیا۔ ''کیا.... ؟ یعنی تمہارے ماموں نے انہیں قتل کیا ہے؟''

''ہاں.... میرے پاپا بہت طاقت ور تھے مگر وہ کالا جادو نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انہیں آخری وقت تک پتا نہ چل سکا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کالے جادو کا کمال تھا کہ ان کی موت بظاہر فطری لگی۔''

میں نے پوچھا۔ ''بھاگیشور راؤ کو انہیں قتل کر کے کیا فائدہ حاصل ہوا؟''

وہ رخساروں پر ڈھلکتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ماموں نے ووڈو ازم پر بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ پاپا لیورن کا دایاں بازو تصور کیے جانے لگے تھے۔ ماموں ہنگن کی سیٹ تک پہنچنا چاہتے تھے مگر وہاں پاپا کا راج تھا۔ وہ انہیں راستے سے ہٹا کر ہی ہنگن بن سکتے تھے اس لیے انہوں نے پاپا کو قتل کر ڈالا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو کیا اب وہ ہنگن بن گئے ہیں؟''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں .... لیکن ان کے پاس پاپا جیسی طاقت نہیں ہے۔ ووڈو ازم میں جتنے زیادہ لوگ ان کے معتقد ہوں گے اور ان کی آتمائیں ماموں کے قبضے میں آئیں گی، وہ اتنے ہی طاقت ور ہوتے چلے جائیں گے۔ یہی اس مذہب کا اہم اور خطرناک جادو ہے۔''

وہ اداس ہوگئی تھی۔ میں اس کا موڈ بدلنے کے لیے ہنستے ہوئے بولا۔ ''اچھا.... اس کا مطلب جادو میں بھی جمہوریت آگئی ہے۔ جتنا زیادہ ووٹ بینک، اتنی ہی زیادہ طاقت....''

وہ میری بات سن کر مسکرانے لگی، پھر بولی۔ ''انہیں یہاں کے لوگوں کا مکمل اعتماد حاصل نہیں ہے۔ وہ اپنی طاقت کو جزیرے کی بھلائی کے بجائے تباہی میں صرف کررہے ہیں۔ وہ میرے بغیر لوگوں کی حمایت حاصل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کئی بار مجھ سے رابطہ کرنا چاہا مگر میں نے انکار کردیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی وہ مجھے زبردستی سینکچری میں لے جانا چاہتے تھے مگر تم نے میری مدد کر کے مجھے ان سے نجات دلادی۔''

''وہ بھاگیشور راؤ.... یعنی تمہارے ماموں تھے؟''

''ہاں .... وہی میرے ماموں ہیں۔ دراصل میں اپنے پاپا لیورن کے ساتھ رہی ہوں اور یہی میری سماجی مقبولیت کی وجہ ہے۔ میرے سمجھانے پر لوگ ان کے مرید بن جائیں گے اور اپنی آتمائیں ان کے حوالے کردیں گے۔''

میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ''تم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، وہ دشمنی کے طور پر تمہارے اندر پریت آتما داخل کر کے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ”میں ان کا ساتھ کیوں دوں ۔۔۔؟ انہوں نے میرے باپ کو قتل کردیا۔ میری ممی سے ان کا آبائی وطن چھڑوایا۔ اگر وہ پاپا کو ان کی حقیقت سے آگاہ کر دیتیں تو وہ انہیں جزیرے سے نکال دیتے۔ واپس انڈیا بھیج دیتے۔ جہاں حکومتی کارندے یا تو ماموں کو گرفتار کر لیتے یا انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ ممی نے ماموں کا ہر طرح ساتھ دیا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہ جادو ٹونے کی خاطر پاپا کی جان لے لیں گے تو کبھی ان کا ساتھ نہ دیتیں۔ ماموں شیطان ہیں اور شیطان کبھی مخلص نہیں ہوتا۔“

”وہ شیطان تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔“

”وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، میں پاپا لیورن کی بیٹی ہوں۔ اپنی زندگی کے بیس سال ان کے ساتھ گزارے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ پریت آتما کو شریر میں داخل ہونے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ میرے اندر اُن کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے۔“

وہ مجھے تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے آپ کی فکر ہو رہی ہے۔ لوگوں کے سامنے آپ نے ان کی بے عزتی کی ہے، وہ بدلے کے طور پر کسی پریت آتما کو آپ کے شریر میں داخل کر کے آپ کو مارنے کی کوشش کریں گے۔“

میں ذرا بے پروائی سے بولا۔ ”تم میری فکر نہ کرو۔ میں اُن سے نمٹ لوں گا۔“

”آپ انہیں نہیں جانتے۔ وہ بہت مکار اور چالاک ہیں۔ جسے یوگا پر مکمل عبور حاصل ہو۔ وہی ان سے نمٹ سکتا ہے۔ یوگا کی مشقوں کے ذریعے ہی پریت آتما کو شریر میں داخل ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔“

میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مطلع کرنے کا شکریہ ۔۔۔۔ میں یوگا کی مشکل ترین مشقوں کا ماہر ہوں۔ بھاگیشور راؤ کو سنبھال لوں گا۔“

وہ ذرا مطمئن ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

وہ ہنسنے لگی۔ ایک بار پھر مشرقی کھنک کانوں سے ٹکرائی تو عجیب سرشاری کا احساس ہونے لگا۔ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”یہ بھی ایک جادو ہے۔“

”کیا تم بھی جادو جانتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”نہیں ۔۔۔۔ میں مذاق کر رہی تھی۔ پاپا کے قتل کے بعد میں نے سیکٹری چھوڑ دی اور یہاں سن رائز ہوٹل میں بطور منیجر ملازمت کر لی ہے۔ مسٹر جان فاروے نے آج ہی مجھے بتایا کہ دو سراغ رساں مسٹر وائل کی موت کا سراغ لگانے آج شام وانڈرٹو سے آرہے ہیں۔ ان میں ایک لڑکی لیزا اسکاٹ اور ایک نوجوان سلمان واحد ہیں۔ میں آپ دونوں کو ریسیو کرنے کے لیے ہوٹل سے نکلی تھی اور بھاگیشور راؤ سے سامنا ہوگیا۔“

اس نے اپنے بیگ سے دو تصویریں نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر جان فاروے نے مجھے آپ دونوں کی تصاویر بھی دی تھیں تاکہ آپ کو پہچاننے میں مشکل پیش نہ آئے مگر میری وجہ سے آپ مشکل میں پھنس گئے ہیں۔“

”میں ایسی مشکلات کا عادی ہوں اور ان چیزوں کو ہمیشہ چیلنج کے طور پر قبول کرتا ہوں۔ بھاگیشور راؤ کو میں کافی عرصے سے تلاش کر رہا ہوں۔ میرے والد صاحب اس کے کیس کو ڈیل کر رہے تھے۔ وہ انڈیا سے فرار ہوگیا تھا مگر اب مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکے گا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی اپنائیت اور لگاوٹ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھاگیشور راؤ کے متعلق کافی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اب نمرتا کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سحر انگیز شخصیت کی مالک مغربی اور مشرقی حسن کا عظیم شاہکار تھی۔ اس کا لباس اور لب ولہجہ گواہی دے رہا تھا کہ مغرب میں پرورش پانے کے باوجود وہ مشرقی حیا کا پیکر ہے اور مغربی غلاظتوں سے پاک ہے۔

میں تصور میں نمرتا اور لیزا کا موازنہ کرنے لگا۔ وہ اس کے برعکس یورپی ماحول کی پروردہ تھی اور ہر دم خوش رہنے کی قائل تھی۔ ایک کے بعد دوسرا بوائے فرینڈ بنانا اس کے لیے ایک عام سی بات تھی۔ میں بھی اس کے بوائے فرینڈز کی لسٹ میں شامل ہوگیا تھا۔ یہاں سے کیس ختم کر کے میں ہندوستان چلا جاؤں گا اور وہ امریکا چلی جائے گی۔ میرا اور اس کا ساتھ صرف اتنا ہی ہے۔ ہم زندگی کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں اور دل بھر جانے پر کھلونا بدل لیتے ہیں۔

لیکن نمرتا سے مل کر پہلی بار ایسا لگا کہ عورت محض کھلونا نہیں ہوتی۔ وہ مرد کی زندگی کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ اس کے بغیر مرد ادھورا رہتا ہے۔ نمرتا جیسی لڑکیاں ہی ہماری زندگی میں آکر نصف بہتر کہلاتی ہیں۔

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ

نجومی

جوان اور خوب صورت لڑکی نجومی کے پاس اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے گئی۔ نجومی نے جوان لڑکی کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے انداز ے سے کہا۔

"تمہاری شادی تمہارے خوابوں کے شہزادے سے ہوگی جو جوان، خوب صورت اور صحت مند ہوگا۔"

"اور دولت مند بھی؟" لڑکی نے سوالیہ نظروں سے نجومی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں دولت بے انتہا، ساتھ میں عمر بھی 28 سال کے قریب۔" نجومی نے جواب دیا۔

لڑکی خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

"اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میں اپنے موجودہ شوہر سے کس طرح جان چھڑا سکتی ہوں!"

امریکہ سے جاوید کاظمی

ملاقات لاس اینجلس میں ہوئی تھی۔ ایک کیس میں اس نے میری مدد کی تھی۔ وہاں سے فارغ ہوا تو اس نے یہاں کے کیس میں مجھے اپنی مدد کے لیے بلا لیا اور میں اس خوب صورت جزیرے پر چلا آیا۔"

سامنے سے ایک بھاری بھرکم جسامت کا شخص ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ چہرے سے بُردبار اور باوقار دکھائی دے رہا تھا۔ نمرتا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"مسٹر جان ہماری طرف ہی آرہے ہیں۔"

جان فارو ہمارے قریب آکر رک گیا۔ "ویلکم۔۔۔ مسٹر سلمان ۔۔۔!"

میں نے رسمی طور پر مصافحہ کیا۔ "ہیلو مسٹر جان! آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

مسٹر جان نے کہا۔ "کچھ دیر پہلے مس لیزا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں کمرے میں پہنچا دیا ہے۔ آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں پھر ہم کیس پر ڈسکس کریں گے۔"

"نہیں شکریہ۔ وہ پینے کے بعد گہری نیند سوتی ہے۔ اب صبح ہی اٹھے گی۔ میں جلد از جلد کیس کی ابتدا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے تفصیلات بتا دیں۔"

وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "جیسے آپ کی مرضی۔ چلیں، آفس میں چلتے ہیں۔"

ہم آفس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دوران میں نمرتا اس کی شخصیت مجھے متاثر کر رہی ہے۔ اس نے بڑے مان سے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی داستان سنائی تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کا بھرپور ساتھ دوں گا۔

میں نے کہا۔ "خود کو تنہا نہ سمجھو۔ تمہارے پاپا کے قاتل سے بدلہ لینے کے لیے میں تم سے بھرپور تعاون کروں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے یقین ہے۔"

اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم سن رائز ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ کیس شروع ہونے سے پہلے ہی میں الجھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

سن رائز فنِ تعمیر کا اعلیٰ شاہکار تھا۔ ہم استقبالیہ سے گزر رہے تھے۔ وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "سلمان! ایک بار پھر تنبیہ کر رہی ہوں۔ ہوشیار رہنا، ماموں سے غافل نہ ہونا۔ انہیں آسان حریف نہ سمجھنا۔ اگر وہ سیدھے سادے طریقے استعمال کر کے تم سے مقابلہ کرنے میں ناکام رہے تو شکتی ماں چپیا کے ذریعے شکتی مان پریت آتما کو بلانے سے گریز نہیں کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی معتقد کی بھینٹ دے کر۔۔۔۔ ڈمبالا، سینٹ ایکس پیڈٹ یا بیرن سمیٹری کو تمہارے خلاف اکسانے کی کوشش کریں گے مگر یہ بہت مشکل عمل ہے۔ اس کے لیے انہیں سالانہ تہوار کا انتظار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے مجھے آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا ہے۔ میں محتاط ہو گیا ہوں۔ بھاگیشور راؤ سے غافل نہیں رہوں گا۔"

وہ ذرا مطمئن ہوئی پھر بولی۔ "مسٹر فارو نے کہا تھا، ہوٹل پہنچتے ہی انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دوں۔ آپ ابھی ان سے ملنا پسند کریں گے یا آرام کرنے کے بعد ملیں گے؟"

میں نے کہا۔ "میں پہلے اُن سے ملنا چاہوں گا۔ ہوسکتا ہے، لیزا ابھی یہاں پہنچ چکی ہو؟"

لیزا کے نام پر نمرتا نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ لیزا میری کیا لگتی ہے؟

اس نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ آپ کی ۔۔۔۔ وائف ہیں؟"

مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا ہی کوئی سوال پوچھے گی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں ۔۔۔۔ چند دنوں پہلے ہی ہماری

نے گزرے ہوئے واقعے کے بارے میں مسٹر جان کو تفصیلات بتائیں۔ جنہیں سن کر وہ کچھ پریشان ہو گئے۔ نمرتا ہمیں آفس کے دروازے تک چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ ہم اندر آ گئے۔ آفس نہایت سلیقے سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہم ایک کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔

اس نے پوچھا۔ "سفر کیسا رہا مسٹر سلمان!"

"سفر تو ٹھیک تھا مگر یہاں کے حالات معمول سے ہٹ کر ہیں۔"

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ "یہاں آتے ہی آپ کا ٹکراؤ بھاگیشور راؤ سے ہو گیا اور یہ بہت غلط ہوا ہے۔"

"میں ان چیزوں کا عادی ہوں۔ ایسی ہی مشکلات کو عبور کرتا ہوا آج اس مقام پر ہوں کہ امریکی انٹیلی جنس والے بھی مجھ سے تعاون چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کے کام کی نوعیت سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ہمہ وقت خطرات کا سامنا کرتے رہتے ہیں مگر بھاگیشور راؤ بہت خبیث ہے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ پاپا لیورن کی موت کے بعد وہ اس جزیرے کا سب سے طاقت ور انسان بن گیا۔ آپ کو چوکنا رہنا ہوگا۔"

"نمرتا نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں اس سے نمٹنا جانتا ہوں۔"

"لیکن مسٹر سلمان! یہاں لاس اینجلس جیسا کچھ نہیں ہے۔ ہم آپ کو وہاں جیسی سہولیات فراہم نہیں کر سکتے۔ یہاں کے اور وہاں کے حالات میں بہت فرق ہے۔"

میں تائید میں سر ہلا کر بولا۔ "مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ آپ بتائیں، کیس کی تفصیلات کیا ہیں؟"

اس نے انٹرکام کے ذریعے سافٹ ڈرنک کا آرڈر دیا پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "مس لیزا سے لاس اینجلس میں رابطہ ہوا تھا۔ اس وقت صرف مسٹر وائل کا قتل ہی معما بنا ہوا تھا لیکن آپ دونوں کے واانڈرلو پر سوار ہونے کے بعد سے اب تک ایک اور قتل ہو چکا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا اس کا تعلق بھی وائل کیس سے ہے؟"

"ہاں.... اس کو بھی وائل کی طرح قتل کیا گیا ہے۔"

"مرنے والا دوسرا شخص کون تھا؟"

"وہ وائل کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ اس کا نام پال ہے۔"

"آپ پال اور وائل کی موت کو قتل کہہ رہے ہیں اور انہیں ایک ہی کیس کی دو کڑیاں قرار دے رہے ہیں۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"پتا نہیں کیوں؟ پولیس اس کے قتل کو بھی طبعی موت کہتی ہے۔ کیونکہ وائل کی طرح اس کی باڈی پر بھی کوئی نشان نہ تھا جس سے اندازہ لگایا جاتا کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے مگر موت کا وقت وہی تھا جو وائل کی موت کا تھا۔ اس کی لاش بھی اسی کمرے میں اور اسی حالت میں ملی تھی۔ یہی تمام باتیں ان اموات کو میری نظر میں قتل بنا رہی ہیں۔ وائل کے قتل کے تیسرے دن ہی پال کو قتل کیا گیا ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک ویٹر مشروبات کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا پھر اسے میز پر ہمارے سامنے رکھ کر واپس چلا گیا۔ مسٹر جان ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "یکے بعد دیگرے ہونے والے قتل نے پورے ہوٹل اسٹاف اور کسٹمرز میں ہلچل پیدا کر دی ہے۔ ہوٹل کا عملہ نوکری چھوڑنے کے درپے ہے۔ یہاں آنے والے سیاح دوسرے ہوٹلز اور کاٹیج کا رخ کر رہے ہیں۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ جان فارو بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ لیزا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ تازہ دم دکھائی دے رہی تھی۔ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "سوری .... میں آپ لوگوں کو پہلے جوائن نہ کر سکی۔"

میں نے کہا۔ "اب تک جو گفتگو ہوئی ہے، وہ میں تمہیں بعد میں سناؤں گا۔"

پھر میں نے جان فارو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی بات جاری رکھیں۔"

"مسٹر سلمان! آپ میری کیفیت سمجھ سکتے ہیں۔ ایک تو میرا عزیز ترین دوست اس دنیا میں نہیں رہا، دوسرے منافع کا گراف روز بروز نیچے آتا جا رہا ہے۔ ایسے مشکل وقت میں مجھے امید ہے کہ آپ دونوں میرے لیے مضبوط سہارا بن سکتے ہیں۔"

لیزا نے مداخلت کی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ ہم پوری کوشش کریں گے۔ میں نے مسٹر سلمان کو اسی لیے اس کیس میں شامل کیا ہے۔ یہ ایشیا کے مانے ہوئے سراغ رساں ہیں۔ یہ ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ امریکی انٹیلی جنس والے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ جس کیس کو ہاتھ میں لیتے ہیں، اس میں کامیابی یقینی ہوتی ہے۔"

جان فارو، لیزا کی گفتگو سن کر متاثر ہوتے ہوئے

بولا۔ ”میں نے اپنے اسٹاف کو یہی تسلی دی ہے کہ دنیا کے مانے ہوئے سراغ رساں یہاں آرہے ہیں۔ وہ حالات کو جلد ہی سنبھال لیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”بقول آپ کے یہ دونوں اموات حقیقت میں قتل ہیں تو ہم جلد ہی قاتل کا پتا لگانے کی کوشش کریں گے۔ قاتل کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی سراغ ضرور چھوڑتا ہے اور یہی معمولی سی غلطی ہمیں مجرم تک پہنچا دیتی ہے۔“

جان فارو کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اسی اثنا میں درمیانی عمر کی ایک عورت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور تیزی سے چلتی ہوئی جان فارو کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تہ شدہ کاغذ دبا ہوا تھا۔

جان اسے غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں نے حکم دیا تھا کہ ہمیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”سوری سر! معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ آپ کو ڈسٹرب کرنا پڑا۔“

پھر اس نے تہ شدہ کاغذ جان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سر! میں کاؤنٹر پر تھی۔ کچھ دیر پہلے میں نے ایک کال ریسیو کی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ دوسری طرف کون بول رہا تھا؟ اس نے ایک پیغام دیا تھا۔ وہ اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ آپ پڑھ لیں۔“

وہ عورت کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس پیغام کو ہماری موجودگی میں سنانا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اسی لیے لکھ کر لے آئی۔ جان اس تحریر کو پڑھتا جارہا تھا۔ میں اور لیزا اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں، منہ بے ساختہ کھل گیا تھا۔ چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے سمجھا رہی تھی کہ یہ پیغام ضرور وائل کیس سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ اس کاغذ پر سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جارہا تھا۔ میں لیزا کی طرف متوجہ ہوکر دھیمی آواز میں بولا۔ ”اس جزیرے پر اب تک وائل سمیت دو قتل ہوچکے ہیں۔“

جان فارو کاغذ پر سے نظروں ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”دو نہیں.... تین۔“

ہم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کاغذ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تیسرا قتل ہے اور اس بار ہماری ایک مہمان کسٹمر شکار ہوئی ہے۔“

میں اس تحریر کو پڑھنے لگا۔ لیزا بھی میری طرف جھک کر اسے پڑھنے لگی۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ کمرا نمبر 23 میں مقیم خاتون ایلن انڈروڈ اپنے بیڈ پر مردہ پائی گئی ہے۔ اس کی موت کی اطلاع اجنبی کال کے ذریعے موصول ہوئی تھی۔ اطلاع ملتے ہی کمرے کو چیک کیا گیا تو وہ واقعی فوت ہوچکی تھی۔

میں اور لیزا ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ جان اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ دونوں میرے ساتھ آئیں۔“

ہم آفس سے باہر آئے۔ وہ اس عورت سے بولا۔ ”ڈاکٹر جیمس کو بلاؤ۔“

وہ پلٹ کر ایک طرف چلی گئی۔ ہم تینوں لابی سے گزر کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک کشادہ کوریڈور میں آگئے۔ جان فارو پریشان ہوکر بولا۔ ”یہ اچھا نہیں ہورہا ہے۔ اس طرح تو میں برباد ہوجاؤں گا مسٹر سلیمان! آپ تو تمام حالات دیکھ ہی رہے ہیں.... پلیز.... کچھ کریں....“

جہاز سے اترتے ہی اس بھوت نما شخص سے ٹکراؤ ہو گیا تھا، پھر بھاگیشور راؤ گلے پڑ گیا اور اب ہوٹل ہی میں تیسرے قتل کی خبر مل گئی۔ مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ یہ طبعی اموات نہیں ہیں، اتفاق ایک ہی بار ہوسکتا ہے۔ ہر بار ایک ہی وقت پر کسی شخص کا مرجانا اتفاق نہیں ہے۔

صرف چار دن پہلے وائل کی موت ہوئی، اس کے بعد پال اور اب یہ مہمان خاتون ایلن۔ سب کچھ اچانک اور توقع کے خلاف ہورہا تھا۔ سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ یہاں تو لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کسی نے ٹائی فون چھڑک دیا ہو اور مکھیاں دھڑا دھڑ ہلاک ہورہی ہیں۔

کچھ دیر بعد ہم کمرا نمبر 23 کے دروازے پر کھڑے تھے۔ جان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلے آئے۔ ایک عورت بیڈ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں اور لیزا اس کے قریب آئے۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ شراب کے نشے میں چور پڑی سو رہی ہے۔ اس کے لباس، چہرے اور ہاتھوں پر کہیں کوئی داغ دھبا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جان بیڈ سے کچھ فاصلے پر آنکھیں پھاڑے ایلن کی ڈیڈ باڈی کو تک رہا تھا۔ اس پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ شاید اسے یہ خوف تھا کہ کہیں چوتھا نمبر اسی کا نہ ہو۔

لیزا مردہ ایلن کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے لگی پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”اسے تو مرے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کال کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟“

جان نے چونک کر مجھے دیکھا پھر فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔“

میں ایلن کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی عمر تقریباً پچیس برس رہی ہوگی۔ چہرے پر دلکشی اور تازگی پھیلی ہوئی تھی۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی موت کا کیا سبب ہے؟ یہ معما پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی حل ہو سکتا تھا۔ میں اور لیزا کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔

ایک شخص دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا سا ادھیڑ عمر آدمی تیزی سے چلتا ہوا بیڈ کے قریب آیا اور ایلن کی کلائی پکڑ کر نبض ٹٹولنے لگا۔ جان ریسیور کان سے لگائے پولیس کو اس ہلاکت کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ وہ فون بند کر کے پلٹا۔

نو وارد شخص شاید ڈاکٹر جیمس تھا۔ اس نے ایلن کا جائزہ لینے کے بعد جان فارو سے کہا۔ ”مجھے حیرت ہے اس کی موت بھی وائل اور پال کی طرح ہوئی ہے۔ باڈی پر کہیں تشدد کا نشان یا خراش دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ میں نے ابھی پال کی ڈیڈ باڈی کا تفصیلی پوسٹ مارٹم نہیں کیا ہے مگر وائل کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اسے کسی طرح بھی قتل یا حادثاتی موت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے تمام اعضا اور ٹشوز عمر کے مطابق نارمل تھے۔

وائل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی ہلاکت کی وجہ سامنے نہیں آسکی تھی۔ میں نے اور لیزا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کیس کچھ پیچیدہ ہے۔

ڈاکٹر جیمس نے ایک بار پھر لاش کو ٹٹولا، پھر کہا۔ ”اس کی صحت بتا رہی ہے کہ یہ مزید زندہ رہ سکتی تھی۔ اگر یہ خوف و دہشت سے ہلاک ہوئی ہے تو اس کے چہرے پر خوف کے واضح تاثرات نظر آتے۔ باقی تفصیلات پوسٹ مارٹم کے بعد ہی سامنے آسکیں گی۔“

ڈاکٹر نے اپنا کام مکمل کر لیا اور اپنی ڈائری میں تفصیلات لکھنے لگا۔ میں اور لیزا پولیس کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ آکر اپنی تفتیش مکمل کر لے۔ اس کے بعد ہم اپنے انداز میں چھان بین شروع کریں۔

دو پولیس والے نیلے رنگ کی وردی میں ملبوس دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر تھا اور دوسرا اس کا ماتحت کانسٹیبل تھا۔ انسپکٹر شکل و صورت کے اعتبار سے اسپینش لگ رہا تھا۔ اس کا چوڑا سینہ باہر کو نکلا ہوا اور مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔ وردی کے باوجود بھرے بھرے بازوؤں کے مسلز صاف ظاہر ہو رہے تھے۔

وہ لاش کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد جان سے بولا۔ ”اچھا تو دو کے بعد یہ تیسری موت واقع ہوئی ہے۔ آپ نے فون پر بتایا تھا کہ یہ بھی سابقہ اموات کی طرح سے ہوئی ہے۔“

جان تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ”جی ہاں۔۔۔ بالکل۔۔۔“

وہ میرا اور لیزا کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ”یہ مسٹر سلمان ہیں اور یہ مس لیزا اسکاٹ۔“

ہم دونوں نے انسپکٹر سے رسمی طور پر مصافحہ کیا۔ اس نے جان سے پوچھا۔ ”یہی وہ دونوں سراغ رساں ہیں جن کی آمد کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا؟“

وہ بولا۔ ”جی ہاں۔۔۔ ابھی ہم آفس میں کیس ڈسکس کر ہی رہے تھے کہ تیسری ہلاکت کی اطلاع ملی۔“

کانسٹیبل کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ انسپکٹر نے لاش کا ایک بار پھر سے معائنہ کیا۔ جان سے رسمی سی تفتیش کرنے کے بعد بولا۔ ”۔۔۔ جیسے ہی کوئی خاطر خواہ پیش رفت ہوگی، آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ فی الحال میں یہاں دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا رہا ہوں۔ وہ ہوٹل کی نگرانی کرتے رہیں گے۔“

وہ اپنی فائل میں اہم معلومات تحریر کرنے لگا پھر ہم سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ ایک ہی طرز پر تین قتل ہوئے تھے مگر وہ انسپکٹر اب بھی انہیں فطری موت قرار دے رہا تھا اور اس کیس کی تفتیش سطحی انداز میں کر رہا تھا۔

ڈاکٹر اور انسپکٹر اپنی اپنی کارروائی مکمل کر کے چلے گئے تو میں نے اور لیزا نے پورے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ہم نے کمرے کی ایک ایک چیز کو کھنگال ڈالا مگر کوئی ایسا سراغ نہ مل سکا جو اس کیس میں معاون ثابت ہو سکتا۔ البتہ جان فارو کے ذریعے ایلن کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ایک ہفتے پہلے اس کمرے میں آکر ٹھہری تھی۔ اس کے ساتھ ایک پچاس سالہ شخص فلپس بھی تھا۔ وہ اس کے برابر والے کمرا نمبر 26 میں قیام پذیر ہوا تھا۔ وہ دونوں اپنا زیادہ تر وقت ایک ساتھ ہی گزارتے تھے۔ انہوں نے دونوں کمروں کی ریزرویشن ایک ماہ پہلے خط کے ذریعے

کروائی تھی۔ ان کی آمد کے دو روز بعد وائل کی موت واقع ہو گئی۔

جان فارو نے میرے کہنے پر ایک ملازم کے ذریعے وہ دونوں خط منگوائے۔ میں اور لیزا انہیں بغور پڑھنے لگے۔ وہ بولی۔ ”ان دونوں خطوں کو ایک ہی ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیا گیا ہے۔ دونوں خطوط میں چھوٹا حروف ”ٹی“ لائنوں سے ذرا اوپر ہے۔“

جان فارو نے میرے کہنے پر ایک ملازم کے ذریعے فلپس کو بلوایا تو پتا چلا کہ وہ کمرے میں نہیں ہے۔ اسے دو گھنٹے پہلے ہوٹل سے باہر جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

اس چھوٹے سے جزیرے میں ایلن کی موت کی خبر آناً فاناً پھیل گئی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ تیسری ہلاکت کی خبر سب کو پتا چل چکی ہے تو کیا فلپس کو علم نہیں ہوا ہوگا؟ اگر اسے بھی معلوم ہو چکا ہے تو وہ اب تک کیوں نہیں پہنچا ہے؟ ایلن کے بعد چوتھا شکار کہیں وہ تو نہیں ہے؟

میں نے جان کو ہدایت دی کہ اسے فوراً تلاش کیا جائے۔ اس نے اپنے تین ملازموں کو فلپس کی تلاش کے لیے روانہ کر دیا۔ ایک ملازم نے آکر اس سے کہا۔ ”مارکس رول آئے ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔“

جان فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم سے اجازت لے کر چلا گیا۔ لیزا تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ میں ذہنی طور پر الجھ گئی ہوں۔ باتھ فریش کرنے بار میں جا رہی ہوں۔ اب تم سے جان کے آفس میں ملاقات ہوگی۔“

وہ ایک ادا سے میرے گال پر بوسہ دے کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ وہ یورپ کی پیداوار تھی۔ شراب سے مائنڈ فریش کرتی تھی۔ میں بھی فریش ہونا چاہتا تھا۔ جب سے یہاں آیا تھا، کسی نہ کسی نئے مسئلے میں الجھتا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے نسرتا کا خیال آیا۔ اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ ایلن کی ہلاکت کا تذکرہ پورے ہوٹل میں ہو رہا تھا مگر وہ اب تک یہاں نہیں پہنچی تھی۔

میں نیچے لابی میں آ گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا کاؤنٹر پر آیا تو وہاں جان ایک رعب دار شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے گہری نظروں سے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت اکڑو قسم کا آدمی ہے۔

جان نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ مسٹر سلمان واحد ہیں۔ ایشیا کے نامی گرامی انویسٹی گیٹرز میں سے ایک ہیں۔ یہی مس لیزا اسکاٹ کے ساتھ آئے

بینک بیلنس

لڑکی نے شرما کر لڑکے سے پوچھا۔ ”تم نے ابو سے بات کی؟“

”ہاں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے پوچھا کہ میرا بینک بیلنس کتنا ہے، میں نے کہا دس ہزار۔“

”پھر کیا ہوا؟“ لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا، انہوں نے وہ رقم مجھ سے ادھار لی اور کہا کہ تم تو دو کوڑی کے آدمی بھی نہیں ہو۔“

شوکت علی قریشی، جیکب آباد سندھ

ہیں۔“

”وہ رسمی سی ”ہائے ..... ہیلو“ کے بعد جان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اچھا جان میں اب چلتا ہوں۔ مجھے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکا۔ اس سے آگے سوچنا اب تمہارا کام ہے۔“

وہ جان فارو سے باتیں کر رہا تھا لیکن میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ آج سے پہلے بھی میں نے اس چہرے کو کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا تھا، یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہم دونوں سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ شخص کون تھا؟“

اس نے کہا۔ ”یہ لاس اینجلس کا بہت بڑا بزنس مین ہے۔ اس کی وہاں بہت بڑی جاگیر ہے اور پوری دنیا میں درجنوں ہوٹلوں کا مالک ہے۔“

میں لاس اینجلس کا نام سن کر چونک گیا۔ ذہن پر دباؤ ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

جان اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”میں نے وائل کے مشورے کے مطابق اس سے دس لاکھ ڈالرز بطور قرض لیے تھے۔ یہ لاس اینجلس کے بڑے انویسٹرز میں سے ایک ہے۔ شیئرز کا لین دین بھی کرتا ہے۔ یہ اس ہوٹل کو خریدنا چاہتا ہے مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ یہ ہوٹل مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہتا۔“

مجھے یاد آیا کہ میں نے مارکس رول کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔ لاس اینجلس پولیس ڈیپارٹمنٹ کے پاس اس کی فائل

موجود تھی۔ انٹیلی جنس والے جرائم پیشہ اور مافیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی فائلز کو اپ ٹو ڈیٹ رکھتے ہیں۔ مافیا کے ڈان ہر وقت ان کی نگاہ میں رہتے ہیں۔ انہی فائلز میں سے ایک فائل مارکس رول کی بھی تھی۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا تھا مگر اس میں مارکس کا مافیا سے کوئی تعلق ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی فائل تیار کرنے کا سبب اس کے دوست ہیں جو مافیا کے اہم اور مضبوط ستون سمجھے جاتے ہیں۔ حکومت بھی ان کے سامنے بے بس ہے۔

میں اور جان کاؤنٹر پر کھڑے باتیں کررہے تھے۔ نمرتا نے آکر بتایا۔ ''فلپس کے بارے میں اب تک کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ نہ جانے وہ کہاں ہے؟'' فلپس کا یوں اچانک غائب ہوجانا بھی غور طلب بات تھی مگر میں اس وقت مارکس رول کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جان سے پوچھا۔ ''مارکس رول یہاں کتنے عرصے سے مقیم ہے؟''

''تقریباً ایک ماہ سے.....''

ایک ملازم جان فارو سے آکر بولا۔ ''سر! آپ کے آفس میں فون آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

پھر وہ نمرتا سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''سلمان کو بھوک لگی ہوگی۔ ان کے لیے ڈنر کا انتظام کرو۔''

وہ اسے ہدایت دے کر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''اچھا تو مسٹر سلمان! اب آپ سے صبح ملاقات ہوگی۔ ایک تو سفر کی تھکان، دوسرے یہاں کی بڑھتی ہوئی الجھنوں نے آپ کو ذہنی طور پر کافی تھکا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پُرسکون نیند آپ کو تازہ دم کردے گی۔ ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں آرام کریں۔ کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔''

وہ مصافحہ کرکے چلا گیا۔ نمرتا نے پوچھا۔ ''ڈنر کورل روم میں کرنا چاہیں گے یا اپنے کمرے میں؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہ کورل روم..... نہ اپنے کمرے میں.....''

اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''پھر.....!''

''ٹیرس پر سے ساحل کا خوب صورت نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ میں ڈنر وہاں کرنا چاہوں گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔''

اس نے انٹرکام کے ذریعے کھانے کا آرڈر دیا پھر میری فرمائش پر میرے ساتھ ٹیرس پر آگئی۔ میں ریلنگ پر ہتھیلیاں ٹیک کر ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ پام کے اونچے اونچے درختوں پر جابجا رنگین کاغذوں کی کینڈل لائٹس لٹک رہی تھیں۔ ان سے پھوٹنے والی رنگ برنگی روشنی ساحلی ماحول کو دور تک رنگین بنا رہی تھی۔ نمرتا میرے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس کی قربت میرے دل میں ہلچل مچا رہی تھی مگر میرے جذبوں کی سرپھری موجوں کا ساحل ابھی دور تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی چمکدار سیاہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''تم اسی ہوٹل میں رہتی ہو؟''

وہ چونک گئی، خیالات کی دنیا سے واپس آتے ہوئے بولی۔ ''آں..... ہاں.....''

اس نے پلٹ کر میز کی طرف دیکھا۔ کھانا چن دیا گیا تھا۔ ہم دونوں کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ اب بھی چور نظروں سے سمندر کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہاں ملگجے اندھیرے میں چند ایک رومینٹک جوڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ یقیناً صاحبِ ذوق ہوں گے۔ تب ہی اندھیری رات میں ساحلی خوب صورتی کو دیکھنے کے لیے اپنے کاٹیج یا ہوٹل سے نکل کر ساحل پر آگئے تھے۔

میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹیرس کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ چاندنی کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے ایک ڈش میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''لیزا کہاں ہے؟''

''وہ بار میں ہے۔''

''ایک ذاتی سوال پوچھوں۔ آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟''

میں کندھے اچکا کر بولا۔ ''یہ تو سوال پر منحصر ہے۔ پوچھو..... کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

اس نے سر جھکا لیا پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ..... آپ لیزا سے محبت کرتے ہیں؟''

مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ ایسا ہی کوئی سوال پوچھے گی۔ میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم صرف دوست ہیں..... اچھے دوست.....!''

وہ بڑے دلربا انداز میں مسکرائی۔ اس نے ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی پھر ساحل کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ میں اس کی اس ادا پر پگھل کر رہ گیا۔ وہ میرے اصولوں کو توڑ رہی تھی اور بار بار کام کے دوران میں بھی میرے دماغ میں سمارہی تھی۔

اچانک وہ چونک گئی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے وہاں کچھ بھی خاص نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، اب اس کی نگاہیں پام کے درختوں کے اردگرد بھٹک رہی تھیں۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے ریلنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے اسے پکارا۔ ''نمرتا۔۔۔! کیا ہوا۔۔۔؟ نمرتا۔۔۔!''

وہ میری آواز پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ ریلنگ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں اب بھی پام کے درختوں کے آس پاس بھٹک رہی تھیں۔ میں نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''نمرتا۔۔۔! کیا ہوا۔۔۔؟ تم ایسے آنکھیں پھاڑ کر وہاں کیا دیکھ رہی ہو؟''

وہ میری طرف دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں تجسس تھا پھر اپنے کانوں کا رخ پام کے درختوں کی سمت کر کے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہاں ساحل پر مچلتی ہوئی لہروں اور ہوا سے پام کے ہلتے ہوئے پتوں کی آواز کے سوا کوئی تیسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس نے ایک دم سے چونک کر پوچھا۔ ''سلمان! آپ نے کچھ سنا۔۔۔؟''

میں توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''یہ آواز۔۔۔ یہ آواز۔۔۔ آپ کو سنائی دے رہی ہے؟ کیا آپ سن رہے ہو؟''

مجھے سوائے ساحلی شور کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیسی آواز۔۔۔؟ مجھے تو صرف سمندر کا شور اور پتوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔''

''نہیں، یہ ساحلی آواز نہیں ہے۔ یہ تو پیار بھرے جذبوں میں ڈوبی ممتا بھری آواز ہے۔ رات کے وقت جب بھی میں یہاں آتی ہوں تو یہ مجھے پکارتی ہے، اپنی طرف بلاتی ہے۔''

میں حیران پریشان سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ نہ جانے اسے کیسی آواز سنائی دے رہی تھی؟ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اپنے جذبات بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوف یا دہشت کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کے برعکس چہرے پر سرشاری کے تاثرات نمایاں تھے۔

وہ بولی۔ ''یہ آواز مجھے اپنی آغوش میں سمیٹنے کے لیے پکارتی ہے۔''

میں الجھ کر بولا۔ ''پلیز نمرتا۔۔۔! مجھے واضح طور پر بتاؤ، تم کیا سن رہی ہو؟ وہ کیسی آواز ہے جو تمہیں اپنی طرف بلا رہی ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ آواز کوئی نہیں سن پاتا، آپ کو بھی یہ سنائی نہیں دے رہی ہے لیکن میں۔۔۔ میں سن سکتی ہوں۔ واضح طور پر سن سکتی ہوں۔ وہ مجھے بلاتی ہیں۔''

''وہ کون ہیں، جو تمہیں بلاتی ہیں۔۔۔؟''

اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میرا سوال اسے تصوراتی دنیا سے اچانک نکال لایا ہو۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ ''وہ۔۔۔ میری ممی۔۔۔ وہی مجھے پکارتی ہیں۔''

میں تعجب سے بولا۔ ''تمہاری ممی۔۔۔؟''

اس نے سر اٹھا کر بے بسی سے پام کے درختوں کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کے سائے سے محرومی کی تڑپ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے، میری ممی زندہ ہیں۔ وہ یہیں کہیں ہیں، مجھے پکارتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں جس سمت سے یہ آوازیں سنائی دے رہی ہیں، وہاں چل کر دیکھو۔''

''میں نے ان آوازوں کا کئی بار تعاقب کیا ہے مگر جب میں ان کی سمت میں بڑھتی ہوں تو یہ مزید دور سے سنائی دینے لگتی ہیں۔ میں اور آگے بڑھتی ہوں تو یہ آوازیں کبھی دور ہو جاتی ہیں اور کبھی ان کی سمت بدل جاتی ہے۔''

میں سوچتے ہوئے بولا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر وہ زندہ ہیں اور تمہیں بلاتی ہیں تو تم سے ملتی کیوں نہیں؟''

میں ذرا توقف کے بعد بولا۔ ''نمرتا۔۔۔! کہیں۔۔۔ یہ تمہارا وہم تو نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو ان کی آوازیں مجھے بھی سنائی دیتیں۔ ایسا تو ممکن نہیں کہ زندہ شخص کی آواز سوائے ایک کے کوئی دوسرا نہ سن سکے؟''

وہ تقریباً جھنجلاتے ہوئے تیز آواز میں بولی۔ ''آپ نہیں جانتے سلمان! اس جزیرے پر سب کچھ ممکن ہے۔ یہاں ووڈو جادو کا راج ہے اس کے ذریعے ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ میں نے اگر ممی کی چتا جلائی ہوتی تو کبھی انہیں زندہ تسلیم نہ کرتی مگر ان کی لاش تو غائب ہو گئی تھی۔''

اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے سینے سے لگا کر چپ کرانا چاہتا تھا، تسلیاں دینا چاہتا تھا۔ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ خود

کوتنہا نہ سمجھے لیکن ہمارے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔
میں اس کے شانے کو تھپک کر دلاسا دینے لگا۔
اس نے چونک کر سر اٹھایا، پھر تڑپ کر پام کے درختوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ سلمان۔۔۔۔! ممی۔۔۔۔ ممی جارہی ہیں۔ ان کی آواز دور ہوتی جارہی ہے۔''
میں نے اس طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ تمہیں دکھائی دے رہی ہیں؟''
''نہیں۔۔۔۔ میں آواز سے اندازہ لگالیتی ہوں۔ پہلے آواز دور ہوتی جاتی ہے پھر خاموشی چھاجاتی ہے۔''
وہ اپنے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔
''چلیں۔۔۔۔ میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آؤں۔''
وہ اپنی ماں کے لیے رو تی رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتے جذبوں کے پانی سے چہرہ دھلتا رہا تھا۔ میں بڑی اپنائیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر آگے بڑھ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔
ہم کوریڈور سے گزر رہے تھے۔ ایک ملازم ہماری طرف آتے ہوئے بولا۔ ''مس نمرتا! کاؤنٹر پر آپ کا فون آیا ہے۔''
ملازم اتنا کہہ کر چلا گیا۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ ''اس وقت کس کا فون ہوسکتا ہے؟''
ہم دونوں تیزی سے چلتے ہوئے کاؤنٹر کے پاس آئے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔۔۔۔؟''
وہ دوسری طرف کی آواز سن کر پریشانی سے بولی۔
''ماما۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔؟''
اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے فوراً ہی فون کا وائڈ اسپیکر آن کردیا۔ بھاگیشور راؤ کی بھاری بھرکم آواز ابھرنے لگی۔ ''تو کیا سمجھتی ہے، میں تیرے اس جاسوس سے خوف زدہ ہوگیا ہوں؟ اس سے ڈر کر منہ چھپارہا ہوں؟ بہت جلد تو اس کا عبرت ناک انجام دیکھ لے گی۔ میں جسے ایک پھونک سے اڑا سکتا ہوں، اس پر ہاتھ پاؤں نہیں چلاتا۔ تو خود کو اس کے سائے میں محفوظ سمجھ رہی ہے۔ آنے والا وقت تیری یہ غلط فہمی دور کردے گا۔''
وہ جاہلانہ انداز میں نمرتا کو مخاطب کررہا تھا۔ وہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش کردیا۔
بھاگیشور راؤ کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو میری طرف راغب کر۔ انہیں سمجھا کہ وہ اپنی آتماؤں کو میرے حوالے کردیں، میرے معتقد بن جائیں۔ وہ تیری بات مانتے ہیں مگر تو ہمیشہ میری بات کو رد کرتی آئی ہے۔''
نمرتا ناگواری سے اس کی جاہلانہ گفتگو سن رہی تھی۔ وہ پھسلانے والے انداز میں بولا۔ ''اری لڑکی! میری بات مان لے۔ اس میں تیرا ہی فائدہ ہے۔ میں انعام کے طور پر ایسی دولت دوں گا جو تجھے پوری دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔ میں تیرا ماما ہوں۔ تجھے فائدہ نہیں پہنچاؤں گا تو اور کسے پہنچاؤں گا؟''
وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''میں دولت کی بھوکی نہیں ہوں۔''
''جو دولت میں تجھے دینے والا ہوں، اس کے لیے تو کچے دھاگے سے بندھی میرے پاس چلی آئے گی۔''
''اپنی یہ غلط فہمی دور کرلیں اور یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ میں لوگوں کو آپ کی طرف مائل کرکے آپ کی طاقت میں اضافہ کروں گی۔ آپ آج تک مجھے قائل نہیں کر پائے ہیں اور نہ ہی آئندہ کرپائیں گے۔''
بھاگیشور کی بھدی ہنسی فون کے وائڈ اسپیکر سے ابھرنے لگی پھر وہ بولا۔ ''ابھی تو نے اپنی ماں کی آواز سنی تھی؟''
نمرتا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی حیران تھا کہ جس آواز کو میں نہ سن سکا، اس کے بارے میں یہ کیسے جانتا ہے؟ وہ سچ کہہ رہی تھی کہ اس جیسے پروڈو کے ذریعے بہت کچھ ممکن ہوسکتا ہے۔
وہ بولا۔ ''اگر تو اپنی ماں سے ملنا چاہتی ہے تو میری بات مان لے۔ لوگوں کو میرا معتقد بنادے۔ اس میں تیرا بھی بھلا ہے اور میرا بھی بھلا ہے۔ ورنہ جس جاسوس کو تو اپنا سہارا سمجھ رہی ہے، اس کو تجھ سے چھیننا میرے لیے مشکل نہیں ہے اور تو میری طاقت سے بخوبی واقف ہے۔ تو میری بھانجی ہے۔ پیار سے سمجھا رہا ہوں، میری سینکچری میں آجا۔''
میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر اسے مشورہ دیا۔ ''اس سے پوچھو، تم سینکچری میں آؤ گی تو کیا وہ تمہاری ماں سے تمہیں ملائے گا؟ کیا وہ تمہاری ماں کو آزاد کردے گا؟''
اس نے پوچھا۔ ''تم خاموش کیوں ہو؟''
''میں سوچ رہی ہوں کہ سینکچری میں آؤں گی تو میری ممی مجھے ملیں گی؟'' اس نے اپنے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اسے قید سے آزاد کردو گے؟ وہ میرے ساتھ رہا کرے گی؟"

"کالی بھگتی کی قسم تو میرا کام کرتی رہے گی۔ میرے ساتھ سینکچری میں دیکھی جائے گی تو تیرے پاپا لیورن کے چاہنے والے میرے معتقد بن جائیں گے۔ تم ماں بیٹی اس جزیرے میں کہیں بھی ساتھ رہوگی۔"

"میں ممی سے ملنے کے لیے کس وقت آؤں؟"

"پرسوں پورن ماشی کی رات ہے۔ تو ٹھیک آدھی رات کو سینکچری میں قدم رکھے گی تو تیری ماں تجھے زندہ ملے گی۔ مگر خبردار! اس جاسوس کو رازدار نہ بنانا۔ اسے اِدھر نہ لانا۔ نہیں تو تیری ماں کبھی تجھے دکھائی نہیں دے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پرسوں رات ٹھیک بارہ بجے وہاں آؤں گی۔"

نمرتا نے فون بند کردیا۔

میں نے کہا۔ "پرسوں رات بہت دور ہے۔ میں اس سے پہلے ہی اس کی سینکچری میں جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ وہاں سے یہاں تک کیسے تماشے کر رہا ہے؟"

"آپ کو وہاں تنہا نہیں جانا چاہیے۔ ماما آپ کے جانی دشمن ہیں۔ وہاں ان کے جتنے چیلے چپاٹے ہیں، وہ سب آپ کے دشمن ہیں۔ کتنی ہی آتمائیں ہیں، جو کبھی نظر آتی ہیں، کبھی نظر نہیں آتیں۔ آپ ان سے کیسے نمٹ سکو گے، جو نظر نہیں آتیں؟"

"میں ایسے بے شمار مجرموں سے نمٹ چکا ہوں جو بدروحوں کی طرح چھپ کر رہتے ہیں اور اچانک حملہ کرتے ہیں۔"

"اُن مجرموں اور یہاں کی آتماؤں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"اول تو میں مانتا ہی نہیں کہ روحیں ہماری دنیا میں واپس آکر زندہ انسانوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اگر اس جزیرے میں روحیں آتی ہیں تو یہ میرے لیے ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔"

"آپ بہت ضدی ہو۔ آج یہاں آتے ہی اب تک بھاگ دوڑ میں مصروف رہے ہو۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ آپ کو اپنے کمرے میں جاکر آرام سے سونا چاہیے۔ چلو میں آپ کو کمرے تک پہنچادوں۔"

میں اس کے ساتھ لفٹ کی طرف جانے لگا۔ اسی وقت پال کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ چیختا چلاتا کاؤنٹر کی طرف آرہا تھا۔ وہ مرچکا تھا اور اب زندہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہوٹل میں رہنے والی چند عورتیں اور مرد اُسے دیکھتے ہی چیخیں مارتے ہوئے دور چلے گئے۔ پال کے پیچھے جان فارو اور ہوٹل کے دو چار ملازم آرہے تھے۔ جان ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ "پال۔۔۔۔ !رک جاؤ۔۔۔۔ میری بات تو سنو۔۔۔۔"

وہ غصے سے بولا۔ "میں کچھ نہیں سنوں گا۔ پہلے میری لاش مجھے واپس کرو۔ میرے مردہ جسم کو سرد خانے میں رکھا گیا تھا۔ وہ جسم وہاں سے کہاں چلا گیا؟ اسے کون اٹھا کر لے گیا؟"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیا پاگل ہوگئے ہو؟ اپنے جسم کے ساتھ زندہ دکھائی دے رہے ہو۔ خوامخواہ چیخ رہے ہو کہ تمہارا جسم کسی نے چرالیا ہے۔"

وہ چیختا ہوا ہوٹل کے باہر جا رہا تھا۔ "میں جسم نہیں ہوں، میں آتما ہوں، اپنے جسم کی تلاش میں آیا ہوں۔ اگر میرا جسم نہ ملا تو میری یہ آتما بھٹکتی رہے گی۔ اگر اپنے ہوٹل میں امن اور سکون چاہتے ہو تو میرا جسم مجھے واپس کردو۔"

وہ غصے سے کہتا ہوا ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ میں نے اور جان فارو نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آئے۔ باہر آتے ہی ہم ٹھٹک گئے۔ دروازے کے سامنے ہی بلیو کلر کی جینز پڑی ہوئی تھی۔ جسے ابھی پال نے پہنا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا یہ کسی اور کی جینز ہوگی۔ جان فارو اسے آواز دیتا ہوا آگے بڑھا۔ میں اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ ذرا آگے جاکر ایک اونچے سے پودے پر ملٹی کلر کی شرٹ اٹکی ہوئی دکھائی دی۔ وہ شرٹ بھی پال کے بدن پر دیکھی گئی تھی۔ کچھ دیر بھٹکنے کے بعد ہم رک گئے۔ اب اس کے تمام کپڑے نظر آرہے تھے۔ کپڑوں کے اندر جو جسم تھا وہ نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔

نمرتا دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں ہے وہ؟"

جان فارو نے کہا۔ "گم ہوگیا۔ وہ سچ مچ پال نہیں تھا۔ اس کی آتما تھی۔ باہر آتے ہی اس کا بدن فضا میں تحلیل ہوگیا۔ اس کے کپڑے رہ گئے۔"

میں نے کہا۔ "یہ کوئی شعبدے بازی ہے۔ کیا آتما کپڑے پہنتی ہے؟"

وہ بولا۔ "آتمائیں بنا کپڑوں کے بھی تو نہیں رہتیں۔ وہ اسی لباس میں تھا، جس میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ اسے سردخانے میں اسی لباس میں رکھا گیا تھا۔"

میری عقل تسلیم نہیں کر رہی تھی کہ ایک روح آکر اپنا

گمشدہ جسم تلاش کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "اس کے مردہ جسم سے کسے دلچسپی ہو سکتی ہے؟ کون اس کی لاش چرائے گا؟"

نمرتا نے کہا۔ "میرے ماما ایسا کر رہے ہیں۔ انہوں نے پال کی لاش چرا کر کہیں چھپائی ہے اور اس کی آتما کو پریشان کر رہے ہیں۔ وہ پریشان ہو کر ماما کے قابو میں آئے گی تو اسے اس کے جسم میں پہنچا کر ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنالیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمہارے ماما اور پال کا ڈراما ہے۔ پال ابھی باہر آتے ہی کپڑے اتار کر پھینکتا ہوا کہیں جا کر چھپ گیا ہے۔ یہ تاثر دے رہا ہے کہ آتما غائب ہو گئی ہے۔"

جان نے کہا۔ "لباس اتارتے ہوئے جانے میں دو چار منٹ لگتے ہیں۔ ہم تو اس کے پیچھے صرف چند سیکنڈ میں باہر آئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ چند سیکنڈ میں لباس اتارتا ہوا گیا ہے؟"

مجھے قائل ہونا پڑا۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ ہم نے ہوٹل سے باہر آنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی تھی۔ وہ تو جیسے چشم زدن میں لباس چھوڑ کر فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ بعض باتیں عقل تسلیم نہیں کرتی پھر بھی آنکھوں سے دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ میں تسلیم نہ کرتا، تب بھی یہ حقیقت سامنے رہتی کہ پال چشم زدن میں لباس چھوڑ کر غائب ہوا تھا۔

میں نے نمرتا سے کہا۔ "تمہاری ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا ہے۔ تم اس کی آواز سنتی ہو اور اس آواز کے پیچھے بھاگتی رہتی ہو۔ یہ بھی کوئی آتما والا چکر ہے۔ میں مانتا ہوں، وہ بھاگیشور راؤ کالے جادو کا کھیل، کھیل رہا ہے۔"

جان نے کہا۔ "اس کا یہ کھیل میرے ہوٹل کو بدنام کر رہا ہے۔ پال کی آتما کو دیکھ کر یہاں کے تمام مسافر سہمے ہوئے ہیں۔ کتنے ہی جا چکے ہیں۔ کل اور چلے جائیں گے۔"

"کیا بھاگیشور راؤ تمہارا دشمن ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ میں ایسے خطرناک لوگوں کو دوست بنا کر رکھتا ہوں۔ میں کل اس کی سینگچری میں جاؤں گا۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ میرے ہوٹل کو ویران کرنے والے جادوئی تماشے نہ دکھائے۔"

"میں بھی وہاں جانے والا ہوں۔ ایک بات تو طے ہے کہ اس نے پال کی آتما کو قابو میں کرنے کے لیے اس کا مرڈر کیا۔ شاید اس نے ایلن کو بھی اسی مقصد کے لیے قتل کیا ہے۔ بائی داوے کیا ایلن کی لاش سرد خانے میں ہے؟"

جان نے کہا۔ "ہاں۔ میں ابھی اسے دیکھ کر آیا ہوں۔ میرے ہوٹل کے سرد خانے کو مردہ خانہ بنا دیا گیا ہے۔ کل ایلن کے رشتے دار آ کر اس کی لاش لے جائیں گے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے ہوٹل کے اندر آئے۔ تمام سہمے ہوئے مسافر ہم سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ جان انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔ میں نے بھی یقین دلایا کہ قاتل کا سراغ مل رہا ہے۔ شاید اسے کل شام تک گرفتار کر لیا جائے گا۔"

دو عورتیں اور دو مرد وہاں کے دو کمرے خالی کر کے سامان اٹھا کر کاؤنٹر پر آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "ابھی ہمارا حساب کرو۔ ہم کسی دوسرے ہوٹل میں جا رہے ہیں۔"

نمرتا نے کہا۔ "پلیز، آپ نہ جائیں۔ ہم یقین دلاتے ہیں۔ آئندہ یہاں کوئی واردات نہیں ہوگی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی آ کر جان سے لپٹ گئی۔ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ سب نے اُدھر دیکھا۔ خوف اور حیرت سے کچھ اور عورتیں چیخنے لگیں۔ تمام مرد سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ ایک دروازے پر ایلن کھڑی ہوئی تھی اور گھورتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "کیوں چیخ رہی ہو؟ کیا میں چڑیل دکھائی دے رہی ہوں؟"

پھر وہ جان فارو کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "مسٹر فارو! اگر میں عارضی طور پر مر گئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے سرد خانے میں لے جا کر ڈال دیتے۔ سردی کی شدت سے میرا بدن اکڑ گیا ہے۔ فوراً گرم کافی پلاؤ۔"

وہ کاؤنٹر کے پاس ایک اونچے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ مسافر عورتیں اور مرد سہمے ہوئے تھے اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بولی۔ "مجھ سے نہ ڈرو۔ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں۔ زندہ ہوں۔ مردہ نہیں ہوں۔ یقین نہ ہو تو مجھے چھو کر دیکھ لو تم کسی آتما کو چھو نہیں سکتے۔ مجھے چھو سکتے ہو۔ میرا بدن ٹھوس ہے تمہاری طرح۔"

ایک ویٹر نے کافی کی ٹرے لا کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھی۔ وہ ویٹر کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تم بھی میرا ہاتھ پکڑو۔"

وہ بری طرح سہا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "ٹھ.... ٹھیک ہے.... س.... سچ بول رہی ہو۔ تم

آتما نہیں ہو۔ زندہ ہو۔ میں تمہیں چھو رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایلن ایک پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے بولی۔ "میرے اندر میری آتما واپس آئی تو میں نے دیکھا، وہاں پال نہیں ہے۔ اسے مجھ سے پہلے سرد خانے میں رکھا گیا تھا۔ شاید اسے بھی میری طرح نئی زندگی مل گئی ہے۔"

وہ کافی میں دودھ اور چینی حل کرنے لگی۔ "مجھ سے اور پال سے پہلے یہاں وائل کی موت ہوئی تھی۔ اگر اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جاتا اور اسے دفن نہ کیا جاتا تو وہ بھی ہماری طرح یہاں زندہ نظر آتا۔"

وہ جان فارو کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔ "فارو نے اس کی تدفین میں جلدی کی۔ تاکہ اسے دوسری زندگی نہ ملے۔ وائل اس ہوٹل میں ففٹی ففٹی پرسنٹ کا پارٹنر تھا۔ فارو تنہا اس ہوٹل کا مالک بننا چاہتا تھا اور اب بن چکا ہے۔"

جان فارو نے ناگواری سے کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ وائل میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ابھی واپس آجائے تو میں یہ ہوٹل اس کے نام کردوں گا۔"

"اور تم جانتے ہو، وہ واپس نہیں آسکے گا۔ میں تم سے بحث نہیں کروں گی۔ اس سے کہوں گی۔۔۔۔"

ایلن نے انگلی اٹھا کر میری طرف اشارہ کیا پھر کہا۔ "تم قاتل کا سراغ لگانے آئے ہو اور قاتل کے ساتھ کھڑے ہوئے ہو۔ اس کے ہوٹل میں رہ کر اس کا نمک کھا رہے ہو۔ اس سے نمک حرامی نہیں کروگے۔"

وہ کافی کا ایک گھونٹ پی کر بولی۔ "تمہارے ساتھ آنے والی لیز اشراب کے نشے میں مارکس رول کے بیڈ پر پڑی ہے۔ تم بھی کسی حسینہ کے ساتھ بستر گرم کرتے رہو۔ کچھ روز عیش کرو پھر جزیرے سے چلے جاؤ۔"

اس نے کافی کے دو گھونٹ پیے پھر دوسرے مسافروں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم سب کو جاننا چاہیے۔ اچھا ہوا، سب ہوٹل میں آگئے۔ ہماری طرح تمہیں بھی یہاں عارضی موت ملے گی تو موت کا ذائقہ چکھ لوگے۔"

وہ گھبرا کر ایک دوسرے کو تکنے لگے، وہ بولی۔ "گھبرانا نہیں چاہیے۔ ایک بار ذائقہ چکھ لینے کے بعد پھر کبھی موت سے ڈر نہیں لگے گا۔ میں یقین دلاتی ہوں، بڑا مزہ آتا ہے، جب جسم سے جان نکلتی ہے۔ یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ ہوگا پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ عمر بڑھ جائے گی۔ زندگی طویل ہو جائے گی۔ جب روح جسم سے نکل کر واپس آنا سیکھ لے گی تو تم نہیں مرو گے۔ موت کا ہرکارہ تمہاری روح نکال کر چلا جائے گا۔ اس کے جاتے ہی وہ پھر تمہارے اندر واپس آجائے گی۔"

ایک عورت نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں، مجھے بار بار نہیں مرنا ہے۔ ایک ہی بار کی زندگی اور ایک ہی بار کی موت اچھی ہوتی ہے۔"

"میں کہہ چکی ہوں۔ اس ہوٹل میں ایک بار مرنا ہوگا۔ موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد زندگی کی طرف واپس آنا ہوگا۔"

جان نے غصے سے کہا۔ "تم میرے معزز مہمانوں کو دہشت زدہ کر رہی ہو۔"

وہ کافی کی پیالی سے آخری گھونٹ پینے کے بعد بولی۔ "بچوں کو دہشت زدہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب بڑے ہیں، سمجھ دار ہیں، اپنی آنکھوں سے میرے اور پال کے مرنے کا اور پھر جی اٹھنے کا منظر دیکھ چکے ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ اس ہوٹل میں رہنے کے دوران میں ایک بار عارضی موت کا مزہ چکھنا ہوگا۔"

پھر اس نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بزدل ہو؟ مجھ جیسی کمزور دل کی عورت نے عارضی موت کا لطف اٹھایا ہے۔ اس کے نتیجے میں مجھے ایک طویل

چارہ بے چارہ

ماما اور پاپا اپنی چھوٹی بچی کو اس کے بڑے بھائی کے پاس چھوڑ کر شاپنگ کے لیے چلے گئے۔ عورت شاپنگ مال میں اور بھینس پانی میں چلی جائے تو دونوں کا باہر آنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بھائی اپنی ننھی بہن کی دیکھ بھال کرتے کرتے اکتا گیا تو اسے ساتھ لے کر مچھلی کے شکار پر نکل گیا۔

واپسی پر ماما نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا لیکن وہ برہمی سے بولا۔ "میری توبہ۔۔۔ آئندہ کبھی اس چڑیل کو اپنے ساتھ شکار پر نہیں لے جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا۔۔۔ دریا کے شور سے ڈر کر رو رہی ہو گی۔۔۔ اگلی بار تمہیں تنگ نہیں کرے گی۔"

"رونے دھونے سے میں نہیں گھبراتا، ماما۔" اس نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "میں کانٹے میں لگانے کے لیے جو کیچوے لے گیا تھا، وہ سب کے سب کھا گئی۔ مجھے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔"

زندگی مل گئی ہے۔ تمہیں بھی ملے گی۔ کچھ پانے کے لیے حوصلہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ صرف ایک بار مرنے کا تجربہ کرو اور طویل زندگی پاؤ اور مرنے کے لیے اسی ہوٹل میں رہو۔''

پھر وہ مجھ سے بولی۔ ''سلمان! تم تو بالکل خاموش ہو۔''

میں نے کہا۔ ''جب عورت بولتی ہو تو مرد کو خاموش رہ کر سنتے رہنا چاہیے، روانی میں بولنے والی عورتیں اکثر غلطیاں کرتی ہیں۔''

''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟''

''یونہی تم نے کہہ دیا کہ جان نے اپنے دوست وائل کو قتل کروایا ہے۔ جب جان کو یہ ہوٹل جان سے زیادہ عزیز ہے تو یہ اپنے گاہکوں کو بھگانے کے لیے یہاں عارضی موت کا ڈراما کیوں کریں گے؟ تم کسی کے اشارے پر یہ تماشے کر رہی ہو۔ جان کے دو دشمن تمہارے پیچھے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اور پال کو اس ہوٹل کے خلاف آلۂ کار بنایا ہے۔ تمہارے بعد وہ یہاں کسی کو عارضی موت دے کر زندہ کرنا چاہیں گے لیکن اب میں یہاں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اگر کسی ایک کے ساتھ بھی ایسا کیا جائے گا تو میں تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دوں گا پھر وہ مداری تمہیں دوبارہ زندہ نہیں کر سکے گا۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ بھاگیشور راؤ کس طرح اپنے آلۂ کاروں کو عارضی موت دے کر کئی گھنٹوں کے بعد زندہ کر دیتا ہے؟ لیکن میں یہ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایلن اور پال واقعی مر چکے تھے۔ ان کا طبی معائنہ کیا گیا تھا اور میں نے خود بھی ایلن کا معائنہ کیا تھا۔ وہ واقعی مر چکی تھی اور اب دوبارہ زندگی حاصل کر کے مجھے حیران کر رہی تھی۔

ایک بات یہ سمجھ میں آ رہی تھی کہ مرنے والوں کو دفن کر دیا جائے یا کسی کو گولیوں سے یا کسی ہتھیار سے ہلاک کیا جائے تو بھاگیشور راؤ شاید اسے دوبارہ زندہ کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی لیے ہوٹل میں جو تینوں قتل ہوئے تھے، ان کے جسموں پر کہیں کوئی زخم کا نشان نہیں تھا۔ میں نے ایلن کو گولی مارنے کی دھمکی دی تھی جسے سن کر وہ سہم گئی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

میں نے ہوٹل کے مسافروں سے کہا۔ ''آپ سے درخواست ہے کہ ہم پر بھروسا کریں۔ ہم جلد ہی کالا جادو کرنے والے دشمنوں کو قانون کے حوالے کریں گے۔''

ایک نے کہا۔ ''جب وہ گرفتار ہو جائیں گے اور کوئی خطرہ نہیں رہے گا تو ہم یہاں آ جائیں گے۔ ابھی ہم موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے یہاں نہیں رہیں گے۔''

دوسری عورتیں اور مرد بھی یہی کہنے لگے۔ کاؤنٹر پر اپنے تمام بل ادا کر کے، اپنا سامان اٹھا کر وہاں سے جانے لگے۔ میں نے جان کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''یہ نقصان برداشت کریں۔ جب تک مجرم گرفتار نہیں ہوں گے، اس وقت تک کوئی اس ہوٹل پر اور آپ پر بھروسا نہیں کرے گا۔ یہ بتائیں، مارکس رول کہاں ہوگا؟''

''یہاں اس کا اپنا ایک خوب صورت سا ساحلی کاٹیج ہے۔ رات کے دو بج رہے ہیں وہ سو رہا ہوگا۔''

''اسے ہماری نیند حرام کر کے سونا نہیں چاہیے۔ آپ مجھے اس کے کاٹیج کا نمبر اور ایڈریس بتائیں۔''

اس نے کاٹیج کا نمبر بتایا پھر وہاں کا پتا سمجھانا چاہتا تھا۔ نمرتا نے کہا۔ ''میں وہ کاٹیج جانتی ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ آپ بہت ضدی ہو۔ میں آپ کو روکنا چاہوں گی تو آپ نہیں رکو گے۔''

ہم دونوں باہر آ گئے۔ ہوٹل کی ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تمہاری ممی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔ یہ بتاؤ، ان کی موت کیسے ہوئی تھی؟''

''حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ان کی موت کی تصدیق کی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اور اسے چتا میں جلانے سے پہلے لاش غائب ہو گئی تھی۔ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے تمہاری ممی کی آتما کو اپنے قابو میں رکھا ہے۔''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔ ماما نے ایسا کیا ہے۔۔۔۔ لیکن میں ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ ماما کو موت آ جائے اور ممی کو نجات مل جائے۔''

''صرف دعا مانگنے سے مرادیں پوری نہیں ہوتیں۔ دوا بھی کرنی پڑتی ہے۔ ذرا صبر کرو۔ میں تمہاری ممی کو رہائی دلاؤں گا۔''

اس نے بڑی محبت سے مجھے دیکھا، پھر اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ خبیث تمہاری آتما کو اپنے بس میں کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا، پاپا نے مجھے ووڈوازم کے چند گر سکھائے ہیں۔ میں نے یوگا میں مہارت حاصل کی ہے۔ جب میں خاص منتر پڑھ کر رقص کرتی ہوں، اپنے بدن

کو طرح طرح سے بل دیتی ہوں اور وقفے وقفے سے سانس روک لیتی ہوں تو پھر کالے جادو کا کوئی عمل مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ماما نے دو بار کوششیں کیں اور ناکام رہے۔ ان کی سمجھ میں آگیا کہ وہ میری آتما کو کبھی اپنے بس میں نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی کسی پریت آتما کو میرے شریر میں ڈال سکیں گے۔"

"وہ اسی لیے تمہاری خوشامدیں کر رہا ہے کہ تم اس کا ساتھ دو۔ تم نہیں مان رہی ہو تو وہ تمہاری ماں سے تمہیں ملانے کا لالچ دے رہا ہے۔ ہوسکتا ہے، سینگچری میں تمہاری ماں نہ ہو۔ وہ تمہیں دھوکا دے کر وہاں بلا رہا ہے۔"

"نہیں.... میری ممی وہاں موجود ہیں۔ ماما نے انہیں مجبور اور بے بس بنا کر رکھا ہوگا۔"

ہم سمندر کے ساحلی راستے پر تھے۔ اس نے دور ایک کاٹیج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مارکس رول کا کاٹیج وہ رہا۔ کیا تم سامنے والے گیٹ سے اندر جاؤ گے؟"

میں کار کو ایک ٹرن دے کر اس کاٹیج کے پیچھے لے آیا۔ رات کے اس پہر میں گہری خاموشی، سناٹا اور ویرانی تھی۔ دور تک نہ کوئی بندہ تھا اور نہ کسی بندے کا پالتو کتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "میرے واپس آنے تک یہاں بیٹھی رہو۔ میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"تم اندر نہیں جا سکو گی۔ میں یہ اونچی دیوار پھاند کر جا رہا ہوں۔"

"میں آپ سے پہلے اندر پہنچ جاؤں گی۔ آپ نہیں جانتے میں اسپورٹس گرل ہوں۔ میں نے جمناسٹک کی مشقیں کی ہیں۔"

اس نے کار سے باہر آکر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "کاٹیج کے پچھلے حصے میں چوکیدار گشت پر آتا ہوگا یا پھر وہاں کتے ہوں گے۔ میں ابھی دیکھ کر بتاتی ہوں۔"

وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے احاطے کی دیوار کے قریب گئی پھر فضا میں قلابازی کھا کر اس دیوار کی اونچائی سے دونوں ہاتھوں کے ذریعے لٹک گئی پھر آہستہ آہستہ سر اٹھا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بعد دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اشارے سے سمجھایا کہ دوسری طرف کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

میں دوڑتا ہوا آکر، اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا۔ کاٹیج کے اس پچھلے حصے میں بھی ایک خوب صورت سا باغیچہ تھا۔ دور تک گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ہم وہاں سے کود کر گھاس کے فرش پر پہنچ گئے پھر دبے قدموں تیزی سے چلتے ہوئے ایک دروازے پر پہنچے۔ میری جیبوں میں چند مخصوص اوزار پڑے رہتے ہیں جو ایسے وقت کام آتے ہیں۔ میں نے ایک مضبوط تار کے ذریعے لاک کو کھولا تو دروازہ کھل گیا۔ ہم نے اندر آکر دروازے کو بند کر دیا۔

اس وقت ہم ایک بڑے سے کچن میں تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ایک کوریڈور میں آئے۔ ہلکی ہلکی قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ میں نمرتا کو کھینچتا ہوا ایک قریبی دروازے کو کھول کر اندر پہنچا۔ وہ کوئی اسٹور روم تھا۔ وہاں سامان اس قدر بھرا ہوا تھا کہ کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دیوار اور سامان کے درمیان چپک سے گئے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے دروازے کو بند کیا۔

اسٹور روم میں گہری تاریکی تھی۔ نمرتا کے پیچھے دیوار تھی اور سامنے میں تھا۔ وہ بری طرح جکڑ گئی تھی۔ سانس لیتے ہوئے اس کے سینے پر میرا ایسا دباؤ پڑ رہا تھا کہ نہ جانے وہ کیسے سانس لے رہی تھی؟ باہر قدموں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ اندر ہماری سانسیں ایک دوسرے کو آنچ دے رہی تھیں۔ جب سے ملی تھی اس کا وجود مجھے اپنی طرف کھینچتا رہا تھا اور اب تاریکی میں اس وجود نے مجھے جکڑ لیا تھا۔

میں دروازے کے کی ہول سے دیکھنا چاہتا تھا کہ کوریڈور میں کون ہے؟ وہاں کی نیم تاریکی میں وہ نظر آسکتا تھا۔ لیکن وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں کی ہول کی طرف جھک سکتا۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ ہم ایک دوسرے کو تو تنگ کر سکتے تھے مگر دشمن کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے سر کو اس کی طرف جھکایا تو اس کے لبوں سے ٹکرا گیا۔ میں نے قصداً ایسا نہیں کیا تھا لیکن تاریکی اتنی تھی کہ ارادہ نہ کرتا تب بھی واردات ہوتی رہتی۔

قریب ہی کچن سے فریج کے کھولنے اور بوتلوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ نائٹ گارڈ ہوگا۔ فریج سے ٹھنڈی بوتل پینے آیا ہوگا۔ میرے ہونٹوں کی بھی پیاس بجھ رہی تھی۔ اندھیرے میں راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میں اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا اور اسے میرا بھٹکنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کبھی میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ رہی تھی اور کبھی میری گردن اور پشت پر ناخن گاڑ رہی تھی۔ باہر قدموں کی آواز دور جاتے جاتے گم ہوگئی۔

میں نے کان میں سرگوشی کی۔ ''شاید وہ جاچکا ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔'' اس نے ہاں ایسے کہا، جیسے ہائے کہہ رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔ ''چلیں؟''

اس نے پھر ہائے کی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کے ہینڈل کو ہولے سے گھمایا پھر اس سے ہٹ کر دروازے کو کھول کر دائیں بائیں دیکھا۔ کوریڈور اپنے آخری سرے تک ویران تھا۔ میں اس کے ساتھ باہر آگیا۔ دائیں طرف ایک اور کوریڈور تھا۔ ہم نے وہاں ایک کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت سا بیڈروم تھا۔ وہاں ایک آرام دہ بستر پر لیزا چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام تھا۔ نمرتا اسے دیکھ کر شرما گئی۔ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''شٹ۔۔۔۔ بے شرم! تم ایسی بے حیا لڑکی کے ساتھ کام کرتے ہو؟''

''مجھے اس کی بے حیائی سے کیا لینا ہے؟ میں صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔''

ہم دروازے پر آئے۔ اندر مارکس رول نہیں تھا۔ باہر سے دروازہ بند کر کے کہیں گیا تھا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر آئے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ سرہانے کی میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔ ''یہ پی کر مدہوش ہوگئی ہے۔ اس کو کیا دیکھ رہے ہو؟ اپنا کام کرو۔ میرا خیال ہے، وہ مارکس رول تھا جو کچن کی طرف آیا تھا۔''

میں نے لیزا کے قریب آکر مخصوص انداز میں ہلکی سی سیٹی بجائی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بستر سے اتر کر لباس پہنتے ہوئے بولی۔ ''وہ مجھے نشے میں مدہوش سمجھ کر دروازے کو باہر سے بند کر کے گیا ہے۔''

''ابھی میں نے کوریڈور میں کسی کے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔''

''وہ نائٹ چوکیدار تھا۔ میرا کام ہو چکا ہے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اسی کی وجہ سے پھر مدہوش ہو کر بستر پر گر پڑی۔ وہ اس کھڑکی سے مجھے دیکھ کر گیا ہوگا۔''

''مارکس رول کہاں ہے؟''

''وہ تین گھنٹے پہلے فون کے ذریعے بھاگیشور راؤ سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس کی سیکریٹری میں گیا ہوا ہے۔ کسی وقت بھی واپس آسکتا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً جانا چاہیے۔''

''میں اس کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

''میں لے چکی ہوں۔ ایک اہم ڈاکومنٹ، ایک ویڈیو کیسٹ اور ایک کمپیوٹر ڈسک ہاتھ لگی ہے۔ میں نے ویڈیو اور ڈسک کو مانیٹر پر دیکھا ہے۔ یہ سب ہمارے کام کی چیزیں ہیں۔۔۔۔ کم آن۔''

میں نے کمرے سے نکلتے وقت سائلنسر کو ریوالور سے لگا لیا۔ نائٹ گارڈ سے کہیں بھی ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔ ہم ان ہی راستوں سے گزرتے ہوئے کچن میں آئے۔ پھر اس کا دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا تو ایک دم سے نائٹ گارڈ کا سامنا ہو گیا۔ وہ باہر سے اندر آرہا تھا۔ اچانک سامنا ہوتے ہی بوکھلا گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ گن سیدھی کرتا، میں نے اچھل کر ایک کک ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر گھاس پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ میں نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ فوراً اندر چلو۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اندر آکر اسٹور روم کا دروازہ کھول کر کہا۔ ''یہاں اندر بند رہو۔ تمہارا باس آکر تمہیں یہاں سے نکالے گا۔''

وہ بولا۔ ''تم بہت اچھے ہو۔ مجھے زندہ چھوڑ رہے ہو۔''

''اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے ہو تو مارکس رول سے کہو گے، دو نقاب پوش آئے تھے۔ وہ لیزا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تم ہمیں چہروں سے نہیں پہچانو گے اور نہ ہی ہماری نشاندہی کرو گے۔''

وہ راضی ہو گیا۔ میں اسے اسٹور روم میں بند کر کے باہر آیا۔ ہم تینوں دوبارہ احاطے کی دیوار پھاند کر اپنی کار میں آئے پھر اس میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف جانے لگے۔ نمرتا نے لیزا سے پوچھا۔ ''تم نے مارکس رول کے ساتھ اچھی خاصی شراب پی ہوگی۔ تمہیں نشہ کیوں نہیں ہوا؟''

''میرے پاس ایک ایسا کیپسول ہے جو شراب کو پانی کر دیتا ہے۔ میں پینے کے دوران میں اسے ایک ڈاڑھ میں دبا کر رکھتی ہوں پھر پوری بوتل پی جاؤں تب بھی مجھے نشہ نہیں ہوتا۔''

میں نے لیزا سے پوچھا۔ ''مارکس رول کی باتیں بتاؤ۔ وہ فون پر بھاگیشور راؤ سے کیا کہہ رہا تھا؟''

''وہ بھاگیشور سے کہہ رہا تھا کہ پندرہ دن پہلے اسے ایک لاکھ ڈالر دیے تھے پھر وہ اگلے پندرہ دن پورے ہونے سے پہلے مزید رقم کیوں مانگ رہا ہے؟''

''اس کا مطلب ہے، ان دونوں کے درمیان کسی

طرح کا لین دین جاری ہے۔"

"ہاں .... اور یہ لین دین مارکس رول کے لیے بہت اہم ہے۔ وہ بھاگیشور راؤ سے ملنے اور مزید رقم ادا کرنے کے لیے سینکچری میں گیا ہے۔"

میں نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ بھاگیشور اس سے بڑی بڑی رقمیں لے کر ہوٹل سن رائز میں موت کا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہاں کے مسافروں کو دہشت زدہ کررہا ہے۔ وہ آئندہ ہوٹل کو اس حد تک بدنام کردے گا کہ پھر کوئی مسافر وہاں نہیں آئے ا۔ وہاں آلّو بولنے لگیں گے۔ جان فارو مجبور ہوکر ہوٹل بند کردے گا یا اسے آدھی قیمت پر فروخت کردے گا۔ تب اس ہوٹل کا پہلا خریدار مارکس رول ہوگا۔"

ثمرتا نے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا کہ ماما سینکچری کے اخراجات کہاں سے پورے کررہے ہیں۔ وہاں ماما کے پندرہ بیس چیلے ہیں بیس پچیس آتمائیں ہیں۔ جو عارضی موت کا ذائقہ چکھنے کے بعد پھر اپنے جسموں میں واپس آگئی ہیں۔ ماما انہیں بھی کھلاتے پلاتے ہیں اور ان کے اخراجات پورے کرتے رہتے ہیں۔"

وہ سینکچری بڑی اہم تھی۔ مارکس رول اور بھاگیشور راؤ وہاں سے اپنی چالیں چل رہے تھے۔ مارک رول اس ہوٹل کو کم سے کم قیمت میں حاصل کرنے کی چالیں چل رہا تھا اور بھاگیشور زیادہ سے زیادہ آتماؤں کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے عارضی موت کا ڈراما پلے کررہا تھا۔

جان فارو سو رہا تھا۔ ہم نے ہوٹل پہنچ کر اسے جگایا پھر اس کے دفتری کمرے میں آکر کمپیوٹر کو آپریٹ کیا۔ لیزا جو ڈسک لے کر آئی تھی۔ اسے مانیٹر پر دیکھا۔ ابتدائی منظر دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ مارکس رول کا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے۔

وہ ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے اور دائیں بائیں صوفوں پر چھ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا بڑھاپا اور خوش لباسی بتا رہی تھی کہ وہ بہت معتبر اور اہم لوگ ہیں۔ وہ ایک ڈاکومنٹ پر مارکس رول سے دستخط کرا رہے تھے۔ ایک معمر شخص کہہ رہا تھا۔ "مسٹر رول! تم پہلے ہمارے لیے بڑے اہم فرائض انجام دے رہے ہو۔ اگر تم کسی طرح سن رائز ہوٹل حاصل کرلو تو یہ تمہارا ایک اور بڑا کارنامہ ہوگا۔"

دوسرے نے کہا۔ "وہ جزیرہ ہمارے لیے بہت محفوظ رہے گا۔ انٹیلی جنس والے کبھی معلوم نہیں کرسکیں گے کہ وہاں ہم نے انڈر گراؤنڈ سیٹ اپ قائم کررکھا ہے۔"

ان کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ مارکس رول ایک بھاری رقم کا ایگریمنٹ سائن کررہا تھا۔ پانچ کروڑ ڈالرز پیشگی ادا کیے جارہے تھے۔ جب وہ جان فارو کو مجبور کرکے ہوٹل خرید لیتا اور انڈر ورلڈ کے چند اہم افراد کو ہوٹل کے عملے کے طور پر وہاں پہنچا دیتا تو اسے باقی ڈالرز ادا کردیے جاتے۔

یہ تمام معاملات طے ہونے کے بعد وہ چھ افراد اس سے مصافحہ کرکے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اپنی پرسنل سیکریٹری کو انٹرکام کے ذریعے بلایا۔ وہ کمرے میں آکر مسکراتے ہوئے بولی۔ "کانگریچولیشن مارکس! تم نے پھر ایک بار بہت بڑی ڈیل کی ہے۔"

اس نے کہا۔ "تھینک یو! کیا کیمرے اور آڈیو مشین صحیح کام کررہے ہیں؟"

وہ بولی۔ "میں ریکارڈنگ کروں اور وہ صحیح نہ ہو، یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے ان تمام انڈر ورلڈ کے اعلیٰ عہدے داروں کو اور ان کی گفتگو کو بڑی مہارت سے ریکارڈ کیا ہے۔"

"شاباش .... یہ لوگ بڑی رازداری برتتے ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتے۔ یہ ریکارڈنگ میرے پاس محفوظ رہے گی۔ انہوں نے میری کمزوریاں ہاتھ میں رکھی ہیں۔ اب ان کی کمزوریاں میرے پاس رہیں گی۔ کبھی انہوں نے مجھے ڈبونے کی کوشش کی تو میں اپنے ساتھ ان سب کو لے ڈوبوں گا۔"

اس نے اپنی سیکریٹری کو کھینچ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کے بعد وہ ڈسک ریکارڈنگ ختم ہوگئی۔ میں نے وہ ڈاکومنٹ اٹھا کر پڑھے، وہ جزیرے سے اور ہوٹل سن رائز سے تعلق رکھنے والا ایگریمنٹ تھا۔ اس ایگریمنٹ سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ اس جزیرے میں انڈر ورلڈ والوں کے لیے کام کررہا ہے۔

جان فارو عقیدت سے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ "مسٹر سلمان! آپ نے اور لیزا نے کمال کیا ہے۔ یہ مارکس رول کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ قانونی گرفت سے بچ نہیں پائے گا۔"

لیزا اس ویڈیو کیسٹ کو دیکھنے کے لیے اسے وی سی آر میں رکھ رہی تھی۔ میں نے فون کے ذریعے واشنگٹن ایف بی آئی کے چیف سے رابطہ کیا۔ وہ میرے نام سے اور میرے کام سے مجھے پہچانتا تھا۔ میں نے اسے مارکس رول کے

بارے میں بتایا کہ وہ جزیرے میں کس طرح مصروف ہے اور آئندہ انڈرورلڈ والوں کے لیے یہاں کیا کرنے والا ہے۔ اس کے خلاف آڈیو، ویڈیو اور کمپیوٹرڈ سک ٹھوس ثبوت کے طور پر میرے پاس موجود ہیں۔ اسے کسی حیل و حجت کے بغیر گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

چیف نے کہا۔ ”میں اسے گرفتار کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔ صبح ہیلی کاپٹر کے ذریعے پولیس فورس وہاں پہنچ جائے گی۔ لیکن وہ صبح تک جزیرے سے فرار ہوسکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”کسی بحری جہاز کے بغیر جزیرے سے باہر جانا ممکن نہیں ہے۔ ساحل پر جتنی موٹر بوٹس ہیں، وہ زیادہ ہارس پاور کی نہیں ہیں۔ وہ کسی بھی موٹر بوٹ پر سمندر میں دور تک نہیں جاسکے گا۔“

لیزا نے مجھ سے ریسیور لے کر کہا۔ ”سر! ایسے وقت انڈرورلڈ والے اس کے لیے ہیلی کاپٹر مہیا کرسکتے ہیں۔ اس کا فرار ہونا ممکن ہے پھر بھی ہم اسے روکنے کی کوشش کریں گے۔“

میں نے اس سے ریسیور لے کر کہا۔ ”ہمارے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ وہ اپنے خلاف تمام ثبوتوں کو حاصل کرنے کے لیے ہوٹل کا محاصرہ کرے گا۔ مقامی ووڈو اور بلیک میجک جاننے والا ہنگن بھاگیشور راؤ اس کے ساتھ ہے۔ اس کے درجنوں عقیدت مند ہوٹل میں گھس کر ہمیں ہلاک کرسکتے ہیں۔“

”میں بھاری تعداد میں پولیس فورس بھیج رہا ہوں۔ انہیں وہاں تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔ تم کسی بھی طرح دو گھنٹوں تک اپنی حفاظت کرو اور مارکس کو فرار ہونے سے روکو۔“

”ہم اپنے طور پر پوری کوشش کریں گے۔ آپ یہاں کی پولیس اور انتظامیہ کو حکم دیں کہ وہ اپنی پوری مسلح فورس ہماری حفاظت کے لیے مخصوص کردیں۔ مجھے شبہ ہے کہ یہاں کا پولیس انسپکٹر، مارکس رول اور بھاگیشور راؤ کا درپردہ وفادار ہے۔ اس کی جگہ کسی دوسرے افسر کو یہاں کی ذمے داریاں سونپی جائیں۔“

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ میں نے لیزا سے کہا۔ ”معلوم کرو۔ وہ اپنے کاٹیج میں واپس آچکا ہے یا نہیں؟“

اس نے رابطہ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر نائٹ چوکیدار کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو؟“

لیزا نے آواز بدل کر پوچھا۔ ”ہیلو، مسٹر مارکس رول سے بات کراؤ۔“

”صاحب گھر میں نہیں ہے۔“

”تم کون ہو؟“

”میں مین گیٹ پر ڈیوٹی دیتا ہوں۔ فون کی گھنٹی سن کر ادھر آیا ہوں۔“

”دوسرا نائٹ گارڈ کہاں ہے؟“

”پتا نہیں۔ وہ ادھر کاٹیج کے اندر تھا۔ اب دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

”کچن کے ساتھ والا اسٹور روم کھولو۔ وہ نظر آئے گا۔“

لیزا نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”مارکس رول ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ کیا ہم یہ ویڈیو کیسٹ دیکھیں؟“

”ہاں دیکھ لیتے ہیں۔ اسے آن کرو۔“

ٹی وی اور وی سی آر کو آن کیا گیا۔ اسکرین پر مارکس رول اور بھاگیشور راؤ نظر آنے لگے۔ وہ دونوں سینیٹوریم میں تھے۔ جس طرح قبیلے کا سردار ہوتا ہے، اسی طرح بھاگیشور وہاں کا ہنگن کہلاتا تھا۔ وہاں اس کے کئی چیلے اور پیروکار اس کے آگے سجدہ ریز تھے۔ مارکس رول کہہ رہا تھا۔ ”بھاگیشور! مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ان زندہ لوگوں کی روحیں تمہارے قبضے میں ہیں اور تم جب چاہتے ہو، انہیں عارضی موت مار ڈالتے ہو اور پھر انہیں زندہ کردیتے ہو۔“

بھاگیشور راؤ نے کہا۔ ”میں اپنا یہ کمال ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔“

اس نے ایک تابعدار کو حکم دیا کہ وہ سامنے والے چبوترے پر لیٹ جائے۔ وہ اس چبوترے پر جاکر لیٹ گیا۔ مارکس رول تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ بھاگیشور چبوترے کے پاس آکر اونچی آواز میں منتر پڑھ رہا تھا۔ ایک منٹ کے اندر ہی وہ تابعدار ہاتھ پاؤں جھٹک کر تڑپنے لگا۔ وہ جاں کنی کی حالت میں تھا پھر ایک دم سے ساکت ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔

بھاگیشور نے گھوم کر سینہ تان کر مارکس رول سے کہا۔ ”یہ ہے میرا کمال۔ یہاں آکر دیکھ لو، یہ مرچکا ہے۔“

مارکس رول چبوترے کے پاس آکر اس تابعدار کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے نبض ٹٹولی۔ دل کی دھڑکنیں سنیں۔ نہ دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔ نہ نبض مل رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”بے شک یہ مرچکا ہے۔“

بھاگیشور نے کہا۔ ”تمہیں اور اچھی طرح یقین کرنا

چاہیے کہ یہ مر چکا ہے۔ مرنے کا ڈھونگ نہیں رچا رہا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی جان ہوگی تو اسے چوٹ لگتے ہی یہ تکلیف سے اٹھ بیٹھے گا۔''

اس نے دو تابعداروں کو حکم دیا۔ ''اس لاش کی پٹائی کرو۔''

اُن میں سے ایک نے ڈنڈے سے اس کی پٹائی کی۔ دوسرے نے چابک سے مارنا شروع کیا۔ لاش پھر لاش تھی۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جاتے، تب بھی وہ بے حس و حرکت پڑی رہتی۔ مارکس نے کہا۔ ''بس کرو۔ لاش کو اس طرح نہ مارو۔ یہ زخمی ہو رہی ہے۔ لیکن زخموں سے لہو نہیں رس رہا ہے۔ کیا اتنی جلدی خون منجمد ہو گیا ہے؟''

''ہاں۔ اب میں چاہوں گا تو منجمد خون پھر رگوں میں دوڑنے لگے گا۔ یہ پھر زندہ ہو جائے گا۔''

''او گاڈ! تم خدائی دعویٰ کر رہے ہو۔ میں تمہارے دعوے کی سچائی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

بھاگیشور لاش کی طرف رخ کر کے پھر اونچی آواز میں منتر پڑھنے لگا۔ مارکس رول بھاگیشور کو اور اس لاش کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ مردے کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ پوری دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔

زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک بندہ دوسرے بندے کو مار تو سکتا ہے مگر اسے دوبارہ زندگی نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس شعبدے بازی کے پیچھے فراڈ چھپا ہوتا ہے۔

بہرحال منتر پڑھتے ہی وہ مردہ تابعدار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اتنی پٹائی ہوئی تھی کہ وہ زندہ ہونے کے بعد تکلیف سے کراہنے لگا۔ دو تابعدار اس کی مرہم پٹی کے لیے اسے اٹھا کر وہاں سے لے گئے۔ مارکس رول نے کہا۔ ''تم تو بہت ہی باکمال ہو۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میرا کام کر سکتے ہو۔ سن رائز ہوٹل میں آنے والے مسافروں کا مرڈر ہوگا تو دوسرے مسافر ایسی اچانک موت سے پریشان ہوں گے پھر وہ مرنے والے تمہارے جنتر منتر سے واپس آئیں گے تو سب ہی دہشت زدہ ہو کر بھاگیں گے پھر اس ہوٹل میں کوئی نہیں آئے گا۔''

بھاگیشور نے پوچھا۔ ''تم اس ہوٹل کو ویران کرنا کیوں چاہتے ہو؟''

''وہ ویران ہوگا اور آسیب زدہ ہوٹل کہلائے گا تو اس کی قیمت گر جائے گی پھر میں کم سے کم قیمت میں اسے خرید لوں گا۔ تم میرا کام کرتے رہو گے۔ میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دیتا رہوں گا۔''

ہم سب اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے درمیان لین دین طے ہو رہا تھا۔ بھاگیشور کو اتنی رقم مل رہی تھی کہ وہ سینکچری کے اخراجات بھی پورے کر رہا تھا اور دولت مند بھی بنتا جا رہا تھا۔ اس نے وائل، پال اور ایلن کو ہلاک کر کے پانچ لاکھ ڈالرز کمائے تھے۔

مارکس رول ان تمام اہم معاملات کو ویڈیو کیسٹ یا ڈسک میں ریکارڈ کر لیا کرتا تھا۔ تاکہ اس کے ساتھ دوسروں کے جرائم کے ثبوت بھی اس کے پاس محفوظ رہا کریں۔

ہم نے اس کیسٹ کا ایک حصہ دیکھا تھا۔ ابھی دیکھنے کے لیے تین حصے باقی تھے۔ میں نے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم باقی حصے پھر کسی وقت دیکھیں گے۔ فی الحال حفاظتی انتظامات ضروری ہیں۔''

اسی وقت ایک پولیس افسر ہوٹل میں آیا۔ ہم نے کاؤنٹر پر آ کر اس سے ملاقات کی۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی وجہ سے میری ترقی ہوئی ہے۔ آپ کی خدمت کرنے کے لیے سخت احکامات صادر کیے گئے ہیں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

میں اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر آیا۔ وہاں دور تک خاصی تعداد میں مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ مجھے اطمینان ہوا۔ میں نے کہا۔ ''جزیرے کے چاروں طرف ساحلی پٹی پر تیس سپاہیوں کی ڈیوٹی لگاؤ۔ انہیں حکم دو کہ تمام موٹر بوٹس کے انجن کھول کر الگ پھینک دیں انہیں ناکارہ بنا دیں پھر بھی کوئی سمندری راستے سے جانا چاہے تو اسے گولی مار دیں۔''

لیزا نے مجھ سے پوچھا۔ ''مارکس کی مدد کے لیے کہیں سے ہیلی کاپٹر آ سکتا ہے۔ اس کے لیے کیا کرو گے؟''

''پولیس افسر اور میں مسلح سپاہیوں کے ساتھ ہر اس جگہ گشت کریں گے جہاں ہیلی کاپٹر اتارے جا سکتے ہیں۔ ہم انہیں زمین تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے۔''

جان فارو نے کہا۔ ''میرے ہوٹل کی حفاظت کے لیے بھی کچھ کریں۔''

میں نے کہا۔ ''باقی بیس عدد مسلح سپاہی ہوٹل کے چاروں طرف مستعد اور محتاط رہیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔''

میں، نمرتا اور لیزا کے ساتھ پولیس موبائل وین میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت نمرتا دوڑتی ہوئی آ کر بولی۔ ''سلمان! اِدھر آؤ۔ اس ویڈیو میں میری ممی بھی ہیں۔''

میں اس کے ساتھ اندر آیا۔ وہ بولی۔ ''میں بڑی

دیر سے انتظار کر رہی تھی کہ سینچری میں میری ممی نظر آئیں گی۔ تم اسے آف کر کے گئے تو میں پھر اسے آن کر کے دیکھنے لگی۔"

ہم نے ٹی وی کے سامنے آ کر دیکھا۔ اسکرین پر مارکس رول کہہ رہا تھا۔ "ووڈو اور بلیک میجک کے ذریعے حیرت انگیز تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ بھاگیشور کہتا ہے کہ وہ بھاگیشور راؤ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اصل میں پاپالیورن ہے۔ اس نے اپنی روح بھاگیشور کے جسم میں منتقل کی ہے۔

یہ عجیب اور ناقابلِ یقین بات ہے۔ میں اسے ریکارڈ کر رہا ہوں۔ یہ ریکارڈنگ بھی وقتِ ضرورت کام آئے گی۔"

اسکرین پر اگلا منظر دکھائی دیا۔ نمرتا کی ممی سفید ساڑی پہنے ایک چٹائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بھاگیشور اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں چھ مہینے سے سمجھا رہا ہوں کہ میں تمہارا سگا بھائی نہیں ہوں۔ تمہارا شوہر پاپالیورن ہوں۔ مجھے بیوی بن کر قبول کرو۔"

بھانومتی نے کہا۔ "میں کبھی قبول نہیں کروں گی۔ میں اندھی نہیں ہوں۔ بچپن سے اپنے بھائی کی یہ صورت شکل دیکھتی آ رہی ہوں۔ تم پکے بدمعاش ہو۔ بے شرم اور بے غیرت ہو۔ اپنی بہن کو بیوی بنانا چاہتے ہو؟"

"ایسا نہ کہو بھانومتی! میں یہ برداشت کرلوں گا کہ تم میری بیوی نہ بنو لیکن نمرتا میری بیٹی ہے۔ میرا خون ہے۔ میں اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگانا چاہتا ہوں لیکن وہ مجھے دشمن سمجھ رہی ہے۔ تم اسے قائل کر سکتی ہو۔ اسے یقین دلا سکتی ہو۔ ماں کے کہنے سے بیٹی مجھے باپ تسلیم کرلے گی۔"

"جب مجھے یقین نہیں ہے تو میں بیٹی سے جھوٹ کیوں بولوں کہ تم اس کے باپ ہو؟"

"میری بات مان لو۔ اس طرح میں تمہیں بیٹی سے ملاؤں گا پھر تم ماں بیٹی پہلے کی طرح میرے ساتھ رہا کرو گی۔"

اچانک اسکرین پر منظر بدل گیا۔ بھاگیشور راؤ، مارکس رول سے کہہ رہا تھا۔ "میں اپنی بیوی کو قیدی بنا کر رکھتا ہوں۔ اسے دن رات سمجھاتا رہتا ہوں لیکن وہ مجھے اپنا شوہر پاپالیورن تسلیم نہیں کرتی ہے اور نہ ہی میری بیٹی کو میری طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔"

مارکس رول نے پوچھا۔ "تم نے بھاگیشور کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے اپنی بیوی کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا۔ اسے کیوں نہیں بتایا کہ تم اس کے بھائی کے اندر جا کر زندہ رہو گے؟"

وہ بولا۔ "حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ میں جسم تبدیل کرنے سے پہلے بھانومتی سے رابطہ نہ کر سکا۔ ان دنوں وہ نمرتا کے ساتھ ساؤتھ امریکا گئی ہوئی تھی۔ اِدھر میں اپنی جنم کنڈلی دیکھ رہا تھا کہ میری زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں۔ اگر میں نے اپنی آتما کو کسی جوان مرد کے جسم میں منتقل نہ کیا تو پھر ایک نئی زندگی حاصل نہیں کر سکوں گا۔

"اس مقصد کے لیے مجھے ایسے شخص کی ضرورت تھی جسے کسی حد تک کالے جادو کے منتر آتے ہوں یا میں اسے پڑھاؤں تو وہ آسانی سے منتر پڑھ سکتا ہو۔ اس جزیرے میں ایک ہی شخص میری طرح منتر پڑھنا جانتا تھا اور وہ تھا میرا سالا بھاگیشور راؤ۔

"وہ مجھ سے میرے ووڈو ازم کے کمالات سیکھا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "آج میں تمہیں آتما نکالنے پھر اسے واپس جسم میں لانے کے راز بتاؤں گا یہاں آؤ اور میرے سامنے چبوترے پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ بہت خوش ہوا۔ میری ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ میرے سامنے چبوترے پر بیٹھ کر وہ خاص منتر پڑھتا رہا جسے میں پڑھاتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ آتما کو جسم سے باہر نکالنے کا منتر سیکھ رہا ہے۔ اب اس کے بعد اسی آتما کو جسم کے اندر لانے کا منتر سیکھنے والا تھا لیکن میں کب سکھانے والا تھا؟

ہم دونوں ایک ہی منتر ایک ساتھ پڑھتے ہوئے اس مرحلے پر پہنچے جہاں آتما جسم سے نکل جاتی ہے اور یہی ہوا ہم دونوں کی آتمائیں ایک ساتھ جسموں سے نکلیں۔ دونوں کے جسم خالی ہو گئے۔ میں فوراً ہی بھاگیشور کے جسم میں داخل ہو کر اسی کے اندر مستقل رہنے کا منتر پڑھنے لگا۔ اسے کسی جسم میں داخل ہو کر دوسرا منتر پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس کی آتما بھٹکتی ہوئی پرلوک سدھار گئی۔ تب سے میں اس بھاگیشور کے جسم میں ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔"

ہم سب ٹی وی اسکرین پر بھاگیشور راؤ کی باتیں سن رہے تھے۔ اب وہ بھاگیشور نہیں تھا، نمرتا کا باپ پاپالیورن تھا۔ ہم نے نمرتا کی طرف دیکھا وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں اپنی آنکھوں کے سامنے ماما کو دیکھ رہی ہوں؟ ذہن تسلیم نہیں کر رہا ہے کہ یہ میرے پاپا ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ذہن کیسے تسلیم کرے گا؟ تمہارے

موسم بہار کی نوید دیتا مارچ 2016ء کا دل رُبا شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
انجم انصار، درثمن بلال و نایاب جیلانی کی سلسلے وار تحریروں کی نئی و پُر حیرت اقساط
نگہت سیما کا ناول ...... اعتبار وفا اختتامی موڑ پر
عقیلہ حق کے پراثر قلم کا شاہکار مکمل ناول ...... سود و زیاں
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور محترمہ اختر شجاعت کے روح پرور مقالے
معروف رائٹر اور بہترین استاد
پروفیسر افسر سلطانہ کی
پربہار آمد سے سجی ہماری بزم
شائستہ زریں کی محنت سے سجا ایک مقبول و پسندیدہ سروے ...... بہت خاص موضوع لیے ہوئے
اس کے علاوہ
شیریں حیدر، تابندہ نعیم، حمیرا نوشین، شمیم فضل خالق، صدف آصف
سحرش فاطمہ، نادیہ احمد، نبیلہ نازش راؤ و دیگر پرتنوع قلمکاروں کی مایہ ناز تحریریں
اس کے ہمراہ جدید تفریحی معلومات و دیگر خوش بیانیاں لیے مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

پاپا یہاں نیک اور دیانت دار کہلاتے تھے اور یہ بھاگیشور پکا شیطان ہے۔ اگر تمہارے پاپا واقعی اس کے اندر سمائے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنی نیکی اور دیانت داری کیوں چھوڑ دی ہے؟ مارکس رول سے بڑی رقمیں لے کر کیوں شیطانی حرکتیں کر رہے ہیں؟''

میں نمرتا اور لیزا کے ساتھ ہوٹل سے باہر آ کر پولیس موبائل وین میں بیٹھ گیا۔ اس وین کے آگے پیچھے مسلح سپاہیوں کی تین گاڑیاں تھیں۔ ہم جزیرے میں گشت کرنے کے لیے وہاں سے چل پڑے۔ میں نے پولیس افسر سے پوچھا۔ ''تم یہاں کتنے عرصے سے ہو؟ پاپا لیورن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں پچھلے پانچ برسوں سے یہاں اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ پاپا لیورن کے خفیہ معاملات سے جتنا میں واقف ہوں اتنا کوئی اور نہ ہوگا۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ خوامخواہ نمرتا کو برا لگے گا۔''

وہ بولی۔ ''جو سچائیاں میرے سامنے آ رہی ہیں، ان کے پیشِ نظر برا ماننے کے لیے اب کچھ نہیں رہا۔ آپ ان کی حقیقت بیان کریں۔''

وہ بولا۔ ''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے، وہ پکے سیاست داں تھے۔ کہتے کچھ تھے، کرتے کچھ تھے۔ وہ جسے دعائیں دیتے تھے، وہ اس کے لیے بددعائیں بن جاتی تھیں۔ درپردہ اس کا کام تمام کر دیتے تھے۔''

وہ افسر بتا رہا تھا کہ جزیرے میں جتنے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس ہیں، وہاں آنے والے مسافروں سے پاپا لیورن رابطہ رکھتے تھے اور ان کے ایسے مسائل حل کرتے تھے جو مجرمانہ ہوتے تھے۔ وہ ان کے مسائل حل کر کے ہزاروں ڈالرز کمایا کرتے تھے۔

وہ افسر اندر کی باتیں جانتا تھا۔ پاپا لیورن کا کچا چٹھا بیان کر رہا تھا۔ ان کے شیطانی کرتوت بھاگیشور سے زیادہ تھے لیکن وہ خود کو نیک اور پارسا ظاہر کرتے رہے۔ اگر کوئی ان کا رازدار ان کی مخالفت کرتا تھا اور ان کے بھید کھولنا چاہتا تھا تو اس کی زبان کھلنے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے اس کا منہ بند کر دیتے تھے۔

نمرتا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کے ذہن میں پاپا لیورن کا ایک مقدس بت تھا۔ وہ اپنے باپ پر فخر کرتی تھی اور اس بت کی پوجا کرتی تھی۔ اب وہ بت ٹوٹ کر پاش پاش ہو رہا تھا۔

لیزا کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے ایک بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے مارکس رول کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ ''ہاں، میں بول رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تم تو نشے میں مدہوش ہو گئی تھیں پھر یہاں سے اٹھ کر کیسے گئیں؟''

''یہ میری اپنی تکنیک ہے۔ تم کام کی بات کرو۔''

''نائٹ گارڈ کا بیان ہے، کوئی نقاب پوش آیا تھا۔ وہ تمہیں یہاں سے اٹھا کر لے گیا۔ وہ یقیناً تمہارا ساتھی سلمان واحد ہوگا۔''

''ہاں.... وہی تھا.... پھر....؟''

''تم دونوں میرے اہم راز چرا کر لے گئے ہو۔''

''ہاں.... چرا کر لے آئے ہیں.... پھر....؟''

''اسے واپس کرنے کی قیمت بتاؤ؟''

''اگر میں سودا نہ کروں تو پھر؟''

''چند گھنٹوں میں سلمان کے ساتھ خاک میں مل جاؤ گی۔''

''چند گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔ تم ایک گھنٹے کے اندر اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لو۔''

''یہ .... یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ میرے تمہارے درمیان سمجھوتا ہو سکتا ہے۔''

''سلمان سمجھوتا کرنے سے پہلے ہی تمہاری شامت لے آیا ہے۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اپنی جان بچانے کی سوچو۔''

لیزا نے فون بند کر دیا۔ میں نے افسر سے کہا۔ ''اب ہم ساحلی سڑک پر جائیں گے۔ مجرم اسی طرح جائے گا۔''

ہم اُدھر جانے لگے۔ پولیس افسر نے فون پر مارکس رول کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو مسٹر رول! میں تمہیں گرفتار کرنے آ رہا ہوں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''بکواس مت کرو! جزیرے کا انچارج افسر کہاں ہے؟''

''اس کی چھٹی کر دی گئی ہے۔ وہ تمہارا چمچہ تھا۔ تم بڑے بڑے نوٹوں سے مجھے خرید نہیں سکو گے۔''

اس سے بھی فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ اب پتا نہیں وہ کیا کر رہا ہوگا۔ اپنی سلامتی کے لیے ضرور پریشان ہوگا۔ انڈر ورلڈ والوں سے رابطہ کر رہا ہوگا۔ وہ لوگ بھی اسے جزیرے سے نکال لے جانے کی کوششیں کریں گے لیکن کوششیں کرنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ ایف بی آئی پولیس فورس کسی

وقت بھی یہاں پہنچنے والی تھی۔

ہم پولیس بیس پہنچے تو ملاحوں نے بتایا کہ مارکس رول اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ آیا تھا لیکن تمام بوٹس کے ناکارہ انجن دیکھ کر سینکچری کی طرف گیا ہے۔

ہمارے مسلح سپاہیوں نے سینکچری کا محاصرہ کر لیا۔ اسی وقت کئی ہیلی کاپٹرز آرہے تھے۔ ہمیں موبائل فون کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ ہماری مدد کے لیے آئے ہیں۔ پاپا لیورن (بھاگیشور) نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ابھی گرفتار کر سکتے ہو لیکن میں خود کو بے گناہ ثابت کر کے رہائی حاصل کر لوں گا۔“

نمرتا نے کہا۔ ”آپ میرے ماما ہیں..... یا میرے پاپا، مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ بتائیں کہ میری ممی کہاں ہیں؟“

بھانومتی سینکچری کے ایک گوشے سے نکل کر آئی۔ نمرتا اسے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گئی۔ پولیس افسر نے پوچھا۔ ”اس نے آپ کو کتنے عرصے سے قیدی بنا کر رکھا ہے؟“

بھانومتی نے کہا۔ ”اس نے مجھے چاردیواری میں قید نہیں کیا تھا۔ اپنے پُراسرار عمل سے میرے ذہن کو جکڑ رکھا تھا۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ اسے چھوڑ کر جانا چاہتی تھی لیکن نہیں جاسکتی تھی۔“

وہ اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس نے صرف مجھے ہی نہیں، یہاں کئی لوگوں کو سحرزدہ کر رکھا ہے۔ یہ زبردست شعبدہ باز ہے۔ پچھلی رات اس نے مجھے سحر سے آزاد کیا تو سمجھ میں آیا کہ ہمیں مار ڈالنے اور پھر زندہ کرنے کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے۔ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ”تنویمی عمل کے سلسلے میں یہ بہت زبردست عامل ہے۔ اس نے چھ ماہ پہلے مجھ پر عمل کیا تھا اور میرے ذہن میں یہ نقش کیا تھا کہ میں چھ گھنٹے تک سانس روک لوں گی۔ ایک پُراسرار عمل کے مطابق میرے دل کی دھڑکنیں تھم جائیں گی۔ نبض کی رفتار رک جائے گی پھر یہ جب بھی اپنا مخصوص منتر پڑھے گا اس کی آواز میرے کانوں میں پہنچے گی۔ میں سانس لینا شروع کر دوں گی۔ دنیا والے یہی سمجھیں گے کہ عارضی موت کے بعد زندگی کی طرف لوٹ کے آئی ہوں۔“

میں نے بھاگیشور سے کہا۔ ”تم نمرتا کے ماموں ہو یا باپ ہو۔ دونوں ہی صورتوں میں شیطان ہو۔ جب چاہتے ہو ہپناٹائز کے ذریعے اپنے کسی آلۂ کار کی سانس چند گھنٹوں کے لیے روک دیتے ہو پھر اس کی سانسیں لوٹا کر یہ تاثر دیتے ہو کہ ان کی آتمائیں تمہارے قابو میں ہیں۔ تم جب چاہتے ہو مار ڈالتے ہو، جب چاہتے ہو، نئی زندگی دے دیتے ہو، تمہارے اس خدائی دعوے کا پول کھل گیا ہے۔“

لیزا نے پوچھا۔ ”مارکس رول کہاں ہے؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مر چکا ہے۔“

ہم بھاگیشور کے ساتھ دوسرے کمرے میں آئے۔ وہاں فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر مارکس رول کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”جزیرے سے فرار ہونے کے لیے موٹر بوٹس نہیں ملیں۔ انڈرورلڈ والوں نے اس کے لیے ہیلی کاپٹر نہیں بھیجا۔ اس کے لیے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ عارضی موت کا ذائقہ چکھتا رہے۔ جب مصیبت ٹل جائے گی۔ ہم اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ جائیں گے تو بھاگیشور ہپناٹائز کے ذریعے اس کی سانسیں واپس لے آئے گا۔“

افسر نے بھاگیشور کا گریبان پکڑ کر حکم دیا۔ ”اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو فوراً اس کی سانسیں واپس لاؤ۔“

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”میرا گریبان چھوڑ دو۔ میں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا ہے۔ تم زیرِحراست رہنے والے سے بدسلوکی نہیں کرو گے۔ یہ خلافِ قانون ہے۔“

افسر نے اس کے منہ پر گھونسا جڑتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں تجھے گولی مار دوں تو تیری آتما جسم سے نکلنے کے بعد واپس کیسے آئے گی؟ کیوں میرے ہاتھوں مرنا چاہتا ہے۔“

میں نے اپنا ریوالور نکال کر مارکس رول کی عارضی لاش کا نشانہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”میں اسے گولیوں سے چھلنی کروں گا تو تم اس کی سانس بحال نہیں کر سکو گے۔ یہ زندہ ہونے کے بعد یقیناً تمہیں بھاری رقم دینے والا ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”اسے گولیوں سے چھلنی نہ کرو۔ جسم چھلنی ہوگا تو میرے عمل کے باوجود یہ سانس نہیں لے سکے گا۔ میں اس سے رقم لے چکا ہوں اور غیر معینہ مدت کے لیے سانسیں روکے رکھنے کا حکم دے چکا ہوں۔ وعدہ کر چکا ہوں کہ اسے قانون کی گرفت میں نہیں آنے دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم مرجاؤ گے تو یہ

غیر معینہ مدت تک مردہ پڑے رہے گا۔ اسے قیامت تک سرد خانے میں رکھنا ہوگا۔"

بھاگیشور نے کہا۔ "اسے میرے بغیر زندگی کی طرف کوئی نہیں لاسکے گا۔ اسے سرد خانے میں رکھ کر مقدمہ چلاتے رہو مگر اسے کوئی سزا نہیں دے سکو گے۔ اسے ذرا سی بھی اذیت نہیں پہنچا سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "جب اس کی طبعی عمر پوری ہوجائے گی تو یہ اسی سرد خانے میں مردہ ہی پڑا رہے گا۔ کسی کو خبر نہ ہوگی کہ یہ تمہارے تنویمی عمل سے بھی گزر چکا ہے۔ عارضی موت کا ذائقہ چکھنے والا دائمی موت مر چکا ہے۔"

نمرتا نے نفرت سے کہا۔ "سلمان! میں نہ اسے ماما کہوں گی اور نہ ہی باپ تسلیم کروں گی۔ آپ اسے قانونی شکنجے میں نہیں جکڑ سکو گے۔ یہ پھر رہائی پاکر واپس آجائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اسے سینکچری میں واپس نہیں آنا چاہیے۔"

میں نے اس کا نشانہ لیا۔ وہ سہم کر بولا۔ "یہ قانون کے خلاف ہے۔ تم مجھے گولی نہیں مار سکتے۔"

"مجھے کون روک سکتا ہے۔ میں دنیا کے اُن چند سراغ رساں میں سے ہوں، جس کے پاس کسی بھی مجرم کی جان لینے کا لائسنس ہوتا ہے۔ تم مرو گے تو مارکس کی باقی تمام زندگی سرد خانے میں گزرے گی۔ یہ دنیا کا پہلا مجرم ہے، جو عجیب و غریب سزائے موت پاتا رہے گا۔"

یہ کہتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک گولی اس کی پیشانی میں آگے سے سوراخ کرتی ہوئی پیچھے سے نکل گئی۔ وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ زندگی اور موت کے تماشے کرنے والا خود تماشا بن کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔

وہ ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ماں اپنے بھائی کی موت پر یا شوہر کی موت پر؟ بیٹی اپنے ماموں کی موت پر یا باپ کی موت پر؟ ایک شخص مرا تھا لیکن دو رشتوں کی موت ہوئی تھی۔

اور وہ قانونی گرفت سے جان چھڑانے والا غیر معینہ مدت تک سرد خانے میں پڑا رہے گا۔ اندر سے کہیں زندگی باہر آنے کے لیے ہمکتی رہے گی لیکن مردہ جسم کے قید خانے سے باہر نہیں آسکے گی۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہماری دنیا میں تنویمی عمل کے ذریعے ایسی اموات ہوچکی ہیں۔

انتقال پر ملال

داستان نویسی کا ایک عہد تمام ہوا۔ پڑھنے والوں کے محبوب و مقبول، کہنہ مشق قلم کار، 1398 اقساط پر محیط افسانوی داستان دیوتا کے خالق اور ادارے سے کم و بیش چالیس سال کا قلبی اور قلمی تعلق رکھنے والے محی الدین نواب بیماری سے لڑتے لڑتے 6 فروری کو خالق حقیقی سے جاملے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ادارہ ان کے پس ماندگان کے رنج و غم میں برابر کا شریک ہے۔ رب العالمین انہیں صبرِ جمیل اور استقامت دے۔ قارئین سے التماس ہے کہ مرحوم کی مغفرت کے لیے فاتحہ اور دعائے خیر فرمائیں۔

مرحوم نے ادارے کے پرچوں کے لیے جہاں اَن گنت ناقابلِ فراموش کہانیاں لکھیں، وہیں ان کی سلسلے وار داستانیں، دیوتا، پتھر، مقدر، واپسی، اندھیر نگری اور مسیحا قارئین میں بہت مقبول ہوئیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں شناخت کے مسودے بھی مرحوم کی نظرِ ثانی کے بعد ادارے کو موصول ہوتے تھے جبکہ سسپنس ڈائجسٹ میں ان کا ماروی نامی سلسلہ جاری ہے۔ مرحوم وفات سے قبل اپنی نظم و نثر پر مشتمل کتاب "دوتارا" کی اشاعت کی دیرینہ خواہش کو مطبوعہ صورت میں قارئین کے سامنے لے آئے تھے۔ ان کی بہت سی کہانیوں کو قارئین مدتوں نہیں بھلا سکیں گے۔

گل گذیدہ

جمال دستی

پھولوں کی خوشبو سانسوں کو ہی نہیں بعض اوقات زندگی کو بھی سنوار دیتی ہے ... فضاؤں کو معطر بنا دیتی ہے... سرخ گلابوں کی ایک ایسی ہی شاپ کے گرد گھومتی کہانی... ایک قتل نے ہر ایک کو حیران و پریشان کر دیا تھا...

معمولی نکتوں اور غیر معمولی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرنے والے سراغ رساں کی مہارت

پھولوں کے اسٹور کا بیسمنٹ نمی کی وجہ سے خنک ہو رہا تھا۔ ورک ٹیبل کے اوپر روشن اکلوتے بلب کی روشنی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی اور پولیس کوٹ کے بٹنوں پر جگمگا رہی تھی۔

سراغ رساں فلیمنگ نے اپنا براؤن فلیٹ ہیٹ اپنے لہریے دار سیاہ بالوں پر مزید پیچھے کھسکا لیا اور اپنے قدموں میں پڑی ہوئی لاش کا گہری نظر سے جائزہ لینے لگا۔

پھر وہ گھوم گیا اور اپنی تیز نگاہیں اس گروپ پر مرکوز

کردیں جو اس کے پیچھے سہما کھڑا تھا۔

''میرے خیال میں تم میں سے کسی کو بھی اس بارے میں کچھ علم نہیں ہوگا۔'' فلیمنگ نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

تینوں نے بے اختیار تیزی سے سرنفی میں ہلا دیے۔

سراغ رساں فلیمنگ کی نظریں ایک بار پھر اس دبلے پتلے نوجوان کی لاش کی جانب اٹھ گئیں جس کے سینے میں ایک پھول تراش چاقو دستے تک گڑا ہوا تھا۔ اس کی سفید قمیص پر سامنے کی جانب ایک قرمزی دھبا پڑا ہوا تھا جو کہ خون کا نشان تھا۔ یہ دھبا چاقو کے سبز اینامل دستے کے اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔

لاش کا سر اور شانے ورک ٹیبل کے نیچے اندر کی جانب تھے جس کی وجہ سے دبلا پتلا پستہ قد کورونر میز کے نیچے سے گھٹنوں کے بل چلتا ہوا جب باہر آیا تو اس کا لہجہ تلخ اور شکایتی تھا۔ وہ اپنے گھٹنے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کسی خاص کو مخاطب ہوئے بغیر بولا۔ ''یہ لاشیں ہمیشہ اس طرح بے ڈھب انداز میں ہی کیوں دریافت ہوتی ہیں؟''

اس نے اپنا خستہ سا بیگ اٹھایا، اپنا ہیٹ اپنے سر پر جمایا اور تیزی سے بولا۔ ''میں اپنی رپورٹ معمول کے مطابق بھیج دوں گا۔ اس شخص کو مرے ہوئے لگ بھگ دس گھنٹے ہو چکے ہیں۔''

سراغ رساں فلیمنگ نے بے دھیانی میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساتھ ہی سیمنٹ کے فرش پر بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے ان سنہری حروف کو اپنے جوتے کی نوک سے ٹھوکر لگانے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں حرف 'U' پکڑا ہوا تھا جو اس نے مردہ شخص کے ہاتھ میں دبا ہوا پایا تھا۔ کبوتر کے کابک نما ایک بکس جس میں وہ تمام سنہری حروف رکھے رہتے تھے، فرش پر الٹا اور خالی پڑا تھا۔ حروف 'M' کا ایک گچھا اس لاش کے بے جان ہاتھ کے پاس بکھرا ہوا تھا۔

''او کے، اسے ڈھانپ دو۔'' سراغ رساں فلیمنگ نے لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پیچھے موجود نیلی وردی میں ملبوس پولیس افسران میں سے ایک سے کہا پھر وہ ان تینوں کی جانب پلٹ گیا جو خاموش کھڑے ہوئے تھے۔

سرخ بالوں والی لڑکی اپنا منہ رومال میں چھپائے بے آواز رو رہی تھی۔

''آل رائٹ۔'' فلیمنگ نے کہا۔ ''اب اس کیس کی بات کرتے ہیں۔ مجھے دوبارہ سے بتائیں کہ کیا ہوا تھا۔''

سب سے پہلے لڑکی گویا ہوئی۔ اس کا نام پیٹریشیا مرے تھا اور وہ گل فروشی کے کاروبار کا علم حاصل کرنے کے لیے اس اسٹور میں نئی آئی تھی۔ فریڈ جینسن کی لاش اسی نے دریافت کی تھی جب وہ صبح بیسمنٹ میں چند گملے لینے کے لیے نیچے آئی تھی۔

''پولیس کو کس نے فون کیا تھا؟'' فلیمنگ نے پوچھا۔

''میں نے کیا تھا۔'' لڑکی کے دائیں جانب کھڑے ہوئے بید نما دبلے پتلے نوجوان نے جواب دیا۔ ''میرا نام جیک انگر ہے اور آرڈرز کی ڈیلیوری کرتا ہوں۔ پیٹریشیا سیڑھیوں سے چیختی ہوئی اوپر آئی تھی تو...''

''انگر!'' فلیمنگ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے حرف U پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کی گہری آنکھوں میں ایک سوال تھا۔

نوجوان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''صرف اس بنا پر کہ یہ حرف فریڈ کے ہاتھوں میں تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ...'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''ڈیم اِٹ۔'' فلیمنگ نے تیزی سے کہا۔ ''اس کا کچھ مطلب ہے! اس نے حرف U کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ تم لوگ ان حروف کو ربن پر جذبات کے اظہار کے طور پر چسپاں کرتے ہو۔ ہے نا؟ تدفینی پیغامات کے طور پر؟''

ان آخری الفاظ پر لڑکی نے اپنی نیلی آنکھیں بھینچ کر بند کرلیں اور اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اس کے دبلے پتلے شانے اس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں کپکپا رہے تھے۔ جیک انگر نے دلاسا دینے کے لیے اس کے ہاتھ کو آہستگی سے چھوا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، پیٹریشیا۔'' جیک انگر نے ملائم لہجے میں کہا۔

پیٹریشیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بائیں جانب کھڑا ہوا شخص پہلی بار گویا ہوا۔ وہ پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں عداوت عیاں تھی۔ ''سنو، مسٹر۔'' اس نے فلیمنگ سے کہا۔ ''پیٹریشیا سے اس سے زیادہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ ہم جو کچھ بتا چکے ہیں، ہمیں اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں ہے۔''

فلیمنگ نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''یقیناً۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ ملائم تھا۔ ''لیکن کسی نہ کسی نے تو سوالات کرنے ہیں۔ چیف نے یہ کیس میری جھولی میں ڈال دیا ہے۔ اب یہ ذمے داری

میری ہے۔“

فلیمنگ سوچنے لگا کہ سراغ رساں ہونا اتنا پُرکشش نہیں ہے۔ کوئی بھی آپ کو پسند نہیں کرتا۔ لوگ خوف زدہ رہتے ہیں کہ اگر وہ آپ سے بے تکلف ہوئے تو آپ الٹا ان پر برس پڑیں گے اور قتل کا الزام ان کے ذمے دھر دیں گے۔

فلیمنگ نے پیٹریشیا کی طرف دیکھا تو اس نے تیزی سے آنکھیں پھیر لیں۔ کوئی اور موقع ہوتا اور حالات نارمل ہوتے تو اس قسم کی لڑکی اتنی بھرپور توجہ پا کر ضرور مسکرانے لگتی۔

فلیمنگ نے ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے لڑکی کے چہرے کے تاثرات اس وقت بھی بھانپ لیے تھے جب جیف انگر نے اس کا ہاتھ چھوا تھا۔ یا پھر اس کی وجہ یہ حقیقت رہی ہوگی کہ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے حرف U پیٹریشیا مرے کے آخری نام کا دوسرا حرف تھا۔ یہ لفظ مرڈر کا دوسرا حرف بھی تھا۔

تو کیا فریڈ جینسن کسی بات کی توضیح کرنے کی کوشش کر رہا تھا؟

”باس کہاں ہے؟“ سراغ رساں فلیمنگ نے اچانک پوچھا۔ ”ڈیوس کون ہے جس کے نام پر یہ فلاور اسٹور ہے؟“ اس نے یہ سوال اس پستہ قد گٹھے ہوئے جسم کے مالک شخص سے کیا تھا۔

”میرا نام ہرب مارٹن ہے۔“ اس پستہ قد نے بتایا۔ ”اسٹور کا مالک تھامس ڈیوس ہے۔ وہ عام طور پر یہیں ہوتا ہے لیکن گزشتہ چند دنوں سے گھر پر ہے۔ اسے ہارٹ کا پرابلم ہے۔“

”اسے خبر کر دی گئی ہے؟“

ہرب مارٹن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے گھر پر پولیس کو خوش آمدید کہے گا اور انہیں وہ سب بتا دے گا جو کچھ وہ جانتا ہے۔“

اس بات پر سراغ رساں فلیمنگ کے چہرے پر مایوسی کے آثار اُمڈ آئے۔ ”مدد کرنے پر آمادہ افراد کو شاذ و نادر ہی ایسی کسی بات کا علم ہوتا ہے جو کارآمد ثابت ہو سکے۔“ اس نے اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بات کہی۔ پھر ان سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا جو اوپر دکان میں جا رہی تھیں۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوں گا تو اچانک شہر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے ان تینوں سے کہا۔ پھر زینے کے جنگلے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک گہرا سانس لینے کے بعد پیٹریشیا سے دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ”کیا یہ گل یاس کی خوشبو نہیں ہے جو مجھے سنگھائی دے رہی ہے؟“

پیٹریشیا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس بڑی سی میز کی جانب اشارہ کیا جو ایک اندھیری دیوار کے پاس موجود تھی۔ ”وہ وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس مزید گل یاس بھی ہیں جو اوپری منزل پر دکان میں ہیں۔“

فلیمنگ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر وہ محتاط الفاظ میں گویا ہوا۔ ”گزشتہ ہفتے میں نے چند گل یاس خریدنے چاہے تو مجھے بتایا کہ ان پھولوں کا سیزن پندرہ روز قبل ختم ہو چکا ہے پھر تمہارے پاس یہ پھول کیوں کر ہیں؟“

پیٹریشیا نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی ہرب مارٹن بول پڑا۔ ”تو پھر ہم خوش قسمت ہیں۔ ہے نا؟ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ...“

”میرے خیال سے... تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ فلیمنگ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پھر وہ آگے کی جانب جھکا۔ ”تم جانتے ہو۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔ ”میرا نہیں خیال کہ میں تمہیں پسند کروں گا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اپنا رویہ مثبت رکھتا۔“

یہ کہہ کر سراغ رساں اپنے ساتھیوں کی جانب گھوم گیا۔ ”تم لوگ اب لاش لے جا سکتے ہو۔“ اس نے ایک افسر سے کہا۔

پھر وہ زینہ چڑھنے لگا۔

☆☆☆

اسٹور کا مالک تھامس ڈیوس مدد کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ بے تاب لگ رہا تھا۔ وہ چمڑے کی ایک دبیز کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چوڑے چہرے پر فکرات کے تاثرات عیاں تھے۔ اس کی انگلیاں اس کے ڈریسنگ گاؤن کے سامنے کے حصے پر بے دلی سے حرکت کر رہی تھیں۔ جب وہ گویا ہوا تو اس کے سفید مصنوعی دانت روشنی میں چمکنے لگے۔

”یہ بہت برا ہوا۔ واقعی بہت برا ہوا۔ فریڈ ایک عمدہ لڑکا تھا۔ بھلا کوئی اسے کیوں...“

”اس کا کوئی دشمن تو نہیں تھا؟“

تھامس ڈیوس کی بھویں جھک گئیں۔ ”میں کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا جو کسی کے لیے الزام ثابت ہو... لیکن، وہ اور جیک انگر دونوں ہی پیٹریشیا میں دلچسپی رکھتے تھے۔“

”اور پیٹریشیا فریڈ جینسن کو ترجیح دیتی تھی؟“

تھامس ڈیوس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ جیک انگر نے۔۔۔''

''اور ہرب مارٹن کے بارے میں کیا کہو گے؟'' سراغ رساں نے تھامس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اوہ، وہ ٹھیک ٹھاک بندہ ہے۔ بس ذرا جذباتی ہے اور جلدی غصے میں آجاتا ہے۔ لیکن۔۔۔''

فلیمنگ نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''تمہارے خیال میں یہ قتل جیک انگر نے کیا ہے؟''

یہ سن کر تھامس ڈیوس کا جسم تن گیا۔ ''میں نے یہ بات نہیں کہی۔ حقیقت میں۔۔۔ یہ وہ کچھ ہو گیا جو مائنگ سلون چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔'' یہ کہہ کر وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

''بولو۔۔۔ آگے بولو۔'' سراغ رساں نے کہا۔

''مائنگ سلون کی پھولوں کی دکان اگلے کونے پر ہے۔ وہ برسوں سے مجھ سے لڑ رہا ہے۔ خاصا جھگڑالو دکان دار ہے۔ گزشتہ کئی دنوں سے مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔''

''کس قسم کی دھمکیاں؟''

''اس کا کہنا تھا کہ میں اس کا کاروبار تباہ کر رہا ہوں۔'' تھامس ڈیوس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

فلیمنگ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اس سے بھی ملاقات کر لوں گا۔'' اس نے تھامس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

تھامس ڈیوس نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا اور بولا۔ ''میں کل صبح اپنے اسٹور میں آنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر تمہیں کچھ پتا چلتا ہے تو مجھے ضرور باخبر کر دینا۔''

فلیمنگ ناخوشگوار انداز میں ہنس دیا اور بولا۔ ''یقیناً خبر کر دوں گا۔''

☆☆☆

فلیمنگ نے اپنی کار فٹ پاتھ کے کنارے روک دی اور اتر کر ڈیوس فلاور اسٹور کے دروازے پر چلا گیا۔ شیشے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ پیٹریشیا نے کھولا۔ وہ اسٹور میں تنہا تھی۔

''تم گھر کیوں نہیں گئیں؟'' فلیمنگ نے پوچھا۔

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ ''میں کام کرنا چاہتی ہوں تاکہ میرا ذہن مصروف رہے۔ بہت سے باہر کے آرڈر آئے ہوئے ہیں۔ فون پر موصول ہونے والے آرڈرز بھی ہیں۔'' پھر اپنے سرخ بالوں والے سر کو گھماتے ہوئے اس مجمع کی جانب اشارہ کیا جو شیشے کی کھڑکیوں کے پاس کھڑا تھا۔ ''یہ لوگ اندر آنے کے لیے بے تاب ہیں اور اسٹور کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''آج تو ایسا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ البتہ کل تم اسٹور کھول سکتی ہو۔'' فلیمنگ نے جواب دیا۔ ''باقی سب لوگ کہاں ہیں؟''

''ہرب مارٹن لنچ کرنے گیا ہوا ہے۔ جیک انگر ڈیلیوری کرنے نکلا ہوا ہے۔''

''سنو۔'' فلیمنگ نے کہا۔ ''اگر تم بُرا نہ مناؤ تو کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟''

پیٹریشیا نے سر ہلا دیا اور واپس اس کاؤنٹر پر چلی گئی جہاں وہ کام کر رہی تھی۔ اس نے اسنیپ ڈریگن پھولوں کا گچھا اٹھا لیا جن کے ڈنٹھل بھی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اس نے مشاقی سے ان کے پتے اتارنا شروع کر دیے۔

فلیمنگ خاموشی سے کھڑا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئی تو اس نے تانبے کی رنگت والے ان شگوفوں کو پانی سے بھرے ایک گلدان میں رکھ دیا۔

فلیمنگ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''کیا فریڈ جینسن تم سے پیار کرتا تھا؟''

پیٹریشیا کے ہاتھ رک گئے اور وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی۔ اس کے سرخ ہونٹ ہلکے سے کپکپائے، پھر وہ بولی۔ ''ہاں، میرا خیال ہے کہ وہ مجھے چاہتا تھا۔ میں بھی اسے پسند کرتی تھی۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔''

''اور جیک انگر؟''

تب وہ فلیمنگ کی جانب گھوم گئی۔ ''مسٹر تھامس ڈیوس نے بتایا ہے کہ جیک انگر نے میری خاطر فریڈ جینسن کو قتل کیا ہے؟'' پیٹریشیا نے جاننا چاہا۔

فلیمنگ نے اپنا ایک شانہ اچکا دیا۔ ''ہو سکتا ہے۔''

''مجھے اس بات پر یقین نہیں۔'' پیٹریشیا نے غصے سے کہا۔

''اپنے جذبات قابو میں رکھو۔۔۔ کوئی بھی اسے الزام نہیں دے رہا۔ تم اسے پسند کرتی ہو؟''

پیٹریشیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں۔'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

''وہ تمہارا ذہن تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ اور فریڈ کو یہ بات پسند نہیں تھی؟''

اس نے نروس انداز میں شیشے کی ایک بوتل اٹھائی۔

اس کا ڈھکن کھولا اور اس میں سے دو گولیاں اپنی ہتھیلی پر نکالیں اور اس گلدان میں انڈیل دیں جس میں اسنیپ ڈریگن کے شگوفے ڈالے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" فلیمنگ نے متجس لہجے میں پوچھا۔

"اسپرین۔" پیٹریشیا نے بتایا۔ "اس سے یہ دیر تک شگفتہ رہتے ہیں۔"

"تین ہفتے تک؟" فلیمنگ نے تیزی سے کہا۔ "یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک؟"

پیٹریشیا اس سوال پر چونک گئی۔ "مجھے نہیں معلوم..." وہ ہکلانے لگی۔

فلیمنگ کاؤنٹر پر سے اس کی جانب جھک گیا۔ "کیا تمہیں یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ تمہارے پاس سیزن کے بغیر پھول موجود ہیں جبکہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے پیلے رنگ کے گلابوں کی جانب اشارہ کیا جو ایک گلدان میں کھڑکی میں سجے ہوئے تھے۔ "یہ وہاں کب سے موجود ہیں؟"

پیٹریشیا کی نظریں اس جانب اٹھ گئیں جدھر فلیمنگ نے اشارہ کیا تھا۔ "یہ خاصے مہنگے گلاب ہیں۔ یہ ابھی تک نہیں بکے۔"

"کب سے؟"

"لگ بھگ ساڑھے تین ہفتے ہو چکے ہیں۔"

فلیمنگ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "تم سے پھر ملاقات ہو گی لڑکی۔ میں ذرا اسٹرک پر آگے جا رہا ہوں۔"

مائنک سلون کے اسٹور کا نام "THE PATTO" تھا۔ یہ دکان تھامس ڈیوس کی پھولوں کی دکان سے چھوٹی تھی۔ فلیمنگ جب دکان میں داخل ہوا تو یرقان زدہ چہرے والا ایک پستہ قد شخص کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر اس کے پاس آ گیا۔

"میں کیا مدد کرسکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"تم مائنک سلون ہو؟" فلیمنگ نے کہا۔

"ہاں، میں ہی ہوں۔" اس نے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں سراغ رساں فلیمنگ ہوں۔ میں فریڈ جینسن کے قتل کی تفتیش پر مامور ہوں۔ کیا تم اسے جانتے تھے؟"

مائنک سلون نے تیزی سے تھوک نگلا اور بولا۔ "ہاں، میں اسے آس پاس دیکھتا رہتا تھا۔ بے چارہ... میں نے سنا ہے..."

فلیمنگ ایک گلاس کیس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکالا۔ اس میں سے ایک سگریٹ منتخب کی اور اسے سلگا کر ایک گہرا کش لینے کے بعد گہرا نیلا دھواں اگلتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

مائنگ سلون نے تیزی سے سر ہلا دیا۔ ''دیکھنے میں وہ ایک ذہین اور ہوشیار لڑکا تھا۔ میں نے متعدد بار خواہش کی کہ کاش وہ میرے پاس کام کر رہا ہوتا... لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں جانتا کہ تمہارے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔''

فلیمنگ اپنی سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ ''تھامس ڈیوس کا کہنا ہے کہ تم نے اسے دھمکیاں دی تھیں؟''

پستہ قد مائنگ سلون کی نیلی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ ''میں نے کبھی ایسی کوئی بات کہی ہو گی لیکن میرا ایسا کوئی مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں یہ ایمان داری سے کہہ رہا ہوں۔ اس کا کاروبار بہت اچھا چلتا ہے اور بعض اوقات مجھے اس سے حسد ہونے لگتا ہے۔''

فلیمنگ سوچ میں پڑ گیا۔ ''آئی سی!'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تھینکس۔ اب میں چلتا ہوں۔''

فلیمنگ، مائنگ سلون کے اسٹور سے نکل کر اپنی کار میں سوار ہو گیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ وہ چمک دار حرف U کہیں فٹ نہیں ہو رہا۔ U انگر میں بھی ہے، U مرے میں بھی ہے اور U مرڈر میں بھی آتا ہے۔

وہ ٹریفک کی روانی میں ویسٹ سائڈ کے اس علاقے کی جانب رواں تھا جہاں فریڈ جینسن کی رہائش تھی۔

وہ سرخ اینٹوں والے ایک ایسے مکان میں رہتا تھا جہاں کمرے کرائے پر ملتے ہیں۔ وہاں ایک گرد آلود نچلی کھڑکی میں ''کرائے کے لیے خالی ہے'' کا ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔

جب فلیمنگ نے لینڈ لیڈی سے جینسن کے کمرے کا نمبر پوچھا تو اس نے اپنی جھاڑو کا سہارا لیتے ہوئے اوپر جانے والے زینے کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہ ولسن اور فنگر پرنٹس کے عملے کو پہلے ہی یہاں بھیج چکا تھا۔

فلیمنگ کے دستک دینے پر فریڈ جینسن کے کمرے کا دروازہ ولسن نے کھولا۔ فلیمنگ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مسکرا دیا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم جلدی ہی یہاں پہنچ جاؤ گے۔''

فلیمنگ نے تیزی سے اطراف میں نظریں دوڑا دیں۔ ''تمہیں کیا ملا؟'' اس نے ولسن سے پوچھا۔

ولسن نے ہاتھ پھیلا دیے۔ ''سب کچھ... اور کچھ بھی نہیں۔'' اس نے کمرے کی ابتر حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں الماری کی درازیں کھلی ہوئی تھیں، کپڑے فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور بیڈ چاک شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''جب ہم یہاں آئے تو کمرے کی حالت یہی تھی۔ دروازہ زبردستی توڑا گیا تھا۔ کوئی شدت کے ساتھ کسی چیز کو تلاش کر رہا تھا...'' ولسن نے بتایا۔

فلیمنگ نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور چند قدم آگے بڑھنے کے بعد فرش پر جھک گیا اور وہاں بکھری ہوئی نصف درجن کے قریب زرد رنگ کی پنسلیں اٹھا لیں۔ اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے جب وہ ان کا جائزہ لینے لگا۔ تمام پنسلوں کی نوکیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور ان کے اریزر والے حصے پر دانتوں سے چبانے کے نشانات نمایاں تھے۔

''لگتا ہے کہ ہمارا دوست جینسن حال ہی میں بہت زیادہ پاورفل رائٹنگ کرتا رہا ہے۔ لیکن کیا؟'' وہ خود سے گویا تھا۔

اگلے روز سہ پہر سراغ رساں فلیمنگ نے خود کو اسی مقام پر پایا جہاں وہ گزشتہ روز تھا... یعنی وہ ابھی تک اس مسئلے کے حل کے قریب بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے چیف سے ملاقات بھی کی تھی لیکن اس ملاقات سے چیف کی انا کو کوئی تسکین نہیں پہنچی تھی۔ چیف نے اسے سخت الفاظ میں کچھ ایکشن دکھانے کی تاکید کی تھی۔ کہا تھا کہ بہتر ہو گا وہ جلد از جلد اس کیس کو نمٹا دے ورنہ... اور ''ورنہ'' کے بعد چیف نے بڑا سا ہاتھ مٹھی بنا کر زوردار آواز کے ساتھ میز پر دے مارا تھا۔

فلیمنگ، ڈیوس فلاور اسٹور میں داخل ہوا تو پیٹریشیا نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت گل بنفشہ کے چند ڈنٹھل ہاتھ میں لیے ہوئے تھی۔ وہ سیدھی فلیمنگ کے پاس آ گئی۔ آج وہ قدرے بہتر اور دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے رخساروں کی لالی بھی لوٹ آئی تھی اور آنکھوں کی سرخی بھی کم ہو چکی تھی۔

''ہیلو!'' فلیمنگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پیٹریشیا بھی جواباً مسکرا دی۔

''تمہارا باس آیا ہوا ہے؟'' فلیمنگ نے پوچھا۔

پیٹریشیا نے اپنے گھنگھریالے سرخ بالوں والے سر سے بالکنی کی جانب اشارہ کیا جو اسٹور کے نصف حصے میں بنی ہوئی تھی اور اس سے ایک گول زینہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔

''وہ اوپر اپنے دفتر میں ہے۔'' پیٹریشیا نے بتایا۔

پھر اپنا ہاتھ فلیمنگ کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہیں اس بارے میں کچھ پتا چلا؟“ پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

فلیمنگ نے نفی میں سر ہلا دیا اور ایک اچٹتی نگاہ اس کے پیچھے موجود ہرب مارٹن اور جیک انگر پر ڈالی۔ ان دونوں میں سے کسی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نہیں آئی۔ ہرب مارٹن کی آنکھوں سے سرد مہری عیاں تھی جبکہ جیک انگر کی آنکھیں حسد کے مارے سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔

فلیمنگ کو عجیب سا احساس ہوا کہ وہ ان دونوں کی کیفیت پر مسکرا دے۔ وہ دونوں ہی اس سے حسد کر رہے تھے۔ لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ جب معاملہ پیٹریشیا جیسی حسین لڑکی کا ہو تو پھر حسد ایک فطری ردِعمل تھا۔

”تم سے پھر ملاقات ہو گی، لڑکی۔“ فلیمنگ نے پیٹریشیا سے آہستگی سے کہا۔

پھر جونہی وہ پلٹا تو اپنے عقب میں فرش پر رکھے ہوئے لکڑی کے پٹوں والے ایک کریٹ میں الجھ کر گرتے گرتے بچا جس میں گلاب رکھے ہوئے تھے۔ پیلے اور سرخ رنگ کے گلاب موم کاغذ میں مضبوطی سے لپٹے ہوئے تھے۔

فلیمنگ نے جھک کر اپنی انگشتِ شہادت سے ایک کلی کو چھوا۔ وہ تمام پھول دیکھنے میں مصنوعی سے لگ رہے تھے۔

تب اسے اپنے عقب میں کسی کی غراہٹ سی سنائی دی۔ ”اپنا ہاتھ ان پھولوں سے دور رکھو۔“

فلیمنگ تیزی سے پلٹا تو اس نے ہرب مارٹن کو اپنے سامنے موجود پایا جو کینہ توز نظروں سے اسے بُری طرح گھور رہا تھا۔

”اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو، مارٹن؟“ اس نے پُراطمینان لہجے میں کہا۔

ہرب مارٹن نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ”گلابوں پر رقم خرچ ہوتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی ناسمجھ پولیس والا انہیں برباد کر دے۔۔۔“

فلیمنگ ایک طویل لمحے تک ٹھنڈے مزاج کے ساتھ اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جان بوجھ کر نیچے جھکا اور گلاب کی ایک کلی توڑ کر اپنے کوٹ کے بٹن ہول میں لگالی۔ پھر اسے تھپک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر؟“

ہرب مارٹن دانت پیسنے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بمشکل تمام اپنی آواز کو قابو میں رکھا اور فلیمنگ کے پیچھے کھڑی ہوئی پیٹریشیا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مسٹر فلیمنگ کو ایک گارڈینیا سیٹ کر کے پیش کرو۔ انہیں کاج میں لگانے کے لیے پھول درکار ہے۔“

”شکریہ! میں پہلے ہی ایک پھول لے چکا ہوں۔“ فلیمنگ نے کہا اور پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر تھامس ڈیوس کے دفتر جا پہنچا۔

تھامس ڈیوس اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ ”ہیلو، مسٹر فلیمنگ!“ اس نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

فلیمنگ اس کے مقابل سیدھی پشت والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں کوئی آئیڈیا ہے کہ فریڈ جینسن گزشتہ شب یہاں تنہا کیوں موجود تھا؟“ فلیمنگ نے پوچھا۔ ”اور اسٹور کس نے بند کیا تھا؟“

تھامس ڈیوس نے اپنی کرسی سے ٹیک لگالی۔ ”اسٹور اسی نے بند کیا تھا۔ میں نے انگر اور مارٹن سے بات کی ہے۔ وہ دونوں اور مس پیٹریشیا ایک ہی ساتھ یہاں سے نکلے تھے۔ فریڈ گھر جانے سے قبل بیسمنٹ میں کچھ کام نمٹانے کے لیے رک گیا تھا۔ میں۔۔۔“ یہ کہہ کر تھامس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سراغ رساں کے بٹن ہول میں اٹکی ہوئی گلاب کی کلی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے یہ طلسمی کلی کہاں سے حاصل کی؟“

فلیمنگ ہنس کر بولا۔ ”یہ تمہاری ہی ہے؟“

تھامس ڈیوس انتظار کرنے لگا کہ فلیمنگ شاید مزید کچھ کہے گا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو تھامس آہستہ سے گویا ہوا۔ ”یہ تمہیں ہرب مارٹن نے دی ہے؟“

”نہیں، میں نے خود لی ہے۔۔۔ کیوں؟“

اس بات پر تھامس نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ ”گلابوں کے معاملے میں مارٹن بے حد جھگڑالو ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے اسی کا شعبہ ہے۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود پنسل کو میز کی سطح پر بجاتے ہوئے بتایا۔

فلیمنگ آنکھیں بھینچ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ”ہوں۔“ اس نے عدم توجہی سے کہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں۔ پھر ملاقات ہوگی ڈیوس۔“

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا اور اس کاؤنٹر پر رک گیا جہاں پیٹریشیا ایک چھوٹا زنانہ گلدستہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی انگلیوں پر ڈنٹھل کا رواں چپکا ہوا تھا۔

”سنو۔“ فلیمنگ نے اپنی آواز اتنی مدھم رکھی کہ صرف پیٹریشیا کے کانوں تک پہنچ سکے۔ ”محتاط رہنا اور اپنا

دھیان رکھنا...''

پیٹریشیا کی آنکھیں یہ سرگوشی سنتے ہی پھٹ پڑیں۔

''کیوں... کیابات ہے؟''

فلیمنگ نے آہستگی سے شانے اچکا دیے۔ ''مجھے فی الحال کچھ معلوم نہیں لیکن معاملات ٹھیک نہیں لگ رہے۔ بعض اوقات مجھے کچھ محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے... اور اس وقت بھی میں یہی محسوس کررہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے دکان میں چاروں طرف نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''جواب یہیں کسی جگہ موجود ہے لیکن کاش میں اسے تلاش کر سکتا...''

اس نے اچانک کاؤنٹر پر رکھا ہوا آرڈر پیڈ اپنی طرف گھسیٹ لیا اور اس پر اپنے قلم سے ایک نمبر لکھنے کے بعد وہ کاغذ پیڈ پر سے علیحدہ کرلیا۔ پھر کاغذ کو احتیاط سے تہ کر کے اسے پیٹریشیا کے اوپری پہناوے کی جیب میں ڈال دیا۔ ''میں اپنا نمبر احتیاطاً دے رہا ہوں۔ اگر تم کوئی ایسی بات سنتی ہو یا کوئی چیز دکھائی دے جاتی ہے جو تمہارے خیال کے مطابق میرے علم میں لانا ضروری ہو تو مجھے فون کر دینا۔''

جب فلیمنگ نے دیکھا کہ ہرب مارٹن انہی کی جانب متوجہ ہے تو اس نے سر جھکاتے ہوئے اپنے کالر میں لگے گلاب کو سونگھا اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''کم از کم اس کی خوشبو تو عمدہ ہے۔''

☆☆☆

گھنٹی کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

فلیمنگ نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ لیکن وہ آنکھیں بند کیے دیر تک اس اُمید پر بستر پر لیٹا رہا کہ گھنٹی کی آواز خود بہ خود بند ہوجائے گی۔

لیکن آواز بند نہیں ہوئی۔

بالآخر اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے آنکھیں کھول لیں اور الارم کلاک کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن گھڑی تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ رک گیا۔ کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابھی رات باقی تھی۔

پھر وہ اچانک اٹھ بیٹھا۔ اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے لپک کر نائٹ اسٹینڈ پر موجود ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔

گھنٹی الارم کلاک کی نہیں بلکہ ٹیلی فون کی تھی جو مسلسل بجے جارہی تھی۔

''ہیلو؟'' اس نے تیزی سے کہا۔

دوسری جانب سے ایک مبہم سی آواز سنائی دی۔ لہجہ ہیجانی اور آواز باریک چیخ کی سی تھی۔ فلیمنگ کو واضح طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''ذرا اطمینان سے بات کریں... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' فلیمنگ نے بتایا۔

''کیا یہ سراغ رساں فلیمنگ کا نمبر ہی ہے؟'' اس آواز نے جاننا چاہا۔

تب فلیمنگ نے وہ آواز پہچان لی۔

''اوہ، یہ تم ہو پیٹریشیا!'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟''

''فلیمنگ، میں نے کچھ تلاش کرلیا ہے۔''

''اچھا! کیا؟ اور تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں نیچے اسٹور میں ہوں۔ میں رات کو یہاں واپس آگئی تھی۔'' پیٹریشیا نے بتایا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ جب تم نے کہا کہ تمہارے خیال میں اس کا جواب یہیں کسی جگہ موجود ہے تو میں نے خود سے چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور یہاں آگئی...''

''پاگل لڑکی!''

''میں، گلاب کی ان کلیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کریٹس میں رکھی ہوئی تھیں اور جن سے الجھ کر تم گرتے گرتے بچے تھے۔ ان کریٹس میں موجود گلابوں کے بارے میں کچھ عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا...''

فلیمنگ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اور تم نے کیا تلاش کیا ہے؟''

''میں نے...'' پیٹریشیا نے کہنا شروع کیا۔

''ہاں، ہاں... آگے کہو۔''

پیٹریشیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریسیور پر موجود فلیمنگ کا ہاتھ پسیجنے لگا۔ اس نے اپنا کان ریسیور پر لگا دیا...

فون ڈیڈ ہو چکا تھا۔

''پیٹریشیا!'' وہ چیخ پڑا۔

دوسری جانب بدستور خاموشی تھی۔

فلیمنگ نے ایک ہی سرعت میں ریسیور ہاتھ سے پھینک دیا اور اپنے کپڑوں کی جانب لپکا۔ پیٹریشیا کے جواب نہ دینے کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی اور اس وجہ کا تصور

کرتے ہی فلیمنگ کے چہرے کی سرخی پھیکی پڑ گئی اور اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔
اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا ریوالور اٹھایا اور باہر کی جانب لپکا۔
جب اس کی کار رات کی تاریکی میں سنسان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی تو اسے اچانک وہ گلاب کی کلی یاد آ گئی جو اس نے کریٹ میں سے اٹھا کر اپنے کوٹ کے بٹن ہول میں لگائی تھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے بٹن ہول پر چلا گیا۔ گلاب وہاں موجود نہیں تھا۔ بھاگ دوڑ میں وہ کہیں گر گیا تھا۔
وہ دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا... جواب اس کے کالر میں موجود تھا اور اسے اس بات کا قطعی احساس نہیں ہو پایا تھا!
لیکن قتل کا گلاب سے کیا تعلق بنتا تھا؟ وہ الجھن میں پڑ گیا۔
فلاور شاپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فلیمنگ کی کار کے ٹائروں کی چرچراہٹ رات کے سناٹے میں گونجی اور اس نے تیزی سے کار فلاور شاپ کے سامنے روک دی۔
اس نے سوچا کہ وہ اپنے چیف کو فون کر دے لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔
پیٹریشیا کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ چیف کو فون کرنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔
اسے فلاور شاپ کا داخلی دروازہ غیر مقفل ہونے کی توقع ہرگز نہیں تھی... لیکن دروازہ مقفل نہیں تھا۔
اس نے اپنا ریوالور ہاتھ میں تان لیا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھول کر محتاط قدم اٹھاتا ہوا شاپ میں داخل ہو گیا۔
''پیٹریشیا!'' اس نے آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟''
اسے اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ اس کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں تھی۔ اسٹور کی ٹھنڈی ساکت فضا میں پھولوں کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔
وہ دبے پاؤں بیسمنٹ کے دروازے کی جانب بڑھا اور اسے ہلکے سے کھول کر نیچے جھانکنے لگا۔ نیچے روشنی ہو رہی تھی۔ اب اسے ایک ہیجانی سرسراتی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ محتاط قدموں سے لکڑی کی سیڑھیاں اترنے لگا۔
جب اس نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھا تو وہ چرچرا اٹھی۔
تب روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔
اب نیچے مکمل اندھیرا چھا گیا۔ لیکن کوئی آواز نہیں ابھری۔
فلیمنگ وہیں رک گیا جہاں کھڑا تھا۔ اس نے قدموں کی چاپ یا کوئی آواز سننے کے لیے کان لگا دیے۔ وہ بالکل تیار کھڑا تھا۔
لیکن کوئی آواز نہ سنائی دی، نہ کوئی حرکت ہوئی۔
اس نے اپنا جسم ٹیڑھا کرتے ہوئے ایک انچ حرکت کی تو سیڑھی دوبارہ چرچرا گئی۔
عین اسی لمحے تاریکی کی خاموشی ٹوٹ گئی اور ایک فائر کی آواز گونجی۔
فلیمنگ کے کانوں میں گولی کے زناٹے کی آواز سنائی دی جو اس کے سر سے بہ مشکل ایک فٹ کے فاصلے سے ہوتی ہوئی پیچھے دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ وہ بال بال بچا تھا لیکن ساتھ ہی اسے وہ سمت بھی پتا چل گئی تھی جدھر سے فائر کیا گیا تھا۔ اسے اپنے ٹارگٹ کا علم ہو گیا تھا۔
اس نے اپنے ریوالور کا ٹریگر دوبارہ دبایا، لیکن اس کا نشانہ غلط ہو گیا۔ جواباً اندھیرے میں ایک شعلہ سا لپکا اور اس مرتبہ بھی گولی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ اس مرتبہ بھی وہ بال بال بچا تھا۔
اس نے فوراً نیچے اندھیرے میں چھلانگ لگا دی، ساتھ ہی ٹریگر بھی دباتا چلا گیا۔ اس بار اس نے اس مقام سے قدرے بائیں جانب نشانہ لیا تھا جہاں آخری بار شعلہ چمکا تھا۔
ایک تیز چیخ سنائی دی اور پھر کسی کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔
اس بار اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ وہ زینے کے پاس نیچے روشنی کا سوئچ ٹٹولنے لگا۔ سوئچ پر ہاتھ پڑتے ہی اس نے بٹن دبا دیا۔
کمرا روشنی میں نہا گیا۔
سامنے بائیں جانب ایک کریٹ کے پاس ایک شخص اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔
فلیمنگ محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھا، پھر اس نے اس شخص کو پلٹ دیا۔
وہ ہربرٹ مارٹن تھا!
اس کے بالوں سے خون قطرہ قطرہ رس رہا تھا۔ گولی اس کے سر میں کہیں لگی تھی اور یہ خون اس گولی کے زخم سے بہہ رہا تھا۔
فلیمنگ نے کریٹ پر نگاہ ڈالی۔ یہ گلابوں کا وہی کریٹ تھا جس سے الجھ کر وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ البتہ اس مرتبہ موی

کاغذ میں لپٹے ہوئے گلاب کے بنڈل فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ فلیمنگ نے جھک کر ایک بنڈل اٹھالیا۔

گلاب کی تمام کلیاں کھلی ہوئی تھیں... لیکن قدرتی طور پر نہیں، انہیں زبردستی کھولا گیا تھا۔ اندر سے ان کلیوں کا درمیانی حصہ غائب تھا اور تب فلیمنگ کی نگاہ ہر کلی کے اندر رکھے ہوئے چھوٹے کیپسولوں پر پڑی جن میں سفید پوڈر بھرا ہوا تھا۔

فلیمنگ کے منہ سے بے ساختہ سیٹی کی آواز نکل گئی۔

"ہیروئن!" وہ بڑبڑایا۔ "تو جواب یہاں موجود ہے! یہ لوگ گلاب میں ہیروئن بھرے کیپسول چھپا کر منشیات اسمگل کرتے ہیں۔"

لیکن اس معاملے کو بعد میں دیکھنا ہوگا۔ ابھی اسے ایک اور اہم معاملے کو سلجھانا تھا جس کی اسے زیادہ فکر لاحق تھی۔ پیٹریشیا اب بھی غائب تھی۔

وہ پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ وہ پیٹریشیا کا نام پکار رہا تھا۔ اس نے اوپر دکان اور تھامس ڈیوس کا دفتر چھان مارا۔ اس کا خیال تھا کہ پیٹریشیا اگر یہاں موجود ہوئی تو اسے اپنی تمام باتوں کا جواب پیٹریشیا سے مل جائے گا... بشرطیکہ وہ جواب دینے کے قابل ہوئی تو...

لیکن پیٹریشیا کا کہیں کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ وہ پُراسرار طور پر غائب ہوگئی تھی۔

وہ واپس نیچے جانے کے لیے جونہی بیسمنٹ کی سیڑھیوں کی جانب پلٹا تو کاؤنٹر کے پاس اس کا پیر کسی چیز میں الجھ گیا۔ وہ جھک کر اسے ٹٹولنے لگا۔ وہ دھاگے نما کوئی شے تھی۔ اس نے غور سے دیکھا تو وہ پیکنگ ربن کا فیتہ تھا جو اس بڑی سی چرخی سے نکلا ہوا تھا جو کاؤنٹر پر رکھی ہوئی تھی۔

اس فیتے کا دوسرا سرا کہاں ہے، وہ سوچنے لگا؟

اس نے فیتے کو جھٹکا دیا۔ لیکن ربن ڈھیلا نہیں ہوا۔

اس نے فلوریسنٹ لائٹس کا سوئچ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں اسے سوئچ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر اس کی تیلی جلالی۔

دیا سلائی کی روشنی میں اس نے ربن کے دوسرے سرے کو دیکھنا چاہا۔ ربن اسٹور کے ایک حصے تک چلا گیا تھا۔ فلیمنگ ربن کو ہاتھ میں سمیٹ کر آگے بڑھتا رہا۔ ربن ایک چھوٹے سے تنگ دروازے کی جھری میں گیا ہوا تھا۔

تب وہ سمجھ گیا کہ پیٹریشیا کہاں ہے۔ وہ اس دروازے کے اندر تھی۔ اور وہ دروازہ ایک ریفریجریٹر کا تھا۔

فلیمنگ نے ایک جھٹکے سے ریفریجریٹر کا دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی یخ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ اس نے ٹٹولتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کا ہاتھ کسی گلدان سے ٹکرا گیا اور گلدان فرش پر الٹ کر ٹوٹ گیا۔ پھر اس کے ہاتھ نے ایک شانے، پھر چہرے اور پھر نرم بالوں کو چھوا تو اس کا سانس رک سا گیا۔ وہ پیٹریشیا تھی...

کیا پیٹریشیا ابھی زندہ ہے؟ یہ سوال تیزی سے اس کے ذہن میں کلبلانے لگا۔

وہ پیٹریشیا پر جھک گیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوتے ہی پیٹریشیا کے جسم نے ہلکی سی کپکپی لی اور اس کے منہ سے ایک کراہ سی بلند ہوا۔

پیٹریشیا زندہ تھی اور چرخی کے ربن کا دوسرا سرا اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں لپٹا ہوا تھا۔

فلیمنگ نے آہستگی کے ساتھ پیٹریشیا کو اپنی گود میں اٹھالیا اور بے ربط انداز میں اس کے نام کی سرگوشیاں کرتے ہوئے اسے اسٹور میں لے آیا۔ اس نے پیٹریشیا کو دکان کے فرش پر لٹا دیا اور جنونی انداز میں فلوریسنٹ لائٹ کا سوئچ تلاش کرنے لگا۔

اس مرتبہ وہ سوئچ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بٹن دباتے ہی کمرا تیز دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ فلیمنگ بے تابی سے روشنی میں پیٹریشیا کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ پیٹریشیا کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہوگئی تھی۔

اتنے میں پیٹریشیا نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ فلیمنگ نے اسے سہارا دیا تو وہ سسکیاں لیتی ہوئی فلیمنگ سے چمٹ گئی۔

"اِٹ از آل رائٹ، ڈارلنگ!" فلیمنگ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"وہ گلاب..." پیٹریشیا نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ اب معاملہ نمٹ چکا ہے۔ ہرب مارٹن نیچے بیسمنٹ میں ہے اور بے ہوش پڑا ہے۔"

"تو پھر وہ..."

"ہش، ڈارلنگ۔" فلیمنگ نے اسے اٹھ کر کھڑے ہونے میں مدد دیتے ہوئے کہا۔ "تم تو اب ٹھیک ہو نا؟"

پیٹریشیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ قدرے جھوم رہی تھی۔

فلیمنگ پلٹ کر دیوار گیر فون کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا اور اپنے چیف سے مختصر سی بات کی۔ پھر فون کرنے کے بعد اس نے ایک دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب سے فون اٹھانے پر وہ بولا۔ ''تھامس یہاں اسٹور میں آجاؤ۔ میں نے تمہارے قاتل کو تلاش کر لیا ہے۔''

جب فلاور اسٹور کا مالک تھامس ڈیوس عجلت میں وہاں پہنچا تو پولیس پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ تھامس کے چوڑے چہرے پر تناؤ کی کیفیت طاری تھی اور لباس سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ سوتے سے اٹھ کر سیدھا یہاں آ گیا ہو۔

وہ سیدھا فلیمنگ کے پاس چلا گیا جو اپنے چیف کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔

''قاتل کون ہے؟'' اس نے فلیمنگ سے پوچھا۔ ''کیا وہ جیف انگر ہے؟''

فلیمنگ نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تھامس کیا تمہیں علم تھا کہ ہرب مارٹن منشیات کی اسمگلنگ کا کاروبار کر رہا ہے؟''

یہ سن کر تھامس ڈیوس کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ ''نہیں...'' وہ بمشکل تمام کہہ پایا۔ پھر اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے یہاں... میرے اسٹور میں؟''

سراغ رساں فلیمنگ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ہاں، جبھی تو وہ اپنے علاوہ کسی کو بھی گلابوں کے چند کرٹس کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا...''

''اور فریڈ جینسن نے لازمی یہ بات دریافت کر لی ہو گی۔'' تھامس ڈیوس نے فلیمنگ کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''اور اسی بنا پر اس نے فریڈ جینسن کو قتل کر دیا۔''

سراغ رساں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''شاید فریڈ جینسن کے مرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ واحد وجہ نہیں ہے۔ ہرب مارٹن کو جب وہ لوگ اسپتال لے جا رہے تھے تو اس سے پہلے اس نے مجھے ایک اور بات بتا دی تھی۔ وہ یہ کہ فریڈ جینسن نے تازہ پھولوں کو محفوظ رکھنے کا ایک فارمولا دریافت کر لیا تھا۔ اس دریافت میں لاکھوں کی آمدنی متوقع تھی...''

''ہاں، فریڈ جینسن اپنے اس فارمولے کو پیٹنٹ کرانا چاہتا تھا جو کہ اس کا حق تھا۔ اس بنا پر اور اس وجہ سے کہ اسے شبہ ہو گیا... اس بے چارے کو مر جانا پڑا۔''

تھامس ڈیوس نے ٹپٹائے انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''یہ تصور کہ ہرب مارٹن نے فریڈ جینسن کو قتل کیا

ہے...“

فلیمنگ کے ہونٹوں پر ہلکی سی درشت مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”لیکن قتل اس نے نہیں کیا...“

”تم نے تو کہا تھا... تو پھر کس نے کیا ہے؟“ تھامس ڈیوس پھٹ پڑا۔

سراغ رساں فلیمنگ کی آواز بے حد پرسکون تھی۔ وہ بولا۔ ”قتل تم نے کیا ہے، تھامس!“

”تم پاگل ہو۔“ تھامس ڈیوس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”پاگل تم ہو، تھامس۔“ سراغ رساں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہربرٹ مارٹن کو بھی میری طرح اس بات کا علم نہیں تھا کہ حقیقت میں فریڈ جینسن کو قتل کس نے کیا ہے... حتیٰ کہ میں نے کڑیاں جوڑنا شروع کیں تو حقیقت آشکار ہونا شروع ہوئی۔ تمہارے اسٹور کے پھول کہیں اور کے علاوہ دیر پا تازگی کے حامل ہوتے تھے۔ پھر یہ حقیقت کہ فریڈ جینسن کے کمرے کی جس طرح تلاشی لی گئی۔ فریڈ جینسن کی انگلیوں میں دبا ہوا حرف... U میں بالآخر اس بات کی تہ تک پہنچ گیا کہ وہ بے چارہ لڑکا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا... کچھ بتانا چاہ رہا تھا... اور لفظ ”فارمولا“ وہ واحد لفظ تھا جس میں حرف U شامل ہے اور وہ اس کیس کی تصویر میں بالکل فٹ بیٹھ رہا تھا۔

”تم یہ دریافت اپنے نام کرنا چاہتے تھے۔ ہے نا تھامس؟ تم پھولوں کی مارکیٹ پر قبضہ جمانے کا ارادہ رکھتے تھے...“

”یہ... یہ جھوٹ ہے۔“ تھامس ڈیوس نے چیختے ہوئے بات کاٹی۔

فلیمنگ نے اس کی اَن سنی کرتے ہوئے تند خو لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔ ”تمہیں ہربرٹ مارٹن پر بھی اعتماد نہیں تھا، لہٰذا یہ کام تم نے خود کر دیا... اور اس کا الزام جیف انگر کے سر تھوپنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکام ہونے پر تم چاہتے تھے کہ جو قتل تم نے کیا ہے اس کے الزام میں ہربرٹ مارٹن کو پھندا لگ جائے۔ اسے منشیات کی اسمگلنگ کے جرم میں ٹھیک ٹھاک سزا ہو جائے گی لیکن تم! تمہیں بجلی کی کرسی کے ذریعے موت کی سزا ہوگی۔“

فلیمنگ کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی تھامس ڈیوس اپنے چھوٹے بازوؤں کو ہوا میں لہراتا ہوا اس پر جھپٹ پڑا۔

اس کی یہ حرکت اسے مہنگی پڑ گئی۔ اس لیے کہ فلیمنگ پہلے سے تیار تھا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ اپنا زوردار گھونسا تھامس ڈیوس کے جبڑے پر جڑ دیا۔

تھامس ڈیوس کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے فوراً ہی باوردی پولیس والوں نے اپنے نرغے میں لے لیا۔

فلیمنگ اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے ادھر بڑھ گیا جدھر پیٹریشیا بھی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق تھا اور وہ اپنی گردن تھامے ہوئے تھی۔

فلیمنگ نے اس کے پاس پہنچ کر اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کرتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے فلیمنگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں اس بات کا یقین کیونکر تھا کہ قاتل یہی ہے، فلیمنگ؟“ اس کا لہجہ سرگوشی کے مانند تھا۔

فلیمنگ ہنس دیا اور پیٹریشیا کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولا۔ ”ایک چھوٹی سی بات تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

”وہ کیا؟“

”وہ پنسلیں جو مجھے فریڈ جینسن کے کمرے میں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ ان تمام پنسلوں کے ربر والے کنارے بری طرح سے چبائے ہوئے تھے اور پھر میں نے تھامس ڈیوس کو ایک ایسی ہی پنسل سے کھیلتے ہوئے دیکھا جو اسی طرح چبائی ہوئی تھی۔ میں جان گیا کہ یہ پنسل خود اس کی نہیں ہے اور یہ کہ وہ اس نے کسی جگہ سے اٹھائی ہے... یہ ایک اتفاق ہو سکتا ہے... لیکن اس بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔“

”لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ پنسل تھامس ڈیوس کی نہیں تھی؟“ پیٹریشیا نے جاننا چاہا۔

فلیمنگ نے دل کی گہرائی سے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”جس شخص کے دانت مصنوعی ہوں وہ اس بری طریقے سے پنسلیں نہیں چبا سکتا۔ ہے نا؟“

پھر وہ ایک طویل لمحے تک پیٹریشیا کو دیکھتا رہا۔

پیٹریشیا شپٹا سی گئی۔

تب وہ اچانک گویا ہوا۔ ”ایک عروسی گلدستہ بنانے میں تمہیں کتنی مہارت حاصل ہے؟“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں محسوس کر رہا ہوں ہمیں جلد ہی اس کی ضرورت پڑنے والی ہے۔“

رقابت کا گھاؤ

سلیم انور

دو افراد کے درمیان شناسائی سے آگے بڑھ کے کب دوستی میں بدل جاتی ہے... کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بندھن کو قائم رکھنے میں یکساں شوق کا دخل ہوتا ہے... یا پھر متضاد رجحان طبع کا... جو بھی ہو... ان خواتین میں بے حد دوستی اور لگاوٹ و دلچسپی تھی... مگر اچانک ہی محبت کے تیسرے زاویے کی مداخلت نے ان دونوں کی دوستی کو سراسر جان لیوا دشمنی میں بدل ڈالا...

باطن کی خوب صورتی نہ رکھنے والے بدطینت و بدمزاجوں کا جارحانہ قدم...

میرا نام کیتھرائن ہے۔ مجھے میرے حقوق سے آگاہ کر دیا گیا اور میں نے وکیل کی خدمات لینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں بس یہی چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹ جائے۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا، وہ غلط ہے، اوکے!

اور مجھے واقعی بہت برا محسوس ہو رہا ہے۔

سراغ رساں لنکن نے مجھ سے کہا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ سب کچھ میں تحریر میں لے آؤں تو تب میں شاور بھی

لے سکتی ہوں اور سو بھی سکتی ہوں۔ سو جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا اور یہ کہ میں نے اپنی بہترین سہیلی کو کس طرح قتل کیا!

یہ سب کچھ میرے لیے حقیقت میں پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ابتدا کہاں سے کروں۔ میں کبھی بھی تشدد پسند نہیں رہی ہوں۔ ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ میں نے اپنی گریجویشن کلاس میں انتہائی سائیکو کا ووٹ حاصل کیا ہو یا مجھے نفسیاتی قرار دیا گیا ہو۔

امید ہے کہ آپ لوگ یہاں کوئی زبردست قصے کی توقع نہیں کررہے ہوں گے۔ میں چاہے کتنے ہی بہترین حالات میں کیوں نہ ہوں کبھی ولیم شیکسپیئر نہیں ہوسکتی۔ میں حقیقت میں تھک بھی چکی ہوں لیکن تم لوگ پوری داستان جاننا چاہتے ہو۔

"تمام کی تمام خونیں تفصیلات!" تم نے یہی کہا ہے نا، سراغ رساں لنکن؟ میں جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کروں گی۔ گو اس میں اب بھی چند باتیں مبہم ہیں اور ہاں، میں کافی جھلکنے پر معافی چاہتی ہوں۔

چونکہ ہر چیز آفس کے سیکیورٹی کیمرے میں محفوظ ہے اس لیے میں نے آج جو کچھ کیا، اس کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف نہ کرنا سراسر حماقت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ صرف یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے ایسا کیسے اور کیوں کیا؟

کیسے کیا... یہ سب کچھ کیمرے نے محفوظ کرلیا ہے اور آپ ٹیپ چلا کر یہ دیکھ سکتے ہیں اور جہاں تک کیوں کا سوال ہے تو... مجھے امید ہے کہ آپ کے پاس اتنا وقت ہوگا وجہ جاننے کے لیے۔ مجھے یہ سب کچھ تحریر کی صورت میں بیان کرنے کی مہلت دے دیں۔

اس کا آغاز کچھ عرصہ قبل ہوا تھا۔

میں اور تھریسا سہیلیاں تھیں... حقیقت میں بہترین سہیلیاں۔ اکثر جمعے کے روز ہم باہر جایا کرتے تھے اور تقریباً روزانہ لنچ بھی اکٹھے کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم دونوں ایک ہی ہیئر ڈریسر کے پاس جاتے تھے۔

ہمارے جنم دنوں میں صرف پانچ دن اور تین گھنٹے کا فرق تھا۔ ہم دونوں کا اسٹار میزان تھا۔ ہم فیصلے کرنے میں اچھے نہیں تھے البتہ تعلقات بنانے کے بھوکے تھے... اپنے برج کے مطابق۔ لیکن ہم دونوں ہی کیوٹ کہلاتے تھے۔

ہم دونوں ہی ڈیٹ پر بھی جایا کرتے تھے لیکن اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ ہم چاہتے تھے۔ جیسا کہ میری ممی کہتی تھیں تم دونوں کی عمر زیادہ ہورہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں بھی یہی سوچتے تھے کہ ہمیں اب تک شادی کرلینی چاہیے تھی۔ لیکن اس معاملے میں ابھی ہماری قسمت نہیں جاگی

تھی۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اگلے ماہ ہم دونوں چالیس برس کی ہونے والی تھیں۔ ہم دونوں عمر رسیدہ کنواریوں کا جوڑا کہلاتے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی نظر میں یہ ایسی کوئی بڑی بات نہ ہو لیکن تھریسا اور میں، دونوں ہی پریشان خیالی کا شکار تھے۔

چالیس برس کی عمر اور ہماری شادی نہیں ہوئی۔ کسی نے شادی کا وعدہ نہیں کیا۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر رواں تھی۔ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا تھا اور کسی کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں گئی تھی۔ تھریسا کا اکاؤنٹنگ ڈپارٹمنٹ کے ایک کمینے سے چکر چل رہا تھا جو اس بات پر ختم ہوگیا کہ اس نے تھریسا کو ایک خشک بوڑھی طوائف کہہ دیا تھا۔ یہ بات تھریسا کے دل کو لگی تھی اور اسے حقیقت میں تکلیف پہنچی تھی۔

سو ہم دونوں ہی بامراد ہونے کے متمنی تھے۔ ہمیں سچے پیار کی تلاش تھی... کسی عمدہ سے بندے کی کہ جو خوش قسمتی سے اپنے والدین کے ساتھ نہ رہتا ہو اور اس کے پاس اپنی ذاتی کار ہو۔

پھر جب رابرٹ اونیل نے کاپی روم میں کام کرنا شروع کیا تو ہم دونوں سہیلیاں خاصی فعال ہوگئیں۔ تھریسا اور میں دونوں ہی اسے پسند کرنے لگے۔ وہ کیوٹ تو نہیں تھا لیکن دلچسپ اور اچھا نوجوان تھا۔ البتہ اس کی ہنسی بڑی عجیب سی تھی جو کچھ دیر گزرنے کے بعد آپ کے مزاج پر گراں گزرتی تھی۔

بہرحال رابرٹ اونیل پرفیکٹ نہیں تھا لیکن وہ ایک مرد تھا اور ہماری دسترس میں تھا۔ ہم دونوں ہی اسے پسند کرنے لگے اور ایک طریقے سے وہ بھی ہم دونوں کو چاہنے لگا۔ ابتدا میں تو تھریسا اور میں ایک طریقے سے اس معاملے پر آپس میں چھیڑخانی کیا کرتے تھے۔ پھر معاملات بگڑنے لگے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک عرصے تک ہم دونوں سہیلیاں تھیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور پھر اچانک ہمارے درمیان ایک شخص آگیا۔ ایک ٹکراؤ سا ہوا اور پھر ہم سہیلیاں نہیں رہیں۔

اس کا کہنا کچھ یوں تھا۔ "اسے پہلے میں نے دیکھا تھا۔"

سو میرا جواب تھا۔ "اس سے پہلے بات میں نے کی تھی۔"

ہم دونوں کا غصہ بتدریج نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ سو میں نے سوچا۔ "او کے، فائن۔ اب میں کچھ دنوں تک اس سے بات نہیں کروں گی۔"

سو میں نے اسے مکمل طور پر نظرانداز کردیا۔ وہ بھی

مجھے مکمل طور پر نظر انداز کرنے لگی۔
اس دوران میں کاپی روم میں جانے کے لیے مسلسل احمقانہ وجوہات تلاش کرنے لگی تا کہ رابرٹ اونیل سے فلرٹ کر سکوں۔ ایک بار جب میں وہاں گئی تو تھریسیا پہلے سے وہاں موجود تھی۔ ہم دونوں... نظروں ہی نظروں سے ایک دوسرے پر تیر چلانے لگے۔ پھر میں نے نوٹ کیا کہ وہ میرے بہترین اسکرٹس میں سے ایک پہنے ہوئے تھی... سلک کا اسکرٹ! اور وہ اس اسکرٹ میں بے حد پیاری لگ رہی تھی اور میں جان گئی کہ اس کے اس پیارے حلیے میں میری ایک بھی نہیں چلے گی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکوں گی۔

سو میں نے اس سے کہا۔ ”واؤ، نائس اسکرٹ! لیکن بری بات یہ کہ یہ اسکرٹ تمہارا نہیں ہے۔“
اس نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے مجھے دھتکار رہی ہو۔
”تمہارا اِسے جلد ہی مجھے لوٹانے کا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے منہ بگاڑتے ہوئے پوچھا۔
اس نے اپنے دیدے گھمائے اور ایک چٹخارا لے کر رہ گئی۔ وہ اپنی نظروں سے بدستور مجھے نظر انداز کرتی رہی۔
یکدم مجھے غصہ آ گیا۔
”تم اس وقت مجھے یہ اسکرٹ لوٹا دینا جب تم اپنے چہرے کے ناپسندیدہ بالوں کی صفائی کرنے والی ویٹ کا کریم اٹھانے کے لیے آؤ گی اور بہتر یہی ہوگا کہ جلدی آ جانا۔ اس لیے کہ لگ رہا ہے تمہارے ہونٹوں کے اوپر کا رُواں خاصا بڑھ چکا ہے اور ایسا دکھائی دے رہا ہے جیسے تمہاری مونچھیں اُگ آئی ہیں۔“

یہ سن کر تھریسیا کا منہ ایک فٹ کے قریب لٹک گیا اور اس کے مسوڑھے بری طرح نمایاں ہو گئے۔ مجھ پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ یہ صورتِ حال خاصی مضحکہ خیز تھی۔ میں خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔
لیکن پھر تھریسیا کے چہرے پر کمینگی کے تاثرات امڈ آئے۔ وہ پلٹی اور اس نے کریکشن فلوڈ کی بوتل اٹھا کر ”میرے“ اسکرٹ پر تمام کا تمام سیال مادہ انڈیل دیا۔
”اوہ...!“ اس نے بے ساختہ نعرہ بلند کیا جیسے اس سے یہ حرکت اتفاقی طور پر ہو گئی ہو۔
”فکر مت کرو کیتھرائن، یہ سیال مادہ دھونے سے صاف ہو جائے گا۔“ رابرٹ اونیل نے کہا۔ وہ ہماری مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ ہمارے درمیان کوئی بدمزگی نہ ہو جائے۔ وہ اصل صورتِ حال سے واقف نہیں تھا۔ اس

ٹکراؤ

مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر نے اپنی غزل میں فراق گورکھپوری کا ایک شعر ٹانک دیا۔ مشاعرہ ان ہی کی زیرِ صدارت تھا۔ وہ ختم ہوا تو انہوں نے شاعر سے باز پرس کی۔
”خیال سے خیال ٹکرا گیا۔“ نوجوان شاعر نے تجاہلِ عارفانہ سے جواب دیا۔
فراق گورکھپوری تحمل مزاجی کے باوجود غصے سے بولے۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بائیسکل ہوائی جہاز سے ٹکرا جائے؟“

کے اس جملے نے بات مزید بگاڑ دی۔
تھریسیا بناوٹی ہنسی ہنس دی۔ اس نے لپ کرانمٹ سیاہی والا مارکر اٹھایا اور اسکرٹ کے سامنے کے... پورے حصے پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیں۔
”ارے، یہ تو کبھی صاف بھی نہیں ہوگا۔“ رابرٹ اونیل نے چیخ کر کہا۔
تھریسیا ایک شان بے نیازی کے ساتھ تیزی سے کمرے سے یوں نکل گئی جیسے کہ وہ کوئن ہو۔
میں تقریباً رو پڑی۔ مجھے اپنا وہ اسکرٹ بے حد پسند تھا۔
میں اس کے بیچ پر جانے کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے اس کی میز پر سجی ہوئی اس کی تمام تصویروں پر مارکر سے بڑی بڑی مونچھیں بنا ڈالیں۔ حتیٰ کہ اس کی ممی کی تصویر پر بھی مونچھیں بنا دیں۔ یہ مونچھیں اسے اپنی ماں ہی سے ورثے میں ملی ہوں گی۔ ہے نا؟
تھریسیا نے جوابی کارروائی کرنے میں دیر نہیں کی۔
اس نے میرے ہیئر اسپرے کے نوزل پر سپر گلو اس طرح لگایا کہ جب میں اسے استعمال کروں تو اس کا اسپرے رکنے نہ پائے۔ جب میں لیڈیز روم سے باہر آئی تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں وارنش میں ڈبکی لگا کر آئی ہوں۔ عین اسی وقت ہماری میٹنگ کا ٹائم بھی ہو گیا تھا اور میں اس کا بدلہ لینا چاہتی تھی اور وہ بھی فوراً۔
واؤ، یہ موقع بہت اچھا تھا۔
پورا ڈپارٹمنٹ بورڈ روم میں اکٹھا ہونے جا رہا تھا۔ ہم سب اس قسم کی میٹنگ میں اپنے اپنے مگوں میں اتنی کافی بھر کر وہاں چلے جاتے تھے جتنی کافی کی مقدار ہمارے مگوں

میں سما سکتی تھی۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ تھریسیا وہ کافی پسند کرتی تھی جس کے مگ میں ایک انچ پوڈر کریمر کی تہ جمی ہوئی ہو۔ ہمیں اس سے بڑی گھن آتی تھی۔

بہرحال ہم سب میز کے اطراف میں سمٹ سمٹ کر بیٹھے ہوئے کانفرنس فون پر ہونے والی شیخیاں سن رہے تھے۔ ماحول تقریباً خواب آور سا تھا۔

تھریسیا نے حسبِ عادت اپنے مگ میں سے کافی کا ایک بہت بڑا گھونٹ بھر لیا۔ اسے یہ علم ہی نہیں تھا کہ اس کے مگ کی تہ میں پوڈر کریمر نہیں بلکہ حقیقت میں ایک انچ بیکنگ پوڈر بھرا ہوا تھا۔ یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ اس کا منہ بری طرح بگڑ گیا اور گال پھول گئے پھر دوسرے لمحے اس نے تمام کافی پوری میز پر اگل دی۔

اور ہمارا باس مائنگ! اس کی حالت قابلِ دید تھی... اس لیے کہ اس نے وہ ٹائی پہنی ہوئی تھی جو اس کی بیوی نے حال ہی میں اسے تحفے میں دی تھی۔ ٹائی کا ستیاناس ہو چکا تھا۔

میں اس بری طرح ہنس رہی تھی کہ میرا اہتمام مسکارا میرے چہرے پر پھیل چکا تھا... اوہ!

بہرحال اگر اسے پہلے معلوم نہیں ہوا تھا تو اب پتا چل گیا تھا کہ یہ حرکت کس کی تھی۔ اُدھر مائنگ نے اسے خوب ڈانٹ پلائی اور سب کے سامنے اسے بری طرح پھٹکار دیا۔ اس کی کیفیت دیدنی تھی اور مجھے بے حد مزہ آ رہا تھا۔

وہ اتنی اپ سیٹ ہو چکی تھی کہ وہ جلدی چھٹی لے کر گھر چلی گئی حالانکہ وہ ایسا کبھی نہیں کرتی تھی۔

یہ تو ابھی ابتدا تھی۔

اس روز شام کو میں نے اس گھناؤنے رابرٹ اوسنل کو یونائیٹڈ اسٹیٹس پوسٹل کے ایک سروس بندے کے ساتھ فلرٹ کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہمارا اس پر ڈورے ڈالنا بے سود ہے۔ لیکن اب بات اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو معاف بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اگلے روز صبح تھریسیا لیس ہو کر دفتر پہنچی۔ اس نے اپنا پاور سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہی جس میں شولڈر پیڈ لگے ہوتے ہیں اور کمر میں زنجیروں والا بیلٹ ہوتا ہے۔ اس نے اپنے بال کھینچ کر پیچھے باندھے ہوئے تھے اور پنجے نما سرخ ناخن نکیلے نظر آ رہے تھے۔

اگر مجھ میں ذرا بھی سمجھ ہوتی تو مجھے عین اسی لمحے پیک اپ کر کے گھر روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں ٹھہری رہی۔

ہم دونوں غصے سے تیوریاں چڑھائے دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ لیکن اس وقت تک کچھ نہیں ہوا تھا۔

پھر وہ اٹھی اور میرے پاس سے گزرنے لگی۔ اس دوران اس نے "اتفاقیہ" میری پانی کی بوتل میرے کی بورڈ پر گرادی۔ میرا کی بورڈ اسی وقت بھسم ہو گیا۔ ٹیکنیکل سروسز کی جانب سے میرے لیے نیا کی بورڈ آنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ اس روز کی میری تمام ڈیڈ لائنز کا ستیاناس ہو گیا۔

مجھے اپنے چہرے پر تمتماہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میرا پورا بدن تپ رہا تھا اور مجھے پسینا آنا شروع ہو گیا۔ گزشتہ کئی دنوں سے میری کچھ ایسی ہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے شکست فاش ہو گئی تھی۔ میرا خون میری رگوں میں تیزی سے دوڑ رہا تھا اور میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں وہاں جا کر تھریسیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اگر میرے پاس کوئی ریوالور ہوتا تو میں اس کی پیشانی پر اس کی آنکھوں کے درمیان سیسہ اتار دیتی۔

میں نے اس پر کوئی شے پھینک کر مارنے کے ارادے سے اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا تو عین اسی وقت ٹیکنیکل شعبے کا ایک بندہ آ گیا اور مجھ پر چیخنے لگا کہ میں اپنی چیزوں کا بہتر طور پر خیال رکھا کروں۔ میں بھی جواباً اس پر چلانے لگی کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ کیا وہ میرا باپ لگتا ہے؟

بہرحال جب میرا کمپیوٹر ٹھیک ہو گیا تو میں نے اپنے آس پاس پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ تھریسیا کسٹمرز کی فائلوں کے پاس کھڑی ان کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ ایک خوش گوار دھن کی سیٹی بجا رہی تھی۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی اور مسرت اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

یہ دیکھ کر میں ایک بار پھر برافروختہ ہو گئی۔ میں بھاری قدم مارتی اس کے پاس پہنچی اور اس کے ہاتھ سے وہ کاغذات جھپٹ لیے۔ وہ بے ساختہ کراہ اٹھی جیسے کہ لڑکیاں عام طور پر احمقانہ انداز اختیار کرتی ہیں۔ "اوہ!"

جب میں نے اس کے ہاتھ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ اس کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی درمیانی جھلی پر ایک زبردست پیپر کٹ لگ چکا تھا۔ وہ پہلے اپنے ہاتھ کے زخم کو دیکھتی رہی پھر نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شدید نفرت جھلک رہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ اس کی اس کیفیت پر میرے ذہن میں بے ساختہ یہی خیال آیا تھا۔ "اب تم صحیح طور پر مشکل میں مبتلا ہو لڑکی۔" یہ خیال میرے لیے خاصا تمکنت کا باعث رہا تھا۔

تب تھریسیا نے ایک لیٹر ہیڈ کا کاغذ اٹھایا اور اس کا کنارہ میرے بائیں ہاتھ کی پشت پر اس طرح کھینچ دیا جیسے چاقو کی دھار چلائی جاتی ہے۔ میں احمقوں کے مانند کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس حد تک کینہ پرور ہوسکتی ہے۔

پھر اس نے اگلا قدم اٹھاتے ہوئے میری چھنگلی اور اس کے برابر کی انگلی کی کھال درمیان سے چیر دی۔ میں نے بھی لپک کر چند لیٹر ہیڈ کے چند صفحات اٹھالیے۔ اب ہم لیٹر ہیڈز اور اپنے رویّوں سے لیس ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

میں اس پر پہلے حملہ آور ہوئی۔ میں نے تیزی سے لپک کر لیٹر ہیڈ کا کنارہ اس کے چہرے پر رگڑ دیا۔ اس کی آنکھ کے نیچے کی ہڈی پر زبردست خراش آگئی۔

وہ آگ بگولا ہوگئی۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور پاگلوں کے مانند اس کے منہ سے اکھڑی اکھڑی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں حیران تھی کہ کارٹونوں کے مانند اس کے کانوں سے بھاپ کیوں نہیں نکل رہی تھی۔ لیکن اس کا اگلا ہتھیار خاصا ہیبت ناک تھا۔

اس نے قینچی اٹھالی تھی۔

میں اسی لمحے پیچھے ہٹ گئی۔ یہ شے حقیقت میں میرے بالوں کا ستیاناس کرسکتی تھی۔ میں نے حال ہی میں اپنے بال سنوارنے کے لیے خاصی رقم خرچ کی تھی اور مجھے اپنی زلفوں کی یہ تراش بے حد پسند آئی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ آپے سے باہر وہ لڑکی ان کی درگت بنا دے۔ مجھے احساس تھا کہ اسے اپنے سے دور رکھنے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی چیز تلاش کرنی ہوگی۔

اس پر سے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں ہٹائے بغیر جو واحد شے میرے ہاتھ میں آئی وہ میرے باس کا کافی کا مگ تھا۔ میں نے وہ کولڈ کافی تھریسیا پر اچھال دی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ مجھے اپنے عقب میں اس کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔

اب صرف ایک ہی ایسی جگہ تھی جہاں میں جاسکتی تھی۔

میں سپلائی کے کمرے کی جانب دوڑ رہی تھی۔

میں دوڑتے ہوئے یہی دعا مانگ رہی تھی۔ ”پلیز، خدایا سپلائی روم کے دروازے میں تالا نہ لگا ہوا ہو، پلیز سپلائی روم کا دروازہ کھلا رکھنا۔“

تھریسیا مجھ سے صرف تھوڑی دور پیچھے تھی۔ میں ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگ رہی تھی کہ وہاں کمرے میں پہنچنے کے بعد جو بھی شے میرے ہاتھ میں آئے، وہ کم از کم ربر بینڈز کا بے ڈھنگا ڈبا نہ ہو۔

میری خوش قسمتی تھی کہ سپلائی روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اڑتی ہوئی اس کمرے کے اندر پہنچی اور قریب ترین شیلف پر جو کچھ بھی رکھا ہوا تھا، وہ اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ان ڈرائنگ کمپاس میں سے کوئی ایک تھا۔ اتنے میں ایک شور سا ہوا تو میں تیزی سے گھوم گئی۔

تھریسیا عین دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا مجمع تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ سب اس صورتِ حال سے خوب لطف اندوز ہورہے تھے۔

تھریسیا اندر کمرے میں آگئی اور اس نے دروازہ بند کردیا۔ دروازے کا خودکار تالا بھی بند ہوگیا۔ جب اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا، تب میری نگاہ اس شے پر پڑی جو اس کی انگلیوں میں دکھائی دے رہی تھی۔

وہ دروازے کے تالے کی چابی تھی۔

اس نے چابی اپنے گریبان میں ڈال دی اور مسکرانے لگی۔ اس کی یہ مسکراہٹ اور وہ خود بھی مجھے زہر لگ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمیں وہاں کھڑے اور ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے گھنٹوں گزر چکے ہوں۔ میں اس کی پیشانی پر ابھری ہوئی اس رگ پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو بری طرح پھڑک رہی تھی۔ مجھے اسے دیکھ کر جھرجھری سی محسوس ہونے لگی۔

اس نے یقیناً یہ اندازہ لگالیا تھا کہ میری توجہ بٹی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ وہ مجھ پر لپک پڑی۔ قینچی اس کے ہاتھ میں جگمگا رہی تھی۔ اس نے قینچی سے میرے داہنے شانے پر وار کیا جبکہ میں کمپاس کے نکیلے سرے کو اس کے جسم میں گھونپنے لگی۔

مجھے قینچی اپنے شانے میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔

لیکن خوش قسمتی سے اس کی نوک میرے شولڈر پیڈ میں دھنس کر اٹک گئی۔ جب تھریسیا نے اسے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی تو قینچی میرے لباس میں کھونچ بھرتی ہوئی نکل گئی اور وہ قینچی سمیت پیچھے فرش پر گر پڑی۔

تب میں نے بھی کمپاس پھینک دیا۔ مجھے امید تھی کہ اگر اس نے مجھے پسپائی اختیار کرتے دیکھ لیا تو وہ بھی اس جنگ کو ختم کرنے پر آمادہ ہوجائے گی۔

لیکن اس کے ارادے کچھ اور تھے۔

وہ جس شے کو آسانی سے اپنی گرفت میں لے سکتی تھی، وہ ان بڑے سے ٹونر کارٹریجز میں سے ایک تھا۔ اس نے وہ کارٹرج ہاتھ میں آتے ہی گھما کر میری طرف کھینچ مارا۔ وہ میرے بائیں شانے سے ٹکراتے ہوئے اسٹیل کے طاقوں کے پاس جا گرا۔

میں لڑھک کر دفتر کے کرسمس ٹری کے پاس گر پڑی۔
میں فرش پر پڑی اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ کمرے میں ٹونر کا سیاہ پوڈر ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہر شے پر سیاہی چھا رہی تھی۔ مجھے ہر طرف سیاہ ہی سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے نظریں اٹھا کر تھریسیا کی جانب دیکھا۔
وہ قہقہے لگا رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے سیاہ چہرے پر اس کے سفید دانت موتی کی طرح چمک رہے تھے۔
تب میں نے رونا شروع کر دیا۔
"پلیز، تھریسیا! پلیز۔" میں نے عاجزی سے کہا۔
"پلیز، اب رک جاؤ۔"
"کیوں؟"
وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کولھے پر جمائے تن کر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ مجھ پر جھک گئی۔ "میں اس لیے رک جاؤں کہ میری جھوٹی، میرے مرد کو مجھ سے چرا کر لے جانے والی میری بہترین دوست مجھے رکنے کو کہہ رہی ہے؟"
اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔
پھر وہ میرے اور قریب آ گئی۔ اس کے چہرے پر سے سیاہ پوڈر اس طرح جھڑ رہا تھا جیسے سیاہ برف گر رہی ہو۔ اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔
"تم کتیا! تم عمر میں مجھ سے پانچ دن اور تین گھنٹے بڑی ہو۔ اس لیے تمھیں چاہیے تھا کہ اسے تم مجھے حاصل کرنے دیتیں۔"
"لیکن..."
"لیکن ویکن کچھ نہیں، وہ میرا ہے، مکمل طور پر۔"
تب تھریسیا نے دیکھے بغیر اپنے ساتھ کے شیلف سے وہ شے اٹھالی جو اس کے ہاتھ لگی۔
وہ ایک باکس کٹر تھا۔
میں نے بھی کوئی شے حاصل کرنے کے لیے ہاتھ چلائے۔ میرے ہاتھ میں جو شے آئی وہ ایک پرانا ہیوی ڈیوٹی تھری ہول پنچ تھا۔
تھریسیا باکس کٹر سے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لپکی۔ میں نے جتنی قوت سے ممکن ہو سکتا تھا، تھری ہول پنچ گھما دیا۔
اس کے بعد مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میرا باس مائنک مجھ پر جھکا مجھے گھورے جا رہا تھا۔ ایک موٹا سا سیکیورٹی گارڈ اس کے ہمراہ تھا۔ پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "اوہ مائی گاڈ!"

تھریسیا فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ سیاہ پوڈر میں لت پت اس کے چہرے سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک بڑا سا گوشڑا پڑا ہوا تھا اور درمیان میں ایک گھاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی دلکش نیلی آنکھیں ساکت تھیں۔
وہ مر چکی تھی!
باقی تفصیل آپ کے علم میں ہے۔ سیکیورٹی گارڈ نے ایک ہاتھ سے مجھے جکڑ لیا اور اپنے ریڈیو میں چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ اطراف میں ہر کوئی اپنے اپنے سیل فونز ڈائل کر رہا تھا۔
مائنک وہاں ایک منٹ تک کھڑا رہا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آخر تم دونوں کس چیز کے لیے آپس میں اس بری طرح لڑ رہی تھیں؟"
"ایک آدمی کے لیے۔"
"آدمی؟ کون آدمی؟"
"رابرٹ اونیل۔"
"رابرٹ اونیل؟ لیکن وہ تو...."
"ہاں مجھے پتا چل چکا ہے۔" میں نے اپنے باس کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے کہا اور پھر رونا شروع کر دیا۔
"جہاں تم جا رہی ہو وہاں کوئی آدمی نہیں ہوگا۔"
سیکیورٹی گارڈ مجھے دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ پھر اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میرا بایاں ہاتھ بری طرح درد کر رہا تھا اور میں تکلیف سے روئے جا رہی تھی۔ پھر مجھے بے ساختہ وہ بات یاد آ گئی جو اس نے ابھی کہی تھی۔
"کوئی آدمی نہیں ہوگا سے تمہاری کیا مراد ہے؟"
"تم خواتین کی جیل جا رہی ہو۔ وہاں تم عورتوں کے ساتھ جیل کی کوٹھری میں ہوگی، عورتوں کے ساتھ کھاؤ پیو گی، تمھیں کیا کرنا ہوگا، یہ احکامات بھی عورتیں ہی دیں گی، تمہاری محافظ بھی عورتیں ہوں گی... سب عورتیں ہی عورتیں ہوں گی جہاں تم جا رہی ہو۔"
"کیا یہ سچ ہے؟" میں نے اپنے باس سے پوچھا۔
اس نے شانے اچکا دیے اور کمرے سے نکل گیا۔
سو اب میں یہاں خواتین کی جیل میں پہنچ چکی ہوں۔
اور یہی اس خونی داستان کی تفصیل ہے کہ کس طرح میں نے ایک تھری ہول پنچ سے ایک مرد کی خاطر اپنی بہترین سہیلی کو قتل کر دیا تھا۔ ایک ایسے مرد کی خاطر جو احمقانہ انداز میں ہنستا تھا۔
اور وہ مرد عورتوں کا رسیا نہیں بلکہ ہم جنس پرست تھا...

خون کا بدلہ

سید عنایت ناراض

تلخ و تند عناصر حقیقت کی روشنی میں نظر نہیں آتے... حقیقتِ حال جاننے کے لیے کوئی کوشش کرتا ہے... اور کچھ جو ظاہری پردے سے عیاں ہوتا ہے... اسے حقیقت تسلیم کر لیتے ہیں... تاریکیوں میں الجھے ایک ایسے ہی کیس کی پیچیدگیاں... جو حل ہونے کے بجائے ہر بار ایک نیا موڑ اختیار کر رہا تھا... ایک نئی کہانی کو جنم دے رہا تھا... قانون اور انصاف کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے فیصلہ کن اختتام کا انتخاب کرنے والے سراغ رساں کا آخری قدم...

طبقۂ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والی نئی نسل کی ہوش ربا مستیاں...

اس لڑکی کی لاش دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی حالانکہ میرا پیشہ ہی ایسا ہے کہ دن رات اس طرح کے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ڈیٹرائٹ پولیس میں خدمات انجام دینے کے دوران تقریباً روزانہ ہی ایسی لاشوں سے سامنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب میرا تبادلہ مشی گن ہو گیا تب بھی یہ سلسلہ جاری رہا لیکن اس طرح کی لاش اس حالت میں دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی برف سے ڈھکے ہوئے لان پر چت لیٹی

ہوئی تھی۔ اس کے سنہری بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے اور اس کا سفید ساٹن کا گاؤن برف کے ٹکڑوں کی وجہ سے خراب ہوگیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”برفانی فرشتہ۔“

یہ منظر اتنا مکمل اور واضح تھا جیسے لڑکی نے تصویر بنوانے کے لیے پوز دیا ہو۔ گوکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ شاید آخری لمحات میں اس نے اٹھنے کی کوشش کی ہو لیکن ہڈیوں میں اتری سردی نے اس کی طاقت زائل کردی اور وہ کوما میں چلی گئی۔ اب صرف اس کا روح سے خالی جسم زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا۔ بھلا کون ہوگا جو برفانی فرشتے سے پیار نہ کرے۔

میری پارٹنر زینا ریڈف نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا اور عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میں اس کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ ”اس واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟“

”ڈاک تقسیم کرنے والی عورت نے۔“ زینا نے کہا۔ ”اس نے صبح آٹھ بجے اس گھر میں ایک پارسل ڈالا تو اندر آتے ہوئے اس کی نظر اس لڑکی پر پڑ گئی۔ واپسی میں غور سے دیکھا تو نو گیارہ کو اطلاع دے دی۔ وان ڈوزن نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر لڑکی کی لاش دیکھی۔ اس نے گھر کے بیرونی دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ یہاں رک کر ہمارا انتظار کرے۔ ڈاک تقسیم کرنے والی عورت کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا لہٰذا اسے جانے دیا گیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور نیم دائرے کی شکل میں چکر لگاتے ہوئے اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ علاقہ شوگر ہل کہلاتا تھا اور یہاں شہر کے امراء رہائش پذیر تھے۔ ان مکانوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہیں نمبروں کے بجائے ناموں سے پہچانا جاتا تھا۔ اس مکان کا نام چیلسی ہال تھا۔ یہ ایک قدیم طرز کی انیسویں صدی کی عمارت تھی جس کی تعمیر میں قیمتی پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ تاہم مکان کی حالت بتارہی تھی کہ جدید اور خوب صورت بنانے کے لیے اس کی ہر سال تزئین و آرائش کی جاتی ہے۔ گھوڑوں کا اصطبل اب ایک وسیع گیراج میں تبدیل ہوچکا تھا جس میں کم از کم چھ کاریں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ اسی طرح سرونٹ کوارٹرز کو ہاسٹل کی شکل دے دی گئی تھی جہاں مختلف ملکوں مثلاً سوڈان، سربیا سے آئے ہوئے طالب علم قیام کرتے تھے۔ وہاں تقریباً نصف درجن

کاریں نیم دائرے کی شکل میں کھڑی ہوئی تھیں اور ان پر گزشتہ شب ہونے والی برف باری کی وجہ سے ہلکی ہلکی برف کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ صبح سے اب تک وہاں کوئی آیا اور نہ گیا۔ پوسٹ آفس کے ٹرک، میری جیپ اور وان ڈوزن کی پولیس کار کے علاوہ وہاں کسی دوسری گاڑی کے ٹائروں کے نشانات نظر نہیں آرہے تھے۔

پولیس ڈپارٹمنٹ کی زیرِ تربیت ٹیکنیشن جونی کوہن لاش پر جھکی ہوئی اس کا معائنہ کررہی تھی۔ وہ فارنسک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہی تھی اور اس کا شمار اعلیٰ درجے کے ٹیکنیشنز میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ اسے اردگرد اٹھنے والی آوازوں کا شور بھی سنائی نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے کہ اسے سردی لگ گئی تھی۔ اس کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے کار تک جانے کے لیے مختصر راستے کا انتخاب کیا۔ ممکن ہے کہ وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان ہو اور ایک منٹ ستانے کے لیے بیٹھ گئی ہو۔ گزشتہ رات درجۂ حرارت اٹھارہ درجے سینٹی گریڈ تھا اور اس نے کوٹ یا سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی دوسرا کپڑا بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی موت سردی سے ٹھٹھرنے کے باعث ہوئی ہے۔“

”تم ٹھیک تو ہو؟“ زینا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جونی سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”میں اس لڑکی کو جانتی ہوں۔ ذاتی طور پر تو نہیں لیکن میں نے اسے ویل جونیئر کالج کیمپس کے آس پاس دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے سال میں پڑھ رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔“ میں نے جونی سے کہا۔ ”اسٹیٹ پولیس فارنسک یونٹ کا عملہ چند منٹوں میں یہاں پہنچنے والا ہے۔“

”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میرے انکل نے پہلے ہی متنبہ کردیا ہے کہ مجھے جلد یا بدیر ویل کاؤنٹی میں کام کرنا ہوگا اور میرا واسطہ جان پہچان کے لوگوں سے بھی پڑسکتا ہے۔ اس لیے مجھے اپنا کام جاری رکھنا چاہیے۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ اس کی موت کب واقع ہوئی؟“

”اس کے جسم کا درجۂ حرارت اکیس ڈگری ہے جو کہ باہر کے درجۂ حرارت سے زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ گیارہ بجے کے قریب یہاں آئی جبکہ اس کی موت کا اصل وقت غالباً ڈیڑھ اور تین کے درمیان ہے۔ پوسٹ مارٹم کے

بعد ہی صحیح وقت کا پتا چل سکے گا۔ مجھے شراب کی بُو بھی محسوس نہیں ہو رہی۔ اگر اس نے پی تھی تو زیادہ مقدار میں نہیں۔''

''ویسے بھی قانونی طور پر اسے شراب نوشی کی اجازت نہیں تھی۔'' زینا بولی۔ ''مجھے ڈرائیووے میں اس کا پرس ملا ہے۔ ڈرائیونگ لائسنس کے مطابق اس کا نام جولی نووک ہے۔ عمر سترہ سال اور گھر کا پتا پول ٹاؤن لیکن اس کے شناختی کارڈ پر کالج نہیں بلکہ ویل ہالا ہائی اسکول لکھا ہوا ہے۔''

''ویل جونیئر کالج ذہین طالب علموں کو اعلیٰ کورسز میں بھی داخلہ دیتا ہے۔'' جونی نے کہا۔

''مجھے یقین نہیں کہ یہ لڑکی اتنی ذہین ہوگی۔'' زینا بولی۔

''تمہارے خیال میں اس کا لباس کچھ عجیب سا نہیں ہے۔''

''کیا ہم یہاں اس کے لباس پر بحث کرنے آئے ہیں؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''نہیں۔'' زینا بولی۔ ''لیکن ہم اس نکتے کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے کہ رات بہت سردی تھی اور یہ لڑکی کوٹ کے بغیر ہی باہر چلی آئی۔''

''اندر چل کر معلوم کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں نے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اندر سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی پھر کسی نے چلا کر دروازہ کھولنے کے لیے کہا لیکن اس کے باوجود کوئی نہیں آیا۔ میں نے دروازے کی ناب گھمائی، وہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، مجھے فوری طور پر ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک ہی نظر میں رات بھر کی کہانی میرے سامنے آ گئی۔ فضا میں بیئر، پیزا اور مختلف قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ٹی وی روم کی طرف بڑھنا شروع کیا تو زینا بولی۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''گیم روم... وہ سب وہیں ہوں گے۔''

''وہ کون؟'' زینا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''وہی جو گزشتہ شب اس پارٹی میں شریک تھے۔''

ہال کا خاتمہ ایک بڑے پلے روم پر ہوا۔ اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک قطار میں پن بال مشین، فوس بال اور پول ٹیبل لگی ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک طویل چمڑے کے کور والا کاؤچ تھا اور اس کے سامنے ایک بڑے سائز کا فلیٹ اسکرین ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ وہاں کئی کالج اسٹوڈنٹس کاؤچ پر آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں ٹی وی پر کوئی سوسر گیم دیکھ رہی تھیں۔

''ہیلو۔'' میں نے اپنا بیج لہراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام سارجنٹ لاکروز ہے۔ یہاں کا انچارج کون ہے؟''

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مجھے دیکھنے لگے۔ چند ایک نے نفی میں سر ہلا دیا لیکن کسی نے جواب نہیں دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس سوال کو آسان کر کے پوچھتا ہوں... کیا چیلن گھر پر ہے؟''

''میں سیسی چیلن ہوں۔'' ایک لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کی باہوں میں سمٹتے ہوئے بولی۔ ''میرے والدین ویک اینڈ منانے ٹورنٹو گئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ رات ہم نے ایک چھوٹی سی پارٹی کی تھی۔''

اس کا بوائے فرینڈ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم ویل ہائی اسکول کے لیے ہاکی کھیلا کرتے تھے۔''

''کیا ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہاری فلمیں دیکھی ہیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''لارسن۔ میں ویل وائی کنگ کی ٹیم میں گول کیپر ہوں۔''

''کیا تم گزشتہ شب یہاں موجود تھے؟''

''میں یہیں رہتا ہوں بلکہ ہم سب۔'' اس نے کاؤچ پر پڑے ہوئے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ رات ایک لڑکی تمہاری پارٹی چھوڑ کر چلی گئی تھی... جولی نووک؟ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوا... تم میں سے کوئی اسے جانتا ہے یا وہ کس کے ساتھ آئی تھی؟''

ایک بار پھر وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ایک منٹ، میں بتاتی ہوں۔'' سیسی بولی۔ ''جولی، یہ وہی لڑکی ہے جس نے ایک عام سا لباس پہن رکھا تھا۔''

''تم اسے جانتی ہو؟''

''مجھے معلوم ہے کہ وہ غلط جگہ آ گئی تھی۔'' سیسی بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ''اسے وہ انڈین لڑکا اپنے ساتھ لایا تھا۔ ڈیرک پٹیل... ہاں یہی نام تھا اس کا۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ ہمیں کہاں ملے گا؟'' میں نے مضطرب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ صبح ہوتے ہی چلا گیا تھا۔'' لارسن کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ممکن ہے کہ وہ کسی گیسٹ روم میں سو رہا ہو، چلو میں تمہیں دکھاتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا لیکن اس کے قدم ڈگمگائے اور وہ دوبارہ زمین پر بیٹھ گیا۔

''رہنے دو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے راستہ معلوم ہے۔''

زینا اور میں مہمان خانے کی جانب بڑھے۔ وہاں کل آٹھ کمرے تھے۔ ہم نے باری باری ہر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ تیسری دستک پر کامیابی ہوگئی۔ اس کمرے میں ایک انڈین لڑکا سوٹ ٹائی پہنے ہوئے ڈبل بیڈ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ آہستہ سے اٹھا اور پلکیں جھپکانے لگا۔

''ڈیرک پٹیل؟'' میں نے تصدیق کرنے کی خاطر پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہی ڈیرک پٹیل ہوں۔''

''کیا تم جولی نووک نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو؟'' میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پوچھا۔

''جولی، ہاں کیوں نہیں۔ وہ گزشتہ رات میرے ساتھ ڈیٹ پر تھی۔'' پھر اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ''وہ ٹھیک تو ہے؟''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ ٹھیک نہیں ہوگی؟''

''وہ مجھے چھوڑ کر گھر چلی گئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پارٹی میں شرکت کے لیے اس کا لباس مناسب نہیں ہے۔ میں گاڑی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لہٰذا کار کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ اوہ میرے خدا! کہیں اس نے میری کار تو تباہ نہیں کر دی؟ ڈیڈ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔''

''اس نے تمہاری گاڑی تباہ نہیں کی ڈیرک۔ یہ بتاؤ کہ تم دونوں نے گزشتہ شب تھوڑی بہت شراب بھی پی تھی؟''

''بس برائے نام چکھی تھی۔'' وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''جولی ابھی کم عمر ہے اور قانوناً اسے شراب نوشی کی اجازت نہیں۔''

''اگر تم نے تھوڑی سی پی تھی تو نشے میں کیوں آگئے؟'' زینا نے پوچھا۔

''میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر چند گھونٹ لے لیے تھے۔ میں عادی شراب نوش نہیں ہوں۔''

''جولی کے بارے میں کیا کہو گے؟ کیا اس نے بھی چند گھونٹ لیے تھے؟''

''نہیں، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس نے لیموں ملا پانی پیا تھا جس میں نشہ نہیں ہوتا۔ میں نے اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا۔ اوہ میرے خدا! وہ بہت ناراض ہو رہا ہوگا۔ وہ پہلے ہی مجھ سے بدگمان رہتا ہے۔ کیا وہ یہاں موجود ہے؟''

''نہیں۔ جوتے پہن لو۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''کیا تم مجھے گرفتار کر رہے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس نے بھی دوبارہ نہیں پوچھا بلکہ خاموشی سے جوتے پہننے لگا۔ میں نے زینا سے کہا کہ وہ بقیہ مکان کی بھی تلاشی لے لے اور ڈیرک کو ساتھ لے کر باہر آگیا۔ پولیس کی گاڑیوں نے دائرہ نما ڈرائیو وے کے دونوں سروں کو مکمل طور پر بند کر دیا تھا اور اس طرح مکان کے باہر کھڑی نصف درجن کاروں کے نکلنے کا راستہ مسدود ہوگیا تھا۔

میں ڈیرک کو لے کر قریبی پولیس کار کی جانب بڑھا اور وہاں کھڑے ہوئے وان ڈوزن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ڈیرک پٹیل ہے۔ مرنے والی لڑکی کا دوست۔ اسے اپنی گاڑی میں بٹھاؤ لیکن فی الحال کسی کو بھی اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا۔ اندر کی کیا صورت حال ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔ وہی جو رات گزرنے کے بعد صبح کو ہوتی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکے کو چھوڑنا نہیں۔''

''سن لیا تم نے۔'' ڈوزن نے اسے کار کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا پھر اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر دروازہ بند کر دیا۔ زینا بیرونی دروازے پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا موڈ پہلے سے زیادہ خراب نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولی۔ ''ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔''

''کیا ہوا؟'' میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔

''مجھے لیونگ روم سے اس مشروب کی دو بوتلیں ملی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر تین سرخ رنگ کے کیپسول رکھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میرا معدہ اچھل کر حلق میں آگیا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''روفیز۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دوا جنسی ملاپ کے دوران استعمال کی جاتی ہے اور عام طور پر متاثرہ لڑکی کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ مجھے یہ کیپسول مشروب کی بوتلوں کے پاس سے ہی ملے ہیں۔''

''ہمیں باہر کھڑی ہوئی کاروں پر بھی ایک نظر ڈالنا

چاہیے۔ کہیں وہاں بھی کوئی نہ سو رہا ہو۔"
"تم نے کہا تھا کہ پہلے بھی اس عمارت میں آچکے ہو؟" زینا کے لہجے میں تجسس تھا۔
"ہاں، جب میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا گو کہ مسٹر چیلن ہم سے عمر میں بڑے تھے لیکن انہیں کھیلوں سے بہت دلچسپی تھی اور وہ تقریباً ایک ویک اینڈ پر ہمارے ساتھ اسکول کے کھلاڑیوں کو مدعو کیا کرتے تھے۔ یہاں مفت بیئر ملتی تھی اور اگر کسی کھلاڑی کو مالی پریشانی ہوتی تو وہ اس کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔"
"کبھی اوپر کی منزل پر بھی گئے؟" زینا نے پوچھا۔
"نہیں... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"میرے ساتھ آؤ۔" زینا نے کہا۔ "تمہیں وہ جگہ یقیناً پسند آئے گی۔"
وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ دوسری منزل پر واقع کمرے زیادہ بڑے اور آراستہ تھے۔ کوریڈور کے اختتام پر ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ میں نے اندر داخل ہونے سے پہلے ریوالور پر گرفت مضبوط کرلی لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ بیڈ روم بالکل ایک ہنی مون سوئٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کی چھت اور دیواروں پر آئینے لگے ہوئے تھے اور ہر کونے میں بڑے سائز کے بستر بچھے ہوئے تھے جبکہ کمرے کے وسط میں ایک بڑا گول بیڈ رکھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں بڑی اسکرین کا ٹی وی اور اس کے نیچے ویڈیو ریکارڈر بھی نظر آرہا تھا۔ ایک شیلف میں بہت ساری ڈی وی ڈیز رکھی ہوئی تھیں جن میں نصف کے قریب فحش تھیں جبکہ بقیہ نصف پر لیبل کے بجائے صرف نمبر درج تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر بھی کوئی لیبل نہیں تھا بلکہ اس کی ڈسک پر صرف ہاتھ سے لکھا ہوا نمبر درج تھا۔
"تمہارے خیال میں یہ سب کیا ہے؟" میں نے زینا سے پوچھا۔
"مجھے لگتا ہے کہ اس کمرے میں خفیہ طور پر فلمیں بنائی جاتی ہیں۔" زینا نے چھت میں نصب شیشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان شیشوں کے پیچھے خفیہ کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں میری فلم بھی نہ بن رہی ہو۔"
میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "گزشتہ شب یہ کمرا استعمال نہیں ہوا کیونکہ مجھے یہاں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی۔" یہ کہہ کر میں نے ریکارڈر کا بٹن دبایا اور اس میں سے ڈی وی ڈی نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لی۔
ہم کمرے سے باہر آئے تو راہداری میں ایک پندرہ سالہ لڑکے نے ہمارا راستہ روک لیا اور بولا۔ "تم لوگ یہاں نہیں آسکتے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ دوسری منزل صرف فیملیز کے لیے مخصوص ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ "کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"
"میرا نام جوئے چیلن ہے۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ڈیڈی اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"
"ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں۔" میں نے اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔
میں نے نیچے آکر پولیس کی مدد سے مکان کو سیل کیا اور وہاں موجود تمام لڑکے لڑکیوں کو الگ الگ کمروں میں منتقل کرکے ان کے کوائف نوٹ کرنے لگا۔ ہم نے ان سے کئی سوالات کیے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی۔ ان میں سے کچھ ڈیرک پٹیل کو جانتے تھے لیکن انہیں بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی لڑکی کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کرتے ہوئے ڈیرک پٹیل کو ایک بار پھر کریدنے کا فیصلہ کیا۔ زینا کو میں نے وہیں چھوڑا تاکہ وہ بقیہ لوگوں سے پوچھ گچھ جاری رکھے اور خود باہر آگیا۔
میں نے دیکھا کہ ڈیرک پٹیل ڈرائیوو ے میں کمر کے بل چت لیٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے جگہ جگہ خون بہہ رہا تھا جبکہ وان ڈوزن ایک بھاری بھرکم شخص سے گتھم گتھا ہو رہا تھا جس کی کوشش تھی کہ اپنے آپ کو وان ڈوزن کی گرفت سے آزاد کروا کر ایک بار پھر ڈیرک پر حملہ کردے۔ میں دوڑتا ہوا گیا اور پیچھے سے جاکر اس بھاری بھرکم شخص کی گردن میں اپنا بازو ڈال دیا۔ میں اسے وان ڈوزن سے الگ کرنے میں کامیاب تو ہوگیا لیکن وہ کسی بیل کی طرح طاقت ور تھا۔ وہ مسلسل وحشیانہ انداز میں زمین پر پڑے ہوئے ڈیرک کو ٹھوکریں مارتا رہا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر زوردار ضرب لگائی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور ڈیرک کو کیوں مار رہا ہے لیکن یہ بعد میں بھی معلوم ہوسکتا تھا، پہلے اسے قابو کرنا ضروری تھا۔
میں نے نیچے لیٹ کر اس کے گھٹنوں کے گرد اپنی ٹانگوں سے قینچی لگانے کی کوشش کی لیکن یہ بالکل ریچھ سے کشتی لڑنے کے برابر تھا۔ یہ کوشش بھی کارگر نہ ہوئی اور میں اسے روکنے میں ناکام رہا۔ پھر اچانک ہی گشت پر مامور ٹومی

بارڈن وہاں آگیا۔ اس نے یہ ماجرا دیکھا تو اپنی چھڑی سے اس کی کمر پر زوردار ضرب لگائی جس کے نتیجے میں وہ شخص پیچھے ہٹ گیا۔ ٹومی نے دوبارہ ضرب لگانے کے لیے چھڑی فضا میں لہرائی تو وان ڈوزن نے اسے روک لیا اور بولا۔

''اسے مت مارو۔ یہ لڑکی کا باپ ہے۔''

یہ سنتے ہی بارڈن کا ہاتھ رک گیا تاہم ان دونوں نے اس بھاری بھرکم شخص کا ایک ایک بازو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا تاکہ وہ دوبارہ ڈیرک پر حملہ نہ کرسکے۔

''مسٹر نووک۔'' میں نے اپنا لہجہ معتدل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑائی جھگڑے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اپنے آپ پر قابو رکھو۔''

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں اس کے غم کو سمجھتا تھا اس لیے تسلی کے دو چار لفظ اس کے دکھ کا مداوا نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے اسے ڈوزن کے ہمراہ پولیس سینٹر بھیج دیا۔ ہم نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا لیکن فی الحال وہ کہیں اور نہیں جاسکتا تھا۔ میں ڈیرک پٹیل کو جیپ میں بٹھا کر ایمرجنسی روم لے گیا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ شاید وہ بولنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اس کی ناک پچک گئی تھی اور مجھے لگا جیسے اس کا جبڑا بھی اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ میں نے اسے طبی عملے کے حوالے کیا اور خود انتظارگاہ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں زینا بھی آگئی اور ہم دونوں ٹہلتے ہوئے کوریڈور میں آگئے۔

''کیا ہوا؟ تم ڈیرک کو لے کر یہاں کیوں آگئے؟'' زینا نے پوچھا۔

''ڈیرک کو گاڑی میں کچھ گھٹن محسوس ہورہی تھی۔ اس لیے ڈوزن اسے لے کر باہر کھلی فضا میں آگیا۔ اسی وقت کارل نووک بھی وہاں آگیا۔ اس نے بیٹی کو زمین پر مردہ حالت میں دیکھا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے ڈیرک پر حملہ کردیا۔ جس کے نتیجے میں اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور شاید جبڑا بھی... اور وہ بولنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ تم بتاؤ، ان لوگوں سے کچھ مزید معلومات حاصل ہوئیں؟''

''ہاں، جولی نووک پارٹی ختم ہونے سے پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ان میں سے چند ایک نے ہی اس کے جانے کا نوٹس لیا۔ وہ سب اپنے حال میں مست تھے اور ان میں سے آدھے ابھی تک خمار میں مبتلا ہیں۔''

''تم نے ان کے ٹیلی فون چیک کیے؟''

''ہاں، میں نے نصف درجن فون اپنے قبضے میں لے لیے تھے اور جولی ان سے ڈاؤن لوڈنگ کررہی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان کی مدد سے وہ گزشتہ شب ہونے والے واقعات کی پوری فلم بنا سکے گی۔''

''تم لوگ یہاں کیا کررہے ہو؟'' سفید کوٹ پہنے ہوئے ایک انڈین ڈاکٹر ہمارے درمیان آتے ہوئے بولا۔ ''اسٹاف کا کہنا ہے کہ تم میرے بیٹے کو ایمرجنسی وارڈ میں لے کر آئے ہو۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

''آرام سے بات کرو۔'' میں نے اسے اپنا بیج دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں سراغ رساں لاکروز ہوں۔ تم کون ہو؟''

''ڈاکٹر پٹیل... ڈیرک کا باپ۔''

''ڈاکٹر! ہماری بات سکون سے سنو۔'' زینا درمیان میں آتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے بیٹے پر حملہ کیا گیا ہے اور حملہ آور ہماری تحویل میں ہے۔ تمہارا بیٹا ایک لڑکی کے ساتھ پارٹی میں آیا تھا جو مردہ پائی گئی ہے۔ شاید اس نے زیادہ مقدار میں کوئی نشہ آور شے لی ہو۔ کیا تمہارے گھر یا کلینک میں ایسی کوئی نشہ آور دوا ہے جس تک تمہارے بیٹے کی رسائی ہو؟''

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''میرا بیٹا منشیات استعمال نہیں کرسکتا۔''

''ذہن پر زور دو۔'' میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ''ہم خاص طور پر جی ایچ بی کی بات کررہے ہیں۔''

''اوہ میرے خدا۔'' پٹیل نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''یہ پارٹی چیپلن کے گھر میں ہوئی تھی؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''وہ میرے مریض ہیں اور قانونی طور پر میں ان کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں دے سکتا۔''

''ایسی صورت میں بہتر ہوگا کہ تم اپنے بیٹے کے لیے کسی اچھے وکیل کا انتظام کرلو۔'' زینا نے دھمکی آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ صبر کرو۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے مریضوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کرسکتا لیکن اتنا ضرور بتادوں کہ میرا بیٹا اس پارٹی میں کسی قسم کی منشیات لے کر نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔''

''کیونکہ وہ گولیاں وہاں پہلے سے موجود تھیں۔'' زینا

نے کہا۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس فیملی میں کوئی شخص تمہارے دیے ہوئے نسخے کے مطابق یہ گولیاں استعمال کررہا ہے؟''

''میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔'' پٹیل نے کہا۔ ''لیکن میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ اس کی تردید کروں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم سمجھ گئے۔'' زینا نے کہا۔

''کیا میں اپنے بیٹے کو دیکھ سکتا ہوں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے جاتے ہی میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون سنا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔''

''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' زینا نے کہا۔

''ڈسٹرکٹ اٹارنی کا فون تھا۔ چپلن کا وکیل مجھ سے ملنا چاہ رہا ہے، جیوری ان میں۔''

''وہ کوئی سودا کرنا چاہ رہا ہوگا۔'' زینا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو کیس شروع بھی نہیں ہوا۔''

''وہ کوئی سودے بازی نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے زینا کو اسپتال میں چھوڑا تاکہ ڈیرک پٹیل جیسے ہی بولنے کے قابل ہو، وہ اس کا بیان قلم بند کرے۔

جیوری ان پولیس والوں، وکیلوں اور میڈیا کے لوگوں کے لیے پسندیدہ جگہ تھی۔ صبح کا وقت تھا اس لیے ہال آدھے سے زیادہ خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ہال کے عقبی کونے پر نگاہ ڈالی۔ وہاں ایک بڑی سی میز کے گرد چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میری نظر ناٹ جیراڈ پر گئی جو پانچ کاؤنٹیز کا ڈسٹرکٹ اٹارنی تھا۔ وہ مجھ سے اسکول میں تین سال آگے تھا۔ ہم دونوں اسکول کی باسکٹ بال ٹیم میں تھے تاہم میری اس سے دوستی نہ تھی۔ البتہ میں اس کے ماضی اور پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اچھا خاصا امیر شخص تھا لیکن اس نے کبھی اپنی امارت کا اظہار نہیں کیا۔ اس وقت بھی وہ ایک عام سا کوٹ اور جینز پہنے ہوئے تھا جس کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔ اس نے قمیص کے اوپر ٹائی بھی نہیں لگا رکھی تھی۔ اس کے برابر میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی ہاروے بیرس بیٹھا ہوا تھا اور اپنے باس کے مقابلے میں خاصا خوش لباس نظر آرہا تھا۔ تیسرا شخص ان دونوں کے مقابلے میں فربہ اور چالاک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے گولف شرٹ کے ساتھ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ شمالی ڈیٹرائٹ کا انتہائی مہنگا وکیل جیسن ایوری تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تمہارے آنے کا شکریہ لاکروز۔''

میں نے آہستہ سے سر ہلایا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ڈسٹرکٹ اٹارنی کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کیونکہ ایک کیس کی تحقیقات کررہا ہوں۔ معاملہ کیا ہے؟''

''میں مارک چپلن کو کئی سالوں سے جانتا ہوں۔'' جیراڈ نے کہا۔ ''کسی بھی نامناسب بات سے بچنے کے لیے میں نے اس کیس سے دور رہنے کا فیصلہ کیا ہے کہ اگر معاملہ عدالت تک گیا تو ہاروے بیرس پراسیکیوٹر کے فرائض انجام دے گا۔''

ایوری بولا۔ ''اس سے پہلے کہ یہ ایک بڑی مصیبت بن جائے، ہمیں اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرلینا چاہیے۔''

''کس قسم کی مصیبت؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بتانے سے پہلے میں ایک ضمانت چاہتا ہوں۔'' ایوری نے کہا۔ ''میں جو معلومات ظاہر کرنے والا ہوں، اس سے میرے مؤکل کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو خفیہ رہے گی۔''

''تمہیں ہم پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' جیراڈ نے کہا۔ ''ویسے بھی یہ گفتگو آف دی ریکارڈ ہے۔ بتاؤ وہ کون سا راز ہے جو کسی کے لیے نقصان کا سبب بن سکتا ہے؟''

''میری رائے میں لڑکی نے کوئی سادہ مشروب پیا تھا۔ وہ ناکافی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس لیے باہر لان سے گزرتے ہوئے اس پر سردی کا حملہ ہوا جسے روکنے میں وہ ناکام رہی لیکن خون کے ٹیسٹ کے دوران جی ایچ بی کی موجودگی ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ لڑکی ڈیرک پٹیل کے ساتھ ڈیٹ پر آئی تھی جو اس وقت تمہاری تحویل میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اسے مشتبہ سمجھ رہے ہو۔''

''اس کا امکان ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ غلط ہے۔'' ایوری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس مشروب میں جی ایچ بی ملائی گئی تھی۔''

''یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟'' جیراڈ نے پوچھا۔

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' ایوری نے کہا۔ ''ریکارڈ کے مطابق یہ دوا نسخے میں تجویز کی گئی تھی اور اسے مناسب طور پر تالے میں محفوظ کیا گیا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اسے پلے روم میں رکھا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

ایوری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہی ہے۔ قانونی طور پر یہ ایک خواب آور دوا ہے لیکن بعض

اوقات میرے مؤکل اسے جنسی صلاحیت میں اضافے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب بالغ افراد ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کے نام بھی بتا سکتا ہوں۔''

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ لڑکی کے ساتھ کیا ہوا؟''

''وہ ڈیرک چیپل کے ساتھ پارٹی میں آئی تھی۔ ویک اینڈ کے موقع پر چیلن خاندان کے بزرگ گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ویسے بھی اس طرح کی پارٹیاں ہونا معمول کی بات ہے۔ اس میں ان کی بیٹی سارہ اور کچھ دیگر طالب علم موجود تھے۔ ان کی عمریں...''

''تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ مشروب میں دوا کس نے ملائی تھی؟''

''جوئے چیلن نے۔'' ایوری نے کسی تکلف کے بغیر کہہ دیا۔

یہ نام سن کر سب حیران رہ گئے اور ایک لمحے کے لیے کوئی کچھ نہیں بولا۔

''وہ معذور لڑکا...'' میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے ڈر ہے کہ یہ حرکت اسی نے کی ہوگی۔ گزشتہ شام وہ دوسرے طالب علموں کے ساتھ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا جب اس کی بہن نے اسے سو جانے کی ہدایت کی۔ یہ بات اسے ناگوار گزری۔ اس کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ مٹھی بھر کر گولیاں نکالیں اور تفریح لینے کی خاطر مشروب میں ڈال دیں۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس قسم کی گولیاں ہیں اور اس حرکت کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ آج صبح اس نے اپنی بہن کے سامنے اس کا اعتراف کر لیا ہے اور اسے اپنے کیے پر بہت افسوس ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ جو نقصان وہ کر چکا ہے، اس کا ازالہ کرنے کے قابل ہے۔''

''اس لڑکے کی عمر کیا ہوگی؟'' ہاروے نے پوچھا۔

''سولہ سال۔'' ایوری نے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ اس پر کوئی مقدمہ بن جائے گا۔''

''لیکن اسے اس طرح چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔'' جیراڈ نے بے رحمی سے کہا۔ ''تم کیا پیشکش لے کر آئے ہو؟''

''اس وقت ویل جونیئر کالج کو ایک مکمل چار سالہ ڈگری کورس کے ادارے کا درجہ دینے کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔ اس سے شمالی ساحلی علاقے میں رہنے والے طالب علموں کو بہت فائدہ ہوگا۔ جو دوسرے شہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی سکت نہیں رکھتے، وہ بھی اپنے شہر میں رہ کر پڑھ سکیں گے۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس کا زیرِ بحث موضوع سے کیا تعلق بنتا ہے؟''

''اس گفت و شنید میں مارک چیلن پوری طرح ملوث ہے اور اس مرحلے پر کسی اسکینڈل کا منظرِ عام پر آنا اس عمل کو پٹری سے اتارنے کے مترادف ہوگا۔ ممکن ہے کہ معاملہ ہمیشہ کے لیے فائلوں میں دب جائے۔''

''ایک لڑکی کی موت واقع ہوئی ہے اور تم اسے اسکینڈل کہہ رہے ہو۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''واقعی یہ ایک افسوسناک حادثہ ہے۔'' ایوری نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''ایک ذہنی طور پر پسماندہ لڑکے سے غلطی ہوئی۔ وہ اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ ممکن ہے جج اسے بحالی کے مرکز میں بھیج دے۔''

''اس طرح تو اس کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔'' ایوری گھبراتے ہوئے بولا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اکیس سال کی عمر میں وہ باہر آ جائے گا جبکہ جولی بے چاری کو تو اکیسواں برس دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔''

''کچھ بھی ہو، چیلن نہیں چاہیں گے کہ اس کی زندگی تباہ ہو جائے کیونکہ اس سے ایک بچکانا فعل سرزد ہوا ہے۔''

''ہم کسی سمجھوتے پر پہنچ سکتے ہیں۔'' ڈسٹرکٹ اٹارنی کے نائب نے کہا۔ ''اگر فریقین اسے نظر انداز کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔''

''لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔'' ایوری نے کہا۔

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے جل کر کہا۔ ''کسی نہ کسی کو تو شرمندہ ہونا ہی ہوگا۔''

''ڈیلن ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جیراڈ بولا۔ ''ہم اس معاملے کو یونہی ختم نہیں کر سکتے۔''

''مجھے ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کرنے کا اختیار ہے۔'' ایوری نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کس لیے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''جوئے ذہنی طور پر پسماندہ ہے اور جذباتی طور پر غیر متوازن ہے۔'' ایوری نے کہا۔ ''اس پر مقدمہ چلانے کا

کوئی فائدہ نہیں ہوگا جبکہ چپلن اس کے عوض تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جوئے کو مناسب علاج کے لیے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے گا اور اس واقعے پر اظہارِ افسوس کے لیے چپلن کی طرف سے بیان بھی جاری ہوگا اور خفیہ طور پر لڑکی کے گھر والوں کو ایک لاکھ ڈالر ادا کر دیے جائیں گے۔“

سب لوگ حیرت سے سن رہے تھے۔ ایوری اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کے برعکس اگر جوئے کو اس معاملے میں ملوث کیا گیا تو یہ پیشکش ختم ہو جائے گی اور چپلن ایسی ہر کوشش کی مزاحمت کریں گے جس سے لڑکے کو نقصان پہنچے۔ ان کے ذرائع لامحدود ہیں۔ ویسے بھی یہ ایک حادثہ ہے، کوئی جرم نہیں۔“

”یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہو۔“ ایوری تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ جوئے کو کونسلنگ کے لیے بھیج دیا جائے گا اور نووک فیملی کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔ کیا تم یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جیراڈ؟“

”چپلن فیملی کا دوست ہونے کے ناتے میں اس معاملے میں فریق نہیں بن سکتا۔“ جیراڈ نے کہا اور اپنے نائب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہارا کیس ہے۔“

”مجھے نووک فیملی سے ہمدردی ہے۔“ ہاروے نے کہا۔ ”لیکن ایک ذہنی طور پر پسماندہ اور نابالغ لڑکے کو موردِ الزام ٹھہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور عدالتی جنگ کالج کے لیے بھی نقصان دہ ہوگی۔“

”ٹھیک ہے ہم اس رقم کو بڑھا کر دو لاکھ ڈالرز کر دیتے ہیں۔“ ایوری نے کہا۔ ”یہ میری طرف سے آخری پیشکش ہے۔“

ہاروے نے جیراڈ کی طرف دیکھا جس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ہاروے نے کہا۔ ”ہمیں یہ پیشکش منظور ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ ہم سے اس کی کیا مراد ہے لیکن ہاروے میری ترجمانی نہیں کر رہا۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں کسی تصفیے پر پہنچنے سے پہلے نووک فیملی سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔“

”انہیں جوئے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اگر ہماری طرف سے معاوضے کی بات کی گئی تو اسے اعتراف جرم سمجھا جائے گا۔ نووک کو اس گفتگو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ایک لکڑہارا ہے۔ اگر اس کی برادری کا کوئی شخص یہ بات کرے تو زیادہ مؤثر ہوگی۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ میں برہم ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم چاہتے ہو کہ میں نووک کو کچھ بتائے بغیر یہ پیشکش کروں؟“

”وہ چاہے تو اس پیشکش کو مسترد بھی کر سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے چیک بک نکالی اور ایک چیک لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ ”یہ میں اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے دے رہا ہوں۔ دو لاکھ ڈالرز۔ یہ چیک کیش کروانے کے بعد نووک کو ایک تحریر دینا ہوگی کہ اس کی جانب سے یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔“

”میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کم از کم مجھے نووک کو واقعے کے بارے میں اصل حقائق بتا دینے چاہئیں۔“

”بدقسمتی سے اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ ایوری نے کہا۔ ”اس طرح جو فائدہ ملنے والا ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور چپلن فیملی مقدمے بازی پر مجبور ہو جائے گی۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”نووک پر یہ سنگین جرم بھی عائد ہو سکتا ہے کہ اس نے ڈیرک چیپل پر حملہ کیا۔“ ہاروے نے کہا۔ ”اسے یہ بات یاد دلا دینا ڈیکن۔ اس کے پاس اتنی عقل تو ہوگی کہ وہ جیل یا اس بھاری رقم میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی بیٹی کے خون کا سودا کرے گا۔“ میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ جب میں سینٹر واپس پہنچا تو کارل نووک انٹرویو روم میں موجود تھا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یہ آف دی ریکارڈ گفتگو تھی اور اس کے ریکارڈ کیے جانے یا ویڈیو بننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ نووک نے کام والا لباس یعنی پرانی قمیص، اوور آل اور ربر سول کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے کندھے تک پھیلے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی چمک رہی تھی اور ہاتھوں کی ہڈیاں سخت محنت کے سبب ابھر آئی تھیں۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر ناراضی کے تاثرات تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی بیٹی کی موت پر تعزیت کی اور پھر ڈرتے ڈرتے ایوری

کی پیشکش اس کے سامنے رکھ دی۔ رقم کا سن کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"دو لاکھ ڈالرز۔" اس کی آواز کمرے میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟ اتنی رقم سے تو میں پورا جنگل خرید لوں گا۔"

"جانتا ہوں۔ میرے والدین لکڑہارے تھے۔"

"میں نے کئی برس پہلے اس کے ساتھ کام کیا ہے لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ غالباً اس کی موت کار کے حادثے میں ہوئی تھی۔"

"ہاں، اس کی کار کو ایک شرابی ڈرائیور نے ٹکر ماردی تھی۔"

"لیکن کسی نے تمہیں اس کی موت کے عوض دو لاکھ ڈالرز کی پیشکش نہیں کی؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں جانتا ہوں، وہ اچھا کارکن تھا۔ نووک نے کہا۔ "لیکن اس کی قیمت دو لاکھ ڈالرز نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے جولی کی یہی قیمت لگائی ہے۔"

"مسٹر نووک...." میں نے کہنا چاہا۔

"مجھے بات پوری کرنے دو۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "جانتا ہوں کہ یہ پیشکش تمہاری طرف سے نہیں بلکہ کسی نے میرے خاموش رہنے کی قیمت لگائی ہے۔ میں نے جولی کو پڑھانے کے لیے دو دو جگہ ملازمت کی اور ابھی میرے تین بچے اور بھی ہیں۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "میں یہ رقم لے لوں گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"تمہیں احساس ہے کہ اگر ایسا کیا تو یہ معاملہ ختم ہوجائے گا اور تم بعد میں کوئی دعویٰ نہیں کرسکو گے۔"

"میں نے ایسا بھی نہیں سوچا لیکن آف دی ریکارڈ تم سے پوچھ رہا ہوں۔ میری بیٹی کو کس نے مارا؟"

"فی الحال میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی جولی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ ایک حادثہ تھا۔ بہتر ہوگا کہ اس حقیقت کو قبول کرلیا جائے۔"

"میرے ماموں ویت نام کی جنگ میں مارے گئے۔ وہ میری ماں کے اکلوتے بھائی تھے۔ جانتے ہو ان کی بیوی کو کیا معاوضہ ملا۔ دس ہزار ڈالرز اور کفن پر ڈالنے کے لیے ایک پرچم۔ سرکار نے اس کی زندگی کی قیمت دس ہزار ڈالرز لگائی۔ مجھے تو جولی کے بدلے بہت زیادہ مل رہے ہیں۔ اس سے بڑی مدد اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اپنے لوگوں کو بتادو کہ میں اس سودے کے لیے تیار ہوں۔"

"وہ میرے آدمی نہیں ہیں۔" میں نے احتجاجاً کہا۔

"مجھے اس کا پورا یقین ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے جولی کی آخری رسومات میں شرکت نہیں کی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ نووک کا ردعمل کیا ہوگا لیکن میں بن بلایا مہمان بننا نہیں چاہتا تھا۔

ایک ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وِیل جونیئر کالج کو چار سالہ

ڈگری کورس شروع کرنے کی منظوری مل گئی ہے۔ یہ ہم سب کے لیے اچھی خبر تھی۔ جیسن ایوری نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ اسی رات مجھے ڈیرک پٹیل کے غائب ہونے کی خبر ملی۔ ابھی جولی کی آخری رسومات کو دس دن ہی ہوئے تھے کہ وہ ویل جونیئر کالج کے کیمپس سے غائب ہوگیا۔ رات کے کھانے پر وہ موجود نہیں تھا لیکن اس کے والدین یہ سوچ کر خاموش رہے کہ شاید وہ پریکٹیکل کی وجہ سے کالج میں رہ گیا ہوگا تاہم جب وہ دس بجے تک بھی نہیں آیا تو اس کی ماں نے کالج فون کیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے بتایا کہ کالج بند ہو چکا ہے۔ البتہ ڈیرک پٹیل کی واکس ویگن ابھی تک پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی ہے اور اس کا ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا ہے پھر اسے گاڑی کی چابیاں بھی برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر مل گئیں۔ سیٹ کے سرہانے خون کے دھبے بھی نظر آرہے تھے۔

یہ واقعہ کالج کی حدود میں پیش آیا تھا۔ اس لیے اسٹیٹ پولیس کو اس کی تفتیش کرنا چاہیے تھی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے جولی کے کیس میں مشتبہ ہے تو اس واقعے کو بھی ہمارے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ ہمارے پاس امریکا اور کینیڈا کی لیبارٹریز کی طرح ڈی این اے کا سسٹم نہیں تھا جس سے پتا لگایا جاتا کہ کار کی سیٹ پر پائے جانے والے خون کے دھبے ڈیرک پٹیل کے ہی ہیں۔ بظاہر اس پر تشدد کیا گیا تھا لیکن مسلسل برف باری اور پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کی آمدورفت کی وجہ سے کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔

چند طالب علموں نے بتایا کہ انہوں نے ڈیرک کی گاڑی کے قریب ایک ٹرک کھڑا ہوا دیکھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ڈرائیور کی شکل نہ دیکھ سکا اور نہ ہی کسی کی نظر نمبر پلیٹ پر گئی۔ یہاں تک کہ کوئی اس کا میک بھی نہ بتا سکا۔ شاید فورڈ ہو یا پھر شیورلیٹ۔ بس وہ اتنا بتا سکے کہ وہ ایک سفید رنگ کا ٹرک تھا۔ جس کے پہیوں کے اردگرد کا حصہ زنگ آلود ہو چکا تھا اور اس کا ڈرائیور بھی کوئی طالب علم نہیں بلکہ بڑی عمر کا شخص تھا۔ اب مجھے ایسے آدمی کو تلاش کرنا تھا جس کے پاس سفید زنگ آلود ٹرک ہو۔

میں نے کارل نووک سے بھی پوچھ گچھ کی۔ اس کے پاس پورے دن کی مصروفیات کا ریکارڈ تھا جس سے اس کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی ظاہر ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ شک بھی ابھرا کہ وہ کسی نہ کسی طور اس واقعے میں ملوث ہے۔ کوئی بھی شخص پورے دن کی مصروفیات کا ریکارڈ نہیں رکھتا جب تک کہ اسے اس بارے میں سوال جواب کی توقع نہ ہو۔ بے گناہ لوگوں کو جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ظاہر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

ڈاکٹر پٹیل اور اس کے گھر والے شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔ پولیس نے ان کے گھر پر ایسے آلات نصب کر دیے تھے جن کے ذریعے تاوان کا مطالبہ کرنے والوں تک پہنچا جا سکے لیکن ایسی کوئی کال نہیں آئی جس میں تاوان مانگا گیا ہو یا کوئی دھمکی دی گئی ہو۔ جس فون کا انتظار تھا، وہ پٹیل کے گھر یا میرے دفتر میں نہیں آیا بلکہ اسے سننے والا جنگلی جانوروں کے تحفظ کے ادارے کا ایک افسر براؤن کیڈر تھا جسے پیٹ ڈی نوکس نامی کسان نے فون کر کے اپنے شکار کے بارے میں بتایا۔ اس نے ایک ایسے بھیڑیے پر گولی چلائی جو چھوٹے جانوروں کو اپنی خوراک بنا رہا تھا۔ وہ بھیڑیا رینگتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ وہ برف پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کو دیکھتا ہوا شکار کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ جہاں اس کی زمین ختم ہوئی تھی، وہیں باڑھ کے نزدیک اسے کچھ ہڈیاں بکھری ہوئی نظر آئیں۔ جس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ بھیڑیے نے اسی جگہ کو اپنے ناشتے اور کھانے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر واپس پلٹنے والا تھا کہ اچانک ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ کھوہ کے اردگرد بہت ساری خون آلود ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ وہ ہڈیاں کسی چھوٹے سور یا ہرن کی نہیں تھیں۔ اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کسی انسانی جسم کی ہڈیاں ہیں۔ پھر اس کی نگاہ ایک پھٹے ہوئے ٹینس شو پر گئی اور وہ لرز کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے فون کرے۔ اس نے بوکھلاہٹ میں جانوروں کے تحفظ کی تنظیم کو فون کر دیا جنہوں نے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی۔

عام طور پر ڈسٹرکٹ اٹارنی بذاتِ خود جائے وقوعہ کا معائنہ کرتا ہے لیکن ڈیرک پٹیل کا تعلق ایک ایسے کیس سے تھا جس سے ٹاڈ جیراڈ نے اپنے آپ کو علیحدہ کر رکھا تھا چنانچہ اس نے اپنے نائب ہاروے کو بھیج دیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی جائے وقوعہ پر پہنچے۔ ہاروے نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے ذہن میں اس حوالے سے کوئی سوال ہے؟“

”نہیں۔ ابھی ہمیں ڈیرک پٹیل کا ڈھانچا نہیں ملا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”البتہ اس کے گھر والوں نے جوتے کا جو برانڈ اور نمبر بتایا، اس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کی

لاش کہیں قریب ہی موجود ہے۔“

”کیا وجہ ہے کہ تم ابھی تک اس کا ڈھانچا تلاش نہیں کرسکے؟“

”کیونکہ اس کی لاش یہاں نہیں پھینکی گئی۔ اسے تلاش کیا جارہا ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ اسے ساحلی سڑک کے نزدیک دفن کیا گیا ہے۔ بھیڑیے نے اس کی چیڑ پھاڑ کی اور اپنے لیے اس کا کچھ حصہ لے کر کھوہ تک آگیا۔“

”یہ تو طے ہے کہ بھیڑیے نے اس لڑکے کو نہیں مارا۔“ ہاروے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے۔“

”ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس کی موت کا جو بھی وقت ہو، کارل نووک بڑی آسانی سے اپنی غیر موجودگی ثابت کردے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس نے کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کی ہوں گی؟“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو اور ہم نے اس [illegible] میں اس کی [illegible]

[illegible] کے لیے [illegible] ایک [illegible] میں آتے ہی [illegible]

”وہ بچ نہیں سکے گا۔“ ہاروے نے غصے سے کہا۔

”وہ اپنی غیر موجودگی ثابت کردے، تب بھی میں اسے گرفتار کرنا چاہوں گا۔“

”اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ایک اچھا وکیل اسے مکھن میں سے بال کی طرح نکال کرلے جائے گا۔ ویسے بھی نووک وہ شخص نہیں جس کی ہمیں تلاش ہے۔“

”تم کس کی بات کررہے ہو؟“

”اس کی بیٹی برف پر مردہ پائی گئی اور ہم کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکے اور اب ایک اور لڑکا مارا گیا۔ ہم نے نووک کو انصاف کے بجائے پیسے دے دیے اور اس نے اس رقم کو انصاف خریدنے کے لیے استعمال کیا۔“

”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس نے کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کیں؟“

”بالکل یہی بات ہے اور مجھے وہی شخص چاہیے جس نے پیسوں کی خاطر اس لڑکے کو قتل کیا اور نووک ہی مجھے اس کا نام بتائے گا۔ فی الحال وہ غصے میں ہے اور سمجھتا ہے کہ اس

خوش گماں

ایک صاحب نے اپنی سیکریٹری کو بیوی کے نام خط ڈکٹیٹ کرایا۔ بیوی ان دنوں میکے گئی ہوئی تھی۔ خط کے آخر میں انہوں نے جملہ ڈکٹیٹ کرایا۔ ”اینڈ آئی لو یو۔“

سیکریٹری جب خط ٹائپ کرکے لائی تو اس میں یہ جملہ نہیں تھا۔ صاحب نے جب اس بارے میں پوچھا تو سیکریٹری معصومیت سے بولی۔ ”اچھا تو وہ بھی لکھنا تھا؟ میں سمجھی وہ جملہ آپ نے مجھ سے کہا ہے۔“

نے بدلہ لے لیا لیکن جب میں اسے حقیقت بتاؤں گا کہ اس نے غلط لڑکے کو مار دیا تو وہ مجھے سب کچھ سچ بتادے گا۔“

”لیکن تم اسے نہیں بتاسکتے۔ تم پر اعتماد کرتے ہوئے یہ حقیقت بتائی گئی تھی۔“

”اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ مجھے نووک کو سچ بتانا ہی ہوگا اور اس کے بدلے وہ مجھے قاتل کا نام بتائے گا۔“

میں نے ڈیرک کی ران کی ہڈی اٹھائی اور اسے لے کر نووک کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں نے وہ ہڈی اس کے ہاتھ میں پکڑائی اور اسے بتادیا کہ یہ مجھے کہاں سے ملی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی بیٹی کے ساتھ ہونے والے واقعے کی تفصیل بھی بتادی۔ اس کا چہرہ دہشت سے تاریک ہوگیا پھر اس نے دروازے کی ناب پکڑی اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ جیسے اس کے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ یہی وہ کمزور لمحہ تھا جب میں نے اسے پوری طرح گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم مجھے اس قاتل کا نام بتادو تاکہ تمہارے اوپر سے یہ الزام ہٹ جائے۔“

اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہ نام بتادیا جو میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔

زینا لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ ہم دونوں جیپ میں بیٹھے پولیس کار کا انتظار کررہے تھے جو نووک کو لینے آرہی تھی۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ میں نے کارل نووک پر نظریں جماتے ہوئے کہا جو اپنے بیوی بچوں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

”آسکر سورسا۔“ زینا لیپ ٹاپ کی اسکرین پڑھتے ہوئے بولی۔ ”قد چھ فٹ سات انچ، وزن دو سو اسی پونڈ... دو مرتبہ جیل جاچکا ہے۔ دونوں مرتبہ اسے کھیلین کا کاروبار کرنے پر سزا ہوئی۔ ایک مرتبہ تین سال اور دوسری بار چار

سال کے لیے جیل گیا۔ آخری مہم کے بعد وہ ایل خرت روڈ پر کہیں رہائش پذیر ہے لیکن اس کا مکمل پتا دستیاب نہیں۔"
"یہ جگہ سرکاری جنگل میں واقع ہے۔ اس کے دادا کا وہاں کیبن ہے۔"
"تم اس شخص کو جانتے ہو؟"
"ہاں۔ میں نے اسے لکڑیاں کاٹتے ہوئے دیکھا ہے لیکن کبھی اس کے ساتھ کام نہیں کیا۔ اس وقت بھی اس کی ساکھ اچھی نہیں تھی۔ لگتا ہے کہ جیل جانے کے بعد وہ اور بگڑ گیا۔"
"ہم اسے کس طرح قابو کریں گے؟"
"ہم ایسی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے اگر ہم پولیس لے کر گئے تو وہ خاموشی سے روپوش ہو جائے گا اور ہم سال بھر تک اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ اگر میں اکیلے میں اس سے بات کروں تو شاید وہ قابو آجائے۔"
"اور اگر ایسا نہ ہوا؟"
"اگر میں اکیلا گیا تو وہ بھاگے گا نہیں۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں نووک کے ساتھ رک کر پولیس کار کا انتظار کرو۔ خیال رکھنا کہ وہ اپنے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔"
"گویا تم سورسا کے پاس اکیلے جاؤ گے؟ میرے خیال میں یہ غلطی ہوگی۔"
وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اکیلے جانا واقعی غلطی ہوتی اور میں یہ بات جانتا تھا لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ سورسا تک پہنچنے میں مجھے کوئی وقت نہیں ہوئی۔ وہ راستہ میرا جانا پہچانا تھا۔ جب میں پہنچا تو وہ ایک ہرن کی کھال اتار رہا تھا جو ایک بڑے درخت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں جیپ سے اترا، وہ مجھے دیکھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ خون آلود چھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اپنے موزے میں ریوالور چھپا رکھا تھا۔
اس نے میرے عقب میں نگاہ دوڑائی۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ میرے ساتھ مسلح پولیس والے ہوں گے۔ لیکن جب اسے احساس ہوا کہ میں اکیلا آیا ہوں تو وہ کسی حد تک پرسکون ہو گیا۔ میں نے جیپ سے اترتے ہی صحن کا جائزہ لیا۔ کیبن کے برابر میں ہی زنگ آلود سفید رنگ کی پک اپ کھڑی ہوئی تھی۔ باہر کی دیوار کے ساتھ جلانے کی لکڑیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں اور دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ ایک رائفل لگی ہوئی تھی۔

"تم کون ہو؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔ وہ تقریباً چھ فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن اس کے منہ سے وھسکی کی بو آرہی تھی۔
"سراغ رساں ڈیلن لاکروز۔" میں نے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں بڑے جرائم کی تحقیقات کرتا ہوں۔"
"میں نے کوئی بڑا جرم نہیں کیا۔" وہ طنزیہ انداز میں اپنا ٹوٹا ہوا دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ "بلکہ کوئی چھوٹا جرم بھی نہیں۔"
"شکار کا موسم دسمبر میں ختم ہو چکا ہے۔ تم نے غیر قانونی طور پر ہرن کا شکار کیا ہے۔"
"سڑک پر ہونے والے حادثوں کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ یہ مجھے ایک گڑھے میں پڑا ہوا ملا تھا۔ اسے کسی ٹرک نے ٹکر ماری تھی۔"
"تب تو چوٹ کا نشان نظر آنا چاہیے تھا جبکہ میں اس کے سر میں گولی کا سوراخ دیکھ رہا ہوں۔"
"رہنے دو لاکروز۔ کسی کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے اگر میں سیزن نہ ہونے کے باوجود اپنے کھانے کے لیے ہرن کے گوشت کا انتظام کرلوں۔"
"میں یہاں کسی ہرن کی نہیں بلکہ ایک لڑکے ڈیرک پٹیل کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔"
اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی نظریں سیدھی رائفل پر گئیں جو صرف چند گز کے فاصلے پر تھی۔ یقیناً وہ بھری ہوئی ہوگی۔ اس کے علاوہ ابھی تک اس نے اپنے ہاتھ میں خون آلود چھری پکڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے دماغ میں ہونے والی کشمکش کو اچھی طرح پڑھ سکتا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی خاموشی توڑی اور بولا۔ "میں کسی لڑکے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"
"میں تم سے اعتراف جرم کروانے نہیں آیا۔ نووک نے سب کچھ بتا دیا ہے لیکن تم زیادہ بہتر انداز میں بیان کر سکتے ہو۔ کیا تم نے لڑکے کو اکیلے ہی مارا تھا یا کسی کی مدد بھی لی تھی؟"
اس نے ایک جانب قدم بڑھایا اور رائفل سے اس کا فاصلہ ایک فٹ کم ہو گیا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔" وہ نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے بولا۔ "وہ لڑکا غلیظ لوگوں میں سے تھا۔"
"غلیظ لوگ؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ براؤن یا سیاہ فام یا وہ لوگ جو ہم جیسے نہیں ہوتے۔"

وہ خوامخواہ احساسِ برتری میں مبتلا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "گویا تم اسے اکیلے ہی لے کر آئے تھے۔ یہ سب تم نے کیسے کرلیا؟"

"بہت آسانی سے۔ میں نے اپنی پک اپ اس کی کار کے برابر میں کھڑی کی اور اس سے پتا پوچھنے لگا۔ پھر میں نے اسے باتوں میں لگا کر مشروب پلا دیا جسے پیتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا اور سارے راستے اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔"

یہ کہہ کر اس نے رائفل کی طرف ایک قدم اور بڑھایا۔ اب وہ بمشکل دو گز کے فاصلے پر تھی۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں اس سے سچ جاننا چاہ رہا تھا۔ اس لیے اسے بولنے دیا۔

"تم نے اس کی لاش کہاں دفن کی؟"

"ہائی وے کے پاس سرکاری زمین پر۔ وہاں بہت سے بھیڑیے ہوتے ہیں۔ میں نے اس کا پیٹ چاک کردیا تاکہ بھیڑیے اس کی انتڑیاں کھا سکیں۔"

یہ کہہ کر اس نے رائفل کی جانب ایک قدم اور بڑھایا اور اس دوران وہ مسلسل میری جانب دیکھتا رہا۔ جب میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تو اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ جان گیا تھا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔

"آخری سوال۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بہت اہم ہے۔ جب تم نے اس کا پیٹ چاک کیا، وہ مر چکا تھا یا صرف بے ہوش تھا؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔"

"نہیں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس وقت صرف ایک بات اہم ہے اور وہ یہ کہ میں دوبارہ جیل نہیں جانا چاہتا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے ٹرک پر سرسری نظر ڈالی لیکن یہ محض ایک چال تھی۔ جیسے ہی میری توجہ ہٹی۔ اس نے پوری قوت سے چھری میرے سر پر دے ماری اور رائفل کی طرف بڑھا۔ میں نے چھری کے وار سے بچنے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ چھری میرے ماتھے پر لگی۔ میں گھٹنے کے بل جھک کر اپنا ہتھیار نکالنے لگا۔ اتنی دیر میں وہ بھی رائفل تک پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں نے تقریباً ایک ہی وقت میں گولی چلائی لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ پہلے فائر کس نے کیا تھا۔ رائفل کی گولی میرے گال کے پاس سے گزری جبکہ میرا نشانہ خطا گیا اور گولی دروازے کی چوکھٹ میں گھس گئی۔ وہ دوبارہ رائفل لوڈ کر رہا تھا کہ میں نے دوسرا فائر کردیا جو نشانے پر لگا۔ اس کے بعد بقیہ تین فائر بھی ضائع نہیں ہوئے۔

مجھے تین دن معطل رہنا پڑا۔ اس دوران میں اسٹیٹ پولیس نے واقعے کی آزادانہ تحقیقات شروع کردی۔ مجھے ایک شوٹنگ بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ تین کمانڈنگ افسروں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ مجھے اپنا وکیل کرنے کی اجازت تھی جبکہ میں نے اس کے لیے نہیں کہا تھا لیکن شاید بعد میں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ کچھ پولیس آفیسرز ایسے بھی ہیں جو پوری ملازمت کے درمیان ایک مرتبہ بھی اسلحہ استعمال نہیں کرتے اور میرا اندازہ تھا کہ بورڈ کا سربراہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔

وہ بار بار ایک ہی طرح کے سوالات پوچھتے رہے مثلاً میں ایک خطرناک مجرم اور مشتبہ قاتل کی تلاش میں اکیلا کیوں گیا؟ میں نے اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس کی مدد کیوں نہیں لی؟ کیا میں پہلے بھی اس سے مل چکا تھا یا کبھی اس سے واسطہ پڑ چکا تھا؟ کیا میری اس سے کوئی دشمنی تھی وغیرہ وغیرہ۔

"میں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "اسکول کے زمانے میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اس کے ساتھ جنگل میں کام کرچکا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص سے پُرامن انداز میں ملنا پسند کرے گا جس کے ساتھ اس کا تعلق رہا ہو۔"

"لیکن تم اسے قائل نہ کرسکے۔" چیف نے کہا۔ "کیا تم نے پوری طرح کوشش نہیں کی تھی؟"

"اس کا موقع ہی نہیں ملا۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "جب میں نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی تو اس نے چھری سے حملہ کردیا اور مجھ پر رائفل تان لی۔ اس کے بعد مجھے اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی۔"

"میں تو یہی کہوں گا کہ تم نے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں غلطی کی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے یقین تھا کہ میں اپنی کسی وجہ سے اس سے تنہا ملنے گیا تھا اور اس کا خیال درست تھا۔ سورسا نے ایک ایسے لڑکے کو قتل کرنے کے لیے

پیسے لیے تھے جسے وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ کسی جرم کی تلافی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ لڑکا واپس آ سکتا تھا لیکن میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر وہ پُرامن طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیتا تو میں اسے زندہ لے آتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

میں نے مختصراً ان کے تمام سوالوں کے جواب دیے۔ آخر میں بورڈ نے حقائق کی بنیاد پر فیصلہ سنا دیا۔ سورسا جرائم پیشہ شخص تھا اور غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے علاوہ اس پر ایک قتل کا بھی الزام تھا۔ مرتے وقت بھی اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی جبکہ میرے ماتھے پر چھری کے زخم کا نشان تھا جس پر آٹھ ٹانکے آئے تھے۔ بورڈ نے تسلیم کر لیا کہ میں نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ بظاہر یہ میری جیت تھی لیکن میں ایسا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

سماعت ختم ہونے کے بعد میں اپنے دفتر چلا آیا۔ وہاں ٹاڈ جیراڈ میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھ سے شکوہ کیا کہ میں نے اس کے نائب کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ اس کی ذمے داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔ پھر میں نے اسے قبائلی جرگے کی مثال دی جہاں کوئی جج ہوتا ہے، نہ وکیل اور سردار کا فیصلہ حتمی تصور کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہم نے جیوری ان میں بیٹھ کر کیا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''ایوری اپنے کلائنٹ چپلن کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ان کے بیٹے کا نام اس معاملے میں نہ آئے۔ یہ تمہاری ذمے داری تھی کہ مرنے والی لڑکی کے حق میں بولتے لیکن تم نے چپلن خاندان سے تعلق نبھانے کی خاطر اپنے آپ کو اس کیس سے الگ کر کے ہاروے کو آگے بڑھا دیا۔ وہ بھی تمہیں خوش رکھنے کے لیے تمہارے دوستوں کو بچاتا رہا۔''

''میں نے اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔''

''تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے وہی کیا جو تم چاہتے تھے۔ میں تمہیں الزام نہیں دے رہا۔ ہم سب اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ اگر نووک کو رقم نہ دی جاتی تو ڈیرک چپیل کا قتل نہ ہوتا۔ اب ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس معاملے کو سیدھا کرنے کی کوشش کریں۔''

''تم کیا چاہتے ہو ڈیلن؟''

''دو باتیں۔ پہلی تو یہ کہ ہاروے کو فوراً سبکدوش کر دو۔ وہ اس کام کے لیے اہل نہیں ہے۔''

میرا خیال تھا کہ وہ کوئی اعتراض کرے گا لیکن وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ ''اور دوسری؟''

''نووک کو کچھ رعایت ملنی چاہیے، اس کے ساتھ کچھ طے کر لو۔''

''اس کا کوئی امکان نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس نے ایک معصوم لڑکے کو قتل کرنے کے لیے کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کیں۔ اس کی وجہ سے ڈیرک کی جان گئی۔''

''وہ نہیں جانتا تھا کہ ڈیرک بے گناہ ہے۔ اگر ہم اسے خریدنے کے بجائے سچ بتا دیتے...''

''تو وہ چپلن کے بیٹے کو قتل کر دیتا اور ہمیں پتا بھی نہ چلتا۔''

''ہم نے ہی اسے اس صورت حال سے دوچار کیا۔ یہ بتاؤ تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''اسے تھوڑی بہت سزا تو بھگتنا ہی ہوگی۔ بعد میں اچھے چال چلن کی بنیاد پر اس کی رہائی کی سفارش کی جا سکتی ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے سورسا کے بارے میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ تم نے بورڈ کو بتایا کہ اس کے پاس اکیلے گئے کیونکہ تمہیں امید تھی کہ وہ اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دے گا۔ کیا یہ سچ ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ غصے سے بولا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا واقعی سچ وہی تھا جو میں نے بورڈ کے سامنے بیان کیا؟ میں جیراڈ سے جھوٹ نہیں بول سکتا لیکن میں خود بھی نہیں جانتا کہ سچ کیا ہے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ اگر سورسا زندہ گرفتار ہو جاتا تو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ جس معاشرے میں ایوری جیسے وکیل ایک امیر زادے کو بچانے کے لیے کتنی لاکھ ڈالرز خرچ کر سکتے ہوں، جیراڈ جیسے ڈسٹرکٹ اٹارنی تعلقات نبھانے کے لیے اپنے فرائض سے چشم پوشی کریں... وہاں سورسا جیسے گھاگ مجرم کے لیے انصاف خریدنا کون سا مشکل ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ میں اسے گرفتار کرنے نہیں بلکہ مارنے گیا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو کسی کو انصاف نہ ملتا پھر کوئی ایوری یا کوئی جیراڈ اسے بچا کر لے جاتا۔ اب مجھے کم از کم یہ اطمینان ہے کہ اسے مار کر میں نے انصاف کا تقاضا پورا کر دیا۔ خون کا بدلہ خون ہی ہوتا ہے اور میں اسی کا قائل ہوں۔

ایک بار دیکھا ہے

منظر امام

ایک زمانہ گزرا جب قصبوں... دیہاتوں میں داستان سرائے آباد تھے... سرما کی طویل راتوں میں لوگ طلسماتی اور سحر انگیز داستانیں نہایت شوق سے سنتے اور سر دھنتے تھے... وقت کی گردشوں نے کروٹ لی تو داستان سنانے والے رفتہ رفتہ قصۂ پارینہ بن گئے... اور ان کے شوقین وقت کی دھول میں اٹتے چلے گئے... مگر منظر امام کا داستان سرا آج بھی زندہ اور تروتازہ ہے...

شامی کے سوالات اور حاتم طائی کی سخاوت و ذہانت کے نادر انکشافات کی دل لبھاتی تحریر

حاتم طائی اس وقت ہوٹل میں چائے پی رہا تھا جب شامی نے آکر ہاتھ پکڑ لیے۔

اس وقت شامی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ حاتم طائی اس کی یہ حالت دیکھ کر لرز گیا اور اپنے آپ پر افسوس اور ملامت کرنے لگا۔ ”تف ہے حاتم طائی تف ہے۔ تو ہوٹل میں آرام سے بیٹھا دودھ پتی کی چائے پی رہا ہے اور ایک انسان کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔“

اس نے اپنے آپ پر ملامت کی اور ٹھنڈی آہیں

بھرنے لگا۔ ایک طرف شامی ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور اب حاتم طائی بھی شروع ہو گیا تھا۔
دیکھتے ہی دیکھتے ہوٹل کی فضا میں ٹھنڈک پیدا ہو گئی پھر ہوٹل کے مالک نے حاتم طائی کے پاس آ کر عرض کیا۔
''بھائی جان! کیوں ہمارا دھندا خراب کر رہا ہے۔ اگر آہیں بھرنی ہیں تو باہر جا۔''
ہوٹل کے مالک کی اس ڈانٹ پر حاتم اور شامی دونوں خاموش ہو گئے پھر حاتم نے خفا ہو کر شامی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بدبخت انسان، تیری وجہ سے میری اچھی خاصی بے عزتی ہو گئی ہے۔ بتا کیا مصیبت آ پڑی ہے تجھ پر؟''
''حاتم بھائی، میری محبوبہ کا سوال ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''اسے واپس دلوا دو۔ ورنہ میں رو رو کر مر جاؤں گا۔''
''تیری محبوبہ کیا میرے قبضے میں ہے یا وہ انڈر گراؤنڈ چلی گئی ہے۔ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟''
''سخی انسان، میری محبوبہ موبائل چھینتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔'' شامی نے بتایا۔
''کیسی بات کر رہا ہے۔ کس طرح موبائل چھین رہی تھی؟''
''ہم دونوں بائیک پر تھے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہم نے دو موبائل کامیابی سے چھین لیے تھے لیکن تیسرے پر پکڑے گئے۔''
''کہاں پکڑے گئے، تو تو آزاد گھوم رہا ہے؟'' حاتم طائی نے کہا۔
''میں موٹر سائیکل چھوڑ کر بھاگ لیا تھا۔ وہ چونکہ موٹاپے کی وجہ سے دوڑ نہیں سکتی تھی اس لیے پکڑی گئی۔'' شامی نے بتایا۔
''بے غیرت اور بے شرم انسان۔ بزدل، تو اپنی محبوبہ کو پھنسا کر بھاگ لیا۔ شرم آنی چاہیے پھر ایسے کاموں میں کسی عورت کو لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''حاتم بھائی، وہ خود ہی ایڈونچر کے شوق میں میرے ساتھ ہو لی تھی۔'' شامی نے بتایا۔
''اچھا اچھا، پھر کیا ہوا؟''
''ایک تھانے دار ہے۔ وہ اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں اس کے پاس بھی کسی کی سفارش لے کر گیا تھا لیکن وہ تھانے دار خود اپنی محبوبہ کے چکر میں پریشان ہو رہا ہے۔''
''ابے کھل کر بتا، تھانے دار کی محبوبہ کو کیا ہوا ہے؟''
''تھانے دار کی محبوبہ نے تھانے دار کے سامنے سات سوال رکھ دیے ہیں۔ وہی سات سوال جن کی وجہ سے تمہاری پبلسٹی ہوئی ہے۔ تم پر کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ تم پر فلمیں بنی ہیں۔ وہی سات سوال۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔''
''ہاں ہاں سمجھ گیا۔ سارے سوال میری ڈائری میں لکھے ہوئے ہیں تو بات کیا بنی۔ تھانے دار کی محبوبہ سے تمہاری محبوبہ کا کیا تعلق ہے؟''
''تعلق یہ ہے کہ تھانے دار کو اپنی محبوبہ کے یہ ساتوں سوال کے جواب اس کی برتھ ڈے پر گفٹ کے طور پر دینے ہیں جب میں اپنی محبوبہ کی سفارش لے کر گیا تو اس نے وہ ساتوں سوال میرے سامنے رکھ دیے کہ جاؤ ان کے جواب لے کر آؤ۔ پھر تمہاری محبوبہ کو چھوڑ دوں گا۔''
''سمجھ گیا۔'' حاتم طائی نے ایک گہری سانس لی۔
''یعنی تم پہلے تھانے دار کے سات سوالوں کے جواب ڈھونڈو گے پھر وہ اپنی محبوبہ کو بتائے گا۔ اس کے بعد تمہاری محبوبہ کو چھوڑے گا۔''
''ہاں حاتم بھائی، یہ محبوبہ در محبوبہ کا معاملہ ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''اب تمہارے علاوہ پوری دنیا میں کون ہے جو اس قسم کے احمقانہ سوالوں کے جواب ڈھونڈ کر لائے۔ اس موقع پر تم ہی کام آ سکتے ہو۔''
''ابے، اب کیا میں اسی لیے رہ گیا ہوں۔ اپنا کوئی کام نہ کروں۔ بس تم ہی لوگوں کے چکر میں پڑا رہوں۔ گارمنٹس کا کام شروع کیا تھا۔ وہ بھی برباد ہو گیا۔''
''وہ کس طرح برباد ہو گیا حاتم بھائی، میں نے خود دیکھا ہے تم نے تو بہت بڑی شاپ کھولی تھی؟''
''ہاں، بہت بڑی شاپ تھی۔ کم از کم دو ہزار جوڑے رکھے تھے۔'' حاتم طائی نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن کیا کرتا، اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ ایک بار ایک بھکاری آیا۔ کپڑے پھٹے ہوئے، بہت بُرا حال، کہنے لگا۔ سخی داتا، میرے پاس پہننے کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ میں نے ترس کھا کر ایک جوڑا اس کو دے دیا۔ وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ شام کے وقت وہ کم بخت اپنی پوری برادری کو لے کر آ گیا۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب ہی اٹھ کر آ گئے۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میں نے سارے کے سارے جوڑے ان لوگوں میں بانٹ دیے اور خود فٹ پاتھ پر آ گیا۔ یہ ہے اس گارمنٹس شاپ کی کہانی۔''
''حاتم بھائی، اب ذرا میری طرف بھی دھیان دو، یہ بتاؤ میں کیا کروں؟''
''اچھا اس کا پہلا سوال کیا ہے؟''
شامی خوش ہو گیا۔ ''خدا تمہارا بھلا کرے۔ اس کا

پہلا سوال ہے۔ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔''

''ہوں۔'' حاتم نے ہنکاری لی۔ ''ویسے یہ سوال پہلے بھی حل کر چکا ہوں۔ تم نے کہانیوں میں پڑھا ہوگا۔''

''ہاں حاتم بھائی، لیکن وہ پرانا زمانہ تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''آج نئے انداز سے اس سوال کو حل کرنا ہوگا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' حاتم طائی کھڑا ہوگیا۔

''کہاں چل دیے حاتم بھائی۔'' شامی نے پوچھا۔

''سوال کو حل کرنے۔ میں نیکی کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔''

''خوش رہو حاتم بھائی خوش رہو، لیکن جاتے ہوئے چائے کے پیسے دیتے جانا اور میرے لیے بھی چائے کا کہہ دینا۔ صبح سے میں نے چائے نہیں پی ہے۔''

''اور تو نے جو دو موبائل وصول کیے تھے، ان کے پیسے کہاں گئے؟'' حاتم طائی نے پوچھا۔

''وہ بیچنے کی نوبت ہی کہاں آئی۔'' شامی نے بتایا۔

''وہ تو تھانے دار نے اپنے بیٹوں کو گفٹ کے طور پر دے دیے۔ کیا قسمت ہے، موبائل بھی گئے اور محبوبہ بھی گئی۔'' شامی آنسو بہانے لگا۔

''اچھا اچھا، رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ محبوبہ واپس آجائے گی۔'' حاتم طائی نے تسلی دی۔

''لیکن تم اپنے کام کی ابتدا کہاں سے کرو گے؟'' شامی نے پوچھا۔

''یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم نے میری کہانیوں میں بھی پڑھا ہوگا کہ حاتم نے جب قدم اٹھالیا تو سمجھو وہیں سے کام شروع ہوگیا۔''

''جاؤ، خدا تمہارا بھلا کرے۔'' شامی نے دعا دی۔

حاتم چائے کے پیسے ادا کر کے ہوٹل سے باہر آگیا۔ سوال تھا ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ ایسی کون سی چیز ہوسکتی تھی۔ یقیناً کوئی دلچسپ اور حسین نظارہ ہی ہوگا یا پھر کسی کی سوہنی صورت ہوگی۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

تو پھر کہاں سے کام شروع کیا جائے۔ ایک بار حاتم کا دل چاہا کہ وہ لعنت بھیجے منیر شامی پر۔ خواہ مخواہ اس چکر میں کیوں پڑے۔ اس کی محبوبہ سے حاتم کا کیا فائدہ ہونے والا تھا۔ اس خواری سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنے گھر میں جا کر سو رہے۔

لیکن اسی وقت اندر کے حاتم نے آواز دی۔ ''خبردار حاتم، تو یہ کیا سوچنے لگا۔ یہ تو تیری روایت اور تیری شان کے خلاف ہے۔ تو نے اس غریب کو زبان دے دی ہے۔ اس کا ساتھ دے۔ اپنا قول پورا کر۔''

حاتم اپنے اندر کے اس انسان کی آواز سے تنگ آچکا تھا۔ یہ آواز ہر اس موقع پر اڑنگے لگا دیتی جب حاتم سکون سے آرام کرنے کی پلاننگ کرتا۔

حاتم تو یہ کر... حاتم سچ کا ساتھ دے... حاتم ظلم کی طرف سے آنکھیں مت بند کر۔ حاتم فلاں شخص کی مدد کر۔ اس کا ساتھ دے۔ وغیرہ وغیرہ اور حاتم ہر بار اس آواز کے چکر میں پھنس کر خوار ہوجاتا تھا۔

اچانک حاتم کی نظر ایک مرد درویش پر پڑی۔

وہ درویش ایک بڑے سے درخت کے نیچے دھونی جمائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی بے ہنگم داڑھی اس کے سینے پر جھول رہی تھی۔

حاتم کو احساس ہوا کہ شاید پہلے سوال کا جواب اس مرد خدا کے پاس ہوسکتا ہے یا کم از کم وہ اس سوال کے راز سے پردہ ضرور اٹھا سکتا ہے۔

حاتم بہت ادب کے ساتھ اس درویش کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ حاتم کی آہٹ سن کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ حاتم کو اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں جلال اور جمال کے کرشمے نظر آنے لگے۔

''لا ادھر دے۔'' درویش نے اپنا ہاتھ حاتم کی طرف بڑھا دیا۔ ''معرفت کے بندھن کمزور ہونے لگے ہیں۔ میرا رابطہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ لا جلدی کر۔''

''حضرت آپ کیا مانگ رہے ہیں؟'' حاتم نے پوچھا۔

''کیا تو طبق روشن لے کر نہیں آیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں جناب، میں تو کچھ نہیں لایا۔ میں تو آپ کے پاس اپنا ایک مسئلہ لے کر آیا ہوں۔'' حاتم نے کہا۔

''جا پہلے طبق روشن لے کر آ۔ پھر تیرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

''صاحب، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ طبق روشن کیا چیز ہے۔'' حاتم نے پوچھا۔ ''میں تو سیدھا سادہ حاتم طائی ہوں۔''

''کیا تو وہی حاتم طائی ہے، کہانیوں والا؟'' درویش نے اب حاتم میں دلچسپی ظاہر کی۔

''جی جناب، میں وہی ہوں۔'' حاتم نے انکساری سے گردن جھکالی۔

''تو پھر تو میرے ضرور کام آئے گا۔'' درویش نے کہا۔

''جناب میں تو خود آپ کے پاس کام لے کر آیا ہوں

اور آپ مجھے کوئی اور کام پکڑا رہے ہیں۔''
''فکر مت کرو، میں نے کہانیوں میں پڑھا ہے کہ تو سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔ تو اس وقت بھی تیرے ساتھ ایسا ہی کوئی مسئلہ ہوگا۔''
''جی جناب۔ ایسا ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔''
درویش ہنس پڑا۔ ''بس اتنی سی بات؟''
''جناب کیا آپ کو اس سوال کا جواب معلوم ہے؟'' حاتم نے بے تابی سے پوچھا۔
''ظاہر ہے، ورنہ میں ہنستا کیوں۔ میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں لیکن پہلے طبق روشن۔''
''کم از کم یہ تو بتا دیں کہ یہ طبق روشن ہے کیا؟''
''یہ ایک قسم کی آفاقی بوٹی ہے۔'' درویش نے بتایا۔ ''جس کو ایک خاص طریقے سے بنایا جاتا ہے اور جب بن جاتی ہے تو جاہل لوگ اسے چرس کہنے لگتے ہیں لیکن ہم جیسے لوگ طبق روشن کہتے ہیں۔ اس کو سگریٹ میں ڈال کر جب دم لگایا جائے تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اسے طبق روشن کہتے ہیں۔ اس کے فیض سے دور ونزدیک کے راز فاش ہو جاتے ہیں۔ انسان معرفت کی ساری منزلیں طے کر جاتا ہے۔''
''لیکن جناب یہ ملے گی کہاں؟'' حاتم نے پوچھا۔
''ہائی وے پر چلا جا، وہاں بہت سی بستیاں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کا یہی کام ہے۔''
''کتنی چاہیے آپ کو؟''
''بس ایک پاؤ لے آنا۔ قناعت کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزار لوں گا۔'' درویش نے کہا۔ ''بس اب جا، جلدی سے لے کر آجا، معرفت سے میرا رشتہ کمزور ہوتے لگا ہے۔''
حاتم، درویش سے رخصت ہو کر ہائی وے کی طرف چل پڑا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اسے بس کرنی پڑی تھی۔ ایک اسٹاپ پر اتر کر اس نے پان اور سگریٹ کے ایک کیبن کا رخ کیا۔ جہاں ایک پہلوان نما آدمی دکانداری کر رہا تھا۔
''بھائی! مجھے طبق روشن چاہیے۔ وہ کہاں سے ملے گا؟'' حاتم نے دریافت کیا۔
''خدائی خوار، یہ کون سا نام لیا ہے۔ طبق روشن، یہ کیا ہوتا ہے؟''
''جناب، عام زبان میں اسے چرس کہتے ہیں۔'' حاتم نے بتایا۔
''تو صاف صاف اردو میں بولو نا۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''سیدھے چلے جاؤ، ایک کچا مکان ہے۔ اس مکان کے دروازے پر کھڑا ہو کر آواز لگاؤ۔ ''لگ جائے دم، لگ جائے دم۔ تین دفعہ بولنا ہوگا پھر ایک آدمی باہر آئے گا۔ وہ تم سے پوچھے گا۔ ''الٹا لٹکنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔'' تم کو بولنا ہوگا۔ ''کھوپڑی گھوم جاتی ہے۔'' بس وہ تم کو چرس لا کر دے دے گا۔''
حاتم نے اس دکاندار کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے راستے پر چل پڑا۔ سڑک سے اتر کر کچے میں ایک راستہ اندر کی طرف جاتا تھا اسی راستے پر آگے جا کر وہ کچا سا مکان بنا ہوا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ حاتم نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ ''لگ جائے دم، لگ جائے دم، لگ جائے دم۔''
تیسری آواز کے بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر آ گیا۔ وہ ایک خطرناک صورت اور خطرناک مونچھوں والا آدمی تھا۔ اس نے حاتم کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر پوچھا۔
''الٹا لٹکنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟''
''کھوپڑی گھوم جاتی ہے۔'' حاتم نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے۔ کتنی چاہیے؟''
''ایک پاؤ۔'' حاتم نے بتایا۔
''لا پیسے نکال۔ تین سو روپے۔''
حاتم کی جیب میں اس وقت تین ہی سو روپے تھے۔ اس نے وہ نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔
''بس یہیں کھڑا رہ۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔''
وہ آدمی دروازے کے اندر چلا گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا تھا۔ اسی دوران ایک اور آدمی بھی آ نکلا۔ اس نے حاتم کی طرف دیکھا اور آواز لگائی۔ ''لگ جائے دم، لگ جائے دم، لگ جائے دم۔''
دروازہ کھلا اور وہی آدمی باہر آیا۔ اس نے پہلے کی طرح اس آدمی سے پوچھا۔ ''الٹا لٹکنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟''
''کھوپڑی گھوم جاتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے، کتنی چاہیے۔''
''پچیس کلو۔'' اس آدمی نے بتایا۔
''لا پیسے نکال۔''
اس آدمی نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر دوسرے کے حوالے کر دی۔ حاتم کے خیال میں وہ پچیس تیس ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔
حاتم کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ آدمی پچیس کلو لے کر کیا کرے گا۔ بہر حال یہ اس کا دردِ سر نہیں تھا۔ اب

جو بھی کرے۔

مکان والا آدمی اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں کئی بڑے بڑے شاپرز تھے۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا شاپر بھی تھا۔ اس نے حاتم کی طرف ایک پاؤ والا شاپر بڑھا دیا۔

''جاؤ، اب تم دونوں نکل لو۔'' اس نے کہا اور واپس اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

دونوں نے سڑک کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس آدمی کے پاس پچیس کلو کا وزن تھا۔ جبکہ حاتم کے پاس صرف ایک پاؤ، اسی لیے اس کی رفتار اس آدمی سے زیادہ تھی۔

لیکن وہ ابھی کچھ ہی فاصلے پر گئے تھے کہ پولیس کی ایک موبائل بھیانک قسم کے سائرن بجاتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

دو چار بندوق بردار پولیس والوں نے موبائل سے اتر کر دونوں کو گھیر لیا۔ ''اے رک جاؤ۔''

آگے جانے والا آدمی بھی رک گیا۔

''کیا ہے اس شاپر میں؟'' ایک پولیس والے نے حاتم کے پاس آ کر پوچھا۔

''جناب، اس میں طبق روشن ہے۔'' حاتم نے بتایا۔

اس دوران دوسرے پولیس والے اس آدمی کے شاپرز چیک کر رہے تھے۔

''اوئے، دکھا تو سہی، کیا ہوتا ہے یہ طبق روشن۔''

حاتم نے شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔ شاپر میں دیکھتے ہی وہ چیخ اٹھا۔ ''اوئے، چرس لے کر جا رہا ہے اور کہتا ہے طبق روشن۔ چل موبائل میں بیٹھ۔''

''جناب، میری بات تو سنیں، یہ تو میں کسی درویش کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔''

''دیکھ لیتے ہیں تیرے درویش کو، پہلے تجھ سے تو نمٹ لیں۔''

حاتم نے دیکھا کہ اس دوسرے آدمی کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ اپنے شاپرز سنبھالے آگے چل دیا تھا۔

''جناب، اس کو بھی تو پکڑیں۔ وہ کیوں جا رہا ہے؟'' حاتم نے احتجاج کیا۔

''بے وقوف انسان، لگتا ہے تو نے کبھی کسی بینک سے قرض نہیں لیا۔''

''نہیں جناب، آج تک اس کی نوبت نہیں آئی۔''

''اسی لیے تجھے اصول نہیں معلوم۔ دیکھ، جو بندہ بینک سے دو چار لاکھ روپے قرض لے لے، بینک والے قبر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور جو پچاس ساٹھ کروڑ لے لے، بینک والے اسے کچھ نہیں کہتے۔ الٹا سلام کرتے ہیں۔ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔''

''یہ تو الٹا دستور ہے جناب۔''

''اب یہاں یہی ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اس بندے کو جانے دیا۔ جو بیس پچیس کلو لے کر جا رہا تھا اور تجھے پکڑ لیا کیونکہ تیرے پاس صرف ایک پاؤ ہے۔''

''یہ تو ناانصافی ہوئی جناب۔''

''اب چل، ناانصافی کی اولاد۔ ابھی تجھے ڈرائنگ روم کی سیر کرواتے ہیں تو تجھے پتا چل جائے گا کہ ناانصافی کیا ہوتی ہے۔''

''یہ ڈرائنگ روم کیا چیز ہے جناب؟'' حاتم نے سوال کیا۔

''اوہو، تو یہ بھی نہیں جانتا۔'' پولیس والا ہنس پڑا۔ ''تو چل تو سہی۔ خود ہی کہے گا کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔''

حاتم اچھل پڑا۔ ''ہاں ہاں، یہی بالکل یہی... میں اسی کی تلاش میں تو نکلا تھا۔ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔''

''اب کیا بکواس کر رہا ہے۔ کس کی تلاش میں نکلا تھا؟''

''اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا جناب۔'' حاتم نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں حاتم طائی ہوں۔ میں منیر شامی کی مدد کے لیے نکلا ہوں۔''

''اچھا حاتم طائی، اب شرافت سے موبائل میں بیٹھ جا اور ڈرائنگ روم کی سیر کر۔''

''کیوں نہیں۔ اب تو میں بہت شوق سے بیٹھوں گا۔'' حاتم دوڑتا ہوا موبائل میں بیٹھ گیا۔

دو دنوں کے بعد اس شہر کے ایک چوک پر ایک آدمی دیکھا گیا جس کو چلنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ اور پورا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بند ہو چکی تھی۔ کپڑے پھٹ چکے تھے اور جو چیخ چیخ کر آواز لگا رہا تھا۔

''ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار میرے باپ کی توبہ۔ ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار میرے باپ کی توبہ۔''

راستہ چلتے ہوئے لوگ اس کی طرف دیکھتے اور ہنستے ہوئے یا اس کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

نویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا، مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں WWF کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہوکر اسپتال میں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "غلطی" کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا ختنہ صفت منگیتر اسحاق اپنے گاؤں کے زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آئے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راستے کو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان تمبر دارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کے کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آگئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں تمبر دارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا سرنگ تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔۔۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔۔۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر ستانجی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔۔۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کی باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ میں تاجور کو لے کے اس آستانے تک جا پہنچا۔۔۔ اور ایک ہیبت ناک واقعے کا چشم دید گواہ ہونے کے باعث ان کے قیدی بن چکے تھے۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہوگیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہوگیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے مگر یہاں بھی درگاہ کے کارندے ہمارے منتظر تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے کہا۔ ”اگر تم لوگوں کا موبائل فون ٹھیک ہوتا تو اب تک تمہیں یہ ساری خبریں پہنچ چکی ہوتیں۔ اب بھی تم ہمارا ایمونیشن بیگ کھول کر دیکھ سکتے ہو، اس میں تمہیں پردے والی سرکار کی باقیات مل جائیں گی۔ اس کی انگوٹھیاں اور مالائیں وغیرہ۔“

چند سیکنڈ تک کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں پھر دلام کی لرزاں آواز ابھری۔ ”پردے والی سرکار کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں تم نے چرائی ہوں گی... یا پھر...“

”ابھی تھوڑی دیر میں تمہارا باقی کا نشہ بھی ہرن ہو جانا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”تمہیں سب کچھ پتا چل جائے گا، لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ اب میں تمہیں اس آفر کے بارے میں بتاتا ہوں جو میں نے کی ہے۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ میں نے ہولے سے اپنا رخ پھیرا اور اس کے دھواں دھواں چہرے کی طرف دیکھا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں دلام! یہ ملنگی ڈیرا ختم ہو چکا ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لینا ہے۔ پھر تم لوگوں کی زندگی کا چانس ختم ہو جائے گا کیونکہ اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تم ہمیں چھوڑ دیتے ہو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لیں گے، اور اس نوری والے واقعے کو رپورٹ نہیں کریں گے۔ تمہیں سزا میں زیادہ سے زیادہ رعایت دلانے کا وعدہ بھی ہم کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تم میں سے ایک دو کو سلطانی گواہ بنا لیا جائے۔“

دلام کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ میگزین بیگ اس کے سامنے کھلا پڑا تھا اور اس میں سے پیر سائنا کی بیش قیمت انگوٹھیاں، مالائیں اور کڑے جھانک رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے دلام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”اگر سب کچھ واقعی اسی طرح ہو چکا ہے جس طرح تم بتا رہے ہو، تو پھر کیوں نہ ہم تمہیں چھلنی کر دیں اور اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔“

”میں نے تم سے کہا ہے نا دلام، اس جگہ کو گھیرے میں لینے کا کام شروع ہو چکا ہے۔“

”بکواس کر رہے ہو تم۔“ دلام نے رائفل کے دستے پر اپنے ہاتھوں کو بے قراری سے حرکت دی۔

یہی وقت تھا جب ایک بالکل غیر متوقع کام ہوا۔ میں نے رنگا کو دیکھا۔ اس نے اچانک دلام پر جست لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا، نوری کی لاش کے پاس گرا۔ دلام نے ٹریگر دبا دیا، تاہم گولیاں کھوہ کی چھت میں پیوست ہوئیں۔ اتنا موقع میرے لیے کافی تھا۔ میں نے قریبی محافظ پر چھلانگ لگائی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی طرف لڑھک گئی اور اس کا سر پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے ایک طوفانی گھونسے نے اس کا جبڑا توڑ ڈالا۔ تاجور اور ریشمی کے چلانے کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، پستول بردار محافظ میرا نشانہ لے رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر پھرتی کے علاوہ قسمت بھی ساتھ دیا کرتی ہے۔ میں نے جھک کر خود کو مہلک گولی سے بچایا... پھر بھاگ کر اس شخص کے چہرے پر ٹکر رسید کی... وہ گردن کے بل اس گڑھے میں گرا جو نوری کے لیے کھودا گیا تھا۔ اتیق نے زخمی ہونے کے باوجود اسے گڑھے کے اندر ہی دبوچ لیا۔ رنگا ابھی تک انچارج دلام سے لپٹا ہوا تھا اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دلام نے زوردار ٹانگ ماری اور رنگا کو دور گرا دیا۔ رائفل ابھی تک دلام کے ہاتھ میں تھی۔ ایک بلند چنگھاڑ کے ساتھ اس نے رنگا کو نشانہ بنانا چاہا مگر اس سے پہلے ہی ایک گولی اس کی چھاتی میں لگی اور وہ پشت کے بل گرا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، یہ رضوان تھا جس نے اس لڑائی میں پہلی گولی چلائی تھی۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ اناڑی ہے۔ میں نے اس سے رائفل جھپٹ لی۔ زخمی ہونے کے باوجود دلام اٹھنا چاہ رہا تھا مگر اس بار رنگا اس پر خنجر سے حملہ آور ہوا اور اس کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ بڑی وحشت تھی رنگا کے وار میں۔ شاید اس وحشت کے پیچھے وہ ”توہین“ تھی جو رنگا کو ڈیرے پر اور کچھ دیر پہلے یہاں بھی جھیلنی پڑی تھی۔

اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور نوری کی لاش نے بڑی دیر سے میری آنکھوں میں خون اتارا ہوا تھا۔ میں نے رائفل کو برسٹ پر سیٹ کیا اور پلک جھپکتے میں دو پہرے داروں کو بھون کر رکھ دیا۔ تیسرے پہرے دار نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا کہ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ پر فائر کرنے کے بجائے پلٹا اور بھاگ نکلا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ تقدیر فیصلہ دے چکی ہے۔ ان گھڑیوں میں یہاں وہی کچھ ہوگا، جو میں چاہوں گا۔ شاید اس وقت پورا ملنگی ڈیرا بھی یہاں پہنچ جاتا تو اسے مجھ سے بچا نہ سکتا... میں اس کے پیچھے لپکا۔ تاجور چلا رہی تھی۔ میں اس بندے کو ہرگز چھوڑنے والا نہیں تھا لیکن جو کچھ ہوا، اس کی اپنی غلطی

کی وجہ سے ہوا۔ اس نے بدحواسی میں ایک کھائی کو چھلانگ لگا کر پار کرنا چاہا، کھائی کچھ زیادہ چوڑی بھی نہیں تھی، بمشکل سات آٹھ فٹ رہی ہو گی لیکن ایک تو وہ بدحواس تھا، دوسرے قدرے فربہ جسم کا تھا۔ اس کا ایک پاؤں زمین پر پڑا لیکن دوسرا خلا میں رہ گیا۔ وہ بھیانک انداز میں چلایا اور الٹ کر نیچے گرا۔ ایک درخت کی جڑیں اس کے ہاتھ میں آئیں۔ وہ لٹک گیا۔ نیچے کم و بیش ساٹھ فٹ تک کچھ نہیں تھا۔ وہ گرتا تو نکیلے پتھروں سے ٹکراتا۔ اس کی رائفل ہاتھ سے نکل کر انہی پتھروں میں پہنچ چکی تھی۔ ''بچاؤ۔'' وہ پکارا۔

میں نے اوندھے گر کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی شاخ ٹوٹ گئی۔ وہ زندگی کی آخری پکار بلند کرتا ہوا گہرائی میں پتھروں پر جا گرا... اور جھاڑ جھنکاڑ میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بچنے کا امکان پانچ فیصد بھی نہیں تھا۔

میں پلٹا۔ پہرے دار کے بھاگنے اور اس کے کھائی میں گرنے کے سارے عمل میں بمشکل ایک منٹ لگا تھا۔ اس ایک منٹ کے دوران میں ہی کھوہ کے اندر ہونے والا معرکہ اختتام کو پہنچ گیا۔ ہماری مدد کرنے والا پہرے دار رنگا، دہانے کے پاس گرا پڑا تھا اور آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ میں رائفل کا پورا ایک برسٹ لگا تھا مگر اس برسٹ سے پہلے اس نے انچارج ولام کا کام تمام کر دیا تھا۔

میں نے رنگا کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا سر تھوڑا سا اونچا کیا۔ وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں رک رک کر بولا۔ ''چلے جاؤ... وہ بڑی جلدی... یہاں پہنچ جائیں گے...'' اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ اترنا شروع ہو گئی۔ اس نے بڑی نفرت سے ولام کی لاش کی طرف دیکھا۔

رنگا جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے بس اپنا بدلہ چکایا ہے۔ تم مجھے چھوڑو اور جاؤ یہاں سے۔''

پھر ایک دم اس کے جسم میں تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ ایک بار زور سے اینٹھ کر ختم ہو گیا۔

میں نے اس کا سر دوبارہ زمین پر ٹکا دیا۔ ہمارے اردگرد لرزہ خیز منظر تھا۔ ولام اپنے تین ساتھیوں سمیت اس کھوہ میں زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ پانچواں شخص ابھی کھائی میں گر کر جہنم واصل ہوا تھا۔ کھوہ میں پڑی چار لاشوں سے بہنے والا خون، سورج کی روپہلی کرنوں میں کچھ اور بھی سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ پانچویں لاش نوری کی تھی اور یہ لاش ہمارے دلوں کو خون کر رہی تھی مگر ہمارے پاس ماتم کا وقت نہیں تھا۔ تاجور ایک بار پھر روتی ہوئی نوری کی لاش سے چمٹ گئی تھی۔ ریشمی نے اس بدنصیب جواں مرگ کے پاؤں تھامے ہوئے تھے۔ ہم میں سے کسی کو یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ایک بار پھر اس کے چہرے پر سے کپڑا ہٹاتے۔ تاجور پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے اسے تقریباً جھڑک کر نوری سے علیحدہ کیا۔ بس ایک نظر اس کے ستم زدہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور چہرہ پھر سے ڈھک دیا۔ میں نے اکیلے ہی اس کی لاش کو اٹھا کر پہلے سے کھدے ہوئے گڑھے میں ڈالا۔ اس کی اپنی چادر ہی اس پر پھیلائی... اور پھر آمنا اسے اس گڑھے میں دفن کر دیا۔ یہ عارضی قبر بنانے میں رضوان اور انیق نے بھی میرا ساتھ دیا۔

اس کے فوراً بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے دور ہونا تھا۔ ملنگی ڈیرے سے ہمارا فاصلہ جتنا بڑھ جاتا، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ ریشمی ابھی تک غم سے نڈھال تھی۔ وہ گاہے گاہے مڑ کر عقب میں دیکھنے لگتی تھی۔ جیسے اسے اب بھی آس ہو کہ اس کا بابا جانی لنگڑاتا ہوا اور زمین پر ہاکی ٹیکتا ہوا اس تک پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

اگلے تین گھنٹے میں ہم نے پہاڑوں سے گھرے ہوئے دشوار گزار راستے پر حتی الامکان تیزی سے سفر کیا۔ ہر لحظہ یہی دھڑکا لگا تھا کہ ابھی کسی طرف سے ملنگی ڈیرے کے مشتعل ملنگ نمودار ہو جائیں گے اور ہم پر گولیوں کی بارش کر دیں گے۔ سورج اب نصف نہار پر چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کی ''کاٹ'' دھوپ کی تمازت نے کسی حد تک کم کر دی تھی۔ انیق کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی، زخمی ہونے کے باوجود وہ بڑی روانی اور تسلسل سے ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ ریشمی کے منہ سے گاہے بگاہے ''ہائے'' نکل جاتی تھی۔ تاجور بھی چند منٹ کے وقفے سے سسکنا شروع کر دیتی تھی۔ رات کے آخری پہروں میں ملنگی ڈیرے پر پیش آنے والے خونی واقعات جاگتی آنکھوں کا خواب لگتے تھے۔ رضوان کا ڈاکٹر ارم کو زخمی کر کے واش روم میں بند کرنا، ہمارا جنگلارے سے نکلنا اور پھر میرا تاجور تک پہنچ کر پردے والی سرکار کو ختم کرنا، بعدازاں کرنالی کے بندوں پر گولیوں کی بوچھاڑ اور خونخوار چیتوں کی ہلاکت... اور آخر میں ماضی کے نامور گول کیپر کا آخری ''یادگار کھیل''

میری نگاہوں میں ابھی تک وہ تصوراتی نقشہ جما ہوا تھا۔ خونخوار فارورڈز اور چٹان کی طرح جمے ہوئے گول کیپر کی یادگار ٹکر۔

دوسروں کی طرح دونوں لڑکیوں کا بھی تھکاوٹ اور پیاس کی شدت سے برا حال تھا۔ میں سب سے آگے تھے، مجھے عقب میں کراہ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ریشمی پہلو کے بل گری پڑی تھی۔ اس کے لمبے بال بھورے پتھروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اور تاجور نے اسے لپک کر اٹھایا۔ اس کو پکارا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کو جنبش دی۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھالیا۔ یہاں رک کر ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے تو اپنے لیے خطرات میں اضافہ کرلیتے۔

''وہ دیکھیں جی۔'' رضوان نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہم سب ہی چونک گئے۔ اونچے گھنے درختوں کے عقب میں لکڑی کا ایک تنہا گھر نظر آرہا تھا۔ یہ دو منزلہ گھر تھا، چھت مخروطی تھی۔ اس تنہا مکان کے اردگرد کٹے ہوئے درختوں کے چند ڈھیر دکھائی دے رہے تھے مگر انسان کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے ریشمی کو بہ آہستگی کندھے سے اتارا اور رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے تیار حالت میں کرلیا۔ رضوان نے بھی رائفل سونت لی لیکن میں جانتا تھا وہ اسے چلانے کی ہمت شاید ہی کرپائے گا۔ ہم دونوں احتیاط سے مکان کی طرف بڑھے۔ عقب میں ایک کھلی چھت والی جیپ کھڑی نظر آئی۔ اسے ترپال سے ڈھانپا گیا تھا۔ قریب ہی دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ بکریوں کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ یہاں کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔

ہم تھوڑا سا مزید آگے گئے تو اندازہ ہوا کہ گھر کی نچلی منزل میں کہیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر بج رہا ہے تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمیں ریشمی کی آواز سنائی دی۔۔۔ وہ گا رہی تھی۔ اب یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں تھا کہ اندر ٹیپ ریکارڈر پر ریشمی کی آواز کی کیسٹ چل رہی ہے۔ وہی دلسوز، دلگداز آواز جو کانوں کے راستے سیدھی دل پر اثر کرتی تھی۔ وہی پنجابی کافی کے بول۔ یہ آواز گواہی دے رہی تھی کہ اندر جو کوئی بھی موجود ہے، وہ ملنگی ڈیرے کے مجاوروں کا عقیدت مند ہے۔ ہم احتیاط سے آگے پیچھے چلتے کٹی ہوئی لکڑیوں کے درمیان سے گزرے اور چوبی گھر کے اندر پہنچ گئے۔ آواز ایک وسطی کمرے میں سے آرہی تھی۔ یہاں لمبے بالوں والا ایک نوجوان لحاف اوڑھے اونگھ رہا تھا بلکہ سو رہا تھا۔ کمرے میں ملنگی ڈیرے میں موجود مستاں مائی کے مزار کی ایک پوسٹر نما تصویر بھی تھی دیگر نشانیاں بھی ظاہر کرتی تھیں کہ یہ شخص ملنگی ڈیرے کے عقیدت مندوں میں سے ہے۔ اس شخص کو بزور بازو مطیع کرنے سے بہتر تھا کہ ہم خود کو ملنگی ڈیرے کے مرید ظاہر کرتے اور یوں اس کی ہمدردی حاصل کرتے۔

میں اور رضوان جس طرح خاموشی سے آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ انیق اور تاجور مل کر ریشمی کو ہوش میں لاچکے تھے، تاہم وہ ابھی تک خود سے کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھی۔ میں نے انیق اور تاجور وغیرہ کو بھی سمجھا دیا کہ ہمیں کیا اور کیسے کرنا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ کمرے میں سوئے ہوئے نوجوان کے دیگر ساتھی بھی اردگرد موجود ہوں اور جلد ہی یہاں پہنچ جائیں۔ بہرحال ایک بات واضح تھی۔ یہ لوگ ابھی تک اس قیامت سے بے خبر تھے جو اٹھارہ بیس کلومیٹر پیچھے ملنگی ڈیرے پر ٹوٹ چکی تھی۔

ہم نے پروگرام کے مطابق ریشمی کو ایک لمبی چادر اس طرح اوڑھا دی کہ اس کا چہرہ اور لباس اس میں چھپ گیا۔ انیق نے اپنا زخمی کندھا چھپانے کے لیے ایک کمبل اوڑھ لیا۔ اپنی دو رائفلیں ہم نے وہیں درختوں میں چھپا دیں۔ بس ایک رائفل انیق نے اپنے کمبل کے نیچے گھسائے رکھی۔ ہم نے جا کر لمبے بالوں والے شخص کو جگایا۔ وہ پہلے تو حیران ہوا پھر علیک سلیک کے بعد ہم کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ ہم چارپائی پر بیٹھ گئے۔ تاجور نے ریشمی کو ایک خالی چارپائی پر لٹادیا اور اسے چادر اوڑھا دی۔

لمبے بالوں والے نے ریشمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہن جی کو کیا مسئلہ ہے بھرا جی؟''

''بیمار ہے۔ بہت علاج کرائے۔ کوئی فرق نہیں پڑا۔ ملنگی ڈیرے لے کر جارہے ہیں۔ شاید رب سوہنا کوئی کرم کردے۔'' میں نے کہا۔

''کہاں سے آرہے ہیں آپ؟'' لمبے بالوں والے نے پوچھا۔

میں اور رضوان اس سوال کا جواب پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ میں نے پلندری کے ایک قریبی گاؤں کا نام لیا اور بتایا کہ ہم پاپیادہ ڈیرے کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔

''آپ کو تو کافی لمبا سفر کرنا پڑے گا۔'' اس شخص نے کہا۔

''سفر تو واقعی لمبا ہے۔ بس اوپر والا کرم کردے اور

ہماری مریضہ ٹھیک ہو جائے تو پھر کوئی تکلیف... تکلیف نہیں ہے۔''

''کرم تو ضرور کرے گا اوپر والا۔ سرکار جی کے ہاتھ میں بڑی شفا دی ہے نیلی چھتری والے نے۔ مردے زندہ ہونے لگتے ہیں۔'' لمبے بالوں والے نے بڑی عقیدت سے اوپر نیچے سر ہلایا... پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسے اس سلسلے میں، میں تم لوگوں کی مدد کرسکتا ہوں۔''

''وہ کس طرح؟'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''کل رات کو ''بڑا لنگر'' ہے ڈیرا شریف پر۔ میرا پروگرام بھی صبح سویرے جانے کا بن رہا ہے اگر تم لوگ چاہو تو...''

''مگر ہم تو جلدی جانا چاہ رہے ہیں۔'' رضوان نے کہا۔

''موسم خراب ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں بارش شروع ہو جائے۔ تم لوگ پیدل نکلو گے تو بھی کل سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکو گے۔''

موسم واقعی تبدیل ہو رہا تھا۔ دھوپ غائب ہو گئی تھی اور ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ ہماری گفتگو جاری رہی۔ لمبے بالوں والے کا نام یاسین معلوم ہوا۔ وہ اور اس کا باپ حاجی نیاز یہاں لکڑی کی کٹائی کا کام کرتے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر انھوں نے ایک بڑی ٹرالی والی آرا مشین بھی لگا رکھی تھی۔ آج یہاں چھٹی تھی اس لیے ورکشاپ میں کوئی مزدور نظر نہیں آ رہا تھا۔ حاجی نیاز صاحب بھی قریبی قصبے میں گئے ہوئے تھے۔ انھیں شام کو آنا تھا۔ یاسین کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پردے والی سرکار کا بہت بڑا عقیدت مند ہے لیکن اس کے والد کی رائے مختلف ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ روشن خیال تھے بلکہ وہ کسی اور گدی نشین کے پیروکار تھے، اپنے بیٹے اور بہو کا پردے والی سرکار سے عقیدت رکھنا انھیں پسند نہیں تھا۔

میں نے یاسین سے پوچھا۔ ''اگر ہم کل آپ کے ساتھ جاتے ہیں تو پھر ہمیں رات یہاں گزارنا پڑے گی۔ کیا آپ کے والد صاحب برا تو نہیں منائیں گے؟''

''اس کا انتظام میں کرلوں گا۔'' یاسین پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''آپ اوپر والے بڑے کمرے میں سو جانا۔ میں باہر سے تالا لگا چھوڑوں گا۔ صبح سویرے، ابا جی نماز کے بعد سو رہے ہوں گے، ہم نکل جائیں گے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی بادل گھر کر آنے لگے اور دوپہر میں ہی شام کا سماں محسوس ہونے لگا۔ فی الوقت یہ ٹھکانا تو ہمارے لیے موزوں تھا لیکن اگر ملنگی ڈیرے کے مشتعل ملنگ ہمیں کھوجتے ہوئے یہاں پہنچ جاتے تو معاملہ سنگین ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس طرح کے رسک تو اب ہمیں لینا ہی تھے۔

میں نے یاسین سے پوچھا۔ ''کوئی اور بھی ہوگا، آپ کے ساتھ؟''

''بس ایک دوست ہے اور دو جانور۔''

''جانور؟''

''ہاں، وہ سامنے جو دو بکرے بندھے ہیں۔ وہ ڈیرے پر قربان کرنے ہیں۔ لنگر میں حصہ ڈالنے کے لیے۔'' یاسین نے جواب دیا۔

''یہ بڑا لنگر کیوں ہو رہا ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

یاسین کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آئی۔ عقیدت بھرے انداز میں بولا۔ ''سرکار جی کے آستانے پر ایک ''خوشی'' ہے۔ وہ نکاح کر رہے ہیں۔ پاک بہن کا نام سنا ہوا ہے آپ لوگوں نے؟''

''وہ... جن کی آواز بہت پسند کی جا رہی ہے؟'' میں نے کہا۔

''پسند ہی نہیں کی جا رہی بلکہ لوگ عشق کرتے ہیں اس آواز سے۔ وہ دراصل... ڈھائی سو سال پہلے کی مستاں مائی کی آواز ہے۔'' یاسین بڑی سادہ لوحی سے اس آواز کے اور پاک بہن کے قصیدے پڑھنے لگا۔

وہ جانتا نہیں تھا کہ اس سے چند قدم کی دوری پر جو ''بیمار لڑکی'' شال اوڑھے چارپائی پر بے سدھ پڑی ہے، یہ وہی پاک بہن ہے اور وہ جس سرکار جی کے گن گا رہا ہے وہ اپنا منکا تڑوا کر راہی ملکِ عدم ہو چکا ہے اور وہاں اب بڑے لنگر کے بجائے بڑا سیاپا ہونے والا ہے۔

بارش شروع ہونے والی تھی۔ سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی کہ ہم رات یہاں گزاریں گے اور صبح یاسین کے ساتھ ملنگی ڈیرے جائیں گے۔ یاسین ایک ساتھ تین ''پیر بھائی'' پا کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ وہ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھا کر ہمیں اوپر لے آیا اور وہ کشادہ کمرا دکھایا جہاں چار عدد چارپائیاں موجود تھیں اور لحاف وغیرہ پڑے تھے۔ یہ جگہ یقیناً مزدوروں کے سونے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ایسے ہی تین چار کمرے یہاں مزید موجود تھے۔ ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ مجھے اس اسلحے کی فکر ہو رہی تھی جو ہم باہر درختوں میں چھوڑ آئے تھے۔ جب تاجور اور رضوان سہارا دے کر ریشمی

کو اوپر لا رہے تھے، میں بہانے سے باہر نکلا۔ جھاڑیوں میں جا کر میں نے دونوں رائفلوں اور ان کے ایمونیشن کو ایک پلاسٹک میں لپیٹا اور انہیں اچھی طرح خشک ٹہنیوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھانپ دیا۔

سردیوں کی شام نے جلدی ہی پر پھیلا لیے۔ بارش جاری تھی۔ ہمارے لیے صورتِ حال کسی بھی وقت دھما کا خیز ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انیق نے اپنے کمبل کے نیچے آٹو میٹک رائفل کو بالکل تیار حالت میں رکھا ہوا تھا۔ تاجور اور ریشمی دونوں منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھیں اور یقیناً دونوں ہی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ”کوئی آ رہا ہے۔“ اچانک انیق نے چونک کر کہا۔

کسی گاڑی کے انجن کی مدھم گھرر گھرر سنائی دے رہی تھی۔ ہم چوکس ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ ملنگی ڈیرے کے ملنگ ہی ہوں۔ یاسین نے ہمارے کمرے میں خورونوش کا سامان رکھ دیا تھا اور باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم کمرے میں کسی طرح کی آواز پیدا نہ کریں۔ یہ احتیاط اس نے اپنے والد بزرگوار کی وجہ سے کی تھی۔

کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی موجود تھی۔ میں نے اس کی درز میں سے جھانکا... ایک جیپ نما گاڑی تیزی سے اچھلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر رکی تو اس میں سے فربہ جسم اور کھچڑی داڑھی والے ایک حاجی صاحب اترے۔ یقیناً یہی یاسین کے والد گرامی تھے۔ سر پر چھتری تانے ہوئے وہ تیزی سے مکان میں داخل ہو گئے۔ جیپ نما گاڑی انہیں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

”لو جی، مالک مکان تو آ گیا۔ اب آواز بالکل پیدا نہیں کرنی۔“ میں نے ساتھیوں سے کہا۔

کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ یاسین کی ہدایت کے مطابق میں نے اس کی لو بہت نیچی کر دی۔ سیڑھیوں کے پاس سے باتوں کی آواز آنے لگی۔ حاجی صاحب کسی بات پر بیٹے سے بحث کر رہے تھے، غالباً اسے کہیں جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ کسی وقت ان کی آواز خاصی ترش ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ یاسین چھتری لیے ہوئے برآمد ہوا اور اپنے سوزوکی لوڈر کی طرف چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس کا لوڈر ہچکولے کھاتا ایک جانب جا رہا تھا۔ ”پتا نہیں یہ کہاں گیا ہے؟“ انیق نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

”چلو جہاں بھی گیا ہے لیکن صبح سے پہلے واپس آ جائے۔“ میں نے دعائیہ انداز اختیار کیا۔

ابھی یاسین کو گئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ رضوان ایک بار پھر پکار اٹھا۔ ”لگتا ہے جی، اب کوئی اور گاڑی آ رہی ہے۔“

اندھیرا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ میں نے لحاف سے نکل کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ یہ ایک نہیں دو گاڑیوں کی روشنیاں تھیں۔ وہ بڑی تیزی سے اس ورکشاپ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ہمارے خدشات درست ثابت ہو گئے۔ ان گاڑیوں میں سے جو لوگ برآمد ہوئے، وہ ملنگی ڈیرے کے مسلح محافظ تھے۔ ایک فربہ شخص کو چھتری کے سائے میں باہر لایا گیا۔ 86 ماڈل ٹویوٹا کار کی روشنی اس شخص پر پڑی اور میں پہچان گیا۔ یہ ملنگی ڈیرے کا بڑا مجاور کرنالی تھا۔ لکڑی کے پل کے پاس ڈیرے کے محافظوں سے ہمارا جو زوردار ٹاکرا ہوا تھا، اس میں یہ کرنالی ہی محافظوں کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کی آگ اگلتی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ”یہ سرکار جی کے قاتل ہیں، ان کو مار دو... ٹکڑے کر دو ان کے۔“

اب بھی وہ یقیناً اسی موڈ میں تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہماری نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے اس کی مدھم آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت حاجی صاحب کے سامنے موجود تھا اور گرج رہا تھا۔ ”اور کتنے لوگ ہیں یہاں؟“

حاجی صاحب نے ہراساں لہجے میں جواب دیا۔ ”آج تو صرف میں اور میرا بیٹا ہیں۔ آج چھٹی تھی نا۔ مزدور وغیرہ گھروں کو گئے ہوئے ہیں۔“

”بیٹا کہاں ہے تمہارا؟“ کرنالی نے تحکم سے پوچھا۔

”وہ ذرا قصبے تک گیا ہے، ڈیزل کا انتظام کرنے۔ سویرے کام شروع ہونا ہے نا۔“

”تم کتنی دیر سے ہو یہاں؟“

”کوئی ڈیڑھ گھنٹا تو ہو گیا ہے جی۔“

”کسی اور کو دیکھا ہے تم نے یہاں؟“

”نہیں جی، بارش ہو رہی ہے۔ مجھے تو کوئی راہ گیر بھی نظر نہیں آیا۔ یاسین نے کسی کو دیکھا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

پھر آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ڈیرے کے محافظ گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لے رہے ہیں۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آہٹیں سنائی دیں۔ لکڑی کے فرش پر دندناتے قدموں کی صدا کانوں میں پڑی۔ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بھی آ رہا تھا۔ ہم نے سانس تک روک لیے۔ کسی نے لاک دروازے سے باہر جھولتے ہوئے قفل کو دیکھا اور رسمی

انداز میں قفل کو ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ اس موقع پر کسی کو کھانسی یا چھینک وغیرہ بھی آجاتی تو کام بگڑ سکتا تھا۔ اوپر آنے والے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلے گئے۔ اب کرنالی اور حاجی نیاز صاحب باتیں کررہے تھے۔

کرنالی نے کہا۔ ''پانچ لوگ ہیں۔ تین مرد اور دو لڑکیاں۔ مردوں میں سے ایک زخمی بھی ہے۔ آج صبح سویرے ڈیرے سے فرار ہو کر اس طرف آئے ہیں۔''

حاجی نیاز نے کہا۔ ''ہم پوری خبر رکھیں گے جی۔ اگر کوئی مشکوک بندہ نظر آیا تو آپ کو فوراً اطلاع دیں گے۔''

''لکھو... یہ ایک موبائل نمبر لکھو۔'' کرنالی نے حکمیہ انداز میں کہا۔

حاجی نیاز غالباً نمبر لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک دوسرا مجاور بھاری آواز میں بولا۔ ''ان کو خود چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس اطلاع دینی ہے۔ ان کے پاس ہتھیار وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں۔''

''جو حکم جناب۔'' حاجی نیاز نے نیازمندی سے کہا۔ (مجاوروں نے ملنگی ڈیرے پر گزرنے والی قیامت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا)

کچھ مزید ہدایات دینے کے بعد ملنگی ڈیرے کے مشتعل مجاور باہر نکل گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی گاڑیوں پر سوار ہو کر وہاں سے جارہے تھے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی۔

اگلے آدھے گھنٹے تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ رہ رہ کر تاریکی میں چوٹیوں پر برق لہراتی تھی اور پھر بادل دھاڑنے لگتے تھے۔ یاسین ابھی تک واپس نہیں آیا تھا جو اشیائے خورونوش وہ چھوڑ گیا تھا، ان میں بسکٹ، فروٹ، بن، ڈبا بند دودھ اور اس قسم کی دیگر چیزیں تھیں۔ ہم نے کچھ پیٹ پوجا کی۔ لڑکیوں نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی دوران میں ایک بار پھر کسی گاڑی کے انجن کا شور سنائی دینے لگا۔ کیا محافظ اور مجاور دوبارہ آگئے ہیں؟ پہلا خیال یہی ذہن میں ابھرا۔

''لگتا ہے کہ یہ یاسین ہے۔'' رضوان نے گویا دل کو تسلی دینے کے لیے کہا۔

بہرحال انجن کی آواز بتارہی تھی کہ یہ سوزوکی پک اپ نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر بعد کسی ٹرک کی روشنیاں دکھائی دیں۔ ٹرک ہچکولے کھاتا ہوا آیا اور مکان کے قریب آکر رک گیا۔ ٹرک کے آڈیو ٹیپ پر زور شور سے قوالی بج رہی تھی... بھیک ملے... مجھ کو بھیک ملے... لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی۔

کچھ لوگ ٹرک سے اتر رہے تھے۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی تو سارا منظر دکھائی دیا۔ یہ شلواروں قمیصوں والے ڈیڑھ دو درجن لوگ تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس کلہاڑیاں بھی تھیں۔ یہ واضح طور پر اس ورکشاپ کے مزدور تھے۔ جنہوں نے صبح کام شروع کرنا تھا۔ ایک رکھوالی کا جسیم کتا اور ایک رائفل بردار چوکیدار بھی دکھائی دیا۔ یہ سب لوگ باتیں کرتے اور شور مچاتے اندر آگئے۔ ٹرک انہیں اتار کر واپس چلا گیا تھا۔ اس ویران گھر میں اچانک ہی گہما گہمی کی فضا بن گئی تھی۔ ہٹے کٹے مزدور گلا پھاڑ پھاڑ کر باتیں کررہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ اسی اثنا میں ہمارا میزبان یاسین بھی اپنی پک اپ پر سوار واپس آگیا۔ اس کے آنے کے بعد نسبتاً خاموشی ہوگئی۔ صورتِ حال سے اندازہ ہورہا تھا کہ اب ہمارے مسائل بڑھنے والے ہیں۔ مجاوروں نے حاجی نیاز کو بتادیا تھا کہ ملنگی ڈیرے سے فرار ہونے والے افراد پانچ ہیں اور دیگر تفصیل بھی بتائی تھی۔ اب یہ تفصیل حاجی نیاز کی زبانی یاسین کو بھی معلوم ہونے والی تھی۔ اس کے بعد یاسین کا دھیان یقیناً ہماری طرف جاتا تھا۔ بہرحال اگلے چار پانچ منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا اور اس نے ہمارے لیے صورتِ حال کو کافی بہتر کردیا۔

سیڑھیوں کے نچلے سرے پر یاسین اور اس کے والد حاجی نیاز کے درمیان جو بات چیت ہوئی، وہ صاف صاف ہمارے کانوں میں پڑی۔ حاجی نیاز نے خشک لہجے میں بیٹے کو بتایا۔ ''تمہارے آنے سے پہلے ملنگی ڈیرے کے کچھ بہروپیے (ملنگ) آئے تھے یہاں، ایک وکھری ہی خبر سنا گئے ہیں۔''

''کیا ہوا؟'' یاسین نے پوچھا۔ یاسین کے لہجے سے عیاں تھا کہ اس نے مجاوروں کے لیے بہروپیوں کا لفظ مشکل سے ہضم کیا ہے۔

''وہ کہہ رہے ہیں کہ ڈیرے سے کچھ بندے فرار ہوئے ہیں صبح منہ اندھیرے... اور وہ اسی علاقے میں آئے ہیں۔ دو مرد ہیں اور تین عورتیں، ایک مرد زخمی بھی ہے۔'' (حاجی نیاز نے غالباً کمزور یادداشت کے سبب تین مردوں اور دو عورتوں کو الٹ کر دو مرد اور تین عورتیں بتادیا تھا)

''بھاگے کیوں ہیں؟'' یاسین نے پوچھا۔

''یہ تو اُن کو پتا ہوگا، یا پھر ان مشٹنڈے مجاوروں کو۔''

حاجی نیاز نے بیزاری سے کہا۔

اس کے بعد باپ بیٹے کی گفتگو ختم ہو گئی۔ کیونکہ آہٹوں سے اندازہ ہوا تھا کہ یاسین پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ وہ بالائی منزل پر آیا لیکن ہمارے کمرے کی طرف نہیں آیا۔ شاید ایک قریبی کمرے میں چلا گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ بالائی منزل پر یاسین ہی کو تصرف حاصل ہے۔

حاجی نیاز کو اعداد و شمار میں جو غلطی لگی وہ ہمارے حق میں بہتر تھی۔ مزید بہتری یہ ہوئی تھی کہ باپ بیٹے میں گفتگو زیادہ طول بھی نہیں پکڑ سکی تھی۔ کرنالی اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا تھوڑا بہت حلیہ بھی حاجی نیاز کو بتایا تھا، یہ حلیہ وغیرہ بھی فی الحال حاجی نیاز تک ہی محدود رہا تھا۔

انیق کا زخم تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ بہت برداشت کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے ریشمی کی سسکیاں سنائی دے جاتی تھیں۔ وہ لحاف میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ میں تاجور کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ خود کو سنبھالے بلکہ ریشمی کو بھی سنبھلنے میں مدد دے۔ ہمیں سخت حالات نے گھیرا ہوا ہے اور اس میں ہمیں ہمت حوصلے کی ضرورت ہے۔ لحافوں اور کمبلوں کے باوجود ہمیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں انگیٹھی کی ضرورت تھی مگر انگیٹھی مہیا ہونے کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔ باہر بارش برستی رہی اور بادل گرجتے رہے۔ نیچے مزدوروں کی ہاہاکار بتدریج کم ہو گئی۔ یقیناً وہ سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ بہرحال رکھوالی کا کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ شاید اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس چاردیواری میں کچھ غیر مانوس لوگ بھی موجود ہیں۔

رات کوئی بارہ بجے کا وقت ہو گا جب کسی نے آہستہ سے دروازہ ہلایا۔ ''کون؟'' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''میں یاسین۔'' سرگوشی میں جواب ملا۔

وہ بغیر آواز پیدا کیے تالا کھول رہا تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی گرا دی۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا اور دروازہ بولٹ کر دیا۔ ریشمی اور تاجور رو رو کر سو چکی تھیں۔ رضوان بھی اونگھ رہا تھا۔ بہرحال میں اور انیق جاگ رہے تھے۔ انیق نے کمبل اوڑھے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور گھٹنوں تک لحاف لیا ہوا تھا۔ اس کے لحاف کے نیچے سیون ایم ایم بالکل تیار حالت میں موجود تھی اور کسی بھی خطرے کی صورت میں آگ اگل سکتی تھی۔ یاسین نے لالٹین کی لو اونچی کر کے رضوان سے ہماری صورتیں دیکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں موہوم سا شک موجود رہا ہو۔ بہرحال دو چار سوال پوچھنے کے بعد وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے بتایا۔ ''سنا ہے کہ ملنگی ڈیرے سے کچھ لوگ کوئی ناجائز کام کر کے ہمارے علاقے کی طرف آئے ہیں۔ ڈیرے کے محافظ ان کا پیچھا کر رہے ہیں، کوئی اسلحہ وغیرہ بھی ہے ان کے پاس۔''

میں نے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکیڑے۔ انیق اور رضوان نے بھی تشویش کا اظہار کیا۔ باہر رکھوالی والا کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔

''کہیں کسی کو مار کر تو نہیں بھاگے یہ لوگ؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' یاسین بولا پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

میں نے کھدر کے لحاف کے نیچے کسمساتی ہوئی ریشمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بہت درد ہو رہا ہے، اس کے کندھوں میں، کوئی درد کی دوا... پین کلر مل جائے گی؟''

''ہاں، ہاں، درد والی گولیاں ہیں میرے پاس بلکہ میں نے تو ٹیکا بھی رکھا ہوا ہے۔ مزدوروں کو چوٹیں وغیرہ لگتی رہتی ہیں اس لیے علاج معالجے کا سامان رکھنا پڑتا ہے۔''

''ٹیکا ہے تو لے آؤ۔ میں لگا لوں گا اور گولیاں بھی لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ باہر گیا اور یہ دونوں چیزیں لے آیا۔ اس نے تکلیف کی نوعیت کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ مریضہ سے میرا کیا رشتہ ہے۔ میں نے بتایا کہ وہ میری بھابی ہے۔ رضوان کو اس کا شوہر بتایا۔ یاسین نے ہم سے ہمارے نام اور کوائف وغیرہ پوچھے۔ ہم نے بتا دیے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ جاتے جاتے یاسین نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم لوگ تیار رہنا ہم نے صبح پانچ بجے یہاں سے نکل جانا ہے۔ ناشتے کا سامان میں پک اپ میں رکھ لوں گا۔ ہم کہیں بھی رک کر ناشتا کر لیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے یاسین بھائی! ہم تیار ہوں گے۔''

یاسین کے باہر جانے کے بعد میں نے اندر سے دروازے کو پھر بولٹ کیا اور لالٹین قریب رکھ کر انیق کا زخم دیکھا۔ گولی سو فیصد اندر ہی تھی۔ کندھا سوج گیا تھا اور خون رس رس کر پٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ میں ایک مرتبہ کوپن ہیگن میں اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے زخم کی تکلیف کتنی شدید ہوتی ہے۔ انیق

کی پیشانی بار بار پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کی پٹی بدلی۔ پین کلر گولیاں کھلائیں اور پھر انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ زخم لگے اب تقریباً 20 گھنٹے ہو چکے تھے۔ خطرہ تھا کہ زہر پھیلنا نہ شروع ہو جائے۔ بہر حال ابھی گولی نکالنے کے سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

میں انیق کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا اور اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگا۔ ملنگی ڈیرے کے تہلکہ خیز مناظر ایک بار پھر ہماری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ پردے والی سرکار... کا ریشمی کو قتل کرنے کی کوشش کرنا ایک سنسنی خیز واقعہ تھا اور اس واقعے سے زیادہ سنسنی خیز اس کا خود ہلاک ہونا اور پھر بے پردہ ہونا تھا۔ اس کا جلا ہوا چہرہ، عبرت کی مثال تھا۔ یہ شخص جو اصل میں پیر ساتا تھا کوئی سات برس قبل چاند گڑھی سے جان بچا کر بھاگا اور ان پہاڑیوں میں آبسا۔ یہاں اس نے بڑی تیزی سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی اور رنگ برنگی شفائی پڑیوں کی آڑ میں سادہ لوح لوگوں کو ایلوپیتھک دوائیں دینا شروع کیں۔ دوسرے لفظوں میں مسیحا بن کر بیٹھ گیا۔ کل رات ہم نے اس "مسیحا کی گندی کہانی کو" دی اینڈ لگا دیا تھا مگر ابھی اس کا پورا اینڈ کہاں ہوا تھا۔ پیر ساتا تو بے شک مر گیا تھا لیکن اس کا لختِ جگر پیر ولایت چاند گڑھی کے علاقے میں موجود تھا اور اس نے بھی باپ کی طرح اپنا کاروبار خوب چمکایا ہوا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی محسوس ہوئی کہ اب پردے والی سرکار کو پیر ساتا کی حیثیت سے پہچان لیا جائے گا اور اس کے کرتوت چاند گڑھی والوں کے سامنے بھی آئیں گے۔

اچانک لحاف کے نیچے ریشمی ہچکیاں لے لے کر بلند آواز سے رونے لگی۔ اس کے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہو گیا تھا۔ "چپ کرو ریشمی! آواز باہر جا رہی ہے۔" میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔

"بابا جانی... میرے بابا جانی..." وہ بلک کر بولی۔

تاجور خود بھی غم کے گھیرے میں تھی لیکن اس موقع پر اس نے ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ اس نے لپک کر ریشمی کا منہ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور اسے اپنے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ اسے پیار سے ڈانٹ بھی رہی تھی۔ باہر موجود کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی آواز ہمیں بڑی بری لگ رہی تھی۔

☆☆☆

صبح ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ یاسین نے ہمارے کمرے کے دروازے کا تالا آواز پیدا کیے بغیر کھولا۔ ہم نے اندر سے چٹخنی اتار دی۔ ہم پہلے سے تیار تھے۔ یاسین نے ہمیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دبے پاؤں بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اترے اور گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ ایک بڑے ہال کمرے میں کئی مزدور، گدیلے بچھائے اور لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ ان کے خراٹے پورے ہال میں گونج رہے تھے۔ ان کے قریب سے گزر کر ہم باہر نکلے۔ بارش رک چکی تھی مگر بادل موجود تھے اور بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہم سوزوکی پک اپ تک پہنچ گئے۔ اس کا انجن گرم کرنے کے لیے یاسین کے دوست نے اسے اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ پک اپ کے کھلے حصے پر ترپال کی چھت ڈالی گئی تھی۔ دو بکرے ہم سے پہلے ہی پک اپ پر سوار ہو چکے تھے۔ یہ قربانی کے بکرے تھے۔ یاسین نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بیبیوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ جاؤ۔ ہم آگے بیٹھ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ چار لوگ آگے کیسے بیٹھو گے؟"

وہ بولا۔ "نہیں، یہ میرا دوست نذیر ہمارے ساتھ نہیں جارہا۔ ہم تین آگے آسانی سے آجائیں گے۔"

ہمارے لیے یہ بہتر صورت حال تھی۔ رضوان اور انیق آگے کیبن میں یاسین کے پاس چلے گئے۔ میں نے ریشمی اور تاجور کو سہارا دے کر پیچھے بٹھا دیا۔ یہاں فوم کی عارضی نشستیں تھیں۔ جب پک اپ روانہ ہونے والی تھی، میں پیشاب کے بہانے جھاڑیوں میں چلا گیا۔ دونوں رائفلیں میں نے بڑی احتیاط سے کمبل کے نیچے چھپائیں اور واپس پک اپ میں آبیٹھا۔ تاریکی کی وجہ سے یاسین اور اس کے ساتھی کو بالکل شک نہیں ہوا کہ میں جھاڑیوں میں سے کچھ نکال کر لایا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد پک اپ ہچکولے کھاتی وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ اس کا رخ واپس ملنگی ڈیرے کی طرف تھا لیکن میں جانتا تھا کہ پک اپ نے زیادہ دیر اس رخ پر نہیں چلنا۔ انیق کے شال نما کمبل کے نیچے چھوٹی نال کی رائفل موجود تھی اور وہ یہ رائفل یاسین کو دکھا کر، کسی بھی وقت اسے پک اپ کا رخ کوٹلی کی طرف موڑنے پر مجبور کرسکتا تھا۔

ہچکولوں کی وجہ سے قربانی کے دونوں جانور ڈگمگا رہے تھے۔ کبھی وہ مجھ پر گرتے کبھی تاجور اور ریشمی پر۔ جگہ

تنگ تھی۔ ہمیں یا ان کو چوٹ لگنے کا خدشہ تھا۔ میں نے ان کی رسیاں تنگ کر دیں۔

ہم ورکشاپ سے قریباً تین کلومیٹر دور آچکے تھے، جب میری توقع کے مطابق پک اپ ایک جگہ رک گئی۔ کیبن کی طرف سے یاسین اور انیق کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یاسین کی ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

انیق نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہیں یا تمہاری گاڑی کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہنچائیں گے۔ بس چپ چاپ ہمیں وہاں پہنچا دو جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔ تمہیں تمہارا کرایہ تک دے دیں گے ہم۔''

''مم... مگر آپ تو...''

''دیکھو فضول میں وقت برباد مت کرو۔ ورنہ ہمیں سختی کرنا پڑے گی۔'' انیق نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

''کہیں تم لوگ وہی تو نہیں، جن کو محافظ ڈھونڈ رہے ہیں؟'' یاسین نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''تم جو بھی سمجھنا چاہتے ہو، سمجھ لو۔'' انیق پھنکارا۔ ''مگر اب اپنی اس ماں کا اسٹیئرنگ موڑو اور چلو جس طرف میں بکواس کر رہا ہوں۔'' انیق نے ایک گینگسٹر کی سی زبان بولی تو یاسین کا پتا پانی ہو گیا اور اس نے بے چون و چرا... پک اپ کو موڑا اور انیق کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہو گیا۔

ہم اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان ایک ناہموار راستے پر جا رہے تھے۔ یہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ دن اب چڑھ آیا تھا مگر بادلوں کی وجہ سے سورج کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یاسین حتی الامکان تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا، جیسے ہمیں جلد از جلد منزلِ مقصود تک پہنچا کر بھاگ نکلنا چاہتا ہو۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس کی جان اتنی آسانی سے چھوٹنے والی نہیں۔ بے شک انیق نے اس کو تسلی دی تھی مگر ہم اسے تب تک آزاد نہیں کر سکتے تھے جب تک ہمیں اپنے تحفظ کا یقین نہ ہو جاتا۔

ایک جگہ پہنچ کر پک اپ بری طرح ڈگمگانے لگی۔ پتا چلا کہ ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ پک اپ رک گئی۔ اضافی ٹائر موجود تھا۔ ڈرے سہمے یاسین نے ٹائر بدلنا شروع کر دیا۔ انیق اس کے سر پر کھڑا رہا۔ کمبل کے نیچے اس کی رائفل بالکل تیار حالت میں تھی اور یاسین بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی کوئی بھی غلط حرکت اس کے لیے شدید نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

رضوان نے میرے قریب آکر مدھم آواز میں کہا۔ ''یہاں کرنالی کے بندے ہمیں جگہ جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

میں نے یاسین سے مخاطب ہو کر تحکم سے کہا۔ ''جلدی کرو، اگر تمہارے پیر بھائی یہاں پہنچ گئے تو پھر ان کے ساتھ تم بھی مصیبت میں پڑو گے۔''

یاسین نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پیٹرول کتنا ہے تمہارے پاس؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ٹینکی فل کرائی تھی۔ ابھی تو تین چار لیٹر ہی خرچ ہوا ہوگا۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

وہ توہم پرست لیکن سیدھا سادہ بندہ تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اس بکھیڑے میں سے کوئی دشواری اٹھائے بغیر نکل جائے۔ بہرحال اس کا دارومدار حالات پر تھا۔

انیق کا درد پھر شدت پکڑ رہا تھا۔ میں نے اسے دو پین کلر مزید دیں۔ کھانے پینے کی جو اشیا رات کو یاسین نے ہمیں مہیا کی تھیں ان میں سے کچھ میں ساتھ لے آیا تھا۔ راستے میں ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

ٹائر بدلنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ لیکن اس مرتبہ یہ سفر زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکا۔ رفتار ایک دم سست ہوئی اور پھر پک اپ رک گئی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا اور بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ آگے ایک ناکا لگا ہوا تھا۔ یہ پولیس والے نہیں تھے۔ دور ہی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ عام لوگ ہیں اور زیادہ امکان یہ تھا کہ یہ ڈیرے کے محافظ ہیں۔

انیق آگے یاسین کے پہلو میں موجود تھا۔ یقیناً اسی کے کہنے پر یاسین نے پک اپ کو تیزی سے دائیں رخ موڑ دیا۔ ہم نے راستہ بدل لیا تھا۔ یہ راستہ زیادہ ناہموار تھا اور دشوار موڑ بھی آرہے تھے لیکن تشویش کی اصل بات یہ تھی کہ کہیں ہمارا راستہ بدلنے کی وجہ سے وہ لوگ چونک تو نہیں گئے جنہوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ دو چار منٹ بعد ہی یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا۔ میں نے دیکھا کھلی چھت والی ایک جیپ تیزی سے ہمارے پیچھے آرہی ہے۔ یہ سرخ جیپ ان دو گاڑیوں میں سے ایک تھی جو کل رات ورکشاپ پر پہنچی تھیں۔ ان گاڑیوں میں کرنالی اور اس کے مسلح ساتھی سوار ہو کر آئے تھے۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہماری پک

اب ان لوگوں کی نظر میں آ گئی تھی۔ اس بات کا خطرہ صبح سے ہی ہمارے ذہنوں میں موجود تھا کہ ڈیرے کے محافظ اس علاقے میں ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور کسی جگہ ان سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے اور یہی ہوا تھا۔

تاجور نے بھی سرخ جیپ دیکھ لی تھی۔ ''اب کیا ہوگا شاہ زیب؟'' وہ منمنائی۔

''کچھ نہیں ہوگا، تم بے فکر رہو۔'' میں نے کمبل کے نیچے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے کہا۔

وہ بغور عقب میں دیکھ رہی تھی۔ سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور اردگرد کا ہر منظر واضح دکھائی دیتا تھا۔ ''ان کے پاس تو رائفلیں بھی ہیں۔'' وہ سہم کر بولی۔

''تو کیا ہوا؟ ہمارے پاس بھی ہیں۔''

''وہ دیکھیں... ایک اور گاڑی بھی ہے۔'' تاجور نے انگلی اٹھائی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سرخ جیپ کے عقب میں ایک اور متحرک گاڑی میں نے دیکھ لی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم و بیش دس افراد نہایت خطرناک ارادوں کے ساتھ ہمارے پیچھے لپک رہے ہیں۔ ہم ملنگی ڈیرے پر انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر آئے تھے اور اب وہ سراپا قہر ہمارے پیچھے تھے۔ انیق نے پک اپ کے کیبن کی کھڑکی سے منہ نکال کر مجھے پکارا۔ ''شاہ زیب بھائی! وہ پیچھے آ رہے ہیں۔''

''ہاں میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر انہوں نے گولی چلائی تو ہم بھی چلائیں گے۔'' میں نے بھی پکار کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے کمبل اتار پھینکا اور پوزیشن سنبھال لی۔ یکایک اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ یہ سرخ جیپ سے ہی کیے گئے تھے۔ یہ کسی ''اے کے 57'' ٹائپ کی رائفل کی فائرنگ تھی۔ ایک گولی پک اپ کی باڈی میں کہیں لگی۔ تاجور اور ریشمی ایک ساتھ چلا اٹھیں۔ ''نیچے لیٹ جاؤ۔'' میں نے ان دونوں سے کہا اور اس کے ساتھ ہی جواب میں دو گولیاں چلائیں۔

میری اس فائرنگ کے جواب میں پورا ایک برسٹ آیا۔ ریشمی اور تاجور فرش پر لیٹ چکی تھیں اس لیے گولیوں سے محفوظ رہیں۔ ایک گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزر گئی اور ایک گولی قربانی کے لیے جانے والے بکرے کی گردن میں لگی۔ وہ بلند آواز میں ممیایا اور فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا گرم خون فوارے کی شکل میں میرے پاؤں پر گرنے لگا۔

کیبن کی طرف سے انیق نے بھی تابڑتوڑ فائرنگ شروع کر دی۔ اب یہ نہایت خطرناک صورتِ حال بن گئی تھی۔ سخت دشوار راستے پر تینوں گاڑیاں زبردست ہچکولے کھاتی جا رہی تھیں اور فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ ہمارے بائیں جانب پہاڑ اور دائیں جانب گہری کھائیاں تھیں۔ جگہ جگہ پُرخطر موڑ تھے اور ڈھلوان کی وجہ سے رفتار بھی تیز تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہماری تابڑتوڑ فائرنگ کی وجہ سے متعاقب گاڑیوں کا فاصلہ ہم سے کچھ بڑھ گیا لیکن وہ مسلسل پیچھے آ رہی تھیں۔ ایک اور برسٹ آیا اور اس برسٹ کی چند گولیاں پک اپ کی ایک کھڑکی اور ونڈ اسکرین کو چکناچور کر گئیں۔ ہم دیکھ نہیں سکتے تھے مگر شیشہ ٹوٹنے کی زوردار آواز... ہمارے کانوں تک پہنچی۔ میں نے دیکھا، دوسرا بکرا بھی قربان گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی قربان ہو چکا تھا اور یہی وقت تھا جب ایک اور نہایت غیر متوقع واقعہ ہوا۔ ایک تیز موڑ کاٹتے ہوئے ہماری پک اپ کا اگلا پہیا ایک کھڈے میں گیا، پک اپ کو زوردار جھٹکا لگا۔ میں نے تاجور کو اچھل کر پک اپ سے گرتے اور کنارے کی جھاڑیوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود بھی چلتی پک اپ سے چھلانگ لگا دیتا۔ میں نے جست لگائی اور چند پلٹیاں کھا کر جھاڑ جھنکاڑ میں گرا۔ سب سے پہلے میں نے تاجور کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ بہرحال اتنی تسلی ضرور ہو گئی کہ وہ کھڈ میں نہیں گری ہوگی۔ یہاں نشیب میں کچھ ہموار جگہ تھی اور اصل کھڈ اس کے بعد شروع ہوتے تھے۔ رائفل ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھی۔ ہماری سفید پک اپ اسی رفتار سے بھاگتی دو ڈھائی سو میٹر دور جا چکی تھی۔ سرخ جیپ تیزی سے ہچکولے کھاتی میرے سامنے سے گزری۔ میں نے لمبے بالوں والے ملنگی محافظوں کی ایک جھلک دیکھی۔ انہوں نے رائفلیں سونت رکھی تھیں۔ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر سرخ جیپ پر فائرنگ کی۔ میں نے جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنایا تھا۔ بالکل قریب سے کی جانے والی یہ فائرنگ کارگر ثابت ہوئی۔ جیپ کے دونوں دائیں ٹائر دھماکوں سے برسٹ ہوئے اور وہ پتھروں سے ٹکرانے کے بعد راستے کے عین درمیان میں الٹ گئی، عقب میں آنے والی 86 ماڈل ٹویوٹا کے بریک بڑی شدت سے لگے۔ ٹائر چرچرائے اور وہ الٹی ہوئی جیپ کے عین سامنے رک گئی۔ الٹی ہوئی جیپ میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہاں کھڑے ہو کر آگے کی صورتِ حال دیکھتا۔ میں اس طرف لپکا جہاں تاجور گری

تھی۔ آٹھ دس قدم آگے جانے کے بعد مجھے اس کے کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ یہ دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ کپڑوں میں حرکت تھی۔ میں جھک کر دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔ وہ ابھی تک جنونی ڈاکٹر ارم والے لباس میں تھی۔ وہ گرد اور جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی تھی مگر اٹھ بیٹھی تھی۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“ میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ بہرحال اس نے اپنی ایک کہنی دوسرے ہاتھ سے دبائی ہوئی تھی۔ پشت پر سے بھی لباس پھٹا ہوا لگتا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نشیب کے درختوں میں گھس گیا۔ عین ممکن تھا کہ محافظوں کو بالکل پاس سے ہونے والی اس فائرنگ کا اندازہ ہو گیا ہو۔ اب وہ کسی بھی وقت ہمارے پیچھے لپک سکتے تھے۔ ہم دونوں گرتے پڑتے کم و بیش سو میٹر نیچے چلے گئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا، ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ ہمیں ان غضب ناک ملنگوں کی زد سے دور نکلنا ہے۔

تاجور بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ اس کے چہرے پر زردی نہیں بلکہ ایک توانا سرخی ہے۔ پنجاب کی اس خوبرو مٹیار کا چہرہ جیسے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر خون اس کے شفاف چہرے پر یوں یورش کرتا تھا جیسے کسی نے اچانک اس کے چہرے پر برش سے سرخ رنگ پھیر دیا ہو۔

وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ”شاہ زیب! باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”وہ نکل گئے ہیں، ان کی فکر نہ کرو۔“ میں نے بھی ہانپتے لہجے میں کہا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، اوپر بلندی سے دو فائر ہوئے۔ شاید ان لوگوں کو کہیں کسی جگہ کسی کی موجودگی کا شک ہوا تھا یا پھر انہوں نے ویسے ہی اندھے فائر کر دیے تھے۔ بہرحال اس سے ایک بات ثابت ہوتی تھی اور وہ یہ کہ وہ لوگ یا ان میں سے کچھ لوگ یہاں رک گئے ہیں اور اب نیچے اترنے والے ہیں۔

”تمہاری کہنی ٹھیک ہے نا؟“ میں نے بھاگتے بھاگتے پوچھا۔

”ہاں شاہ زیب، بس کمر پر کچھ چوٹ آئی ہے۔“

”کہیں رک جائیں؟“

”نہیں میں چل سکتی ہوں۔“ وہ ہمت سے بولی۔

دو تین منٹ بعد اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ شاید انہوں نے بلندی سے ہمیں درختوں میں حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھا ہماری جانب ہی لپک رہے تھے۔ ان کی بلند آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے بھاگتے بھاگتے، رائفل کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کر لیا اور صورتِ حال کے لیے تیار ہو گیا۔ دفعتاً ہم نے خود کو گھنے درختوں کے درمیان ایک بوڑھے شخص کے رُوبرو کھڑے پایا۔ وہ خاکی شلوار قمیص میں تھا اور اس نے ایک سیاہ شال کی بُکل مار رکھی تھی۔ وہ تشویش ناک انداز میں ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے تیزی سے کہا۔ ”کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ کیا آپ ہمیں کچھ دیر کے لیے پناہ دے سکتے ہیں؟“

بوڑھے نے مجھے دیکھا، پھر سرتاپا تاجور کو دیکھا۔ وہ جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی تھی۔ ... ہم مصیبت میں ہیں محترم بزرگ، ہماری مدد کریں۔ اس شخص کی عمر ساٹھ ستّر سال کے درمیان رہی ہو گی۔ جسمانی حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن وہ بولا تو اس کی آواز میں حوصلہ اور ارادہ تھا۔ ”کوئی بات نہیں۔ تم لوگ پریشان نہ ہو، کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔“

”یہاں کوئی چھپنے کی جگہ ہو گی بزرگو؟“ میں نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے ایک دو گھنٹے کے لیے؟“

”تمہیں چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔ تم درختوں کی اوٹ میں ہو جاؤ۔“ اس نے انگلی سے چیڑ کے کچھ تناور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں کچھ سمجھ تو نہیں پایا لیکن اس معمر شخص کی بات ماننے میں کوئی نقصان دکھائی نہیں دیا۔ تاجور اتنی تھک چکی تھی کہ اگر ہم اسی طرح بھاگتے رہتے تو شاید دو تین منٹ بعد وہ گر پڑتی۔ وہ اب بھی بے طرح ہانپ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ یہ بہت اونچے اور بڑے قطر کے درخت تھے۔ یہاں سے ہمیں ڈھونڈ لینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ ہمارا یہ بوڑھا مددگار ہمارے لیے کیا کرتا ہے؟ بہرحال کلاشنکوف رائفل میرے ہاتھوں میں بالکل تیار حالت میں موجود تھی۔ بمشکل ایک منٹ گزرا ہو گا کہ آوازیں نزدیک آ گئیں۔ درختوں کے درمیان یہ چوڑا ڈھلوان راستہ ان لوگوں کو سیدھا ہماری طرف ہی لا رہا تھا۔

تب میں نے معمر شخص کو دیکھا، اس نے اپنی سیاہ

شال کے نیچے سے ایک پستول نکال لیا۔ بظاہر تو یہی لگا کہ بوڑھے کے کمزور ہاتھوں میں یہ چھوٹا سا پستول ہمارے تعاقب میں آنے والوں کا کیا بگاڑ سکے گا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ بوڑھے نے بلند آواز میں کسی کو پکارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کی سبز شاخوں میں چھپے ہوئے چار پانچ افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے اور مختلف جگہوں پر پوزیشن لے لی۔ ان میں سے زیادہ تر نے خاکی یا سیاہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ بوڑھے نے پکار کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ منڈا اور لڑکی ہماری پناہ میں ہیں۔ ان کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

چند سیکنڈ بعد ہمارا تعاقب کرنے والے موقع پر پہنچ گئے۔ میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ ملنگی ڈیرے کے مجاور اور ملنگ ہی تھے۔ وہ اپنے لباس اور اپنے ”کندھے تک جاتے ہوئے بالوں“ سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ وہ ہانپے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں میں شعلے تھے لیکن اپنے سامنے چوکس مسلح افراد کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ کرنالی ان میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کا چربی دار جسم نیلے مخملی چولے کے اندر ہچکل رہا تھا۔ وہ ترخ کر بوڑھے سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کون لوگ ہو؟“

بوڑھے نے کہا۔ ”اور میں تم سے پوچھتا ہوں، تم کون ہو۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔“

”ہمارا علاقہ... کیا مطلب...؟ ہم اپنے مجرموں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ قتل کر کے بھاگے ہیں۔“

”مجھے تو وہ قاتل نہیں لگ رہے... بلکہ تم لگ رہے ہو۔ کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟“

”مستاں مائی کے مزار سے۔“ کرنالی نے تنک کر کہا۔

”کون سا مستاں مائی کا مزار؟“

”تم نہیں جانتے اسی لیے اس طرح اکڑ رہے ہو۔ تمہارا بہت نقصان ہو جائے گا۔“ کرنالی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس کے اردگرد پانچ چھ مسلح محافظ موجود تھے۔

بوڑھا بولا۔ ”اگر تم نقصان کی دھمکی دیتے ہو تو پھر تو ہم ان دونوں کو ضرور پناہ دیں گے۔ تمہارے جیسے بدمعاش ملنگ، سادھو بہت دیکھے ہیں ہم نے۔“

کرنالی کا ایک ساتھی چلایا۔ ”زبان سنبھال کر بات کر بڈھے، نہیں تو لاشیں بچھ جائیں گی یہاں۔“

بوڑھے کے ایک ساتھی نے کہا۔ ”لاشیں تو ضرور بچھیں گی، لیکن وہ تمہاری ہوں گی۔ تم اس وقت بھی کم از کم چھ رائفلوں کی زد میں ہو۔ بہتر ہے کہ ابھی الٹے پاؤں واپس بھاگ جاؤ۔“ اس نے رائفل سیدھی کر کے کندھے سے لگا لی۔

مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ درختوں سے اترنے والے افراد کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے بھی صرف دو نے اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں۔ وہ چھ رائفلیں کہاں تھیں جن کا ذکر ابھی ہمارے مددگار نے کیا تھا۔

یکایک تین فائر ہوئے اور موٹے تگڑے کرنالی کے پاؤں کے پاس چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ باقی رائفلیں کہاں ہیں۔ کچھ افراد اب بھی اردگرد کے گھنے درختوں کے اوپر موجود تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہے تھے مگر انہوں نے نیچے موجود ملنگوں کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ بوڑھے کے ایک اشارے پر وہ ملنگوں کو کرنالی سمیت بھون کر رکھ دیتے۔

کرنالی نے بدحواسی کے عالم میں اردگرد کے درختوں پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً اسے کوئی بندہ تو نظر نہیں آیا لیکن وہ موت ضرور نظر آ گئی جو ٹکراؤ کی صورت میں اس کا مقدر بن سکتی تھی۔ چند لمحے شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹے لیکن کچھ پیچھے جا کر پھر رک گئے۔ ان کے چہرے لال بھبوکے ہو رہے تھے، تاہم اپنی بے بسی کو بھی وہ اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ درختوں پر سے ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ یہ فائرنگ بھی ملنگوں کے قدموں کے آس پاس کی گئی تھی۔ اس مرتبہ ان لوگوں کو رخ پھیر کر درختوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ فائرنگ کرنے والے درختوں کے اوپر کافی بلندی پر تھے۔ کوئی جگہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ملنگ محافظ اور کرنالی وغیرہ ڈر کر بھاگے تو پھر بھاگتے ہی چلے گئے۔ درختوں پر موجود افراد گاہے بگاہے ان کے آس پاس فائر کرتے رہے اور انہیں کہیں رکنے نہیں دیا۔ ان لوگوں کا بھاگنا یقیناً ایک مضحکہ خیز پہلو بھی رکھتا تھا۔

جب ملنگوں کی طرف سے پوری تسلی ہو گئی تو بوڑھا ہمارے پاس پہنچا اور ہمیں درختوں کی اوٹ سے نکل آنے کو کہا۔ بوڑھے کی سفید شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی کلائیوں پر گھنے بال تھے اور چہرے پر پرانے زخموں کے کچھ نشان اس کی جنگجوانہ طبع کے غماز تھے۔ اس کے ساتھی بھی مار دھاڑ والے لوگ ہی لگتے تھے۔ بوڑھے کے سوا وہ مجھے شکل و

صورت سے کچھ اچھے لوگ نہیں لگے۔ ان کا اسلحہ اور لباس وغیرہ دیکھ کر مجھے ایک اور شبہ بھی ہو رہا تھا۔

بوڑھے نے مجھے اپنا نام فیض محمد بتایا اور یہ بتایا کہ وہ ایک قریبی بستی کے رہنے والے ہیں... اور یہاں اپنی ایک دشمن پارٹی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اوپر راستے کے قریب ہونے والی فائرنگ کی آوازیں سن کر انہیں یہ لگا کہ شاید مخالف پارٹی پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے پوزیشن لے لی۔ ان کی یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی تھی۔ کئی سوالات تھے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ اگر وہ واقعی یہاں کسی مخالف پارٹی کا انتظار کر رہے تھے تو پھر آناً فاناً یہاں سے جانے کے لیے کیوں تیار ہو گئے تھے؟ اور پھر ان کے جدید ہتھیار اور بے باکانہ انداز؟ کیا واقعی وہ یہاں کسی بستی کے مکین تھے؟

تسلی بخش بات یہی تھی کہ انہوں نے ابھی تک مجھ سے میری رائفل طلب نہیں کی تھی اور ان کا انداز بھی دوستانہ ہی تھا۔ بوڑھے فیض محمد نے مجھ سے میرے اور تاجور کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں اپنا درست نام بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ ہم اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ ملنگی ڈیرے کی شہرت سن کر وہاں پہنچے تھے۔ ہماری ایک عزیزہ بیمار تھی۔ لیکن وہاں اس عزیزہ کو جھاڑ پھونک کے نام پر برہنہ کیا گیا اور ایک مجاور نے نازیبا حرکات کیں۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہاں مجاوروں سے ہمارا سخت جھگڑا ہوا اور ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں نے بوڑھے فیض محمد کو بتایا۔ ”ہمارے تین ساتھی آگے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان میں دو مرد اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکی ہماری وہی عزیزہ ہے جو علاج معالجے کے چکر میں وہاں پھنسی ہوئی تھی۔ باقی دونوں میرے کزن ہیں۔“

بوڑھے فیض اور اس کے ساتھیوں کے ردِعمل سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ ملنگی ڈیرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ درحقیقت ہم پچھلے ایک دن کی بھاگ دوڑ کے دوران میں اس علاقے سے کافی آگے نکل آئے تھے۔

بوڑھا فیض محمد اور اس کے ساتھی ہمیں لے کر نشیب میں اترتے چلے جا رہے تھے۔ بے شک انہوں نے ہماری مدد کی تھی مگر ان کے طور اطوار مجھے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ سگریٹ پھونک رہے تھے اور کانوں میں کھسر پھسر بھی کر رہے تھے۔ اچانک میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے خبردار کرنے لگی۔ یہ لوگ تاجور کو دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تاجور میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ ان میں سے ایک بندہ چلتے چلتے تاجور کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں لگا کہ وہ تاجور پر جھپٹنے والا ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے بالکل صحیح سگنل دیا تھا۔ وہ شخص لپکا یک تاجور کی طرف جھکا۔ میں چونکہ پہلے سے تیار تھا۔ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر خاردار جھاڑیوں میں گرا۔ دوسرا شخص آگے بڑھا تو اس کا سامنا بھی کلاشنکوف کے آہنی دستے سے ہوا۔ تاجور چلّا کر میری پشت پر آ گئی تھی۔ میں نے کلاشنکوف سیدھی کی اور ایک شخص کی ٹانگوں کو نشانہ بنانا چاہا مگر تب مجھ پر ایک مایوس کن انکشاف ہوا۔ کلاشنکوف نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کلاشنکوف جیسی مقبولِ عام رائفل سے ایسی بے وفائی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے حریفوں نے بھی ایک لحظے میں بھانپ لیا کہ میری رائفل میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک شخص پھرتی کے ساتھ تاجور سے لپٹ گیا اور اس کی گردن پر ایک لمبا تیز دھار چھرا رکھ دیا۔ رائفل برداروں نے رائفلیں میری طرف سیدھی کر دیں۔

”گولی مار دیں گے۔ کھڑے رہو اپنی جگہ۔“ چوڑی ناک والا ایک شخص دہاڑا۔

شاید اگر تیز دھار آلہ تاجور کی گردن پر نہ ہوتا تو میں اس موقع پر بھی کچھ نہ کچھ کر گزرتا مگر اب میں بالکل بے بس تھا۔ رائفل تاحال میرے ہاتھ میں تھی لیکن اب وہ ایک لاٹھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

”پھینک دو اسے۔“ بوڑھے فیض محمد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

میں نے رائفل پھینک دی، جسے فوراً اٹھا لیا گیا۔ ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے تاجور کے سر پر سے چادر کھینچ لی۔ تاجور کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔ اس شخص نے وحشت کے عالم میں چادر کو درمیان سے دو ٹکڑے کیا۔ ایک ٹکڑے کو رسی کی طرح بل دیے اور پھر میرے عقب میں پہنچ کر میرے ہاتھ اس چادر سے باندھ دیے۔ اس دوران میں چمک دار چھرا ایک لحظے کے لیے بھی تاجور کی گردن سے ہٹا نہیں تھا اور تاجور وہ ہستی تھی جس کے لیے میں چھوٹے سے چھوٹا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔

صورتِ حال مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی تھی۔ بوڑھے فیض کے چہرے سے بھی ہمدردی اور نرمی رخصت ہو چکی تھی۔ بوڑھا ہونے کے باوجود اس کے جسم میں عجیب طرح کی اکڑ اور تن فن تھی۔ اس نے اپنی سفید مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مجھ

سے کہا۔ ”شکر کرو تمہاری بندوقچی نے کام نہیں کیا۔ اگر یہ چل جاتی اور کوئی نقصان ہو جاتا تو پھر تمہارا حال بہت خراب ہوتا تھا۔“
میں نے کہا۔ ”کون ہو تم لوگ؟ اور کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“
چوڑی ناک والا بولا۔ ”اپنے منہ کا پھاٹک بند کر۔ اب جو سوال کرنا ہے، ہم نے کرنا ہے۔ تم کو صرف جواب دینا ہے اور باقی رہی یہ بات کہ کیا چاہتے ہیں تم سے؟ تو ہم بہت کچھ چاہ سکتے ہیں اور خاص طور سے اس کڑی سے تو ”بہت کچھ“ چاہ سکتے ہیں۔“
اس نے تیز نظروں سے تاجور کو سرتاپا گھورا۔ کمر کی طرف سے تاجور کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور اندر سے اس کا دودھیا بدن جھانک رہا تھا۔ چوڑی ناک والے کی نظریں خاص اسی جگہ پر مرکوز تھیں۔ جیسے کسی قلعے کی فصیل کہیں سے ٹوٹی ہوئی ہو اور بپھرے ہوئے لشکری اس رخنے کو مشتعل نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ میں جب سے پاکستان آیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ میں خود کو اس طرح بے بس محسوس کر رہا تھا جو کچھ ہوا اتنا آناً فاناً ہوا کہ میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ رائفل کا جواب دے جانا تھا۔
یہ لوگ ہمیں مسلسل چلاتے ہوئے کم و بیش چار کلومیٹر آگے لے آئے۔ ان کے کچھ ساتھی یقیناً ابھی تک اسی جگہ درختوں کے اوپر موجود تھے جہاں انہوں نے ملنگوں کو ڈرا کر وہاں سے بھگایا تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ سب سے اہم سوال میرے ذہن میں یہی ابھر رہا تھا۔ کیا وہ داؤ بھاؤ کی طرح کا کوئی گینگ تھا یا پھر اسمگلروں کا کوئی گروہ؟ ان کا جدید اسلحہ اور قیمتی سیل فونز دیکھ کر نہ جانے کیوں یہ گمان ہو رہا تھا کہ یہ اسمگلر ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں تنگ گھاٹیوں سے گزارتے ہوئے بلند چوٹیوں کی طرف لے آئے۔ یہاں پہنچ کر بلند درختوں کے اوپر کچھ رائفل برداروں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک چھوٹے سے درّے سے گزر کر ہم ایک کشادہ جگہ پر پہنچے اور پھر دنگ رہ گئے۔ ایک وسیع احاطہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے اردگرد پتھروں سے بنے ہوئے چھوٹے بڑے گھروندے تھے۔ یہاں چند جہازی سائز کی چارپائیاں بچھی تھیں اور کچھ مسلح افراد بیٹھے آلو گوشت کے سالن کے ساتھ خمیری روٹیاں کھا رہے تھے۔ شلواروں قمیصوں میں ملبوس یہ لوگ شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ بوڑھے فیض محمد کو دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کیا۔ ”بیٹھو، بیٹھو۔ کھانا کھاؤ۔“ فیض محمد نے کہا۔
لیکن وہ پھر بھی کھڑے رہے اور ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ خاص طور سے تاجور کو بڑی کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ عورت ان لوگوں کے لیے کوئی نادیدہ شے ہے اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کھا جانے کے خواہش مند تھے۔ وہ سب فیض محمد سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ یہ نادر ہیرا اسے کہاں سے اور کیسے ملا ہے۔ وہ میرے لباس کو بھی بڑی دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ فیض محمد نے چوڑی ناک والے کو اشارہ کیا۔ ”انہیں اندر لے جاؤ فخرو۔“
وہ ہمیں رائفلوں کے سائے میں ہانکتا ہوا ایک پتھریلی کوٹھڑی میں لے آیا۔ اسے دس ضرب بارہ فٹ کا ایک چھوٹا سا کمرا بھی کہا جا سکتا تھا۔ اندر دو شکستہ چارپائیاں تھیں اور بھاری لحاف پڑے تھے۔ کونے میں لالٹین رکھی تھی۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس میں موٹی گرل لگی ہوئی تھی۔ ہمیں اندر دھکیل کر لکڑی کے مضبوط دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔
تاجور نے سب سے پہلے میرے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے پھر اس پھٹی ہوئی چادر کو کھول کر اپنے سینے پر پھیلا لیا۔ وہ بے حد ہراساں نظر آتی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ یہاں اسے ہر طرف گندی نظریں دکھائی دے رہی تھیں۔ ابھی تک ہم یہ بھی نہیں جان پائے تھے کہ یہ لوگ ہمیں کس جگہ لائے ہیں۔
سردی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی دھند پھیلنے لگی تھی۔ ہمارے لباس ناکافی تھے، خاص طور سے تاجور کا لباس۔ میں نے اس کی کمر کی چوٹ دیکھی۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کے اندر سے اس کے زیریں لباس کی ڈوریاں دکھائی دیتی تھیں۔ پنڈے پر گہری نیلی خراشیں تھیں۔
قریباً آدھ گھنٹے بعد کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے برآمدے کا دروازہ کھولا اور ہمارے والے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی پر آ بیٹھا۔ یہ بوڑھا فیض محمد ہی تھا۔ اس نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ تمہارے ساتھی ان ملنگوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ان کا کہیں کوئی کھوج نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے یہ خوشی کی بات ہو گی۔“
میں نے کہا۔ ”خوشی کی بات تو ہے مگر صحیح خوشی تو تب

ہوتی جب ہم بھی یہاں سے نکل سکتے۔"

وہ بولا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ تم سب اکٹھے گاڑی میں نکلے، پھر تم دونوں پیچھے کیسے رہ گئے؟"

میں نے اسے صاف بتا دیا کہ کس طرح تیز رفتار پک اپ میں سے تاجور اچھل کر نیچے گری اور مجھے اس کے پیچھے چھلانگ لگانا پڑی۔ فیض محمد نے حیرت سے یہ سب کچھ سنا۔ آخر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ "یہ کیا لگتی ہے تمہاری جس کی خاطر اتنی قربانی دی تم نے؟"

"یہ میری... منگیتر ہے۔" میں نے کہا۔

فیض محمد نے اس حوالے سے کچھ مزید سوال پوچھے۔ یعنی ہم کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ ذات پات کیا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہم نے پہلے ہی سوچ رکھے تھے۔ صرف گاؤں کا نام اور تاجور کا نام میں نے بدلا اور خود کو کوٹلی کے ایک قریبی علاقے کا رہائشی ظاہر کیا۔ باقی سب کچھ فیض محمد کے گوش گزار کر دیا۔ تاجور کا نام میں نے شمسہ بتایا۔

وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔ "تو یہ منگیتر ہے تمہاری؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن یہ تمہاری منگیتر نہیں ہے۔ تمہاری بیوی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اور اسے بچہ بھی ہونے والا ہے... کچھ دن پہلے ہی اس کا پاؤں بھاری ہوا ہے۔" فیض محمد سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک صاف ستھرے رومال کی گرہ کھولی اور اس میں سے تین چار لیموں نکال کر گرل کے اندر سے مجھے تھما دیے۔ میں حیرت سے کبھی فیض محمد کو اور کبھی لیموؤں کو دیکھ رہا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شکل سے اتنے بدھو تو نہیں لگتے ہو۔ بے وقوف، یہ کھٹائی ہے۔ عورتیں جب پیٹ سے ہوتی ہیں تو ایسی چیزیں لیتی ہیں۔"

"لیکن یہ سب کیوں ضروری ہے؟"

مجھے بوڑھے کے چہرے پر اپنے لیے ہمدردی نظر آئی۔ اس نے ایک نگاہ تاجور کی طرف دیکھا اور ذرا دھیمے لہجے میں سرگوشی کی۔ "تمہاری قسمت کا پھیر ہے کہ تم ایک بری جگہ پھنس گئے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اگلے چند گھنٹوں تک تمہاری اس منگیتر کی عزت یہاں محفوظ رہے، اور آئندہ دنوں میں بھی وہ کسی بڑی مشکل میں نہ پھنسے تو یہ سب کچھ ضروری ہے۔ میں فی الحال تمہیں کچھ زیادہ نہیں بتا سکتا۔ بس جو کہہ رہا ہوں اس کے مطابق شروع ہو جاؤ... اور اپنی اس بات سے بالکل پیچھے نہ ہٹنا کہ یہ تمہاری منکوحہ زنانی ہے اور نہ ہی کسی کو یہ بھنک پڑنے دینی ہے کہ اس بارے میں تم سے میں نے کچھ کہا ہے۔"

"کس بارے میں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یہی کہ میں نے تمہیں کوئی پٹی پڑھائی ہے۔" وہ ذرا جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں صرف اور صرف تمہاری ہمدردی میں کہہ رہا ہوں۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے فیض محمد کے جھلائے ہوئے لہجے میں پھر تھوڑی سے نرمی آگئی۔

میں نے التجا کے انداز میں کہا۔ "بزرگوار! آپ شروع ہی سے مجھے دوسروں سے مختلف نظر آئے ہیں۔ میں خدانخواستہ آپ کی بات پر کوئی شک نہیں کر رہا لیکن اگر آپ مجھے تھوڑی سی تفصیل بتا دیں گے تو مجھے صورتِ حال کو ہینڈل کرنے میں آسانی ہوگی۔"

فیض محمد نے کش لے کر دائیں بائیں دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "سمجھو کہ ایک بندہ کچھ دیر میں یہاں آنے والا ہے۔ وہ یہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ اسے اپنے بڑے بھائی کے لیے ایک عورت کی سخت ضرورت ہے۔ بلکہ ہر وقت ہی رہتی ہے۔ اس سے تم اپنی عورت کو ایک ہی طرح بچا سکتے ہو۔ اگر اسے یقین دلا دو کہ یہ تمہاری منکوحہ ہے اور امید سے بھی ہے... اب زیادہ سوال نہ کرنا۔ میں جا رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر باہر نکل جاتا، میں نے کہا۔ "بزرگوار! ایک مدد تو ہماری کر دیں۔ شمسہ کی کمر پر چوٹ لگی ہوئی ہے۔ یہاں لگانے کے لیے کچھ دے دیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوڑی ناک والا نخرو آیا اور اس نے گرل کے اندر سے مرہم پٹی کا سامان مجھے تھما دیا۔ اس کی پیشانی پر ایک مندمل ہوتا ہوا زخم تھا۔ جیسے کسی نے وہاں شیشے وغیرہ سے چوٹ لگائی ہو۔ اس کی جلتی نظروں نے ایک بار بھرپور طریقے سے تاجور کے جسم کا طواف کیا اور پھر لوفرانہ انداز میں کچھ گنگناتا ہوا واپس چلا گیا۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس جنگل میں مرہم پٹی کا مناسب سامان میسر ہوگا مگر چوڑی ناک والے نخرو نے جو کچھ ہمیں پہنچایا تھا، وہ فرسٹ ایڈ کے لیے کافی تھا۔ مثلاً اسپرٹ، کاٹن، میڈیکل ٹیپ اور آئنٹمنٹ وغیرہ۔

"رہنے دیں شاہ زیب، مجھے درد ہوگا۔" وہ کراہ کر بولی۔ اس کے انداز میں تکلیف سے زیادہ شرم جھلک رہی تھی۔

"زیادہ سیانی مت بنو۔ تمہاری بینڈیج ضروری ہے۔ خون بھی رس رہا ہے۔" میں نے ذرا تحکم سے کہا اور اس کی پشت پر پہنچ گیا۔

وہ ابھی تک ڈاکٹر ارم والا نیلا چولا پہنے ہوئے تھی۔ نیچے کڑھائی دار کرتہ تھا۔ یہ دونوں چیزیں کسی شاخ سے الجھ کر پھٹ چکی تھیں۔ میں نے انہیں کچھ اور پھاڑ دیا۔ کاٹن پر اسپرٹ لگا کر اس کی جلد کو صاف کیا تو وہ "اُف... آہ... پلیز..." کرنے لگی۔ میں نے مرہم لگایا اور کاٹن رکھ کر میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کے سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے جسم کی دید مجھے نہال کرتی مگر فی الحال سچویشن اور تھی۔ میں نے اپنی شال اسے اوڑھا دی اور پہلو کے بل لیٹ جانے کو کہا۔

ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انیق، رضوان اور ریشمی، پتا نہیں کس حال میں تھے۔ انیق کو گولی لگی ہوئی تھی۔ وہ شدید تکلیف میں تھا۔ میرے بعد اسی پر زیادہ ذمے داری بھی آگئی تھی۔ تسلی کی بات یہ تھی کہ انیق نے یاسین پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور وہ اس کی ہدایات کے مطابق چل رہا تھا۔ امید تھی کہ یاسین کی مدد سے وہ کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ کسی بھی طریقے سے پولیس کو یا دیگر ذمے دار افراد کو ملنگی ڈیرے کے حالات سے آگاہ کر سکتے تھے۔ ملنگی ڈیرے پر نوری اور لاہوری پولیس افسر کے بیٹے سمیت کئی بہیمانہ قتل ہوئے تھے۔ اب ملنگی ڈیرے والوں کی کم بختی آنا لازمی تھی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے سوچتا رہا۔ کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا اور اس کے نیچے چار پانچ انچ کا خلا موجود تھا جس میں سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں نے اس خلا کو ایک پرانے کمبل کے ذریعے بند کر دیا مگر فوراً ہی کمبل میں حرکت پیدا ہوئی۔ خلا میں ایک ٹرے نمودار ہوئی، جس میں کھانے کی پلیٹیں تھیں اور ایک ماچس رکھی تھی۔ ماچس کمرے میں موجود لالٹین روشن کرنے کے لیے تھی۔ کھانے میں وہی خمیری روٹی اور آلو گوشت کا سالن تھا جو ہم نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ روٹی گرم تھی اور اس میں سے اشتہا آمیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے بہت اصرار کر کے تاجور کو چند لقمے کھلائے اور خود بھی پیٹ پوجا کی۔ کھانا کھاتے ہوئے تاجور ایک بار پھر سسکنے لگی۔ یقیناً اسے پچھلے 36 گھنٹے کے لرزہ خیز واقعات یاد آ رہے تھے اور ان میں سب سے اندوہناک واقعہ چاچا رزاق کی موت اور پھر نوری کی لاش کا دکھائی دینے والا منظر تھا۔

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب! ہم کہاں آ پھنسے ہیں؟" وہ کراہی۔

"ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہوگا تاجور، ہم حوصلہ رکھیں گے تو راستے خود بخود نکل آئیں گے۔ تم نے وہ مقولہ تو سنا ہوگا، خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

اس نے سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور منمنائی۔ "یہ بوڑھا کیا کہہ رہا تھا آپ کے کان میں؟"

"اس کا کہنا ہے کہ تم اور میں خود کو یہاں میاں بیوی ظاہر کریں گے تو ہمارے لیے آسانی رہے گی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ تمہیں یہ بات بری تو نہیں لگ رہی؟"

"مجھے برا لگنے یا نہ لگنے سے کیا ہوگا۔ آپ جو ٹھیک سمجھتے ہیں وہ کریں۔"

اس نے رضامندی ظاہر کر دی لیکن اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ وہ تین چار لیموں جو فیض محمد مجھے دے گیا تھا، میری جیب میں تھے۔ میں نے ایک لیموں تاجور کے سامنے رکھا تو وہ اپنی بھیگی پلکیں پٹ پٹا کر بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

میں نے نرم اور مناسب لفظوں میں اسے سمجھایا کہ اس نے کیا ظاہر کرنا ہے، اور کس طرح؟ وہ رو دینے والے انداز میں سنتی رہی۔ وہ کوئی اداکارہ نہیں تھی۔ گاؤں کی سیدھی سادی کنواری لڑکی تھی۔ شرم و حیا میں لپٹی ہوئی ایک بند کلی جس کی خوشبو بس اس کے گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ وہ تند ہواؤں کی زد میں آگئی تھی اور اسے ایسے تیز رفتار حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا جو اس بے چاری کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔

میں نے جب اسے بتایا کہ اسے "پُرامید" عورتوں کے انداز میں ابکائیاں وغیرہ لینا ہوں گی اور خود کو بیمار ظاہر کرنا ہوگا تو وہ باقاعدہ اشک بار ہوگئی۔ بہرطور میں کسی نہ کسی طرح اسے نیم رضامند کرنے میں کامیاب رہا۔

جس شخص کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ آنے والا ہے، اس کی آمد رات کوئی نو بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ کہیں پاس سے ہی گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ میرے قیافے کے مطابق یہ تین چار گھوڑے تھے۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ گھڑسوار، گھوڑوں کے ساتھ پیدل ہی چلتے ہوئے آ رہے

ہیں۔ کچھ آگے جاکر ٹاپیں معدوم ہوگئیں۔ یہاں موجود لوگوں میں افراتفری نظر آنے لگی۔ میں نے کھڑکی میں سے دو مسلح افراد کو دیکھا۔ ان میں سے ایک چوڑی ناک والا فخرو تھا۔ وہ جلدی جلدی پگڑیاں درست کرتے ہوئے احاطے کی طرف جارہے تھے۔ کسی کمرے میں لچر فلمی گانے چلانے والا ٹیپ ریکارڈر بھی بند ہوگیا۔

تاجور پہلے سے زیادہ سہمی ہوئی نظر آنے لگی۔ میری دھڑکن بھی بڑھ گئی تھی۔ اگلے چند منٹوں میں کسی طرح کی صورت حال بھی سامنے آسکتی تھی۔ میں نے تاجور کو اشارہ کیا کہ وہ لحاف اوڑھ کر لیٹ جائے۔ لیموں کے دو ٹکڑے اور نمک وغیرہ میں نے لالٹین کے پاس ہی اس طرح رکھ دیے کہ پہلی نظر میں دکھائی دے جائیں (یہ سب باتیں مجھے فیض نے ہی سمجھا دی تھیں۔ وہ یہاں کا بھیدی تھا۔ اس کی ساری باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن اس کے کہنے کے مطابق عمل کرنا مجھے مناسب لگا)

قریباً پندرہ منٹ بعد بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی آرہا تھا پھر وہ نمودار ہوا۔ وہ بلند قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس کے پیچھے دو افراد بہت مؤدب چلے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بوڑھا فیض تھا، دوسرا ایک مسلح شخص جس نے گیس لیمپ اٹھا رکھا تھا۔ دراز قد شخص کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ مسلح شخص نے گیس لیمپ اس کے پاس رکھ دیا اور واپس چلا گیا۔ اس بڑے لیمپ کی روشنی کمرے کے اندر تک آرہی تھی۔ کچھ روشنی نو وارد کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس کی صورت دیکھی اور بھونچکارہ گیا۔ مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ میں اس شخص کو یہاں ویرانے میں دیکھوں گا... یہ وہی خطرناک ڈکیت سجاول سیالکوٹی تھا۔ چاند گڑھی اور گرد و نواح کے علاقوں میں اس کی دہشت تھی۔ وہاں کے لوگ اسے ایک خدائی آفت قرار دیتے تھے... اور اب وہ چاند گڑھی سے قریباً سو میل دور یہاں ان ویران پہاڑوں میں اس کھڑکی کے سامنے گیس لیمپ کی روشنی میں کھڑا تھا اور عقابی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا لیکن میں اسے ایک بار دیکھ چکا تھا۔ جب میں عالمگیر کا تعاقب کرتا ہوا ایک کھنڈر چار دیواری میں پہنچا تھا اور وہاں ناچ گانے کی محفل برپا تھی۔ شہر سے آئی ہوئی طوائفیں (بشمول جانان وغیرہ) ناچ رہی تھیں اور ڈکیت دادِ عیش دے رہے تھے۔

وہ منظر ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

پتا چل رہا تھا کہ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی فیض اپنے اس سرغنہ کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ وہ بڑی دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری توقع کے برخلاف اس نے تاجور کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، نہ ہی یہ حکم دیا کہ میں اسے اٹھ کر بیٹھنے کے لیے کہوں۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی اور خود کو سویا ظاہر کیا۔

سیالکوٹی نے کالے رنگ کی شلوار قمیص اور گرے جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ہولسٹر میں سے نائن ایم ایم کا طاقتور پستول جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنی گھنی مونچھوں کو انگلی سے سہلایا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''کیا کرتے ہو تم اپنے گاؤں ہری پورہ میں؟'' (میں نے اپنے گاؤں کا نام بھی بتایا تھا)

''تھوڑی سی زمین ہے بھائی جی۔ وہی کاشت کرتا ہوں۔ کچھ ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ جٹ فیملی سے ہوں۔ ہم لوگ کھیتی باڑی سے دور تو نہیں رہ سکتے۔''

وہ مجھے دھیان سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری بول چال سے ایسا لگتا ہے جیسے تم پاکستان کی جم پل نہیں ہو، تھوڑی تھوڑی انگریزی گھسی ہوئی ہے تمہاری زبان میں۔ کیوں فیض ایسا ہی ہے نا؟'' سجاول نے بابے فیض محمد سے تصدیق چاہی۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ جٹ پتر ہوں لیکن ولایت پلٹ ہوں۔ میرے ماں باپ میرے بچپن میں ہی ڈنمارک چلے گئے تھے۔ وہیں پلا بڑھا ہوں مگر پھر اپنے وطن کی مٹی، مجھے پھر یہاں کھینچ لائی۔''

''گھر میں اور کون کون ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''والد، والدہ ہیں اور یہ گھر والی ہے۔ کوئی بڑا ٹبر نہیں ہے۔''

''باہر کے ملک میں عیش کرتے رہے ہو، اب پنڈ میں کیسے گزارا کر رہے ہو؟''

''گزارا تو وہاں ہو رہا تھا۔ زندگی گزارنے کا مزہ تو یہاں ہی آیا ہے۔''

وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''فیض نے بتایا ہے کہ جی دار بندے ہو۔ اسلحہ چلانا بھی جانتے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ موقع پڑنے پر تمہاری رائفل نے تمہارا ساتھ نہ دیا۔''

''ہاں جی۔ کوئی خرابی ہوگئی تھی اس میں۔'' میں نے کہا۔

''اور اس خرابی نے تمہیں میرے بندوں کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچا لیا۔''

میں سر جھکا کر رہ گیا، وہ بولا۔ ''فیض بتا رہا تھا کہ یہ

کلاشنگوف تم نے ان مجاوروں سے ہی چھینی تھی؟"

"ہاں جی، ایسا ہی ہوا ہے۔ شریف بندے کی عزت داؤ پر لگ جائے تو پھر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ ہم نے بھی اپنی عورتوں کو بچانے کے لیے مجاوروں سے ٹکر لے لی۔ ہمارا ایک ساتھی مارا بھی گیا ہے لیکن ہم کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آئے۔"

سجاول سیالکوٹی نے ایک گہری سانس لی اور اس کا صندوق جیسا سینہ کچھ اور بھی نمایاں ہو گیا، وہ بولا۔ "اچھے بھلے تگڑے بندے ہو۔ کوئی تگڑا کام کرو۔ یہ وڈے زمیندار، یہ وڈیرے، یہ گدی نشین اور مخدوم، یہ سب چھوٹے لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں، ان کا خون چوستے ہیں، ان کی تو...." اس نے ایک گالی دی اور ایک طرف تھوک دیا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ سارے وڈیرے اور گدی نشین تو ایسے نہیں ہوتے لیکن... پھر اس موقع پر سجاول جیسے غضب ناک شخص کے سامنے نکتۂ اعتراض اٹھانا مجھے مناسب محسوس نہیں ہوا۔ میں خاموش رہا۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "فیض نے بتایا ہے کہ تمہارا جو ساتھی مرا، وہ بڑی عمر کا تھا۔"

"ہاں جی، ہم اسے چاچا رزاق کہتے تھے۔ ہمارے ساتھ جو دوسری لڑکی تھی، وہ اس کا والد تھا۔ وہاں ڈیرے سے نکلنے کی کوشش میں وہ مجاوروں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔"

سجاول مجھ سے کرید کرید کر ملنگی ڈیرے کے محلِ وقوع کے بارے میں پوچھنے لگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا اب ہم اپنے مقتول ساتھی کی موت کا بدلہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں یا اس کے قتل کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کریں گے۔

میں نے کہا۔ "ابھی میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ ہم گاؤں پہنچ کر اور اپنے بڑوں سے بات کر کے ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

وہ مجھے بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ میرا لہجہ اس کے لیے دلچسپی کی چیز تھا۔ (میں نے اب اپنے لب و لہجے پر بہت حد تک کنٹرول حاصل کر لیا تھا لیکن پھر بھی پنجابی میں اردو اور کبھی کبھی انگلش کی آمیزش بھی ہو جاتی تھی)

وہ جب بھی ملنگی ڈیرے کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال پوچھتا تھا، مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ملنگی ڈیرے کا تھوڑا بہت نام پہلے بھی سنا ہوا ہے۔ ملنگی ڈیرے کے بارے میں اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میرے جسم میں پھریری سی دوڑ جاتی تھی۔ اگر یہ شخص ملنگی ڈیرے کو کھوجنے نکل کھڑا ہوتا اور وہاں تک جا پہنچتا تو پھر ظاہر ہے کہ اسے وہاں کے سارے حالات بھی معلوم ہو جاتے تھے۔ جب حالات معلوم ہوتے تو شاید وہ یہ بھی جان لیتا کہ ملنگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے والے ہری پورہ کے نہیں چاند گڑھی کے رہنے والے ہیں۔ اگر ہمارا تعلق چاند گڑھی سے ثابت ہو جاتا تو پھر اور بھی بہت کچھ ثابت ہو جانا تھا جس میں سے اہم اور تہلکہ خیز بات یہی ہوتی کہ میں وہی "ولایت پلٹ جٹ پتر" ہوں جو دین محمد کا گونگا ٹریکٹر ڈرائیور بنا ہوا ہے اور میرے ساتھ کوئی شمسہ نامی لڑکی نہیں بلکہ دین محمد کی اکلوتی بیٹی تاجور ہے اور یہ وہی تاجور ہے جو ایک مرتبہ پہلے ہی اس کے (سجاول کے) ہرکاروں کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچی ہے۔

سجاول سیالکوٹی میں خوداعتمادی حد سے زیادہ تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ ایک نامی گرامی ڈکیت تھا۔ اس کے دشمن تو دشمن اس کے دوست بھی اس کے غیظ و غضب سے خوف کھاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ چاند گڑھی اور اردگرد کے علاقوں میں وہ دہشت بن کر لوگوں کے اعصاب پر سوار تھا اور بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کے اچانک حملے کے اندیشے سے گھر بار چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہے تھے۔

اگلے روز ایک ادھیڑ عمر عورت ہمارے پاس کمرے میں پہنچائی گئی۔ اس کا نام اختری بی بی معلوم ہوا۔ پتا چلا کہ یہ اس جگہ کے خادموں میں سے ہے۔ تندور پر روٹیاں پکانے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یہ دایہ گیری بھی کرتی ہے۔ اختری بی بی نے تاجور کا حال احوال پوچھا۔ اس کی طبیعت دریافت کی، اور چپکے سے اس کے پیٹ پر ہاتھ وغیرہ بھی پھیرا۔ مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ ایسی کائیاں عورت سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ ہمارا جھوٹ پکڑ لیتی لیکن خیریت گزری۔ تاجور نے اس سے سرگوشیوں میں بات کی اور اسے یہ بتا کر مطمئن کیا کہ ابھی اسے چار پانچ ہفتے ہی ہوئے ہیں۔ وہ تاجور کو چند ہدایات دے کر واپس چلی گئی۔ بہرحال الجھن کی ایک شکن سی ضرور میں نے اس کے ماتھے پر دیکھی۔

دوپہر کو ہمیں اچھا کھانا دیا گیا مگر فیض محمد یا سجاول کی شکل پھر نظر نہیں آئی۔ تاجور نے مجھ سے پوچھا۔ "پتا نہیں

کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مونچھوں والے سردار کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ کیا آپ نے اسے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے؟''

یہ ایک مشکل سوال تھا۔ میں اس سوال کا درست جواب دے کر تاجور کے خوف وہراس میں بے پناہ اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اختری بی بی یہاں آئی تھی اور امید تھی کہ وہ آئندہ بھی آتی رہے گی۔ اس نے کسی بھی وقت تاجور کو بتا دینا ہے کہ یہاں کا کرتا دھرتا اصل میں کون ہے۔ وہ نہ بتاتی تو کوئی اور بتا دیتا۔ یہ بات زیادہ دیر راز نہیں رہنا تھی۔ تو پھر کیوں نا میں ہی اچھے طریقے سے تاجور کو بتا دیتا۔ میں نے کہا۔

''تاجور! کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔''

یہ تمہید باندھنے کے بعد میں نے تاجور کے گوش گزار کر دیا کہ ہم اس وقت کسی اور کی نہیں سجاول سیالکوٹی کی میزبانی میں ہیں۔

تاجور کو شدید شاک لگا۔ وہ کئی سیکنڈ تک بول نہیں پائی۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور کہا۔

''تاجور! بری خبر تم نے سن لی۔ اب اچھی خبر یہ ہے کہ سجاول سمیت یہاں کوئی ایسا بندہ موجود نہیں جو تمہیں تاجور کی حیثیت سے اور مجھے گونگے ڈرائیور کی حیثیت سے پہچان سکے۔ ان کی یہ بے خبری ہمیں یہاں سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے۔''

وہ لرزتی آواز میں بولی۔ ''کیا یہ سجاول کا گھر ہے؟''

''ایسے لوگوں کے گھر نہیں، خفیہ ٹھکانے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی ٹھکانا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ ہم کتنے دشوار راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کبھی کبھار اس جگہ آتا ہو۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ فیض محمد تھا۔ اس نے سفید کرتہ اور تہبند پہن رکھا تھا، سفید ہی پگڑی تھی۔ وہ ہمارے پاس آکر لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، پھر تاجور کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ واحد شخص تھا جس کی نگاہوں میں تاجور کے لیے خباثت کے بجائے نرمی اور اپنائیت تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم ٹھیک جا رہی ہو۔ لیکن اس اختری بی بی سے ذرا ہوشیار رہنا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پھر تمہارے پاس آئے۔ اس کے سامنے تم کو پورا ڈراما کرنا پڑے گا۔۔۔ سمجھ رہی ہو نا؟''

تاجور تو کوئی جواب نہیں دے پائی۔ میں نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ وہی ہوگا جو آپ کہہ رہے ہیں۔''

''اور اسی میں اس کی بھلائی ہے۔'' فیض محمد نے زور دے کر کہا پھر سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ آج سردار بھی تم سے رابطہ کریں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور اپنی طرف سے ان کا دل صاف کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ خود بھی ایسے ڈھونگی ملنگوں اور فقیروں کے بہت خلاف ہیں۔ ان کو اچھا نہیں سمجھتے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور ایک بات تمہیں اور بتا دوں۔ کسی طرح کی چالاکی نہ دکھانا۔ جیسے کہ کل رستے میں دکھا چکے ہو۔ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے تو خود کو اور اس لڑکی کو بہت وڈی مصیبت میں ڈال دو گے۔ سردار معاف کرنا نہیں جانتا۔ ذرا سی بات پر سر، دھڑ سے جدا ہو جاتا ہے یہاں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے فیض محمد کی تائید کی۔

کہیں پاس کے کسی کمرے میں کوئی شخص نشے کی حالت میں غل غپاڑا کر رہا تھا۔ ملازمین شاید اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ انہیں بھی ڈانٹ رہا تھا۔ یہ سجاول تو ہرگز نہیں تھا۔ میں اس بارے میں فیض سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اسی اثنا میں وہ اٹھ کر چل دیا۔

جیسا کہ فیض نے کہا تھا، شام سے کچھ پہلے وہ ایک پیغام لے کر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، جس میں کپڑوں کے دو جوڑے اور سویٹر وغیرہ تھا۔ چوڑی ناک والا نجو خودکار رائفل ہاتھ میں لیے اس کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑکی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا۔ فیض محمد نے میرے پاس آکر کہا۔

''سردار سجاول نے تمہیں یاد کیا ہے لیکن اس سے پہلے اپنا حلیہ بدل لو۔ اتارو یہ منحوس چولا۔ ساتھ والے غسل خانے میں جا کر ان میں سے کوئی ایک جوڑا پہن لو۔''

''لیکن۔۔۔''

وہ میرا مطلب سمجھ کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ تمہاری منگیتر کو یہاں کسی طرح کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ یہ میری بیٹی کی طرح ہے۔ میں اس کی طرف سے ضمانت دیتا ہوں۔ ویسے بھی اختری بی بی آ رہی ہے۔ وہ تمہارے آنے تک یہاں اس کے پاس رہے گی۔''

مجھے دور سے اختری آتی دکھائی دی۔ پتا نہیں کیوں فیض محمد کی باتوں پر بھروسا کرنے کو دل چاہتا تھا۔ میری

چھٹی حس بھی کچھ ایسی ہی گواہی دے رہی تھی اور اس حس نے مجھے بہت کم دھوکا دیا تھا۔

فیض محمد نے کوٹھری کا چوبی دروازہ کھول دیا۔ اختری بی بی اندر آگئی۔ وہ تاجور کے لیے مالٹے لے کر آئی تھی۔ تاجور اور وہ باتیں کرنے لگیں تو میں باہر آگیا۔ فیض محمد نے مجھے ایک قریبی دروازے تک پہنچایا اور کپڑے، تولیا، صابن وغیرہ مجھے دے دیا۔ فخرو رائفل سونتے میرے اردگرد موجود تھا۔ وہ راستے میں میری خطرناک مزاحمت دیکھ چکا تھا، لہٰذا اب مجھے کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ غسل خانے میں گرم بھاپ دیتے پانی کی بالٹی بھری ہوئی تھی۔ میں نے رضوان کا لایا ہوا نیلا چولا اور ٹراؤزر اتار دیا۔ (پیر سائیں والا قیمتی چغا میں نے ملنگی ڈیرے سے نکلتے ہی اتار پھینکا تھا) میں نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے، سویٹر پہنا اور کنگھی وغیرہ کر کے تیار ہو گیا۔ فخرو مجھے اپنے ساتھ لے کر احاطے کی مشرقی سمت میں بڑھا۔ اب اس کے ساتھ ایک اور رائفل بردار بھی موجود تھا۔ احاطے میں ہر طرف مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ دو مین دروازوں پر خوفناک شکلوں اور بڑے بڑے پگڑوں والے چوکیدار کھڑے تھے۔ ان کے پاس جدید رائفلیں تھیں اور وہ ایک اشارے پر کٹ مرنے والے لوگ لگتے تھے۔ میں نے ان میں سے کئی ایک کی کمر میں بڑے بڑے تیز دھار چھرے بھی بندھے ہوئے دیکھے۔ کل راستے میں ان لوگوں نے ایک ایسا ہی چھرا تاجور کی گردن پر رکھ کر مجھے بے بس کر ڈالا تھا۔

ایک کمرے کے اندر سے مار دھاڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں لگا کہ سجاول کے کچھ بندے، لڑائی بھڑائی اور چھرے بازی کی مشق میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ مجھے لیے ہوئے ایک کشادہ کمرے میں آئے .... یہاں مٹی کی ایک بڑی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ سرخ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ مجھے لانے والے مسلح افراد میں سے فخرو نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر احتیاطاً میرے لباس کی تلاشی لی اور مجھے اندر بھیج دیا۔ لمبا تڑنگا بارعب سجاول سیالکوٹی پھیل کر ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ڈرائی فروٹ سے بھری ہوئی دو پلیٹیں تھیں اور قہوے کے برتن رکھے تھے۔ میں ''مؤدب'' کھڑا رہا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آلتی پالتی کے بجائے دوزانو بیٹھنا مناسب سمجھا۔

اس نے میرا حال چال دریافت کیا۔ پھر بارعب لہجے میں بولا۔ ''ملنگوں کے ڈیرے کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ''موٹی مرغی'' ہیں۔ ان کے پاس چڑھاؤں اور نذر و نیاز کا کافی روپیا ہوگا۔ مجھے پتا ہے ایسے مزاروں پر لوگ نقدی کے علاوہ زیور اور دوسری قیمتی چیزیں بھی چڑھاتے ہیں۔''

''بالکل جی، ایسا ہی ہے۔'' میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

سجاول کی آنکھوں میں شکاری چمک ابھر آئی تھی وہ بولا۔ ''ایسے لوگوں سے چھیننا پاپ نہیں پُن ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ان ملنگوں کی ایسی تیسی کی جائے تو روپیا نکلے گا ان کے پاس سے؟''

''نکلنا تو چاہیے جی۔ مگر ہیں یہ نخرے لوگ۔ کیا پتا جمع پونجی مزار کے بجائے کہیں اور رکھتے ہوں۔''

''مزار کے اندر کے حصے میں کتنے محافظ ہوتے ہوں گے؟''

''ہم زیادہ اندر تو نہیں گئے جی لیکن سیکیورٹی وغیرہ تو بڑی رکھی ہوئی ہے انہوں نے۔''

اچانک سجاول سیالکوٹی کے قیمتی سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی اور باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو میں عالمگیر کا لفظ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہ وہی عالمگیر تھا جسے میں نے اپنے اتارے ہوئے فوٹو گرافز کی مدد سے اس کے رشتے دار ٹوانہ سے لڑایا تھا اور جیل پہنچایا تھا۔ سجاول اپنے کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ اس نے عالمگیر کے وکیل کو ماں کی گالی دیتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔ ''بس ایک پیشی اور دیکھ لو۔ پھر دفع کرو اس کو۔ ہم نے دو مہینے کے اندر اندر عالمگیرے کی ضمانت کرانی ہے اور ہر صورت کرانی ہے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جس کے جواب میں سجاول دہاڑا۔ ''اس پیدا گیر کو تو میں دیکھ لوں گا۔ اس کی بیٹی کو لاہور کی ہیرا منڈی میں نہ نچوایا تو سجاول نام نہیں۔ بہت دیکھے ہیں ایسے بھن خور افسر۔''

فون بند کر کے اس نے مونچھوں کو سہلایا اور نیا سگریٹ سلگانے لگا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ وہ جس عالمگیرے کو جیل سے باہر لانے کی باتیں کر رہا ہے، اسے جیل میں پہنچانے والا اس سے بس دو فٹ دوری پر بیٹھا ہے۔ مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ سجاول کے اس ٹھکانے پر اس کا کوئی ایسا بندہ موجود نہ ہو جو مجھے یا تاجور کو پہچانتا ہو۔

بہر حال اس حوالے سے ابھی تک تو خیریت ہی تھی۔
اس سے پہلے کہ میری اور سجاول کی گفتگو کا سلسلہ بحال ہوتا، اس کے سیل فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس نے دوبارہ کال ریسیو کی۔ اس مرتبہ کوئی زیادہ خاص بات تھی وہ بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اتنے میں ایک ملازم آیا اور اس نے گرما گرم قہوہ لاکر رکھ دیا۔ قہوے کی خوشبو اشتہا آمیز تھی مگر مجھے سجاول کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ ملازم قہوہ رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں تکیے سے ٹیک لگا کر اور ذرا ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ ذہن عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسی دوران میں دروازے کی طرف سے ایک بھاری نسوانی آواز آئی۔ ”سجاولے... او سجاولے۔“
چند سیکنڈ بعد ایک تھیم شحیم عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر 55 سال سے اوپر ہی ہوگی۔ چہرہ رعب دار تھا۔ اس نے ایک موٹی اونی شال اوڑھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ پہلے اس کے چہرے پر حیرت اور پھر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ میری طرف انگلی اٹھا کر لرزتی آواز میں بولی۔ ”تم... سجاولے کے ساتھ ہی آئے ہو نا؟“
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”نیازیوں کے پتر ہو نا...؟“ اس نے پوچھا اور پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی جیسے خوشی سے چلا اٹھی۔ ”مجھے پتا تھا، تم آؤ گے... ضرور آؤ گے۔ میں صدقے جاواں، واری جاواں... بالکل ویسے ہی ہو جیسا میں نے سوچا تھا۔ اونچے لمبے، سوہنے۔“
میں حیرت کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ میرا منہ، سر چومنے لگی۔ پھر وہ دروازے کی طرف منہ کر کے پکاری۔ ”اوئے دینو... اوئے فخرو۔ کہاں مر گئے ہو... اِدھر آؤ... جلدی آؤ۔ شگن کرو۔ میرا پتر آیا ہے۔ میرے گھر کی رونق آئی ہے۔“
”ماں جی... میں نے تو...“
”بس بس... اب کچھ نہیں کہنا۔ میں وہی کروں گی جو میری مرضی ہے۔ اس نے مجھ پر بوسوں کی بارش کر دی۔ میری گردن کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھ... یہ تل بھی ہے تیری گردن پر۔ یہ بھی اس بات کی نشانی ہے کہ تو ہی میری مائی کا سہاگ بنے گا۔ تو ہی بنے گا۔“ وہ مجھ پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔
میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ لپکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دو منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں سو سو کے سرخ نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔ اس کے پیچھے پانچ چھ ملازم لپکتے ہوئے آرہے تھے۔ عورت نے مجھ پر نوٹ نچھاور کرنے شروع کر دیے۔ ملازم جھپٹ جھپٹ کر یہ نوٹ اکٹھے کرنے لگے۔ نوٹ ختم ہوئے تو اس نے چوڑی ناک والے فخرو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے پھینے! (چپٹی ناک والے) جا جلدی سے دنبہ لے کر آ۔ جلدی کر۔“
فخرو چند سیکنڈ تذبذب میں رہا مگر جب عورت نے اسے ڈانٹ پلائی تو وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ تھیم شحیم عورت مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی ایک اندر کے کمرے میں لے آئی۔ یہ سجا سجایا کمرا تھا۔ اس میں رنگین پایوں والی مسہری اور بان کی رنگین کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ وہ دیوانے پن سے بولی۔ ”تو یہاں بیٹھ پتر۔ تو کوئی مہمان نہیں ہے۔ تو تو گھر کا بندہ ہے۔ اس گھر کی رونق ہے... پتا نہیں کب سے تجھے اڈیک رہی تھی میں۔“
میں نے کہا۔ ”ماں جی! آپ پہلے سجاول صاحب سے بات کرلیں پھر آپ کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔“
”مجھے کچھ بتانے کی لوڑ نہیں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ اس نے کل ہی مجھے بتا دیا تھا سب کچھ۔“
وہ لپک کر ایک الماری کی طرف گئی اور اس میں سے ایک امام ضامن جیسی چیز نکال لائی۔ اس نے میری کوئی بات سنے بغیر یہ شے میری کلائی پر باندھ دی اور ایک بار پھر میرے ماتھے کا طویل بوسہ لیا۔ اسی دوران میں کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف دنبے کی آواز سنائی دی۔ یہ دروازہ ایک برآمدے میں کھلتا تھا۔ عورت مجھے اپنے ساتھ برآمدے میں لے آئی۔ سیاہی مائل رنگ کا ایک موٹا تازہ ترکی دنبہ برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کی رسی چوڑی ناک والے فخرو کے ہاتھ میں تھی۔ تین چار مزید افراد بھی یہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں تیز دھار چھرا تھا۔
سجاول سیالکوٹی مجھے اس سچویشن میں پھنسا کر خود نہ جانے کہاں دفع ہو گیا تھا۔ دو افراد نے نہایت صحت مند دنبے کو میرے پاؤں میں لٹایا اور پھر اسے ذبح کر دیا۔ عورت خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر میرا بازو پکڑا اور مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی واپس کمرے میں لے آئی۔ کرسی پر مخمل کا کشن رکھتے ہوئے اس نے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں ہچکچاتا ہوا بیٹھ گیا۔ وہ پکاری۔ ”اوئے دینو! کہاں مر گیا ہے؟“
دینو بھاگتا ہوا آیا۔
عورت نے کہا۔ ”وہ قہوے کے بھانڈے اور مونگ

پھلیاں ریوڑیاں اِدھر لے کر آ... یہاں۔''

دینو ایک بڑی ٹرے میں سب کچھ رکھ کر اس کمرے میں لے آیا۔ وہ یہ اشیا میز پر سجانا چاہتا تھا مگر میز پر کچھ دوائیں وغیرہ رکھی تھیں۔ عورت نے بڑے جذباتی انداز میں یہ دوائیں اٹھائیں اور انہیں دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں پھینکنے لگی۔ ''مجھے نہیں لوڑ (ضرورت) اب ان دواؤں کی۔ اب میرا جوائی پتر آ گیا ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ملازم دم بخود کھڑے تھے۔ اسی دوران میں میری نظر اونچے لمبے بارعب سجاول پر پڑی۔ وہ برآمدے کی طرف سے کمرے کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے عورت کو دوائیں پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ ذبح شدہ دنبہ بھی دیکھ لیا تھا جس کی گردن سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ ملازم دینو مؤدب انداز میں سجاول کے پہلو میں چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کو صورتِ حال کے بارے میں بتا رہا تھا۔ سجاول کے چہرے پر حیرت اور تشویش کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ قریب پہنچا تو عورت نے اس کی بھی بلائیں لینا شروع کر دیں۔ وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولی۔ ''تو نے میرا کلیجا ٹھنڈا کر دیا۔ مجھے پتا تھا تو اس بار وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ یہ دیکھ... یہ دیکھ۔ میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ اس کی ناک اونچی ہوگی، اس کی گردن پر تل ہوگا۔ یہ دیکھ... یہ ہے تل۔ یہ ہے۔'' اس نے میری گردن پر انگلی رکھی۔ اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔

سجاول نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ شاید وہ عورت کی حالت دیکھتے ہوئے اسے کوئی شاک پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کیا صورتِ حال تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہرطور جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لحیم شحیم عورت جسے یہاں سب ماؤ جی کہتے ہیں دراصل سجاول کی والدہ ہے اور اس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹانے لگی اور میری بلائیں لینے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے سامنے دیہاتی مٹھائی اور فروٹ وغیرہ کا ڈھیر لگ گیا۔ دو بڑے بڑے گلاسوں میں گرما گرم تازہ دودھ لایا گیا جس پر بہت سی ملائی تیر رہی تھی۔ عورت کے کہنے پر میں نے اور سجاول نے مٹھائی کھائی اور دودھ پیا۔

اسی دوران میں عورت جسے بڑے احترام سے ماؤ جی کہا جا رہا تھا، بہت جذباتی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''میں مانی کو خوش خبری سنا کر آتی ہوں۔ تم دونوں اِدھر ہی بیٹھو، باتیں شاتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو جھلاتی اور اپنی قیمتی شال سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد سجاول کے تاثرات بدل گئے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے خشونت برسنے لگی۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''ماؤ جی کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اپنی ایک پوتی کو انہوں نے ماں بن کر پالا ہے۔ اس کی ماں ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئی تھی اور باپ بالکل ناکارہ، بیمار ہے۔ اس لڑکی کا نام مہناز ہے، ہم اسے مانی کہتے ہیں۔ ماں جی اس کے ویاہ کے لیے بہت زیادہ فکرمند رہتی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کی فکر نے ان کو بستر پر ڈال دیا ہے۔ بہت سمجھ بوجھ والی ہیں پر کسی وقت دیوانوں کی سی بات کرنے لگتی ہیں۔ مانی کی عمر چھبیس ستائیس سال ہو چکی ہے پر ابھی تک اس کا کوئی مناسب بر نہیں ملا۔ کچھ دن پہلے میں نے انہیں ایک لڑکے کا بتایا تھا لیکن...''

ایک دم سجاول کو چپ ہونا پڑا۔ ماؤ جی جھومتی ہوئی واپس آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک کارندہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید طرز کا کیمرا تھا۔ اس نے ماؤ جی کے سامنے ہی کھٹ کھٹ میری چار پانچ تصویریں مختلف زاویوں سے اتاریں اور ماؤ جی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

سجاول نے پریشانی کے عالم میں اپنی چوڑی چکلی پیشانی مَسلی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ماں جی کو ایک لڑکے کا بتایا تھا۔ مانی کے جوڑ کا ہی تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اس ہفتے کے اندر اسے یہاں لے کر آؤں گا۔ لیکن ایک مسئلہ ہو گیا۔ اس کے ٹھیکیدار باپ نے اسے کہیں آگے پیچھے کر دیا ہے۔ بہت اعلیٰ نسل کا کنجر ہے اس کا باپ۔ بہرحال کچھ بھی ہے، ہفتے دو ہفتے میں، میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ لیکن یہاں پوزیشن کچھ فلموں، ڈراموں والی ہو گئی ہے۔ ماں جی تمہیں ہی وہ لڑکا سمجھ رہی ہیں۔ اب یہ کسی طور ٹھیک نہیں کہ انہیں کسی طرح کا دھچکا پہنچایا جائے۔ ان کی حالت پھر بگڑ سکتی ہے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نیازمندی سے کہا۔ ''آپ بتاؤ جی آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ جب تک وہ مل نہیں جاتا تم خود کو ماں جی کے سامنے وہی ظاہر کرو اور جس طرح وہ کہہ رہی ہیں، ویسا ہی کرو۔ وہ مل جائے گا... اور مجھے یقین ہے کہ ضرور مل جائے گا... تو میں ماں جی کو خود ساری بات بتا کر اطمینان دلا دوں گا۔''

''مجھے کتنے دن یہاں رہنا ہوگا؟''
وہ بے رخی سے بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ دو چار دن، یا پھر دو چار ہفتے بھی لگ سکتے ہیں۔''
''اور اگر وہ لڑکا نہ ملا تو پھر؟''
''دماغ کو زیادہ لمبا نہ دوڑاؤ۔ بس جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' سجاول کا لہجہ خشک ہو گیا۔
''لیکن میری بیوی ہے... یہ چکر اسے بہت پریشان کر دے گا۔''
''اسے بتا دو کہ کیا مجبوری ہے۔ عقل مند ہوئی تو سمجھ جائے گی لیکن جو کچھ بھی ہے ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ ماں جی کو تمہاری یا تمہاری بیوی کی وجہ سے کوئی دھچکا لگا تو پھر تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔ چاچے فیض نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتا ہی دیا ہو گا۔ ہوسکتا ہے، تم نے خود بھی تھوڑا بہت سن رکھا ہو۔''
''ہاں جی، آپ کو کون نہیں جانتا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں اس طرح آپ سے ملاقات ہوگی۔ آپ کے بندوں کی بڑی مہربانی ہے کہ انہوں نے ملنگوں سے ہماری جان چھڑائی۔ اس کے علاوہ آپ سے اس بات کی معافی بھی چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے بندوں سے جھگڑا کیا۔ دراصل میری بیوی...''
''وہ سارا واقعہ فیض نے مجھے سنا دیا ہے۔'' سجاول نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی اور ڈرائی فروٹ کی ایک مٹھی اپنے بہت بڑے منہ میں جھونک کر بولا۔ ''حرکت تو وہ تمہاری غلط ہی تھی لیکن جو کچھ بھی ہے اس سے تمہاری جی داری کا ثبوت ملتا ہے اور جی دار مجھے پسند ہیں۔ تم پڑھے لکھے بھی لگتے ہو۔ بہادری اور پڑھائی لکھائی ایک ساتھ کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تمہارے جیسے ایک بندے کی لوڑ بھی ہے۔ چلو اس بارے میں پھر بات کریں گے۔''
اسی اثنا میں سجاول سیالکوٹی کے قیمتی موبائل فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور ایک بار پھر بات کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ وہ ایک دم بہت سنجیدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ سجاول کہیں جانے کے لیے تیار نظر آ رہا ہے۔ اس نے سیاہ چادر کی بُکل کے نیچے مشین پسٹل کندھے سے لٹکا لیا تھا۔ اس کے مسلح ساتھی اس کے اردگرد موجود تھے اور وہ بھی تیار دکھائی دیتے تھے۔ سجاول نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی، پھر بوڑھے فیض محمد کو ایک طرف لے جا کر کچھ ہدایات دینے لگا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ہدایات میرے بارے میں ہی ہیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نے فیض محمد سے کہا تھا کہ ماؤ جی کو میری حقیقت سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں یہی معلوم رہنا چاہیے کہ سجاول مجھے بر دکھاوے کے لیے یہاں لے کر آیا ہے۔
چند منٹ بعد سجاول اور اس کے ساتھی عجلت میں کہیں روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بھی سنیں، جو بتدریج دور ہوتی چلی گئیں۔ یقینی بات تھی کہ اس جگہ تک جیپ یا گاڑی وغیرہ کی رسائی نہیں تھی۔ لہٰذا یہ لوگ گھوڑے اور خچر استعمال کرتے تھے۔ میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھانے لگا کہ کہیں یہ ملنگوں والا ہی معاملہ نہ ہو۔ کل والے واقعے میں تو سجاول کے ساتھیوں نے ملنگوں کو بھگا دیا تھا، یہ عین ممکن تھا کہ وہ پھر آ گئے ہوں لیکن ایسی بات ہوتی تو سجاول یا فیض مجھ پر احسان جتانے کے لیے اس کا ذکر ضرور کرتے۔ ویسے بھی جس طرح ملنگوں کی کمر ٹوٹی تھی امکان تھا کہ وہ اس طرح کا ایڈونچر نہیں کریں گے۔ میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ماؤ جی پھر آ دھمکی۔ اس مرتبہ اس کے پاس ایک کارڈ سائز تصویر تھی۔ یہ تصویر ایک خوبرو لڑکی کی تھی۔ بھرے بھرے جسم والی یہ لڑکی چست پتلون اور بغیر آستین کی شرٹ پہنے تن کر کھڑی تھی۔ اس کے بال بوائے کٹ تھے۔ ماؤ بولی۔ ''یہ ہے مانی۔ کیسی لگی؟''
''اچھی ہے۔'' میں نے کہا۔
''طبیعت کی تھوڑی تیز ہے لیکن دل کی بہت چنگی ہے۔ تم ایک دو بار ملو گے تو خود جان جاؤ گے۔'' پھر وہ ذرا توقف کر کے کہنے لگی۔ ''تم سمجھتے ہو گے کہ یہ میری بیٹی ہے نہیں یہ میری پوتری ہے۔ میں نے اسے بڑے لاڈوں سے پالا ہے۔''
اس کے بعد وہ اپنی اس مانی نامی پوتی کی تعریفوں میں مصروف ہو گئی۔ وہ بتا رہی تھی کہ مانی کی ماں ایک ایکسیڈنٹ میں ماری گئی تھی۔ اس وقت مانی صرف چھ سات سال کی تھی۔ مانی کا والد سجاول کا بڑا بھائی تھا۔ بیوی کی موت کے بعد وہ سگریٹ اور شراب کے نشے میں ڈوب گیا۔ کسی کام کا نہ رہا۔ اپنی پوتی مانی کی پرورش ماؤ نے ماں بن کر کی۔ اب وہ اس کے ہاتھ پیلے دیکھنا چاہتی تھی، مگر یہ مراد پوری ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ مانی کی پسند کا بر نہیں مل رہا تھا اور وہ اپنی پسند کے بغیر ہرگز شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔
ہماری گفتگو جاری تھی کہ میں نے اختری بی بی کو

دیکھا۔ وہ سیدھی ہماری ہی طرف آ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے ہی کچھ کہنے کے لیے آ رہی ہے (بعدازاں یہ خیال درست ثابت ہوا۔ وہ بتانے آئی تھی کہ شمسہ (یعنی تاجور) کے سر میں شدید درد ہے۔ وہ روئے جا رہی ہے اور مجھے بلا رہی ہے) لیکن اس سے پہلے کہ اختری کمرے کے اندر پہنچتی اور مجھ سے کچھ کہتی۔ ماؤجی اپنے مخصوص جذباتی انداز میں بول اٹھی۔ "نی اختری! تو کہاں مر گئی تھی۔ یہ دیکھ، یہ کتنی بڑی خوش خبری آئی ہے ہمارے لیے۔" ماؤ نے یہ بات کہتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔

اختری بی بی منہ کھولے میری طرف دیکھنے لگی۔

ماؤ نے بات جاری رکھی۔ "اوپر والے نے ہماری سن لی۔ مانی کا بر مل گیا ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس دیکھنا... دو چار دن کی بات ہے۔"

"مم... میں سمجھی نہیں جی؟" اختری نے کہا۔

ماؤ جوش سے بولی۔ "سجاول نے کہا تھا نا کہ ایک دو دن میں وہ وعدہ پورا کر دے گا۔ اس نے کر دیا ہے۔ آ گیا ہے یہ شاہ زیب۔"

اختری چند لمحے گم صم رہی۔ پھر اس نے ماؤ کو کوئی اشارہ کیا اور اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

میں سمجھ گیا کہ سجاول سیالکوٹی کی ہدایت کے برعکس کام ہونے والا ہے۔ وہ ملازمین کو ہدایت دے کر گیا تھا کہ ماؤجی کو میری اصلیت کا پتا نہ چلے۔ یہ ہدایت غالباً ابھی تک اختری کو نہیں پہنچی تھی اور وہ ماؤ کے سامنے سارا خلاصہ کھولنے والی تھی۔

وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں دونوں عورتوں کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں، ان میں سے کچھ الفاظ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ میں نے اردگرد دیکھا، کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔

اختری کہہ رہی تھی۔ "میں ابھی اس کے پاس سے ہی اٹھ کر آئی ہوں۔ وہ بیوی ہے اس کی۔ شمسہ نام ہے۔ مجھے تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا پاؤں بھاری ہے۔ پر مجھے شک پڑ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی طبیعت شاید ویسے ہی خراب ہے یا مکر کر رہی ہو گی۔ لیکن ایک بات میں آپ کو بالکل پکی بتا رہی ہوں۔ وہ اس شاہ زیب کی بیوی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر ماؤ کی آواز ابھری۔ "تمہاری بات سن کر میرا یقین اور پکا ہو گیا ہے کہ یہ منڈا، مانی کا گھر والا ضرور بنے گا، بلکہ سمجھو کہ بن گیا ہے۔" ماؤ کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

"آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟" اختری نے حیرت سے پوچھا۔

"پیرو سائیں نے کہا تھا۔ انہوں نے گلاب کے عرق سے وضو کر کے پوری "فال" نکالی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ مانی کا ہونے والا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہو۔ اگر وہ شادی شدہ ہوا تو اس کی گھر والی اپنے پہلے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی مر جائے گی۔ اس کے بعد وہ مانی سے شادی کرے گا۔ بہت چنگی زندگی دے گا اسے۔ ساری عمر پاؤں دھو دھو پیے گا۔"

"پر اس منڈے شاہ زیب اور کڑی کو تو یہ لوگ کہیں سے پکڑ کر لائے ہیں۔ وہ کڑی اب تک اتھرو ڈیگ رہی ہے۔" (آنسو بہا رہی ہے)

ماؤ نے بے پروائی سے کہا۔ "ہمیں ان باتوں سے کیا لینا۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام ہونا چاہیے۔ بس یہ منڈا یہاں آ گیا ہے، یہی کافی ہے۔"

"پر ماؤجی، یہ شادی شدہ ہے۔ کیا اس کو ہماری مانی بی بی قبول لے گی؟"

"مجھ سے زیادہ مانی کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا وہ چاہتی ہے۔ تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا..."

شاید میں کچھ اور باتیں بھی سننے میں کامیاب ہو جاتا مگر اسی اثنا میں ایک مسلح شخص برآمدے میں منڈلانے لگا اور مجھے یک لخت دروازے سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد اختری اور ماؤجی باہر آ گئیں۔ میں اختری کے ساتھ تاجور کی طرف چل دیا۔ اس موقع پر ماؤ نے مجھ سے اور کوئی بات نہیں کی۔

تاجور منہ سر لپیٹے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ رات کو بھی نوری اور چاچا رزاق کے لیے روتی رہی تھی اس لیے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے دوا دی اور تسلی تشفی دینے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بکھرے بال جوڑے کی صورت میں سمیٹے اور شال جسم کے گرد لپیٹ لی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے شفاف رخسار سونے کے رنگ کے دکھائی دے رہے تھے۔ غلافی آنکھوں میں نیند کی جھلک تھی۔ چند قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تب میں نے دیکھا کہ دو افراد کے ہمراہ ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑکی کے سامنے آیا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو کانٹوں کی طرح تھی۔ ہونٹ سیاہ اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ سجاول کا وہی بگڑا تگڑا بھائی ہے جس

نے مبینہ طور پر بیوی کی موت کے بعد خود کو شراب میں غرق کر رکھا ہے۔ اس نے اپنا بہت بڑا تھوبڑا کھڑکی کے ساتھ لگایا اور بہکی آواز میں بولا۔ ''ہاں بھئی کہاں ہے وہ سوہنی چھوکری جسے فیض لے کر آیا ہے؟''

اس کو دیکھ کر تاجور نے جلدی سے نقاب کر لیا، بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی دکھائی دیتی رہیں۔ سجاول کے بھائی نے تاجور کو سرتاپا دیکھا، جیسے آنکھوں سے ایکسرے لے رہا ہو۔ پھر اس کے چہرے کی خباثت بڑھ گئی۔ بڑی بے باکی سے بولا۔ ''آہو فخرو، پیس تو اچھا ہے۔ چلو نکالو اس کو ڈبے سے باہر اور میرے کمرے میں پہنچاؤ۔ آج رات اس کو 'چیک' کرتا ہوں۔''

فخرو بولا۔ ''چابی چاچے فیض کے پاس ہے۔''

''فیض سے چابی لے کر آؤ۔ نہیں تو توڑ دو تالا۔ میں پندرہ منٹ کے اندر اس 'ٹوٹے' کو اپنے بستر پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر پہلے اس کو گرم پانی سے ذرا تاری شاری لگوا لو (یعنی غسل کرا لو)۔''

وہ ایسے بول رہا تھا، جیسے کوئی راجا مہاراجا ہو، اور اپنے حرم میں نظر آنے والی کسی خوب صورت لونڈی کو دیکھ کر کپڑوں سے باہر ہونے لگا ہو۔

وہ جانتا نہیں تھا، کمرے کے اندر چند فٹ کی دوری پر نظر آنے والی یہ لڑکی اس سے اتنی ہی دور تھی جتنا مشرق سے مغرب۔ اگر وہ واقعی اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو پھر اسے آگ کے ایک دریا سے گزرنا پڑتا۔

اس نے کوارٹر بوتل کی آدھی وہسکی ایک ہی بڑے گھونٹ میں اپنے اندر انڈیلی اور ہاتھ لہرا کر لوفر انداز میں گانے لگا۔ ''آجا میری رانی لے جا ایک شے نشانی... ایک شے نشانی۔ رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا۔ جب نشہ چھائے گا تب مزہ آئے گا... پھر میری رانی پوچھے گی... دیکھو وے دن چڑھیا کہ نئیں۔ اور میں کہوں گا... میں کہوں گا۔ اے تو ہور گنڈاں ہون گیا پکیاں نی توں جہاں زور لائیں گی...''

وہ کئی گانوں کو آپس میں مکس کر رہا تھا اور ٹُن حالت میں لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ واقعی ایک خطرناک شخص تھا۔ اب میری سمجھ میں فیض محمد کی یہ بات آرہی تھی کہ اس نے آتے ساتھ ہی مجھے یہ ہدایت کیوں کی تھی کہ میں تاجور کو اپنی بیوی بتاؤں، ورنہ اس کی عزت بچانا مشکل ہو جائے گی۔

کچھ اور افراد بھی تماشا دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ اتنے میں چاچا فیض، فخرو کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

اس نے آتے ساتھ ہی کہا۔ ''وڈے سردار، چابی تو میرے پاس نہیں ہے۔ وہ سجاول سردار ساتھ لے گئے ہیں۔''

''کب آئے گا وہ؟''

''پتا نہیں جی۔ ایک دو گھنٹے تو لگ ہی جانے ہیں۔''

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ''اوئے، اتنی ملائم کڑی کے لیے اتنی دیر کون اڈیکے گا۔ توڑ دو تالا۔ اور اسے تاری لگوا کر پہنچاؤ میرے کمرے میں۔''

فیض محمد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''وڈے سردار، یہ شادی شدہ ہے اور... پاؤں بھی بھاری ہے اس کا۔''

وڈے سردار نے چونک کر فیض کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جوش وخروش بھی کچھ ٹھنڈا پڑتا محسوس ہوا۔ غالباً اس وڈے سردار کے لیے سجاول سیالکوٹی نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ وہ بیاہی اور بچے والی عورتوں کو معاف رکھے گا۔ لیکن فی الوقت اس آوارہ شرابی پر نشہ اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ وہ یہاں کے قانون قاعدوں کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تالے کو زور سے جھنجوڑا اور بولا۔ ''شادی شدہ ہے تو اس کے خصم سے اجازت لے لیتے ہیں۔ نوٹ شوٹ دے دیتے ہیں اس کو۔''

اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلے رنگ کے کئی نوٹ ہوا میں لہرائے۔ میں سکون سے بیٹھا رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ فیض محمد کیا کرتا ہے۔ فیض محمد بڑی مشکل سے منت ترلا کر کے ڈگمگاتے ہوئے شرابی سردار کو ایک جانب لے گیا اور اسے کچھ سمجھایا۔ جھلاہٹ کے عالم میں سردار نے شراب کی بوتل نیچے پٹخ کر توڑ ڈالی اور فیض کی گردن پکڑ کر بولا۔ ''تو بالکل کھڑوس ہو گیا ہے۔ لے کر بھی آیا تو بیمار گابھن بکری پکڑ لایا۔ کوئی اتھری ہرنی لے کر آتی تھی۔ سارے موڈ کا کباڑا کر دیا ہے تو نے۔ اب رات تم میں سے کسی کی ہمشیرہ کے ساتھ گزاروں گا؟''

وہ ڈگمگاتا اور جھومتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر رخ پھیرے بغیر زور سے بولا۔ ''کوئی اور انتظام کرو۔ نہیں تو صبح ٹنڈیں کرادوں گا تم سب کی۔''

یہاں کے وڈے سردار سے ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔ سجاول کا بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے اس شخص کو سردار کہا جاتا تھا ورنہ اصل حکم تو سجاول کا ہی چلتا تھا۔ اس کا نام اعظم جاہ معلوم ہوا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کل غل غپاڑے کی جو آوازیں آرہی تھیں، وہ بھی اسی شخص کی تھیں۔

کچھ دیر بعد فیض محمد پھر ہمارے پاس کوٹھڑی کی کھڑکی کے سامنے آیا۔ تاجور لحاف اوڑھ کر بے حرکت لیٹی

تھی۔ پتا نہیں سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ سرگوشیوں میں مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ ''فکر نہ کر شاہ زیب! کچھ نہیں ہوگا تیری منگیتر کو۔ سردار سجاول ایسے معاملوں میں بڑا سخت ہے۔ کوئی بہت زیادہ مجبوری کی بات نہ ہو ورنہ وہ شریف عورت پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اپنے اس نشئی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ بازاری عورتوں کا انتظام کرلیتا ہے۔ اس وقت بھی تین چار کسبیاں ہیں یہاں۔ راولپنڈی سے لایا ہے سردار سجاول۔ پندرہ بیس دن تو گزر ہی جائیں گے اس کے۔''

''پندرہ بیس دن؟ کیا مطلب؟''

''ایک عورت سے ایک ہفتے میں دل بھر جاتا ہے اس کا۔ پھر اس سے لڑ جھگڑ کر بھگا دیتا ہے اُسے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ سردار سجاول کا سگا بھائی ہے؟''

''سگا ہی ہے تو اس کے سارے کرتوت برداشت ہو رہے ہیں نا یہاں۔ کوئی اور ہوتا تو کب کا جیل میں یا پھر قبر میں سڑ رہا ہوتا۔''

''سنا ہے اس کی بیوی کسی ایکسیڈنٹ میں مر گئی تھی۔ اس کے بعد سے اس کی حالت ایسی ہوئی؟''

فیض محمد کے ہونٹ بے ساختہ طنزیہ انداز میں کھنچ گئے۔ ہولے سے بولا۔ ''ایکسیڈنٹ وغیرہ میں نہیں مری تھی۔ کوئی اور چکر تھا خانہ خراب کا... چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تمھیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تم شمسہ (تاجور) کی طرف سے ذرا سی فکر بھی دل میں نہ لانا۔ اس کو یہاں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ سمجھو میں ہر وقت اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا خیال درست تھا۔ اختری بی بی ہوشیار عورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے ''پاؤں بھاری'' ہونے کے بارے میں ہمارا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔''

''ہاں، اس نے تھوڑی سی بات مجھ سے بھی کی ہے۔ اسے شک ہے لیکن کچھ بھی ہے، میں اسے سنبھال لوں گا۔ تم کوئی پریشانی نہ لو اور شمسہ سے کہو کہ خود کو بیمار ہی ظاہر کرے۔''

اگلے روز بھی سجاول سیالکوٹی مجھے اپنے اس ٹھکانے پر کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے فیض محمد سے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ شام کے وقت میرے لیے ایک بار پھر ماؤ جی کا بلاوا آ گیا۔ بلاوا لانے والا فیض محمد ہی تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمھاری واپسی تک میں یہاں شمسہ کے آس پاس موجود ہوں۔ تم بالکل بے فکر

رہو۔"

میں نخرو کے ساتھ کل والے سجے سجائے کمرے میں پہنچا۔ لیکن یہاں ماؤجی کے بجائے ایک فتنہ ساماں لڑکی موجود تھی۔ وہی کسے ہوئے بدن والی اور شوخ چشم نازنین جس کی تصویر کل مجھے ماؤجی نے دکھائی تھی۔ آج موسم کی مناسبت سے اس نے کاٹرائے کی تنگ پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ بوائے کٹ بال گیس لیمپ کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ "اچھا تو تم ہو شاہ زیب؟" وہ مجھے سرتاپا گھور کر بولی۔

"ماؤجی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے تمہیں میرے لیے ہی بلایا تھا تاکہ ہم کوئی بات شات کرلیں۔" وہ بڑے نخرے سے بولی۔ پھر مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "چلو آؤ، تمہیں اپنا کمرا دکھاؤں۔"

ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھ سے دو قدم آگے تھی اور کوشش کررہی تھی کہ چلتے ہوئے اس کے جسم کی ساری دلکشی نمایاں ہوکر سامنے آئے۔ ہم جس کمرے میں پہنچے وہ بھی آراستہ تھا۔ ایک بڑا ٹیپ ریکارڈ اور آڈیو کیسٹس یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ دھیمی آواز میں ایک شوخ انڈین گانے پلے ہورہا تھا۔ کمرے کی سجاوٹی اشیا میں دو تین پوسٹر سائز تصویریں بھی نظر آئیں جن میں سری دیوی اور مادھوری رقص کے نام پر نابالغوں کو بالغ اور بوڑھوں کو جوان بنارہی تھیں۔

یہ تھی مہناز عرف مانی۔ اس کی شادی کی عمر واقعی نکلی جارہی تھی۔ کمرے میں انگیٹھی روشن تھی۔ انگیٹھی کی حدت میں پہنچ کر مانی کے رخسار کچھ اور بھی دہکنے لگے۔

اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی دوسری کرسی پر اس انداز میں بیٹھ گئی کہ اس کے بدن کے نشیب و فراز نمایاں تر ہوگئے بولی۔ "میں صاف صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ چاہے بات اچھی لگے یا بری۔"

"یہ اچھی عادت ہے۔" میں نے کہا۔

"تم سوچ رہے ہوگے کہ میں شکل صورت کی اتنی بری بھی نہیں، پھر ابھی تک میری شادی کیوں نہیں ہوسکی۔ اس کا سیدھا سیدھا جواب ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ میرا چاچو سجاول ایک نامی گرامی ڈکیت ہے۔ میرا ابا بھی کچھ کم شریف نہیں ہے۔ بلکہ کچھ شرافتیں ایسی ہیں جن میں وہ چاچو سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ مثلاً پینا پلانا اور رنگ بازی کرنا۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟" اس نے بے تکلفی سے اپنے دونوں پاؤں کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل آرہی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور دوسری وجہ؟"

"دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر بندہ میری پسند کا نہ ہوگا تو میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ شادی تو دور کی بات ہے، ایسے بندے کو تو میں لاتیں مار مار کر بھگا دیتی ہوں۔ سب سے پہلے میرا جو رشتہ آیا، وہ دو سال پہلے آیا تھا۔ لڑکا شکل کا تو ٹھیک تھا مگر جسم پر بوٹی ہی نہ ہو تو ایسی شکل کا کیا کرنا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد تھا مگر لگتا ایسے تھا کہ بانس پر کپڑے لٹکا رکھے ہوں۔ اوپر سے تمباکو والا پان کھاتا تھا جس طرح لوگ سگریٹ سے سگریٹ لگاتے ہیں وہ پان سے پان لگاتا تھا۔ منگنی والے دن مجھ سے بات کرتے ہوئے کسی بات پر ہنسا تو پان کے چھینٹے سیدھے میرے منہ پر پڑے۔ مجھے رومال دینے کے لیے جیب سے رومال نکالنے لگا تو ساتھ ہی چرس کی دو ڈلیاں نکل کر میز پر آگریں۔ جس طرح پان کے چھینٹے سیدھے میرے منہ پر آئے تھے، میں نے بھی لات سیدھی اس کی پسلیوں میں ماری۔" اس منظر کو یاد کرکے وہ خود ہی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔

چند سیکنڈ بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "کوٹلی کا ایک بڑا نشے باز تھا وہ۔ اس کے بعد سنا ہے کہ کوٹلی وغیرہ میں تو کبھی نظر نہیں آیا۔"

"مطلب یہ ہے کہ نشہ تمہیں اچھا نہیں لگا۔ اچھی بات ہے۔ ایسے برے ماحول میں رہ کر بھی تم بری چیز کو برا ہی سمجھتی ہو۔"

"نہیں ایسی بات بھی نہیں۔ لیکن یہ چرس افیم بھی کوئی نشہ ہے۔ نشہ ہو تو پھر کڑاکے دار ہو۔ وسکی ہو، شیمپین یا جن ہو یا پھر پہلی دھار کی دیسی ہو۔ مرد پی کر شیر بنے... یا کم از کم... مرد تو لگے، چوہا تو نہ لگے۔"

اس نے چند لمحے توقف کرکے آئینے کی طرف دیکھا اور اپنے بال سنوارے۔ پھر بولی۔ "دوسرا رشتہ چاچو کے کسی جاننے والے کا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ جی دار تھا۔ شاید ایک تھانے دار کی ٹانگ بھی توڑی تھی اس نے۔ دو چار ڈکیتیوں میں بھی حصہ لیا ہوا تھا۔ لیکن میرے سامنے یوں بیٹھتا تھا جیسے بلی کے سامنے چوہا۔ بس، آہو جی... ہاں جی... ٹھیک ہے جی کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی تھی اسے۔ اسے بھی میں اپنا کمرا دکھانے کے لیے لائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کھل کر کوئی بات کرے گا کچھ اپنی کہے گا، کچھ

میری سنے گا۔ پر وہ تو ایسے بیٹھا رہا جیسے گل گھوٹو کی بیماری ہو۔ سر جھکایا ہوا تھا اور میرے پاؤں سے نظریں ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ میری ساری چیزوں میں سے اسے میری جوتی ہی زیادہ پسند آئی ہے۔ میں نے وہ جوتی ہی اتار لی۔ میرا پارا چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سر کی ساری گرد جھاڑ دی۔ ایسا بھاگا کہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے بعد چاچو کے ہاتھ بھی نہیں آیا۔ اس کی ایک تصویر ہے میرے پاس۔ بلکہ دونوں کی تصویریں ہیں۔ دکھاؤں تمہیں؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ کرسی پر کھڑی ہو گئی۔ ''ذرا کرسی کو ہاتھ رکھنا۔'' اس نے کہا۔

میں نے کرسی کو پکڑا۔ اس نے کرسی کے دونوں ہتھوں پر دونوں پاؤں رکھے اور ایک الماری کے اوپری خلا تک ہاتھ پہنچا کر ایک البم نکال لیا۔ لیکن کرسی سے اترتے ہوئے وہ بری طرح ڈگمگائی اور میرے اوپر آن گری۔ اب پتا نہیں یہ اتفاقیہ ہوا تھا یا اس کے ارادے کو بھی اس میں دخل تھا۔ ہم اوپر نیچے اونی چٹائی پر گرے۔ وہ مجھ پر تقریباً سوار تھی۔ اس کے دہکتے ہوئے ہونٹ مجھ سے بس تین چار انچ کے فاصلے پر تھے۔ فوراً پیچھے ہٹنے کے بجائے وہ اپنی جگہ رکی رہی۔ یکا یک اس کی آنکھوں کی کیفیت بدل گئی، ہونٹوں کی طرح اس کے رخسار بھی دہک اٹھے۔ اس نے میرے بالوں میں انگلیاں چلائیں، اور پھر بالکل غیر متوقع طور پر میرے رخسار کا بوسہ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزید پیش قدمی کرے گی لیکن اس نے نہیں کی اور جیسے وہیں پر ٹھہر کر میرے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔

وہ کیا ردعمل چاہتی تھی یہ میں جان رہا تھا۔ وقفہ طویل ہوا تو اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھر آئی۔ عورت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ میں نے مشکل ترین عورتوں کو دیکھا تھا اور ہینڈل کیا تھا۔ میں خود کو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تو نہیں کہتا مگر اتنا ضرور ہے کہ میں ان کے اندر دور تک جھانک سکتا ہوں اور میری اس دوررس نگاہ نے مجھے بتا دیا کہ اگلے چند سیکنڈ یا چند منٹ میں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہی ہوتا جو اس سے پہلے ان دو افراد کے ساتھ ہو چکا تھا جن کی تصویر اس البم میں تھی۔

سجاول سیالکوٹی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ ''شاہ زیب! اگر تمہاری وجہ سے میری ماں کو کوئی دھچکا پہنچا یا ان کا کوئی نقصان ہوا تو اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھنائی ہوئی سی مجھ پر سے اٹھ جاتی۔ میں نے وہی ردعمل ظاہر کیا جو وہ چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا اور پلٹ گیا۔ اس کی کارروائی کا مناسب جواب دینے کے بعد میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں چمک تھی۔

میرا خیال تھا کہ میری اتنی جواب دہی کافی ہو گی اور اب وہ مجھے جانے دے گی مگر وہ میری توقع سے زیادہ ''ڈیمانڈنگ'' تھی۔

''پیو گے؟'' اس نے پھولی سانسوں کے ساتھ پوچھا۔

میں چپ رہا۔ اس نے میری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور الماری کھول کر اس میں سے دو بوتلیں نکال لیں۔ اس نے اپنے لیے گلاس میں بیئر انڈیلی اور میرے لیے ووڈکا۔ بولی۔ ''یہ روسی تحفہ ہے۔ تم جانتے ہی ہو گے، دنیا کی تیز ترین شرابوں میں سے ہے۔''

اسے کیا پتا تھا کہ میں نہ صرف اس آتشیں مشروب کو جانتا ہوں بلکہ اگر وہ میرا امتحان لینا چاہے گی تو میں بوتل منہ سے لگا کر خالی بھی کر سکتا ہوں۔

بہرحال بات زیادہ آگے نہیں بڑھی۔ چار پانچ گھونٹ تک ہی رہی۔ وہ مجھے البم دکھانے لگی۔ اس میں اس کی فیشن ایبل مرحومہ ماں کی تصویر تھی۔ اس کے باپ اعظم جاہ کی تصویر بھی میں فوراً پہچان گیا۔ جوانی میں وہ خاصا خوب صورت اور صحت مند تھا جو نحوست اور پژمردگی میں نے اس کے چہرے پر پرسوں رات دیکھی تھی، اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ''تمہاری ماں کا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ٹائم آیا ہوا تھا اُس کا... مر گئی۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور بے پروائی سے البم کا لیف پلٹ دیا۔

ایک تصویر میں وہ پینٹ شرٹ پہنے پستول سے گولیاں چلا رہی تھی اور گھڑسواری کر رہی تھی۔ یہ تصویر چند ماہ پہلے کی ہی لگتی تھی پھر اس نے بڑے فخر سے بتایا کہ یہ پہلا ''پاندر'' تھا جسے اس نے عین منگنی کے موقع پر بھگایا تھا۔ وہ واقعی بہت دبلا پتلا تھا، آنکھیں افیمیوں جیسی تھیں۔ دوسرا لڑکا صحت مند تھا لیکن مانی کے بقول وہ مرد کم اور کرائے کا ٹٹو زیادہ لگتا تھا جو مالک کے قدموں کی آہٹ سنتا ہے تو ٹانگیں ذرا چوڑی اور کمر تان کر بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔

مجھے البم کی تصویریں دکھاتے دکھاتے وہ میرے بالکل پاس آ گئی تھی۔ کسی وقت اس کا کان میرے کان سے

چھو جاتا تھا۔ اچانک گیس لیمپ پھڑ پھڑا کر بجھ گیا۔ پتا نہیں کہ اس کی گیس ختم ہوگئی تھی یا اس ''کافر ادا'' نے اس کے ساتھ بھی کوئی کارستانی کی تھی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اور تاریکی ایسے موقعوں پر بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہ خطرناک ثابت ہوئی۔ وہ میرے ساتھ بستر پر گر گئی اور الجھنے لگی۔ میں اس کی چھوٹی چھوٹی کارروائیوں کا مؤثر اور مناسب جواب دیتا رہا۔ میں شاہ زیب سکنہ کوپن ہیگن، ڈنمارک۔۔۔ اپنے بارے میں کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ نہ ہی میں خود کو کہانیوں کا کوئی روایتی ہیرو ثابت کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے زندگی کا ہر رنگ دیکھا ہوا تھا۔ قمار خانوں سے لے کر نائٹ کلبوں تک اور فائٹنگ رنگز سے لے کر قتل گاہوں تک کون سی جگہ میرے قدموں تلے نہیں آئی تھی۔ یہ میرا ایک روپ ہے، وہ میرا دوسرا روپ تھا۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ عورت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ میں مانی کی خرمستیوں سے بدکنے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے خاطر خواہ جوابات دیے۔۔۔ اور اسے ''بیک فٹ'' پر کردیا۔ اس نے خود ہی لائٹر جلا کر روشنی کردی اور اپنا لباس درست کرنے لگی۔ پچھلے ڈیڑھ دو منٹ نے اسے میرے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا۔

بہرحال ایک بات میری اپنی سمجھ میں بھی آئی تھی۔ اور یہ بڑی جدا بات تھی۔ کسی عورت کے قریب ہو کر مجھے پہلی بار ایک ندامت کا احساس ہوا تھا۔ وہی پشیمانی جو کسی ناجائز عمل کی وجہ سے انسان کے اندر جنم لیتی ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو منٹ میں کئی بار تاجور کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ لٹیں اس کے دلکش چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کیا ہے شاہ زیب؟ یہ کیوں ہے؟ تم تو پیار کرتے ہو نا مجھ سے اور تم کہتے ہو میں تمہارا پہلا اور آخری پیار ہوں؟

مانی نے لائٹر کی مدد سے ایک کینڈل روشن کردی۔ کمرے سے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ غالباً ماؤ اپنی پوتی کی ''آتش مزاجی'' سے آگاہ تھی اور اسے ضرورت سے زیادہ وقت دینا نہیں چاہتی تھی۔ ہم باہر نکل آئے۔

مانی خوش نظر آرہی تھی۔ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ ماؤجی کے ڈرے ڈرے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے میری بلائیں لیں اور جھوم کر بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ تم دونوں کی خوب جمے گی اور خوب نبھے گی۔''

باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ پتا چل رہا تھا کہ سجاول اور اس کے ساتھی جو کسی مہم پر گئے تھے واپس آگئے ہیں۔ میں مانی اور ماؤ سے اجازت لے کر باہر نکلا۔ باہر ہوا سرد تھی۔ احاطے میں ٹارچوں کی روشنی تھی اور چند لالٹینیں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں نے گرانڈیل سجاول کو دیکھا۔ وہ گھوڑے سے اتر رہا تھا۔ سجاول کے ایک ساتھی نے ایک عورت کو سہارا دے کر گھوڑے سے اتارا۔ اس کے سر پر شال تھی اور وہ کچھ ڈری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہ لمبے ہاتھ پاؤں والی قدرے دراز قد لڑکی تھی۔ تب میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں چاند گڑھی سے اتنی دور اس شخص کو یہاں دیکھوں گا۔ ایک ٹارچ کی روشنی سیدھی اس شخص کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور شک شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ میوانی پہلوان حشمت راہی تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دو چوٹوں کے نشان دور ہی سے نظر آرہے تھے۔ اس نے شلوار قمیص پر براؤن کوٹ پہن رکھا تھا۔ ایک گرم چادر اس کے دائیں کندھے پر تھی۔

میں اندھیرے میں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چپٹی ناک والے فخرو نے اسے رائفل سے ٹہوکا دیا اور دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ ایک شخص نے اس لڑکی کی کلائی پکڑی جسے گھوڑے سے اتارا گیا تھا۔ لڑکی نے معمولی مزاحمت کی مگر جب پکڑنے والے نے اس کا بازو زور سے کھینچا اور گرج کر کہا۔ ''چل۔۔۔ نخرے نہ دکھا۔'' تو وہ چل پڑی۔

حیرت کا دوسرا شدید جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے اس لڑکی کی شکل دیکھی۔ حشمت راہی کی طرح اس لڑکی کو بھی یہاں دیکھنے کی میں ہرگز توقع نہیں رکھتا تھا۔ یہ ماڈل گرل اور رقاصہ جاناں تھی۔ میں اسے رام پیاری اور کرم کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ایک طرح سے ان کی پناہ میں تھی پھر وہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ میری رگوں میں خون جیسے سلگ پڑا۔ دو ہی باتیں سمجھ میں آرہی تھیں یا تو رام پیاری کے گھر میں سے کسی نے مخبری کردی تھی یا پھر جاناں نے میری ہدایت اور تاکید کے باوجود غلطی کی تھی اور اس محفوظ پناہ گاہ سے نکل کر شہر پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سجاول کے ڈیرے پر ایک بندے کو زخمی کر کے بھاگی ہوئی تھی۔ اس ڈکیت گروہ کے ارکان ہر طرف اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور اب وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ وہ پھر ان کی دسترس میں آگئی تھی۔ اب اس کے ساتھ جو بھی ہوجاتا کم تھا۔ میں اس صورت حال پر دانت پیس کر رہ گیا۔ کئی اور باتوں کی

طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ پہلوان حشمت اور جاناں اکٹھے کیسے سجاول سیالکوٹی کے شکنجے میں آگئے ہیں۔ پہلوان حشمت چاند گڑھی کا رہائشی تھا اور جاناں کو میں وہاں سے پندرہ بیس کلومیٹر دور فیض پور میں چھوڑ کر آیا تھا۔

میں، تاجور کے پاس بچ بستہ کوٹھڑی میں واپس پہنچا تو وہ بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے۔ اس طرح چھوڑ کر کیوں جاتے ہیں؟''

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجبوری تھی، یہاں ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی کئی کام کرنا پڑیں گے۔''

''ریشمی اور انیق وغیرہ کا کچھ پتا چلا؟''

''پتا تو نہیں چلا لیکن اتنی تسلی ضرور ہو گئی ہے کہ وہ ملنگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔''

اچانک تاجور غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''آپ کے منہ سے... بُو آرہی ہے۔ کیا کیا ہے آپ نے؟''

میں نے مانی کے کمرے میں جو چند گھونٹ لیے تھے، اس کا پتا تاجور کو چل گیا تھا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔ ''تاجور! میں نے کہا ہے ناکہ ہمیں یہاں کئی کام اپنی مرضی کے خلاف بھی کرنا پڑیں گے۔''

''لیکن... اس کا مطلب ہے کہ آپ... یہ گندی چیز پیتے ہیں؟''

''بالکل نہیں... بس زندگی میں دو چار دفعہ ہی ایسا ہوا ہوگا، اور وہ بھی یار دوستوں کے بہت مجبور کرنے پر۔'' میں نے سفید جھوٹ بولا۔ اسے کیا پتا تھا میں یورپ جیسے مادر پدر آزاد معاشرے میں پلا بڑھا تھا۔ پچھلے پانچ چھ سال میں کئی مواقع ایسے بھی آئے تھے جب میں نے خود کو دن رات الکحل میں غرق رکھا تھا۔

تاجور کی پیشانی پر ناگواری کی شکن برقرار رہی، وہ بولی۔ ''کہاں تھے آپ؟''

اب اس سوال کا درست جواب دینا بھی بے حد مشکل تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہاں سجاول سیالکوٹی کی خطرناک بھتیجی سے میرے رشتے کی بات چل نکلی ہے۔ میں نے کہا۔ ''سجاول کی والدہ کو ہمارے بارے میں تجسس ہے۔ وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ ہم یہاں کیسے اور کیوں پہنچے ہیں۔ اگر وہ تم سے کوئی سوال جواب کرے تو تم نے بھی وہی جواب دینے ہیں۔ تمہارا نام شمسہ، تمہارے گاؤں کا نام ہری پورہ،

ہماری شادی کو چھ ماہ ہوئے ہیں۔ میں باہر سے آیا ہوں اور آج کل اپنی زمین آباد کر رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔''

تاجور کو مطمئن کرنے کے بعد میں لیٹ گیا۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ میں نے خود کو سویا ہوا ظاہر کیا، لیکن میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ میں جلد از جلد جاناں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے ایک مسلح شخص سے کہا کہ وہ فیض محمد کو بلائے، میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بعد فیض محمد سگریٹ پھونکتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''نیند نہیں آرہی۔ سوچا تھوڑی دیر بات کر لوں۔''

وہ مجھ سے ماؤ جی اور مانی کے برتاؤ کا حال جاننا چاہتا تھا مگر میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا کہ وہ تاجور کی موجودگی میں یہ ذکر نہ چھیڑے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے جس لڑکی کو یہاں لایا گیا ہے، وہ کون ہے؟''

وہ بولا۔ ''سیالکوٹ کی طرف کسی گاؤں کے لوگ ہیں یہ۔ لڑکی پیشہ ور ڈانسر ہے۔ کچھ دن پہلے یہ سردار کے بندوں سے فراڈ کر کے نکل گئی تھی۔ اب اسے پیسے پورے کرنے کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔''

''پیسے پورے کرنے کے لیے؟''

''بھئی، وہی ناچ گانا... اور فلاناں ڈھمکاناں... پر ابھی تو اسے دو تین دن آرام کرایا جائے گا۔ تیز بخار چڑھا ہوا ہے اسے۔ ملیریا لگتا ہے۔ بری طرح کانپ رہی ہے۔ میں دوائی دے کر آیا ہوں۔''

''اور وہ موٹا سا بندہ، جو ساتھ ہے؟''

''وہ کھوتے کا پتر اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پکڑا گیا ہے۔ اپنی طرف سے سلطان راہی بن کر لڑکی کو بچا رہا تھا۔ ساتھ میں دھر لیا گیا ہے۔ ویسے ہے کام کا بندہ۔ کہتے ہیں کہ ہڈی پٹھے کے علاج کا ماہر ہے۔ اپنے علاقے میں اس کی مشہوری ہے۔ ہڈی کیسی بھی ٹوٹی ہوئی ہو، جوڑ لیتا ہے۔''

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ میں نے کہا۔ ''پھر تو شاید میرا بھی کچھ فائدہ ہو جائے۔''

''کیا مطلب؟'' فیض نے پوچھا۔

''یہ جو ابھی تک نیند نہیں آئی تو اس کی وجہ کندھے کا درد بھی ہے۔ جب میں نے شمسہ کے پیچھے یک لخت سے چھلانگ لگائی تو اسی وقت کندھے پر دباؤ آیا تھا، لگتا ہے شاید جوڑ ہل گیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ کل دکھالیں گے اس کو۔'' فیض نے جھٹ کہا۔ ''ابھی میں تمہیں ایک تیل لا دیتا ہوں۔ وہ لگا کر اوپر سے کپڑا باندھ لو۔ بہت فرق پڑے گا۔''

کچھ دیر بات کرنے کے بعد فیض محمد اٹھ گیا۔ اس نے مجھے تیل کی ایک شیشی پہنچادی۔ ساتھ میں باندھنے کے لیے ایک مفلر بھی تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کندھے میں ہلکی پھلکی تکلیف تو تھی، لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ مجھے کسی ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہوتی۔ میں نے ویسے ہی مفلر باندھ لیا اور لیٹ گیا۔ فیض سے ملاقات کا بہت زیادہ فائدہ ہوا تھا۔ جاناں کی طرف سے مجھے وقتی طور پر تسلی ہوگئی تھی۔ دوسرے پہلوان حشمت سے ملاقات کا امکان پیدا ہوگیا تھا لیکن پہلوان سے ملاقات میں ایک اندیشہ بھی پوشیدہ تھا۔ میں پہلوان کے سامنے جاتا تو اس نے مجھے فوراً گونگے ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے پہچان لینا تھا۔ میری یہ شناخت میرے اور تاجور کے لیے مصیبتوں کے دروازے کھول سکتی تھی۔

بہرحال اگلے دن میری یہ مصیبت خود ہی آسان ہوگئی۔ ابھی میں اور تاجور ناشتے کے چند لقمے لے کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ماؤ نے ایک بار پھر مجھے یاد کرلیا۔ اس مرتبہ یہ بلاوا لے کر فخرو آیا۔ چوڑی ناک اور پیشانی کے زخم کی وجہ سے وہ کافی بھدا نظر آتا تھا۔ خاص طور سے جب وہ تیوری چڑھا کر بات کرتا تھا۔

اس نے کوٹھڑی کا تالا کھولا اور میں اس کے ساتھ ماؤ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب مجھے یہاں کافی رعایت دی جارہی تھی۔ میرے ارد گرد کوئی مسلح شخص موجود نہیں تھا۔ ہاتھ وغیرہ باندھنے کا تکلف تو پہلے دن ہی ختم ہوگیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی پہرا نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہاں نگرانی کا سخت ترین اور ناقابلِ شکست نظام موجود تھا۔ اس احاطے کے گرد پتھریلے ٹیلوں نے ایک قدرتی چار دیواری کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ چاروں طرف چیڑ اور پڑتل کے بلند و بالا درخت بھی تھے۔ ان درختوں پر شاخوں وغیرہ سے چھوٹی چھوٹی مچانیں بنائی گئی تھیں جو بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ان مچانوں پر ہر وقت طاقتور رائفلوں والے مسلح افراد موجود رہتے تھے۔ رات کی نگرانی کے لیے ان کے پاس طاقتور ٹارچیں بھی موجود تھیں۔ کئی درختوں پر چڑھنے کے لیے رسے کی سیڑھیاں بھی لٹکائی گئی تھیں۔ وقت گزاری کے لیے یہ پہرے دار ٹرانزسٹر ریڈیو سنتے تھے یا اپنے سیل فونز پر میوزک پلے کرتے تھے۔

کبھی کبھی یہ اپنے قریبی ساتھیوں سے گپ شپ کرتے بھی سنائی دیتے تھے۔

مجھے ڈر تھا کہ ماؤ جی کی جگہ آج پھر مانی سے ملاقات نہ ہوجائے۔۔۔ تاہم خیریت گزری۔ مانی سے ملاقات تو ہوئی مگر ماؤ کی موجودگی میں۔ ماؤ جی حسبِ معمول خوشی سے سرشار نظر آتی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''ابھی ناشتا تو نہیں کیا نا؟''

''بس کر ہی رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''آج تم اکٹھا ناشتا کرو گے ہمارے ساتھ۔'' وہ بولی۔

میز پر حلوہ پوری، گاجر کا حلوہ، نہاری، مرغ چنے اور پتا نہیں کیا کیا الا بلا رکھا تھا۔ مانی کے رخسار سرخ تھے اور آنکھوں کی چمک، کل رات گزرے ہوئے نرم گرم لمحات کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ آج بھی پُرجوش نظر آرہی تھی مگر اس کے جوش کو راستہ نہیں ملا۔ سجاول یہاں آنے والا تھا، مجھے جلد ہی ''چھٹی'' مل گئی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ماؤ نے حکمیہ انداز میں کہا۔ ''میں نے سجاولے سے کہہ دیا ہے۔ آج سے تم اس کوٹھڑی میں نہیں رہو گے۔ یہاں پاس ہی تم دونوں کو ایک کمرا دے دیا گیا ہے۔ بلکہ یہ دو کمرے ہیں۔ ہر چیز موجود ہے وہاں۔''

میں نے شکریے کے انداز میں سر جھکایا اور باہر نکل آیا۔ ماؤ کی بات سے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس نے پوتی کو میرے شادی شدہ ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ اس بات کا پوتی صاحبہ پر کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں کس طرح کے۔۔۔ بلکہ کس قماش کے لوگ تھے یہ؟

فخرو باہر ہی موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ واپس کوٹھڑی کی طرف روانہ ہوا۔ ہماری کوٹھڑی سے پہلے ہی ایک اور کوٹھڑی نظر آئی۔ اس کی کھڑکی اب کھلی ہوئی تھی۔ میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کھڑکی کی دوسری طرف پہلوان حشمت کسی اداس اُلّو کی طرح بیٹھا تھا پھر اس کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی۔ وہ بری طرح چونکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتا، میں نے اسے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔ خوش قسمتی سے فخرو مجھ سے ایک قدم آگے چل رہا تھا، لہٰذا وہ میرے مبہم اشارے کو نہیں دیکھ سکا۔ پہلوان کا کھلا ہوا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ بہرطور اس نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مکمل خاموشی اختیار کی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ پہلوان حشمت والی کوٹھڑی کے سامنے موجود تھا۔ کوٹھڑی کا تالا کھولنے سے

پہلے فیض محمد نے مجھ سے کہا۔ ''کچھ بھی ہے۔ یہ اس وقت ایک قیدی ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہنا کوئی چالاکی نہ دکھا جائے۔''

''تم بے فکر رہو چاچا۔'' میں نے کہا۔

دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ پہلوان حشمت فراست کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس نے یہی ظاہر کیا جیسے مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ فیض محمد نے پہلوان کو تحکمانہ لہجے میں مخاطب کیا اور کہا۔ ''یہ اپنا خاص مہمان ہے موٹے، اس کے کندھے میں تکلیف ہے اور یہ تیرا امتحان بھی ہے۔ دیکھنا ہے کہ کیا کاریگری دکھاتا ہے تو۔''

میں نے سویٹر اتارا اور کندھے پر سے قمیص بھی کھسکا دی۔ ''یہاں درد ہے۔'' میں نے کندھے کے ٹیل پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور چہرے سے شدید تکلیف ظاہر کی۔

پہلوان حشمت مجسم حیرت میری طرف دیکھنے لگا۔ میں، جو چاند گڑھی میں پیدائشی گونگا تھا، اس کے سامنے بول رہا تھا۔

فیض محمد نے غصے سے کہا۔ ''یہ بٹر بٹر کیا دیکھ رہے ہو، یہ کوئی فارسی نہیں بول رہا۔''

پہلوان نے خود کو بمشکل سنبھالا، اور لرزتے ہاتھوں سے میرے کندھے کا معائنہ کیا۔ اس نے بازو کو اوپر نیچے ہلایا تو میں نے شدید تکلیف ظاہر کی۔

اب حشمت بھی صورتِ حال کو کافی حد تک بھانپ چکا تھا۔ اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ''مجھے لگت ہے کہ جوڑ بری طرح ہل گیا ہے اور پٹھا بھی زخمی ہے۔ پہلے پٹھے کو چالو کرنے کے لیے ٹکور کی ضرورت ہووے گی، پھر گرم گھی کی مالش کر کے پٹی باندھوں گا۔ مجھے ایک انگیٹھی چاہیے اور ایک پکی اینٹ گرم کرنے کے لیے... اس کے علاوہ تھوڑی سی ہلدی بھی۔''

فیض محمد دروازے کو باہر سے بند کر کے انگیٹھی وغیرہ کا انتظام کرنے چلا گیا۔ حشمت نے پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تم نے ہم سب کو دھوکا دیا۔ تم بول سکت ہو۔''

''ہاں، میں بول سکتا ہوں۔ لیکن یہ جو کچھ بھی تھا ایک مجبوری کی وجہ سے تھا۔ فی الحال وقت نہیں کہ میں اس بارے میں تفصیل بتاؤں، ہمیں کچھ ضروری باتیں کر لینی چاہئیں۔''

وہ بدستور میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھے بولتا سن کر پہلوان حشمت کو حیرت تو ہوئی تھی مگر اتنی شدید نہیں، جتنی ہونی چاہیے تھی۔ مجھے شک گزرا کہ وہ اس بارے میں پہلے ہی کچھ جان چکا ہے۔ اگلے چند منٹ میں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ (میں نے پہلوان کو بتا دیا کہ تاجور میرے ساتھ ہے اور صحیح سلامت ہے)

انیق، ریشمی اور رضوان خیریت سے چاند گڑھی تک پہنچ چکے تھے۔ حشمت نے کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''تمہارے گونگے نہ ہونے کی بات ہمیں ریشمی سے معلوم ہوئی ہے۔ وہ تمہارا دوست انیق خود بھی یہ کہوت ہے کہ اسے پتا ناہیں تھا تم بول سکت ہو۔ گاؤں میں جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہورہی ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ ناہیں آرہا۔''

''تاجور کے گھر والے کیسے ہیں؟''

''سب سے برا حال انہی کا ہے۔ گاؤں میں تہلکہ تو اسی وقت مچ گیا تھا جب پچھلے سے پچھلے ہفتے لوگوں کو سن گن ملی تھی کہ دین محمد صاحب چپکے چپکے تاجور کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ نوکرانی نوری کے ساتھ کوٹلی گئی تھی اور پھر کوٹلی سے آگے کسی مزار پر چلی گئی تھی۔ چاچا رزاق بھی گاؤں سے غائب تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ قیافہ بھی لگایا کہ ریشمی کے گھر والے پرویز نے چاچے رزاق کو ریشمی کا کوئی کھوج کھرا بتایا ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے نکلے ہیں... تاجور اور نوری بھی چاچا رزاق کے ساتھ گئی ہیں پھر اسی دوران ایک اور خبر نے لوگوں کو ہلا دیا۔ پتا چلا کہ ریشمی کے شوہر پرویز کو لاہور میں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لوگ یہ باتیں کرنے لگے کہ پرویز کو مارنے والے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے ریشمی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ چاچے رزاق اور تاجور کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں مار دیں گے یا غائب کر دیں گے۔ اس وقت کسی کو اندازہ ناہیں تھا کہ تم اور انیق بھی چاچے رزاق کے ساتھ ہو۔''

''چاچے رزاق کے بارے میں پتا چل گیا ہے نا تمہیں؟'' میں نے افسردگی سے پوچھا۔

حشمت نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ گاؤں میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ یہ پیر کی رات کی بات ہے جب اچانک گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چاچے رزاق کی بیٹی زندہ سلامت گاؤں واپس پہنچ گئی ہے۔ اس کے بعد ایسی خبریں ملیں کہ عقل دنگ رہ گئی۔ پہلے پتا چلا کہ چاچا رزاق ختم ہوگئے ہیں پھر معلوم ہوا کہ نوری بھی

نہیں رہی اور تاجور کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ تاجور کی والدہ پہلے ہی بیمار تھیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال جا پہنچیں۔ بعد میں تمہارے دوست انیق نے بتایا کہ تاجور چلتی گاڑی سے اچھل کر نیچے گر گئی تھی، اسے بچانے کے لیے تم بھی گاڑی سے کود گئے تھے۔ انیق نے تسلی دی کہ تم دونوں ملنگوں سے بچ کر نکل گئے ہو۔''

''ملنگوں کے بارے میں کیا معلوم ہوا تمہیں؟''

''وہ سب کچھ... جس پر اب تک یقین نہیں آرہا۔ عقل خبط ہو گئی ہے لوگوں کی۔ پیر ساتنا کو لوگوں نے سات سال پہلے مردہ سمجھ لیا تھا اور اسے بڑی شان سے دفن بھی کر دیا تھا لیکن اب ایک دوسری ہی کہانی سامنے آئی ہے۔ پولیس نے بھی تصدیق کی ہے کہ یہ پیر ساتنا ہی تھا جو چاند گڑھی سے بھاگ کر آزاد کشمیر کی طرف نکل گیا اور وہاں کسی ملنگی ڈیرے کا کرتا دھرتا بن گیا۔ ملنگی ڈیرے کے بارے میں بھی جو باتیں سامنے آئی ہیں، وہ حیرت زدہ کرنے والی ہیں۔ یقین نہیں آرہا کہ پیر ساتنا نے اس طرح علاقے کے لوگوں کو بے وقوف بنایا ہوا تھا۔ پرسوں شام پیر ساتنا کی لاش بھی پوسٹ مارٹم کے بعد چاند گڑھی پہنچی تھی جن لوگوں نے اس کا جلا ہوا منہ دیکھا ہے، کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ پیر ولایت اور اس کے حمایتی، عام لوگوں سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔''

پہلوان حشمت نے چند لمحے توقف کر کے دھیان سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا واقعی پیر ساتنا کو تم نے مارا ہے؟''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ریشمی... نے تو یہی بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم نے بہت دلیری دکھائی۔ اگر تم ساتنا کو نہ مارتے تو وہ اسے مار دیتا۔''

''ہاں، اس وقت تو یہی سچویشن بنی ہوئی تھی۔''

''چاند گڑھی کے لوگ اس بات پر تو دکھی ہیں کہ چاچے رزاق اور نوری کی جان چلی گئی ہے مگر وہ اس بات پر خوش بھی ہیں کہ پیر ساتنا کا بھید کھل گیا اور وہ بالآخر اپنے انجام کو پہنچا..... اب تو پیر ولایت کے بہت سے عقیدت مند بھی اس پر لعن طعن کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ولایت خبیث کہوت تھا کہ میرے باپ نے علاقے کے لوگوں کے گناہ اپنے سر پر لیے اور ان گناہوں سمیت آگ میں جل کر سرخرو ہو گیا۔ اب پتا چل رہا ہے کہ وہ خبیث اپنا منحوس منہ چھپا کر [illegible] والی سرکار بنا ہوا تھا اور کہیں اور جا کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا۔ چاند گڑھی میں ریشمی اپنے منہ سے اس کی اور پیر کرنالی کی کارستانیاں لوگوں سے بیان کر رہی ہے۔ سنا ہے، کئی تھانوں کی پولیس نے مل کر ملنگی ڈیرے پر بہت بڑا چھاپا مارا ہے۔ وہاں سے درجنوں ملنگ اور مجاور گرفتار ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے مردوں، عورتوں کو ڈیرے سے رہائی ملی ہے جن کو وہاں زبردستی بند رکھا گیا تھا۔ خبروں سے پتا چلت ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کی ٹانگوں کی کوئی رگ کاٹ کر انہیں لنگڑا کر دیا گیا تھا۔ ایسی ایسی کہانیاں سامنے آرہی ہیں کہ دماغ سن ہو جاوت ہے۔ وہ پولیس افسر کے بھائی والی بات جانت ہو تم؟''

''ہاں، اسے وہاں قتل کر دیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے دوست انیق نے تو بتایا ہے کہ اس بے چارے کو زندہ، شکاری چیتوں کے سامنے ڈالا گیا اور انہوں نے اس کے ٹکڑے کر دیے۔ اس بے چارے کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست کی منگیتر کو ڈیرے کے چنگل سے چھڑانا چاہت تھا۔''

''میں نے وہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وقت پڑنے پر اس کی گواہی بھی دوں گا۔'' میں نے کہا۔

میں پہلوان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اور جاناں، ان ڈکیتوں کے شکنجے میں کیسے پھنسے ہیں اور چاند گڑھی سے اتنی دور یہاں اس جنگل میں کیسے پہنچے ہیں لیکن وہ بے تکان بولتا جا رہا تھا پھر ایک دم مجھے نوری کی لاش کا خیال آ گیا۔ میں نے حشمت سے پوچھا۔ ''نوری اور چاچے رزاق کی لاشوں کا کیا بنا؟''

''چاچے رزاق کی لاش تو پہلے دن ہی مل گئی تھی۔ اگلے روز تمہارے ساتھی رضوان کی نشاندہی پر نوری کی میت بھی گڑھے سے نکال لی گئی۔ چاچے رزاق کے جسم پر گولیوں کے کوئی پچاس زخم تھے۔ دستی بم کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے۔ رضوان اور ریشمی نے بتایا ہے کہ چاچا اپنے بوڑھے جسم کے ساتھ آخر تک ملنگوں کی فائرنگ کے سامنے ڈٹا رہا۔ وہ کوئی ایسا ماہر نشانے باز تو ناہیں تھا مگر بندوق چلانا اس کو آوت تھی اور وہ آخر وقت تک چلاتا رہا۔ بڑا پیار تھا اسے اپنی بیٹی سے... اور اس نے یہ ثابت بھی کر دیا۔''

میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''میرے بارے میں لوگوں کی رائے کیا ہے؟''

وہ ایک بار پھر الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف

دیکھنے لگا۔ اس کی چربی دار گردن پر خراشیں نظر آرہی تھیں۔ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے بارے میں رائے اچھی نا ہیں تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے جو اب مجھے بھی نظر آرہی ہے۔ یقین ہی نا ہیں آوت کہ ایسا ہو سکت ہے۔ تم بول رہے ہو اور ہم چاند گڑھی میں تمہیں پیدائشی گونگا سمجھت تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہی ہے کہ تم نے دین محمد اور اس کے گھر والوں سے فراڈ کیا ہے۔ وہ انیق کو بھی اس فراڈ میں شامل سمجھت ہیں۔ تمہارے بارے میں خراب رائے ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ شک میں پڑ گئے ہیں۔''

''کیسا شک؟'' میں نے پوچھا۔

''برا نہ ماننا... لوگوں کو شبہ ہے کہ شاید تم دین محمد کی بیٹی تاجور کے پیچھے ہو۔ وہ یہ بھی سوچت ہیں کہ ملنگی ڈیرے جانے کے بارے میں انیق نے جھوٹ بولا ہے۔''

''کیسا جھوٹ؟''

''اس نے یہی بیان دیا ہے کہ تم، انیق اور تاجور اتفاق سے ملنگی ڈیرے میں اکٹھے ہوئے۔ مگر لوگ سمجھت ہیں کہ تم تینوں یہاں سے پروگرام بنا کر گئے تھے... کہ ریشمی کو ملنگی ڈیرے سے واپس لایا جائے۔ بہر حال...'' پہلوان کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ایک بات ہے کہ ملنگی ڈیرے پر تم نے جو دلیری دکھائی ہے اور جس طرح پیر ساتا کو مارا اور ریشمی کو وہاں سے نکالا ہے، لوگوں کی رائے تمہارے بارے میں کچھ بہتر ہو گئی ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں کی جو پیر ساتا اور اس کے پُتر پیر ولایت کو مکار اور بدکار سمجھت ہیں۔''

''چلو... تھوڑی بہت معافی تو ملی۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ویسے لوگ تمہارے اور تاجور کے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔ وہ اچھی طرح جانت ہیں کہ اس وقت ملنگ تمہارے سخت دشمن بنے ہوئے ہیں۔ تم انہیں جہاں بھی ملو گے وہ تمہیں... مار ڈالیں گے لیکن... جہاں تک میری عقل کام کرت ہے، تم اس وقت ملنگوں کے پاس تو نہیں ہو۔ یہ تو خیر سے سجاول سیالکوٹی کا گینگ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان! تم میرے بارے میں تو کافی کچھ جان گئے ہو، لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے ہو۔ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھے... اور یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ آئی ہے، کیا تمہارے ساتھ ہی پکڑی گئی ہے؟''

پہلوان نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھ کر کہا۔ ''بس میں تو خدا ترسی میں ہی دھر لیا گیا ہوں۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہی ہووت ہے۔ (ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی) وہ استاد دامن کا مشہور شعر ہے نا کہ، چوٹ لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم میر... سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ بس یہی حال میرا ہے۔''

مجھے زیادہ پتا تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ جس شعر کو استاد دامن کا کہا جا رہا ہے، وہ ہرگز ان کا نہیں ہوگا کیونکہ اس میں شاعر کا تخلص ''میر'' آرہا تھا... بہر حال یہ بحث کا موقع نہیں تھا۔ میں پہلوان حشمت کی بپتا سنتا رہا، وہ بولا۔ ''نہر پار کے گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ کھیتوں سے گزر رہا تھا کہ یہی لڑکی بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ نہ پاؤں میں جوتی، نہ سر پر دوپٹا، اس نے کہا کچھ غنڈے میرے پیچھے ہیں۔ میں نے تاؤ دیکھا نہ آؤ۔ اسے اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھا لیا۔ میں نا ہیں جانت تھا کہ وہ لوگ بھی گاڑی پر ہیں۔ دو منٹ میں ان کی جیپ میرے سر پر پہنچ گئی۔ گھبراہٹ میں میری موٹر سائیکل کا گیئر پھنس گیا۔ تم تو جانت ہی ہو، اگر گیئر نہ لگا ہو تو کتنی بھی ریس دیں موٹر سائیکل آگے نہیں جاتی۔ بس انہوں نے پکڑ لیا۔ خطرناک لوگ ہیں، مجھے اور لڑکی دونوں کو رائفل کے بٹ مارے۔ شاید مجھے چھوڑ جاتے لیکن قیامت اعمال (شامتِ اعمال) ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا۔ کہنے لگا یہ چاند گڑھی کا پہلوان حشمت ہے۔ ہڈی جوڑ کا کام کرت ہے۔ ہمارے کام آسکت ہے۔ بدبختوں نے مجھے بھی جیپ پر چڑھا لیا۔ وہ کیا کہوت ہیں، گدھے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔'' پہلوان غالباً کہنا چاہ رہا تھا کہ گدھے کے ساتھ رسی بھی گئی۔

ایک دم پہلوان کو چپ ہونا پڑا۔ فیض محمد واپس آرہا تھا۔ ایک بندے نے انگیٹھی اور اینٹ کا ٹکڑا اٹھایا ہوا تھا۔ ساتھ میں کوئلے بھی تھے۔

فیض محمد کے سامنے پہلوان خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں خدشات ابھر رہے تھے۔ پہلوان نے ابھی بتایا تھا کہ سجاول کے جو ساتھی اسے پکڑ کر یہاں لائے، ان میں ایک ایسا بندہ بھی ہے جو اسے ہڈی جوڑ پہلوان کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اگر وہ بندہ یہاں ساتھ آیا تھا تو پھر وہ مجھے یا تاجور کو بھی شناخت کر سکتا تھا۔

مجھے رہ رہ کر جاناں پر بھی غصہ آرہا تھا۔ میں نے

اسے بار بار تاکید کی تھی کہ وہ تھوڑا صبر سے کام لے اور شہر جانے کی کوشش نہ کرے۔ اسے سجاول کے لوگوں کی طرف سے سخت خطرہ تھا اور رام پیاری اور وکرم کے پاس وہ بالکل محفوظ تھی لیکن حالات بتارہے تھے کہ اس نے میری ہدایت کو نظر انداز کیا اور اس چار دیواری سے نکل آئی۔ اب نتیجہ سامنے تھا۔ وہ پھر ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور ساتھ میں پہلوان حشمت بھی پھنسا تھا۔

پہلوان سے کندھے پر ''غیر ضروری'' پٹی بندھوا کر میں کوٹھڑی واپس پہنچا تو وہاں تاجور نظر نہیں آئی۔ میرے جسم کا سارا خون جیسے میرے سر کو چڑھنے لگا۔ وہ کہاں گئی تھی؟ پھر میری نظر فیض محمد پر پڑی۔ اس نے مجھے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''گھبراؤ نہیں، میں خود اسے چھوڑ کر آیا ہوں۔ تم دونوں کو اندر کی طرف اچھا کمرا دے دیا گیا ہے۔ تاجور وہیں پر ہے۔ اختری بی بی اس کے پاس ہے۔''

میں فیض محمد کے ساتھ اندرونی حصے میں پہنچا۔ تاجور آرام دہ ڈبل بیڈ پر لیٹی تھی۔ اختری بی بی اس کے پاس بیٹھی باتیں کررہی تھی۔ یہ دراصل دو کمرے تھے۔ درمیان میں چھوٹا سا دروازہ بھی تھا۔ آسائش کی کافی چیزیں یہاں موجود تھیں۔ انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ ایک چھوٹے دروازے سے پتا چلتا تھا کہ باتھ روم بھی موجود ہے۔

یہاں اختری بی بی کی موجودگی مجھے اچھی نہیں لگی۔ یہ بڑی کائیاں عورت تھی۔ دو تین دن پہلے میں نے ماؤ کے ساتھ اختری کی جو باتیں سنی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ تاجور کے حمل کے حوالے سے شک میں پڑ چکی ہے۔ اب شاید وہ پھر اسی ٹوہ میں لگی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر گئی تو میں اور تاجور باتیں کرنے لگے۔ تاجور کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بتایا کہ اسے دونوں چھوٹے بھائی راحیل اور اسفند بہت یاد آرہے ہیں... میں نے اسے تسلی دی اور ایک بار پھر اپنی بات دہرائی کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

وہ کہنے لگی۔ ''شاہ زیب! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح سجاول جیسے خطرناک بندے سے سامنا ہوگا۔ میں ہر طرح سے اس کے رحم و کرم پر ہوجاؤں گی۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ ابھی اختری بی بی بتا کر گئی ہے کہ یہ لوگ کسی ایکٹر لڑکی کو یہاں پکڑ کر لائے ہیں۔ وہ ناچ گانا بھی کرتی ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سجاول کے ایک بندے کے منہ پر بوتل مار کر اور اسے زخمی کر کے بھاگ گئی تھی۔ اب وہ

ابا جی! بس یہاں گھر سستا مل گیا تھا، لے لیا۔
پڑھائی کا خرچ مجھے ہر وقت پریشان رکھتا ہے۔

یہاں بھگتے گی۔ ابھی اختری بی بی بتارہی تھی کہ وہ اس لڑکی کو سمجھا کر آئی ہے۔ اسے کہا ہے کہ وہ اب بری طرح پھنس گئی ہے۔ اس لیے اپنی اکڑ شکڑ چھوڑ دے۔ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں، وہ خوشی خوشی کرے۔ وہ سکھی رہے گی اور یہ لوگ بھی خوش رہیں گے۔ اختری بتارہی تھی...'' تاجور جھجک کر رک گئی۔

''کیا بتارہی تھی؟''

''وہ بتارہی تھی کہ ابھی لڑکی کو بخار ہے۔ دو چار دن میں ٹھیک ہوجاتی ہے تو سجاول کا بڑا بھائی اعظم اسے چند دن اپنے پاس رکھے گا، پھر اسے فخرو کے پاس بھیج دیا جائے گا۔''

''فخرو کے پاس کیوں؟''

''فخرو ہی تو وہ بندہ ہے جس کے منہ پر بوتل مار کر یہ بھاگی تھی۔'' تاجور نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

چوڑی ناک والے فخرو کی صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ اس کی پیشانی پر چند ہفتے پرانے زخم کا نشان بھی تھا۔ اب تاجور کی بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ عورت کائنات کی خوب صورت ترین مخلوق ہے جس سے زندگی میں رنگ ہیں، نرمی اور محبت ہے لیکن جب اسے دشمنی کی چکی میں پیسا جاتا ہے اور انتقام کے شکنجے میں کسا جاتا ہے تو پوری

کائنات جیسے بدصورت ہو کر سکنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ "لطف و کرم" بھی ایک پسینازدہ، ہانپی ہوئی کراہت میں بدل جاتا ہے جو قدرت نے پیکرِ زن میں رکھا ہے۔

میں نے کہا۔ "تاجور! میں یہاں ہوں نا، بے شک یہ ایک بری جگہ ہے لیکن ہم پوری کوشش کریں گے کہ کم از کم ہماری موجودگی میں یہاں کوئی گھناؤنا کام نہ ہو۔"

وہ ذرا وقفہ دے کر بولی۔ "یہ آپ بار بار کہاں چلے جاتے ہیں۔ آپ ٹھیک سے ناشتا بھی کر کے نہیں گئے۔ کچھ کھانے کے لیے دوں آپ کو؟"

"نہیں، اب بھوک نہیں۔"

وہ کھوجنے والی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "بھوک نہیں یا کہیں سے ناشتا کر لیا ہے؟"

"سمجھو تھوڑا سا کر ہی لیا ہے۔ سجاول کی والدہ ماؤ جی نے مجبور کیا کہ میں وہاں ان کے پاس ناشتا کروں۔"

"وہ عورت آپ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔ کیا کوئی مقصد ہے اس کا؟"

"اللہ کرے کوئی مقصد ہو۔ جس کی وجہ سے ہمیں یہاں سے کچھ رعایتیں مل جائیں اور پھر ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع بھی مل سکے۔ لیکن ابھی تک تو کوئی بات سامنے نہیں آئی۔" مجھے تاجور کے سامنے جھوٹ بولنا پڑا۔

میں نے دیکھا کہ وہ دور ہی سے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاید اندازہ لگا رہی تھی کہ میں آج پھر تو ڈرنک وغیرہ نہیں کر آیا۔

اب اس کمرے میں مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہی ڈبل بیڈ تھا اور ڈبل بیڈ کا ایک ہی لحاف تھا۔ تاجور اس صورتِ حال پر سخت خجل ہو رہی تھی۔ بہرحال، ہم دونوں بیڈ کے ایک ایک کنارے پر منہ پھیر کر لیٹے رہے اور سو گئے۔ تاجور کے اتنا قریب ہونے کے باوجود رومانی جذبات کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ یقیناً یہ صورتِ حال عارضی تھی اور حالات کے جبر کا نتیجہ تھی۔ یہاں ہمیں اچھا کھانا مل رہا تھا اور دیگر سہولتیں بھی حاصل تھیں۔

اگلے روز ماؤ جی کی طرف سے پھر بلاوا آ گیا۔ میں تیار ہو کر چوڑی ناک والے فخرو کے ساتھ ماؤ کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی کانوں میں کسی کے بھاری آواز میں بولنے کی صدا آئی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ سجاول کا وہی عیاش بڑا بھائی تھا۔ ساتھ میں چاچا فیض محمد بھی تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ سامنے بان کی چارپائی پر جاناں بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ مظلومیت کی تصویر تھا۔ سجاول کا بڑا بھائی اعظم طنزیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے جاناں کی دبلی پتلی کلائی تھام رکھی تھی۔ شرابی انداز میں ہنس کر بولا۔ "ٹھنڈا بخار ہے، ایک دم ٹھنڈا بخار ہے۔ تم زنانیوں کو ایسے بہانے خوب آتے ہیں۔ مہینے میں تیس دن اور تیس دنوں میں پچیس بہانے..."

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیب جاناں کے منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "کھا اس کو، کچھ کھائے پیے گی تو چھیتی ٹھیک ہو گی کھا اِسے۔" وہ زبردستی سیب اس کے منہ میں گھسیڑنے لگا۔ "نخرے نہ کر۔ کھول منہ... شاباش۔" اس نے آدھا سیب اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس نے مجبوراً ایک "بائٹ" لی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ جاناں نے میری طرف نہیں دیکھا تھا اگر دیکھتی بھی تو کہاں پہچانتی میں اسے تین چار بار ملا تھا اور ہر مرتبہ میرے چہرے پر ڈھاٹا تھا۔ وہ مجھے بس یاسر بھائی کے طور پر جانتی تھی۔ اگلے ہی لمحے ہم دروازے کے سامنے سے گزر کر آگے نکل گئے۔ نشئی اعظم کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ اب شاید کمرے سے باہر جا رہا تھا۔ فیض محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اوئے فیضو... بالکل بے فیضو ہوتے جا رہے ہو تم۔ کسی کا پاؤں بھاری ہے، کسی کا سر بھاری ہے، کسی کو ٹھنڈا بخار چڑھا ہوا۔ دو چار دن میں اس چھوکری کو بھلا چنگا کرو۔"

کچھ ہی دیر بعد میں براہِ راست شعلہ صفت مانی کے آراستہ کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ سخت سردی میں بھی اس نے ہلکی سی شرٹ اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ وہ کچھ ہانپی ہوئی بھی تھی۔ کمرے میں میوزک بھی آن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک انڈین پنجابی گانے پر ڈانس کر رہی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور اپنے دہکتے جسم کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی۔

"تمہیں ڈانس کرنا آتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آتا تو ہے لیکن اس وقت کوئی موڈ نہیں۔"

"تو پھر کیا موڈ ہے میرے سونے مونے کا۔" اس نے ہونٹوں سے "پچ" کی آواز نکالی اور میری تھوڑی کو چھوا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "تم پڑھے لکھے ہو لیکن ہو تو جٹ پتر۔ اور جٹ پتر بڑے محنتی اور ڈھاڈے ہوتے ہیں۔"

اس نے میرے سویٹر کے بٹن کھول کر اسے اتار دیا۔ میرے سینے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے بستر پر دھکیل دیا۔ وہ آج پھر پرسوں والے چوچلے چاہ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور تکیے سے ٹیک لگالی۔

وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے، آج کچھ ڈھیلے ڈھیلے نظر آرہے ہو۔ کہیں تمہاری گھر والی نے تو لگام میں تمہیں کھینچ لیں؟''

''نہیں، اس کی مجھے کوئی ایسی پروا نہیں۔ دل سے چڑھ گئی ہوئی ہے۔''

وہ مجھے بازوؤں میں لیتے ہوئے بولی۔ ''دل سے چڑھ گئی ہوئی ہے تو پھر زندگی سے اتار دو نا اُسے۔ دادی بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ جلد ہی تمہاری زندگی سے رفوچکر ہونے والی ہے۔ دادو (دادی) کے مرشد بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ وہ وقت سے پہلے ہی انہیں بہت سی باتیں بتا دیتے ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ اس نے اپنا درمیانی فاصلہ کم کیا اور پھر مجھے اپنی حرارت سے مشتعل کرنے کی کوشش کی مگر میں برف بنا بیٹھا رہا۔

''مجھے بتاؤ، بات کیا ہے؟'' وہ ذرا سٹپٹا کر بولی۔

میں نے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''مانی! تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا... چھوٹا سا کام ہے۔''

''کیا؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''ایک لڑکی کی تھوڑی سی مدد کرنا ہوگی۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ بس یوں سمجھ لو کہ وہ جیسی بھی ہے، میں اسے عزت دیتا ہوں اور اسے یہاں مشکل سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''عزت ہی دیتے ہو نا؟'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''کون ہے وہ؟''

''وہی ماڈل گرل جاناں، جسے تمہارے لوگ سیالکوٹ کی سائڈ سے پکڑ کر لائے ہیں۔''

''وہ جس کے ساتھ ایک موٹا بھی ہے، ڈڈو جیسی آنکھوں والا؟''

''ہاں وہی؟''

میں نے مانی سے کہا کہ تمہارا شرابی باپ اسے چند دن اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے پھر شاید اسے فخرو کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ وہ اسے دھوکا دے کر بھاگی تھی۔ میں نے مانی سے درخواست کی کہ وہ جاناں سے دوستی گانٹھ لے۔ اسے اپنی سہیلی بنالے، یا پھر کوئی اور طریقہ، جس سے وہ خراب ہونے سے بچ جائے۔

میں نے پوری بات مانی کو سمجھا دی تھی۔ وہ خود بھی کافی تیز طرار تھی۔ اس کی سمجھ میں بھی یہی آیا کہ اگر وہ اگلے دو تین دن میں جاناں سے فرینڈشپ بنالے تو اسے یہاں ہونے والی بدسلوکی سے بآسانی بچایا جاسکتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ ادا سے بولی۔ ''چلو اب تو تمہارے دماغ سے بوجھ اتر گیا۔ اب ذرا موڈ بحال کرو۔''

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی الماری سے بیئر اور وہسکی نکال لائی۔ میں نے کہا۔ ''نہیں، آج نہیں۔ دل نہیں چاہ رہا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ ایسی باتیں تو عورتوں کے منہ سے چنگی لگتی ہیں۔''

''بھئی، تمہارے ہوتے ہوئے اس مصنوعی نشے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے بات بنائی۔

وہ تراخ سے بولی۔ ''سیانے کہتے ہیں، نشہ، نشے سے مل جائے تو اور تیز ہو جاتا ہے۔''

''یہ نشہ پہلے ہی بڑا تیز ہے۔'' میں نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی بپھری ہوئی تھی۔ اس کا بدن جیسے خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس کی شادی کو اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔ خوش قسمتی سے ایک دو منٹ بعد ہی ماؤجی یعنی مانی کی دادو کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکارتی ہوئی آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ''اتفاقاً'' نہیں آتی۔ میں اور مانی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ماؤجی اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی راڈو گھڑی اور ایک سیل فون سیٹ تھا۔ فون سیٹ بھی کافی مہنگا رہا ہوگا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے گھڑی میری کلائی پر باندھی اور بولی۔ ''یہ کل بجاولے نے دی تھی، خاص تیرے لیے... اور یہ میری طرف سے۔ لیکن یہ ابھی نہیں، شادی کے بعد ملے گا تجھے۔''

میں نے دل ہی دل میں ان دونوں چیزوں پر لعنت ارسال کی۔ ظاہر ہے یہ ڈکیت کے تحفے تھے اور کسی مقتول یا مضروب کی نشانی تھے۔ ماؤ کی آمد کو غنیمت جان کر میں جلد ہی وہاں سے نکل آیا۔

شام کو عجیب انکشاف ہوا۔ فیض محمد میرے کندھے کا حال پوچھنے میرے پاس آیا۔ اسی دوران میں تیز بارش ہونے لگی۔ تاجور لحاف اوڑھ کر لیٹی ہوئی تھی۔ ہم ساتھ

والے کمرے میں آن بیٹھے۔ چائے پیتے ہوئے فیض نے رازداری کے انداز میں کہا۔ ''شکر ہے کہ تمہاری منگیتر اس رات وڈے سردار اعظم سے بچ گئی۔ ایک نمبر کا خبیث ہے وہ... یہاں ہر ایک کو پتا ہے کہ اصل میں وہ کیا ہے، تمہیں بھی ایک دو دن میں پتا چل ہی جاتا ہے۔''

''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شیطان مردود، اور کیا۔ ویسے تو ہم سب ہی یہاں جہنمیوں والے کام کر رہے ہیں مگر اس وڈے سردار کی تو بات ہی اور ہے۔ اس کی بیوی ایکسیڈنٹ وغیرہ سے نہیں مری تھی۔ گھر سے بھاگ گئی تھی وہ اپنے عاشق کے ساتھ۔ شریف زادی نہیں تھی، طوائف کی بیٹی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو خون بولتا ہی ہے نا۔ اس وقت یہ مانی صرف چھ سات سال کی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بیوی کی بے وفائی کے بعد اعظم کا یہ حال ہوا۔''

''ہاں، شراب اور تھوڑی بہت عورت بازی تو خیر یہ پہلے بھی کرتا تھا لیکن اس کے بھاگنے کے بعد بالکل ہی عیاشی بن گیا۔ اب شاید اس بھگوڑی کا بدلہ ہی لیتا ہے دوسری عورتوں سے۔ اور کسی عورت پر زیادہ دیر ٹکتا بھی نہیں، ہفتے دس دن بعد ہی کسی اور کو ڈھونڈنے لگ پڑتا ہے۔ ایسے ماں پیو ہوں گے تو پھر اولاد تو سبحان اللہ ہی ہوگی نا۔''

فیض شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مانی کے کرتوت میرے سامنے تھے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ اسے میوزک اور رقص وغیرہ میں اتنی دلچسپی کیوں ہے۔

اچانک دوسرے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ تاجور کے چلانے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی سجاول سیالکوٹی اپنی پاٹ دار آواز میں گرجا۔ ''کہاں ہے وہ... کہاں ہے؟''

میں اور فیض اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میں نے سجاول کو دیکھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ کپڑے بارش میں بھیگے ہوئے تھے لیکن وہ خود شعلے کی طرح بھڑکا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دو تین ہرکارے تھے۔ ان میں سے ایک ہرکارے کو دیکھ کر میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ سجاول کے اس ساتھی کو میں نے شاید چاند گڑھی میں بھی دیکھا تھا۔ اسی شخص نے حشمت کو پہچانا تھا اور غالباً اسی نے اب مجھے بھی پہچان لیا تھا۔ ''حرام زادے... دھوکے باز'' سجاول دہاڑا اور رائفل کا دستہ گھما کر میرے سینے پر رسید کیا۔ میں دیوار سے ٹکرایا۔ تین چار ڈشکرے مجھ پر پل پڑے۔ لاتوں اور گھونسوں سے بے دریغ مارنے لگے۔ وہ اپنے زعم میں میری ٹھیک ٹھکائی کر رہے تھے لیکن جس نے یورپ کے خطرناک فائٹنگ کلبوں میں سفاک ترین MMA فائٹرز کی مار کھائی ہو، اس کے لیے یہ ''دھول دھپا'' کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اگر کوئی چیز تکلیف دے رہی تھی تو وہ تاجور کے چلانے کی آواز تھی... مجھ پر حملہ آور ہونے والے مجھے دیواروں سے پٹخ رہے تھے اور بے طرح پیٹ رہے تھے۔ سجاول کی پھنکار میرے کانوں تک پہنچی۔ اس نے کہا۔ ''دین محمد کا گونگا ڈرائیور، اس کی دھی کو بھگا کر لے گیا اور شادی کر لی اس سے۔ کس نے اجازت دی تجھے شادی کی؟ کس نے؟ یہ عالمگیر کے یار کی منگ تھی۔ تجھے پتا نہیں تھا... پتا نہیں تھا؟''

اس نے خود بھی آگے بڑھ کر ایک زوردار لات میری پیٹھ پر جمائی۔ میں چاہتا تو اسی موقع پر اس کے ہولسٹر پر جھپٹا مار سکتا تھا یا اس کی کمر سے بندھے ہوئے چھرے تک ہاتھ پہنچا سکتا تھا مگر ابھی میں کسی طرح کا ایڈونچر نہیں چاہتا تھا۔ اچانک سجاول کے ایک کارندے نے چلا کر کہا۔

''ماؤ جی آرہی ہیں۔''

''ٹھہرو...!'' سجاول گرجا۔

مجھے مارنے والوں نے ہاتھ روک لیے۔ سجاول ٹپٹائے ہوئے انداز میں آگے بڑھا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر جلدی سے اٹھایا۔ اسی دوران میں ہٹی کٹی ماؤ جی گھبرائی ہوئی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے میرا حلیہ دیکھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر ''ہائے اللہ'' کہا اور جیسے چکرا کر تاجور والے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہوا اِسے؟'' وہ کراہی۔ اس کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔

سجاول اس کی طرف بڑھا لیکن سجاول کے تھامنے سے پہلے ہی وہ بستر پر گر گئی... وہ بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔

سجاول نے قہرناک نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر اپنے ایک کارندے سے مخاطب ہو کر دہاڑا۔ ''پانی لاؤ... جلدی کرو۔''

تاجور کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑی، ماؤ جی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

فصیل

ارشد بیگ

ایثار اور قربان کسی کی میراث نہیں... کسی بھی موقع پر کوئی بھی فصیل بن کے... کسی کو بھی بچا سکتا ہے... یہ صرف پل بھر کی کہانی ہوتی ہے... سوچ کی پرواز کو ایک ساعت کی مہلت ملتی ہے... اور اس نے بھی اسی لمحہ فیصلہ کیا اور عمل کر ڈالا... تجسس... تحیر اور محبت کے لافانی جذبے سے سجی دل کش... خون آشام کہانی...

مغرب کے اصولوں اور قانون کے رکھوالوں کی جیتی جاگتی تصویر...

میں اس رات اپنا کلینک بند کر ہی رہا تھا کہ میں نے کھڑکی میں سے بینک کے اسسٹنٹ منیجر مسٹر ولفرڈ ہورن کو اپنی بگھی میں آتے ہوئے دیکھا۔ میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں اس لیے رات دیر تک مریضوں کو دیکھنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں اور جب میں نے دروازہ کھولا تو مسٹر ہورن پر نظر پڑتے ہی سمجھ گیا کہ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اس کا چہرہ سرخ اور پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ وہ جس

انداز سے سانس لے رہا تھا، اسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اسے کسی بھی وقت مرگی کا دورہ پڑ سکتا ہے لیکن جب اس نے مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو میں فوراً ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اسے کسی ڈاکٹر کی نہیں بلکہ پولیس کی ضرورت ہے۔

"میں پولیس اسٹیشن گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ شیرف آرمسٹرانگ کسی کام کے سلسلے میں بفیلو گیا ہوا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں تم ڈپٹی کے فرائض انجام دو گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس بات کی تصدیق کی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ میرے پرانے دوست شیرف نے مجھے اپنا نائب مقرر کیا ہو۔

"پھر تو تمہیں فوراً میرے ساتھ ڈوئل فارم چلنا چاہیے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "وہاں گولیاں چل رہی ہیں۔"

میں نے حیران ہوتے ہوئے اس سے واقعے کی تفصیل پوچھی تو اس نے قدرے ڈرامائی انداز میں بتایا کہ وہ کچھ دیر پہلے بینک کی جانب سے مسٹر ڈوئل سے کچھ کاغذات پر دستخط کروانے گیا تھا۔

"میں وہاں تاخیر سے پہنچا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ تمام دن کھیتوں پر مصروف رہتا ہے۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ پیٹرسن کی لاش کو ٹھکانے لگا رہا تھا۔ کیا تم میری حیرت کا اندازہ لگا سکتے ہو؟ خوش قسمتی سے بینک نے مجھے اسلحہ رکھنے کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ ڈوئل کے ساتھ ان کاغذات کے حوالے سے ہمارا تنازع چل رہا ہے۔ میں کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اپنا ہتھیار نکالا اور ڈوئل کو رکنے کا حکم دیا پھر میں نے اسے رسیوں کی مدد سے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا۔"

اس وقت تک میں اس کے ساتھ چلنے کی تیاری کر چکا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔"

☆☆☆

جب ہم پینتالیس منٹ کا فاصلہ طے کر کے ڈوئل فارم کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچے تو میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا مسٹر ڈوئل کی بیوی ہے؟" میں اس علاقے میں نیا آیا تھا اور یہاں کے رہنے والوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔

ہورن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ چند برس پہلے انتقال کر چکی ہے۔"

"اور بچے۔۔۔؟"

"اس کے دو جڑواں بیٹے لائل اور زاچریا ہیں جن کی عمر آٹھ سال ہے جبکہ ایک سولہ سال کی بیٹی بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ گھر والوں کے ساتھ نہیں رہتی اور اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔"

میں نے بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے کیا مرض لاحق ہے؟"

ہورن محتاط انداز میں بولا۔۔۔ "براہِ کرم یہ بات اپنے تک ہی رکھنا، وہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔"

"اوہ، میں سمجھ گیا۔"

جب ہم وہاں پہنچے تو ڈوئل رسیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر کہیں جا چکا تھا اور اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

ہورن نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو اسے بہت مضبوطی سے باندھا تھا۔"

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ڈوئل اپنے فارم ہاؤس سے برآمد ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شکاری بندوق اور دوسرے ہاتھ میں کیروسین لیمپ تھا۔ دونوں بیٹے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

"یہ بینک آفیسر پھر آ گیا؟" اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

میں آگے بڑھا اور اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں مسٹر پیٹرسن کے قتل کی تحقیقات کرنے آیا ہوں جنہیں گولی ماری گئی ہے۔"

ڈوئل نے بندوق میری جانب کی اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم ڈاکٹر ڈیکن ہو؟"

"اس وقت میں ڈپٹی ڈیکن ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم یہ ہتھیار ایک طرف رکھ دو اور مجھے مقتول کی لاش دکھاؤ تاکہ ہم اندازہ لگا سکیں کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں اپنے کمرے میں جاؤ۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد ڈوئل نے اپنی بندوق ریلنگ کے ساتھ لگا دی۔ لیمپ کو اونچا کیا اور میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے شیڈ کے نیچے رکھ دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر میرے بچے ڈر جائیں۔"

پھر اس نے ہورن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہی بات اس احمق شخص کو بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ میں نے ہی پیٹرسن پر گولی چلائی ہوگی اور اس نے اسلحے کے زور پر مجھے قابو کر لیا۔"

ہورن نے اپنی آنکھ پر لگی ہوئی پٹی درست کی اور بولا۔"میں جانتا ہوں کہ میری صرف ایک آنکھ ہی ٹھیک ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ میں نے دیکھا، اس کے بارے میں نہ جان سکوں۔"

ڈوئل بولا۔"میں کوئی ثبوت نہیں چھپا رہا تھا، پیٹرسن کے چہرے کا بایاں حصہ بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میرے بچے اسے اس حالت میں دیکھتے؟"

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔"کیا ہم لاش کو ایک نظر دیکھ سکتے ہیں؟"

ڈوئل نے شیڈ کا دروازہ کھولا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا لیمپ اونچا کر لیا۔ مقتول کے سر کا بایاں حصہ بری طرح پچک گیا تھا۔ اس کے باوجود میں اس کے چہرے کے دائیں حصے کو دیکھ کر پہچان سکتا تھا کہ وہ پیٹرسن ہے۔

مزید معائنہ کرنے کے بعد میں نے ڈوئل سے پوچھا۔"کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ پیٹرسن یہاں کس لیے آیا تھا؟"

"اس کا خیال تھا کہ میں نے اس کی کتیا کو چھپا رکھا ہے۔"

"کتیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دکھ کی لہر دیکھی۔"میری مرحومہ بیوی کی ایک کتیا ہے جس پر وہ اپنا دعویٰ جتا رہا تھا ---- کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ یہاں اسی لیے آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، وہ جا چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس اس کی کوئی امانت نہیں تھی۔"

میں اس کی باتوں سے الجھ کر رہ گیا۔

وہ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔"ہم گزشتہ ہفتے پوکر کھیل رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں جوئے میں وہ کتیا ہار گیا تھا جبکہ ایسا نہیں ہے۔ شاید وہ نشے میں تھا۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔"جہاں تک آج کے واقعے کا تعلق ہے تو میں گولی چلنے کی آواز سن کر باہر آیا اور میں نے دیکھا کہ وہ میرے احاطے میں مردہ پڑا تھا۔ میں یہ سوچ کر اس کی لاش وہاں سے ہٹانے لگا کہ کہیں میرے بچے نہ دیکھ لیں۔ اسی دوران میں یہ احمق بینک آفیسر آ گیا اور اس نے مجھ پر پستول تان لیا۔"

ہورن اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔"تم لاش کو جائے وقوعہ سے اس طرح گھسیٹ کر لے جا رہے تھے جیسے اسے کہیں چھپانا چاہ رہے ہو۔ ایک مجرم ہی ایسا کر سکتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے درمیان ریلوے لائن کے مسئلے پر تنازع چل رہا ہے لیکن میں نے جو کچھ کیا، اس کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔"

ڈوئل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بولا۔"میں بائبل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کاغذات غیر قانونی ہیں۔ تم میری زمین پر سے ریلوے لائن نہیں گزار سکتے۔"

"اور میں بھی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ریلوے لائن یہیں سے گزرے گی۔"

میں نے دوسری بار مداخلت کرتے ہوئے کہا۔"مسٹر ڈوئل! تم پیٹرسن کے ساتھ پوکر کھیلا کرتے تھے۔ یقیناً اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو گے۔ کیا تم کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں بتا سکتے ہو جن سے اس کی جان پہچان ہو؟ کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو اسے قتل کرنا چاہتا ہو؟"

ڈوئل مجھے گھورتے ہوئے بولا۔"میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو اس سے ناخوش تھے۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔"

"کیا کوئی اس سے اتنا ناراض بھی تھا کہ اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آئے اور اسے گولی مار دے؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔"تم اپنی تفتیش کا آغاز ہوریک گڈمین سے کر سکتے ہو۔ وہ اورینٹ ہوٹل میں اسسٹنٹ منیجر ہے۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے وہ نام ذہن نشین کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ پیٹرسن اس کی بیوی پر فریفتہ تھا۔ اس سے ملنے اور باتیں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ وہ پیٹ کا اتنا ہلکا تھا کہ اس نے قصبے کے تمام لوگوں کو اس بارے میں بتا رکھا تھا۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ گڈمین کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔"

ہورن کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ مزید بولا۔"میں نے آج شام مسٹر گڈمین اور مسز گڈمین کو کوبی روڈ پر جاتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں قصبے کی طرف واپس جا رہے تھے۔"

میں ہورن کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔"تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

وہ جھنجھلاتے ہوئے بولا۔ ”دراصل میرا دماغ پیٹرسن میں بری طرح الجھ گیا تھا۔“ وہ کچھ دیر تک خلا میں گھورتا رہا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو پھر بولا۔ ”آدھ میل چلنے کے بعد مسز گڈمین کے پاؤں میں موچ آگئی اور گڈمین قصبے کی جانب چلا گیا تاکہ بیوی کو لے جانے کے لیے کسی سواری کا بندوبست کرسکے۔ ہاں یاد آیا، اس کے ہاتھ میں شاٹ گن بھی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ شاید یہ لوگ جھیل پر مرغابی کے شکار کے لیے گئے ہوں گے۔“

ڈوئل چپ ہوا تو ہورن اس کی جانب مڑا اور کہنے لگا۔ ”معافی چاہتا ہوں، ایسا لگتا ہے کہ تم نے پیٹرسن کو قتل نہیں کیا۔“

”ظاہر ہے کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا، بے وقوف آدمی۔“

☆☆☆

ہورن کے جانے کے بعد ڈوئل مجھے احاطے میں لے گیا اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اس کی لاش کو یہاں دیکھا تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے شاید تمہیں نظر نہ آئے لیکن خون کی لکیر سے تم اندازہ لگاسکتے ہو۔“

”میں صبح آکر اس جگہ کا جائزہ لوں گا، اس وقت کچھ نظر نہیں آرہا۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے لیے کافی کا انتظام کرتا ہوں۔“

وہ مجھے گھر کے اس حصے میں لے آیا جہاں پونی موجود تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بڑے دوستانہ انداز میں ہماری جانب بڑھی۔ اس کے جسم پر بھورے، سفید اور سیاہ دھبے تھے۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس خوب صورت کتیا کی خاطر کسی کی جان لے سکتا ہوں؟“ ڈوئل نے کہا۔

”تمہارے خیال میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جو قیمت بتائی، وہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے میں معاملے کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھ گیا کہ پیٹرسن کیوں اسے حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔“

ایک گھنٹے بعد ایڈمنڈ ولسن اپنے معاون لائیڈ پیرسن کے ساتھ آیا اور لاش کو چھکڑے پر منتقل کرنے لگا۔ اسی وقت میری نظر سنہری رنگ کے بالوں پر گئی جو پیٹرسن کی انگوٹھی میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ لاش کو ڈھانپتے، میں نے وہ بال نکال کر ایک لفافے میں رکھ لیے۔

پھر میں نے چپکے سے ولسن سے گڈمین کی بیوی مارلین کے بارے میں پوچھا۔ وہ یہاں کا پرانا رہائشی تھا۔ ”کیا تمہیں مارلین اور پیٹرسن کے تعلقات کے بارے میں کوئی علم ہے؟“

اس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ”قصبے کا ہر فرد اس بارے میں جانتا ہے۔ پیٹرسن نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔“

”کیا مسز گڈمین اپنی گزر اوقات کے لیے کوئی کام کرتی ہے؟“

”ہاں، گو کہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں۔ مشکل سے دس جماعت پاس ہوگی۔“

”وہ کیا کام کرتی ہے؟“

”اوربینٹ ہوٹل کی لانڈری میں کپڑے دھونے اور استری کرنے پر مامور ہے۔“

”گویا وہ اور اس کا شوہر ایک ہی ہوٹل میں ملازمت کررہے ہیں؟“

”ہاں، وہ دونوں وہیں ایک اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔“

”اور اس کے بالوں کا رنگ کیسا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے مشتبہ انداز سے دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کے بال زرد رنگ کے ہیں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ”میں دن میں اس لاش کو ایک نظر دیکھنا چاہوں گا، شاید کوئی خاص بات معلوم ہوجائے۔“

وہ خالص پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔ ”کیوں نہیں۔“

☆☆☆

دوسری صبح میں دوبارہ ڈوئل فارم گیا اور دن کی روشنی میں احاطے کا معائنہ کیا۔ فرش پر قدموں اور گھسیٹے جانے کے نشانات سے لگ رہا تھا کہ ڈوئل کو لاش گھسیٹنے میں کافی محنت کرنا پڑی ہوگی۔ مجھے وہاں ایک دودھ کا ڈبا بھی نظر آیا جس پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ میں نے شہتیر میں چھروں کے نشان دیکھے جن کی وجہ سے لکڑی جھڑ گئی تھی لیکن پیٹرسن کے چہرے کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ گولی اوپر کی جانب چلائی گئی ہوگی۔ جس کا مطلب تھا کہ شہتیر میں لگے ہوئے چھرے بعد میں فائر کیے گئے تھے۔

ان چہروں کو دیکھنے کے بعد مجھے توقع تھی کہ یہاں کوئی نہ کوئی کارتوس کا خول ضرور مل جائے گا۔ میں نے زمین پر بڑھے ہوئے گھاس کے ڈھیر کو ایک طرف ہٹانا شروع کیا اور جلد ہی مجھے ایک خول مل گیا۔ میں نے اسے احتیاط سے اٹھایا اور جیب سے محدب عدسہ نکال کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا اگلا حصہ گول نہیں بلکہ مثلث نما تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ جس ہتھیار سے یہ گولی چلائی گئی، اس کی اندرونی پن بھی مثلث نما ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ گولی گڈمین کی شاٹ گن سے چلائی گئی تھی جسے گزشتہ شب ہورن نے وکوبی روڈ پر دیکھا تھا یا ڈوئل کی شاٹ گن سے جو اس نے اپنے گھر میں کہیں چھپا رکھی تھی۔ میں نے وہ خول ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

شام کو مریضوں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے گھوڑے پر زین کسی اور اورینٹ ہوٹل کی جانب روانہ ہوگیا۔ وہاں میری ملاقات بارٹینڈر جیمس کیسی سے ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ میں مسٹر گڈمین اور مسز گڈمین سے ملنا چاہتا ہوں۔ جیمس انہیں بلانے چلا گیا۔ پہلے مسز گڈمین آئی۔ وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہی تھی۔ گویا ہورن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کے پاؤں میں موچ آئی ہوئی تھی۔ وہ بمشکل انیس برس کی ہوگی۔ اس کے بالوں کا رنگ زرد تھا جیسے بال مجھے پیٹرسن کی انگوٹھی سے ملے تھے۔

جب وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تو میں نے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے بتایا کہ شیرف آرمسٹرانگ کی غیر موجودگی میں اس کے نائب کے فرائض انجام دے رہا ہوں اور اس وقت پیٹرسن کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں جسے گزشتہ شب ڈوئل کے فارم پر گولی ماردی گئی تھی۔

اس نے ایک ہلکی سی ہچکی لی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ اس جرم سے پوری طرح باخبر ہے۔ میں اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔ جانتا ہوں کہ مرنے والے کے ساتھ تمہارا قریبی تعلق تھا اس لیے یہ صدمہ تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ اگر تم کچھ سوالوں کا جواب دے سکو تو اس سے ہمیں قاتل تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

اس نے رومال نکال کر اپنی ناک پونچھی اور بولی۔ ''میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس کے قاتل کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

میں نے اپنے لہجے کو حد درجہ نرم رکھنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''میرا پہلا سوال یہ ہے کہ تم کل رات ڈوئل فارم کے نزدیک کیا کر رہی تھیں؟ تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟ اگر تمہاری اس حرکت پر غور کیا جائے تو مرنے والے کے ساتھ تمہارے تعلق کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے تم ہی مشتبہ نظر آتی ہو۔''

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تو گزشتہ شب ڈوئل فارم کے قریب نہیں گئی تھی۔''

''میرے پاس گواہ موجود ہیں جنہوں نے تمہیں لگ بھگ قتل کے وقت وکوبی روڈ پر دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ تمہارے شوہر مسٹر گڈمین کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن بھی تھی۔ مجھے اس تلخ نوائی پر معاف رکھو لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے کئی مواقع پر مسٹر پیٹرسن کے ساتھ اپنے والہانہ پن کا اظہار کیا جس کی وجہ سے تمہارے شوہر کو اس سے حسد ہونے لگا۔ کیا تمہارے شوہر نے ہی پیٹرسن کو قتل کیا ہے؟''

یہ سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ خاص طور پر اس کے سنہری بالوں کو۔۔۔ اور بولا۔ ''لیکن تم یہ اعتراف تو کرو گی کہ اس کے پیچھے گئی تھیں۔''

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''ہاں، میں اسے کسی احمقانہ حرکت سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''مثلاً؟''

''وہ اپنی کسی چیز کے بارے میں بہت پریشان تھا۔''

''تمہارا اشارہ ڈوئل کی کتیا پونی کی طرف ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ شب پیٹرسن مجھے شراب خانہ میں ملا تھا اور مسلسل یہی کہہ رہا تھا کہ وہ کتیا اس کی ہے جسے اس نے گزشتہ ہفتے مسٹر ڈوئل سے پوکر کھیلتے ہوئے جیتا تھا۔ وہ ڈوئل فارم جا کر اس سے وہ کتیا لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے وہاں جانے سے منع کیا لیکن وہ پوری طرح نشے میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ جان سکتی وہ وکوبی روڈ کی طرف جا چکا تھا۔ اس کے پاس بھی شاٹ گن تھی۔''

میں نے اپنی بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے پاس بھی شاٹ گن تھی؟'' گویا اب مجھے تین ہتھیاروں کے بارے میں سوچنا پڑتا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے شوہر نے مجھے

اپارٹمنٹ میں روکنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے پیچھے جاؤں لیکن میں نے اسے جھڑک دیا۔ ہورن یک میرے پیچھے پیچھے آیا اور اس سے پہلے کہ میں پیٹرسن کو روکتی، وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ میں نے اپنے شوہر کو دیکھتے ہی دوڑ لگا دی اور اس طرح میرے پاؤں میں موچ آگئی اور میں پیٹرسن کو نہ بچا سکی۔" یہ کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگی۔

اسی دوران گڈمین بھی آگیا اور اپنی بیوی کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب تم خود ہی دیکھ لو ڈاکٹر ڈیکن۔ اگر کسی عورت کو ڈتے دار لوگوں سے بات کرنی ہو تو اسے پہلے اپنے شوہر سے اجازت لینی چاہیے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔"

یہ الفاظ سن کر وہ بھڑک اٹھی اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا مجھے تم سے معافی مانگنا چاہیے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد گڈمین بولا۔ "میرے لیے بیک وقت یہ خوشی اور افسوس کا مقام ہے کہ میں ایک جوان بیوی کا شوہر ہوں۔ جیمس نے مجھے بتایا کہ تم کچھ سوالات کرنا چاہتے ہو۔ جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی پوچھو۔ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

میں نے پہلا سوال وکوبی روڈ پر اس کی موجودگی کے بارے میں کیا۔ "مرنے والے کے ساتھ تمہاری بیوی کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے تمہاری وہاں موجودگی باعثِ تشویش ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ تم مسلح بھی تھے۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نے پیٹرسن کو قتل کیا ہے تو یہ غلط ہے۔ میں صرف اپنی بیوی کی حفاظت کرنے اور اسے گھر واپس لانے کے لیے وہاں گیا تھا۔"

"مقتول شاٹ گن کے فائر سے ہلاک ہوا ہے اور قرب وجوار میں مقتول کے علاوہ صرف تمہارے پاس ہی شاٹ گن تھی۔ اس لیے سب سے زیادہ شبہ تم پر ہی کیا جائے گا۔"

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں نے صرف اس وجہ سے شاٹ گن لے لی تھی کیونکہ مجھے جیمس سے معلوم ہوا تھا کہ پیٹرسن بھی مسلح ہے۔ وہ غصے کا بہت تیز تھا، خاص کر نشے کی حالت میں اس کا مزاج بے حد برہم ہو جاتا تھا۔ میں اپنی بیوی کو اس صورتِ حال میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ تمہیں میری بیوی نے بتایا ہوگا کہ میں نے آدھے راستے میں ہی اسے جالیا تھا۔ اس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ اس لیے میرا پیٹرسن سے سامنا نہیں ہوا اور میں سواری کی تلاش میں قصبے کی طرف واپس چلا آیا۔"

اس حقیقت کے باوجود کہ گڈمین شاٹ گن لے کر ڈوئل فارم گیا تھا، میں شاید اس کی بات پر یقین کر لیتا۔ اس کے پاس قتل کرنے کا محرک موجود تھا لہٰذا میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے گڈمین کہ میں تمہاری شاٹ گن ضبط کرنے پر مجبور ہوں۔ مجھے جائے وقوعہ سے کچھ خول ملے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان میں سے کوئی خول تمہاری شاٹ گن سے چلائی گئی گولی کا ہے یا نہیں۔"

"بالکل۔" اس نے تعاون کرنے والے انداز میں کہا۔ "میں ابھی وہ شاٹ گن لے کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیا اور تھوڑی دیر بعد شاٹ گن لا کر میرے حوالے کر دی۔

"بہت بہت شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس بھی ایک شاٹ گن ہوگی۔"

پہلے تو اس کا چہرہ بے تاثر رہا پھر میرا اشارہ سمجھتے ہوئے وہ تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ "بہتر ہوگا کہ تم ولفرڈ ہورن کو بھی مشتبہ افراد میں شامل کر لو۔ اس کے پاس میری نسبت پیٹرسن کو قتل کرنے کا بہتر محرک تھا..... اور یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ شب وہ بھی وکوبی روڈ پر موجود تھا۔"

میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہارا خیال ہے کہ یہ قتل اس نے کیا ہے؟"

"مجھے شبہ ہے کہ تم نے ہورن کی آنکھ پر لگی ہوئی پٹی پر غور نہیں کیا ہوگا۔"

میں نے اعتراف میں سر ہلا دیا۔

"پانچ سال پہلے ہورن یہاں آیا تو اسے باہر کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور اسے ایک گائیڈ کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے پیٹرسن ان دنوں بیکار تھا لہٰذا ہورن نے اسے گائیڈ کے طور پر رکھ لیا۔ ہورن نے صرف اسے معقول تنخواہ ہی نہیں دی بلکہ کینیڈین حکام کے ساتھ ہونے والے معاہدے میں اس کا حصہ بھی مقرر کر دیا۔ یہ دونوں سال بھر تک شمالی علاقوں کا سفر کرتے رہے اور پھر یوکون مائننگ آفس میں ان کی رجسٹریشن ہوگئی۔ ہورن نے اپنی رقم سے اس میں سرمایہ کاری کی جبکہ پیٹرسن نے ساری کمائی جوئے اور شراب کی نذر کر دی۔ جب وہ بالکل خالی ہو گیا تو اس نے مطالبہ کیا کہ ہورن اپنے منافع میں سے اسے بھی حصہ دے۔ اس کا اصرار تھا کہ معاہدے کے مطابق اسے بھی حصہ ملنا چاہیے، چاہے وہ ہورن کے سرمائے پر ملنے والا منافع ہی کیوں نہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان جھگڑا بڑھ گیا اور پیٹرسن نے کوئی چیز اٹھا کر اس کی آنکھ پر دے ماری جس کے نتیجے

میں وہ دائیں آنکھ کی بینائی سے محروم ہوگیا۔ اسی لیے وہ اس پر ہر وقت پٹی لگائے رہتا ہے۔ پیٹرسن کو آٹھ ماہ کی سزا ہوئی جبکہ ہورن کے خیال میں یہ سزا ناکافی تھی۔ ایک دو مرتبہ اس نے عہد بھی کیا کہ وہ پیٹرسن کو جان سے مار ڈالے گا۔ میں نے اسی لیے تمہیں اس پر نظر رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور مجھے اس میں وزن محسوس ہوا۔ کم از کم اس بنیاد پر ہورن سے پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی لیکن کافی دیر ہو چکی تھی اس لیے میں نے ہورن سے ملنے کا معاملہ دوسرے روز پر ملتوی کر دیا اور گڈمین سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ مجھے شدید نیند آرہی تھی لیکن ولسن کو اپنے دروازے پر دیکھ کر میری نیند غائب ہوگئی۔

☆☆☆

"کیا ہوا ولسن؟ کوئی مر گیا؟"

"نہیں ڈاکٹر ڈیکن۔" وہ کیروسین لیمپ اوپر کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے پیٹرسن کی لاش پر کچھ مشتبہ نشانات ملے ہیں اور تم نے مجھے تاکید کی تھی کہ ایسی صورت میں تمہیں فوراً مطلع کیا جائے۔"

"ایسی کیا خاص بات دیکھی تم نے؟" میں گھوڑے سے نیچے اترتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس کے بازو پر ایک غیر معمولی نشان دیکھا ہے اور اس کے سر کی پشت پر ایک گہری چوٹ بھی نظر آرہی ہے۔"

"میں یہ گن الماری میں رکھ دوں پھر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

گڈمین کی بندوق کو محفوظ جگہ پر رکھنے کے بعد میں ولسن کے ساتھ مردہ خانے چلا گیا۔

ولسن نے لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ اس کے سر کی پشت پر گہری ضرب کا نشان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گولی لگنے سے پہلے کسی نے اس کے سر پر بھاری شے سے ضرب لگائی تھی۔"

اس کی بات سنتے ہی مجھے اس خون آلود دودھ کے ڈبے کا خیال آیا جو میں نے ڈوئل کے احاطے میں دیکھا تھا۔

"اس سے زیادہ مجھے اس کے بازو کا نشان پریشان کر رہا ہے۔" ولسن بولا۔ "دانتوں سے کاٹنے کا یہ نشان بڑا عجیب سا ہے۔ ابھی یہ زخم بھرنا شروع نہیں ہوا جس کا مطلب ہے کہ اسے مرنے سے کچھ دیر پہلے ہی کسی نے دانتوں سے کاٹا تھا۔"

میں نے غور سے اس نشان کا معائنہ کیا۔ ولسن ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے ایسا نشان نہیں دیکھا تھا۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ کسی کتے یا دوسرے جانور کے کاٹنے کا نشان ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے کسی انسان کے کاٹنے کا نشان لگ رہا تھا۔

میں نے ولسن سے پوچھا کہ کیا ٹریسنگ پیپر اور پنسل مل سکتی ہے۔ ولسن پہلے تو کچھ ٹھٹکا پھر اوپر جا کر اپنی بیٹی کے کمرے سے یہ دونوں چیزیں لے کر آگیا۔ میں نے وہ پیپر زخم کے اوپر رکھا اور پنسل کے چوڑے سرے سے اسے دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح پیپر پر وہ کاٹنے کا نشان ابھر آیا۔ میرا خیال تھا کہ قصبے کے دندان ساز ڈاکٹر چارلس کے لیے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہو سکے گا۔

☆☆☆

میری نیند اب مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی لہٰذا میں نے سونے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے گھوڑے کا رخ ڈاکٹر چارلس کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ راستے میں ہورن کا مکان پڑتا تھا۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں اس سے بھی دو باتیں کر لوں۔ میں نے گھوڑا درخت سے باندھ کر دروازے پر دستک دی۔ میرا استقبال ایک چھ سات سال کے لڑکے نے کیا جس نے اپنے ہاتھوں میں کیک کا ٹکڑا پکڑا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بھی چاکلیٹ لگی ہوئی تھی۔

میں نے خوش دلی سے کہا۔ "ہیلو! کیا تمہارا باپ گھر

گدھا

فصیل

مالک ملازم کو ڈانٹتے ہوئے۔ "تم یہ کام کیوں نہیں کر سکے؟"

ملازم: "مالک! میں نے پوری کوشش کی تھی۔"

مالک: "خاک پوری کوشش کی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں ایک گدھے کو اس کام کے لیے بھیج رہا ہوں تو میں خود چلا جاتا۔"

شادی کا کھانا

ایک آدمی اپنے گدھے کو نہلا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دوست نے پوچھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

آدمی: "آج میرے گدھے کی شادی ہے اس لیے نہلا رہا ہوں۔"

دوست: "تو اس خوشی میں ہمیں کیا کھلاؤ گے؟"

آدمی: "جو دولہا کھائے گا، تم بھی کھا لینا۔"

کراچی سے امتیاز احمد کی حس مزاح

پر ہے؟"
گھر کے اندر سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ایک کتا اچھلتا کودتا میرے قدموں سے آکر لپٹ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ لڑکا اس پر جھکتے ہوئے بولا۔
"بسٹر! ہٹ جاؤ۔"
اسی اثنا میں ہورن بھی لپکتا ہوا آیا اور معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے ڈاکٹر لیکن یہ سامنے والے دروازے سے آنے والے اجنبیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔"
یہ کہہ کر اس نے کتے کو گود میں اٹھالیا۔ اسی وقت میری نظر اس کتے کے دانتوں پر گئی۔ اس کا ایک دانت غائب تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید گزشتہ شب یہ کتا بھی ہورن کے ساتھ ہو اور اس نے اپنے مالک کا اشارہ ملنے پر پیٹرسن پر حملہ کر دیا ہو۔
ہورن نے کتے کو بیٹے کے حوالے کیا۔ وہ اسے لے کر گھر کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔
"میں تم سے گزشتہ رات والے واقعے کے بارے میں کچھ مزید سوالات کرنے آیا ہوں۔ کیا تم مجھ سے تعاون کرو گے؟"
اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ بولا۔ "کیوں نہیں، اس طرف آجاؤ۔"
جب میں نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی تو اس کا چہرہ مرجھا گیا لیکن وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ ماضی میں ہمارے درمیان کچھ تلخیاں تھیں کیونکہ اس نے میری دائیں آنکھ ضائع کر دی تھی اور میں نے ایک دو مرتبہ شراب کے نشے میں اسے قتل کرنے کی بھی دھمکی دی تھی.... لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "پھر تو مجھے کوئی نہ کوئی قدم ایسا اٹھانا ہو گا جس سے تمہارے اوپر سے شک دور ہو جائے۔ کیا تم مجھے اپنی شاٹ گن دے سکتے ہو؟ مجھے جائے وقوعہ سے کارتوس کا ایک خول ملا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ گولی تمہاری گن سے تو نہیں چلائی گئی۔"
"اس وقت میری شاٹ گن یہاں نہیں ہے۔ میں نے حال ہی میں اپنے تمام شکاری ہتھیار ریچھ کے شکار کے سلسلے میں بھائی کے پاس بھیج دیے ہیں۔"
"اور تم نے یہ سامان کب بھیجا؟ یقیناً رسید میں تمام سامان کی تفصیل موجود ہو گی۔ اگر اس میں شاٹ گن کا ذکر ہوا تو تم اس معاملے سے بچ سکتے ہو۔ اگر تم یہ ثابت کر سکو کہ وقوعہ والے روز یہ شاٹ گن تمہارے پاس نہیں تھی۔"
"رسید پر تمام اشیا کی تفصیل درج نہیں ہوتی۔ صرف کارٹن کی تعداد لکھی جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"
"کیا یہ سامان پیٹرسن کی موت سے پہلے بھیجا گیا یا بعد میں؟"
"میں یہ سامان اس کی موت سے پہلے ہی بھیج چکا تھا۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے قتل کرنے کے لیے اپنی شاٹ گن استعمال کرتا۔"
"تمہارے پاس وہ رسید تو ہو گی۔ میں اس پر تاریخ دیکھنا چاہتا ہوں۔"
اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا اور وہ بولا۔ "رسید بینک لاکر میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کے لیے ہمیں صبح تک انتظار کرنا ہو گا۔"

☆☆☆

ہورن سے فارغ ہونے کے بعد میں ڈاکٹر چارلس کی طرف گیا۔ دستک دینے پر اس کے بٹلر موریس نے دروازہ کھولا اور میرا کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ڈاکٹر منہ میں پائپ اور ہاتھ میں وہسکی کا گلاس پکڑے باہر آیا اور مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔
"تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ میں نے ابھی ڈرنک شروع کی ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"
"یقیناً لیکن اگر تم کچھ خیال نہ کرو تو اس دوران ہم کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں۔"
وہ کچھ الجھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس مریض کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہے ہو جس کا ہم دونوں مشترکہ طور پر علاج کر رہے ہیں.... اسے کیا ہوا؟"
"نہیں، میں تم سے پیٹرسن کے قتل کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے ایک غیر متوقع سراغ ملا ہے۔ شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔"
"اچھا۔ اندر آجاؤ۔"
وہ مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور وہسکی کا گلاس پکڑاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اخبار میں اس کی تفصیل پڑھی تھی۔ اس کے چہرے پر شاٹ گن سے فائر کیا گیا ہے لیکن میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ تم تو جانتے ہو کہ میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں۔"

میں نے اپنی جیب سے وہ ٹریسنگ پیپر نکالا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ گولی لگنے سے پہلے کسی نے اس کے بازو پر کاٹا تھا۔ میں نے اس کاغذ پر زخم کا نشان اتار لیا ہے۔ تم دانتوں کے بارے میں جانتے ہو۔ اس لیے بتا سکتے ہو کہ یہ کس کے کاٹنے کا نشان ہے۔ مجھے تو کسی کتے کا لگتا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ کاغذ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کتا کاٹنے سے پہلے اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ یا تو وہ اپنے شکار کو کھینچتا ہے یا اپنا سر آگے پیچھے ہلاتا ہے اور اس طرح چیر پھاڑ کا نشان پڑ جاتا ہے جبکہ یہاں مجھے ایسا کچھ نظر نہیں آرہا۔''

''پھر تمہارے خیال میں یہ کس کے کاٹنے کا نشان ہو سکتا ہے؟''

''یہ کسی انسان کے کاٹنے کا نشان ہے۔''

''لیکن میں نے آج تک کسی انسان کے ایسے دانت نہیں دیکھے۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''ایسے دانت ان مریضوں کے ہوتے ہیں جن کی ذہنی بلوغت رک گئی ہو۔ شاید تم نے بھی اپنی پریکٹس کے دوران غور کیا ہوگا کہ ایسے مریض کا ذہن ہی نہیں بلکہ دانتوں کی بناوٹ بھی مختلف ہوتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی ایسے ہی شخص کے دانتوں کے کاٹنے کا نشان ہے۔''

میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا پھر میرے ذہن میں ایک نئے شبے نے سر اٹھایا اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ ڈوئل کی بیٹی ڈورا ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔''

''ہاں اور وہ میرے زیرِ علاج بھی رہ چکی ہے۔'' وہ کاغذ کو ایک بار پھر غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس نشان کو غور سے دیکھنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسی کے دانتوں کا ہے۔''

''لیکن ڈورا تو کسی اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔''

''یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟''

''ہورن نے اس کا ذکر کیا تھا۔''

''ڈاکٹر، تمہاری معلومات ناقص ہیں۔ گزشتہ خزاں میں ڈوئل کے مالی حالات خراب ہو گئے تھے اور وہ اسپتال کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے کرسمس پر وہ ڈورا کو گھر لے آیا تھا۔''

میرے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم اس کے بالوں کے رنگ کے بارے میں بتا سکتے ہو؟''

''اس کے بالوں کے رنگ کا تمہاری تفتیش سے کیا تعلق ہے؟''

''اگر نہیں ہے تو بن سکتا ہے۔'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس نے ٹریسنگ پیپر مجھے واپس دیتے ہوئے کہا۔ ''سنہری۔۔۔۔ شاید میں نے اب تک اس سے زیادہ خوب صورت سنہری بال نہیں دیکھے۔''

☆☆☆

اگلے روز میں نے الماری سے گڈمین کی شاٹ گن نکالی اور باہر نکل گیا۔ میں یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ڈورا جیسی معصوم لڑکی پیٹرسن کے قتل میں ملوث ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں اپنے آپ کو قائل کرنا چاہ رہا تھا کہ پیٹرسن کو کسی دوسرے شخص نے قتل کیا ہے اور مجھے زیادہ شک گڈمین پر تھا۔

میں نے رات کے اندھیرے میں اس کی شاٹ گن لوڈ کی اور میدان میں جا کر ایک فائر کر دیا۔ پھر میں نے زمین پر پڑا ہوا خول اٹھایا اور واپس اپنی اسٹڈی میں آگیا۔ پھر میں نے اس خول کو جائے وقوعہ پر ملنے والے خول سے ملایا تو مجھے دونوں میں واضح فرق نظر آیا۔ اس کا سرا گول تھا جبکہ پہلے والے خول کا سرا مثلث نما تھا۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گڈمین کی شاٹ گن اس قتل میں استعمال نہیں ہوئی۔ لہٰذا میں نے اسے مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا۔

اب میں ایک بار پھر مارلین گڈمین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بالوں کا رنگ اس بال سے ملتا جلتا تھا جو میں نے پیٹرسن کی انگوٹھی سے برآمد کیا تھا۔ گو کہ بہت دیر ہو چکی تھی، اس کے باوجود میں نے اسی وقت اور رینٹ ہوٹل جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ دونوں ڈیوٹی ختم کر کے اپنے اپارٹمنٹ جا چکے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو گڈمین شب خوابی کے لباس میں باہر آیا۔ میں نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی رات کو تمہیں زحمت دینے پر معافی چاہتا ہوں لیکن میں یہ شاٹ گن واپس کرنے آیا تھا۔''

اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک ابھری اور وہ بولا۔ ''گویا میں مشتبہ لوگوں میں نہیں ہوں؟''

''فی الحال تو ایسا ہی سمجھو۔ میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا اگر تم مجھے اپنی بیوی کے کچھ بال دے سکو۔''

وہ میری بات سن کر چونک گیا لیکن جب میں نے اسے سمجھایا کہ ان دونوں کو مشتبہ افراد کی فہرست سے نکالنے

کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے تو وہ تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے ایک چھوٹی چمٹی سے اس کی بیوی کے برش میں سے کچھ بالوں کے گچھے نکالے اور انہیں ایک لفافے میں رکھ کر واپس آ گیا۔

کلینک میں آنے کے بعد میں نے دوربین سے پہلے اس بال کا معائنہ کیا جو پیٹرسن کی انگوٹھی سے ملا تھا پھر مسز گڈمین کے بال کو دیکھا۔ مجھے ان دونوں میں واضح فرق محسوس ہوا۔ وہ نمونے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ پیٹرسن کی انگوٹھی سے ملنے والا بال ملائم اور چمک دار تھا جبکہ مسز گڈمین کا بال سخت۔ اس بنیاد پر مجھے مارلین کو بھی مشکوک لوگوں کی فہرست سے خارج کرنا پڑا۔

اب ہورن ہی باقی رہ جاتا تھا۔ ابھی مجھے یہ تصدیق کرنی تھی کہ اس قتل میں اس کی شاٹ گن استعمال ہوئی تھی یا نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس قتل سے پہلے ہی اپنی شاٹ گن بھائی کو بھیج چکا تھا لیکن ڈاکٹر چارلس کا کہنا تھا کہ مقتول کے بازو پر کاٹنے کا نشان کتے کا نہیں بلکہ کسی انسان کا ہے۔ لہٰذا میری تفتیش کا رخ ہورن کے بجائے ڈوئل کی جانب ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز علی الصباح میں نے اپنے تین نائبین کو ساتھ لیا اور ڈوئل کے فارم کی جانب چل دیا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے دونوں جڑواں بیٹے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ اسی دوران میں نے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹتے دیکھا اور مجھے وہاں سنہری بالوں کی جھلک نظر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ پردہ برابر ہو گیا۔ گویا ڈورا کہیں موجود تھی۔

میں نے ان دونوں لڑکوں سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاپا گھر پر ہیں؟''

''وہ فارم کے پیچھے والے حصے میں کچھ کام کر رہے ہیں۔''

''کیا تم انہیں بلا سکتے ہو؟ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

وہ دونوں دوڑتے ہوئے چلے گئے۔

میں اپنے نائبین کی جانب مڑا اور بولا۔ ''تمہیں اوپر کی منزل میں ایک لڑکی کو تلاش کرنا ہے لیکن اسے فی الحال یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ تمہیں اس گھر میں اسلحہ بھی تلاش کرنا ہے۔''

ڈوئل کو واپس آنے میں بیس منٹ لگ گئے۔ دونوں لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس وقت تک تینوں نائبین بھی خالی ہاتھ واپس آ چکے تھے۔

''تم میرے گھر میں بلا اجازت کس طرح چلے آئے؟'' ڈوئل غضب ناک لہجے میں بولا۔

''اگر تم یہ بتا دو کہ آلۂ قتل کہاں چھپا رکھا ہے تو ہمارا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔''

''آلۂ قتل؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر! تم کہیں نشے میں تو نہیں ہو؟''

''میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔'' میں پورے اعتماد سے بولا۔

''دیکھو ڈاکٹر! یہاں کوئی آلۂ قتل نہیں ہے کیونکہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ یہی بات میں دو روز پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔''

''پھر مجھے اس پورے معاملے پر تمہاری بیٹی سے بات کرنا پڑے گی۔''

''میری بیٹی!'' وہ بلند آواز میں بولا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری بیٹی یہاں نہیں ہے۔ قصبے کا ہر فرد یہ بات جانتا ہے۔''

اسی دوران مجھے اپنے نائب ہیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''ڈاکٹر! مجھے ایک ہتھیار ملا ہے۔'' اس نے ایک شاٹ گن اوپر اٹھائی اور بولا۔ ''اسے یہاں ٹیلے کے نیچے دفن کیا گیا تھا۔''

میں نے ایک نظر اس شاٹ گن پر ڈالی اور ڈوئل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''ڈاکٹر! تم عارضی طور پر شیرف کی جگہ کام کر رہے ہو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔''

''اس وقت میں ہی شیرف ہوں اور قانون کے محافظ کے طور پر کام کر رہا ہوں۔''

اس کے چہرے پر سختی آ گئی اور وہ بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہتھیار یہاں کس طرح آ گیا۔''

اس وقت تک ہیٹی میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے وہ شاٹ گن میرے حوالے کر دی۔ میں نے اس کی نال کھولی اور فائرنگ پن کو دیکھا۔ اس کا سرا تکون نما تھا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اندر جا کر ڈورا سے کچھ باتیں کر لوں؟''

اس کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بولا۔ ''تم اس سے کس طرح بات کر سکتے ہو جبکہ وہ یہاں موجود نہیں ہے؟''

''میں نے خود اسے اوپر کے کمرے کی کھڑکی میں دیکھا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس سے کچھ باتیں کر

لوں۔"

"آئندہ اگر تم یہاں نظر آئے تو میں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ میری طرف لپکا لیکن بیٹی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "بس.... بہت ہوچکا۔"

☆☆☆

ڈورا اوپر والے کمرے میں کھڑکی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ نے اس کے سنہری بالوں کی چمک میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب وہ میری طرف مڑی تو میں نے غور سے اس کے چہرے کے نقوش دیکھے جو بالکل ویسے ہی تھے جیسے عام طور پر ذہنی پسماندہ بچوں کے ہوتے ہیں۔ مجھے اس کے دانت بھی ٹیڑھے میڑھے نظر آئے۔

"ہیلو ڈورا!" میں نے کہا۔ "میرا نام ڈاکٹر ڈیکن ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ گولی چلنے کے واقعے کے بارے میں جاننے کے لیے آیا ہوں۔ "کیا تم اچھے بچوں کی طرح بتانا پسند کروگی کہ یہ سب کس طرح ہوا؟"

اس نے فوری طور پر کوئی جواب دینے کے بجائے پوچھا کہ کیا مجھے اس کا لباس پسند آیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ پانچ منٹ تک معصومانہ باتیں کرتی رہی جس میں ایک تتلی کی چھوٹی سی کہانی بھی شامل تھی۔ میں نے ایک بار پھر پوچھا کہ اس رات کیا ہوا تھا؟

"وہ گندہ آدمی پولی کو لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔"

"اس وقت تم احاطے میں اکیلی تھیں؟"

"ہاں لیکن بعد میں پاپا بھی آگئے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اب کہانی کھلتی جارہی ہے۔

"جیسے ہی پاپا باہر آئے، اس نے ان پر گولی چلانا چاہی۔ عین اسی وقت میں نے اس کے بازو پر کاٹ لیا۔ اس طرح گولی پاپا کے بجائے چھت کے شہتیر میں جا لگی۔"

"تمہارے کاٹنے کے بعد اس آدمی نے کیا کیا؟"

وہ کافی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ "اس نے دوبارہ بندوق بھری۔ اس بار میں نے دودھ کا ڈبا اٹھایا اور اس کے سر پر زور سے مار دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ لڑکھڑایا تو میں نے اس کی گن اٹھائی اور چارے

بڑی پارٹی

تاج محمد آنسو، اتنے کنجوس تھے کہ ان کے قریبی دوست انہیں مکھی چوس تک کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔

ایک روز "رنڈوے کی فریاد" لکھتے لکھتے ان کا دل چاہا کہ ایک کیلا کھائیں، انہوں نے بہت کوشش کی کہ دل کو اس بیہودہ خیال سے باز رکھیں مگر بڑا کائیاں دل تھا۔ اڑ گیا کہ کیلا کھاؤں گا اور ابھی کھاؤں گا ورنہ دھڑکنا چھوڑ دوں گا۔

ناچار تاج محمد آنسو ادھوری نظم چھوڑ کر اٹھے، بازار گئے اور پھل فروش کی گود میں 5 پیسے کا سکہ پھینک کر بولے۔ "یار ذرا جلدی سے ایک اچھا سا کیلا تو دینا۔ دیکھو، کچا نہ ہو۔"

پھل فروش نے حیرت کی ایک نظر تاج محمد آنسو پر ڈالی۔ دوسری پانچ پیسے کے سکے پر۔ سمجھ گیا کہ یہ حضرت کیلا لیے بغیر نہیں ٹلیں گے اور پانچ کی جگہ چھ پیسے بھی نہیں دیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں۔ عقل اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ دکانداری خراب نہ کی جائے۔

پس اس نے ایک بڑا سا کیلا اٹھایا اور ان کی طرف بڑھا کر بولا۔ "یہ لیجیے سرکار! کیلا حاضر ہے۔" پھر مسکرایا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ حضور والا کے ہاں کوئی بڑی پارٹی ہونے والی ہے۔ جس کی خاطر آپ اتنی زوردار خریداری کرتے پھر رہے ہیں۔"

تاج محمد آنسو چپ رہے۔ تاج محمد آنسو ہنس دیے۔ تاج محمد آنسو گھر کو کھسک لیے۔ منظور تھا کھانا کیلا!

طاہر محمود مجاہد۔ منڈی بہاء الدین

حالات کا تقاضا

ایک بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ شادی سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ ڈارلنگ! تم میری دنیا ہو۔"

شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جب میں تمہیں اپنی دنیا کہتا تھا تو اس وقت میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا اور اب تو میں کئی دنیائیں دریافت کرچکا ہوں۔"

کاشف عبید۔ کراچی

کے ڈھیر پر پھینک دی۔ اس نے لڑکھڑانا بند کیا اور کلہاڑی اٹھا کر میری طرف بڑھا لیکن پاپا درمیان میں آ گئے۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس گندے آدمی نے پاپا کی گرفت سے نکلنے کے لیے کلہاڑی بلند کی تو میں نے گن اٹھائی اور چلا کر اسے کلہاڑی پھینکنے کے لیے کہا لیکن اس نے میری بات نہیں مانی تو مجبوراً مجھے اس پر گولی چلانا پڑ گئی۔"

اب سب کچھ صاف ہو چکا تھا۔ دانت سے کاٹنے کا نشان، شہتیر میں لگی گولی کا نشان، خون آلود دودھ کا ڈبا اور دوسری گولی سے پیٹرسن کے بائیں گال پر لگنے والا زخم.... سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ بعد میں مسٹر ڈوئل نے بدحواسی اور غلط بیانی سے کیوں کام لیا؟ یہ سیدھا سادہ حفاظت خود اختیاری کا کیس تھا کیونکہ پیٹرسن نے ڈوئل پر کلہاڑی سے حملہ کرنا چاہا تھا اور ڈورا کو اپنے باپ کو بچانے کے لیے گولی چلانا پڑی۔

میں نیچے آ گیا اور ڈوئل کو ڈورا کی بیان کردہ کہانی سنا دی۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اب مزید مزاحمت بیکار ہے۔ پھر وہ بولا۔ "اب تم مجھے گرفتار کرو گے یا ڈورا کو؟"

"اگر سچ بتا دو کہ تم نے ان تمام باتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کیوں کی تو میں شاید کسی کو بھی گرفتار نہ کروں۔"

وہ رعونت سے بولا۔ "میں اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک مجھے معلوم نہ ہو جائے کہ کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

میں چاہتا تو اسی وقت اسے گرفتار کر سکتا تھا لیکن جب اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دونوں معصوم لڑکوں کو دیکھا تو میں نے سوچا کہ ان کا خیال کون رکھے گا۔ پھر ڈورا بھی اکیلی رہ جائے گی لہٰذا میں نے اس سے کہا۔ "میں تمام حقائق سے جج نورس کو آگاہ کردوں گا۔ یہ فیصلہ کرنا اس کا کام ہے کہ اس کیس کی سماعت کے لیے جیوری تشکیل دینے کی ضرورت ہے یا نہیں.... لیکن اس دوران میں تم یہ جگہ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔"

☆☆☆

پیر کی سہ پہر میں نے پیٹرسن کی تدفین میں شرکت کی۔ اس سے قبل صبح میں جج سے اس کیس کے بارے میں بات کر چکا تھا۔ اس موقع پر پیٹرسن کی بہن، مارلین گڈمین اور چرچ سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی موجود تھیں۔ مارلین بری طرح رو رہی تھی۔ جب یہ مجمع منتشر ہوا تو مجھے دریا کی جانب واقع ایک قبر پر کچھ نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ڈوئل اور اس کی بیٹی مسز ڈوئل کی قبر پر حاضری دے رہے تھے۔

میں ان کے پاس چلا گیا اور قبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس کی روح تمہیں یہاں دیکھ کر خوش ہو رہی ہو گی۔"

ڈوئل نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا تم نے جج سے بات کی؟ میں اس معاملے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں صبح اس کے پاس گیا تھا اور تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ اس نے جیوری نہ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پیٹرسن کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ کسی بھی شخص کو اپنے دفاع میں گولی چلانے کا حق ہے۔" میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور بولا۔ "اب تو تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تم نے اس معاملے میں جھوٹ کیوں بولا؟"

"میں نے یہ سب کچھ ڈورا کو بچانے کے لیے کیا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکے گی۔ ذہنی معذوری کی وجہ سے وہ ویسے ہی لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بنتی رہتی ہے اسی لیے میں نے تم سے یہ ساری بات چھپائی۔ ڈورا کو کسی جیوری کی نہیں بلکہ لوگوں کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اگر تم مجھے اس جرم میں گرفتار کرنا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ڈورا کو بچانے کے لیے یہ قیمت کچھ بھی نہیں۔"

میں نے دریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایسا نہیں کروں گا مسٹر ڈوئل۔ ایک باپ کو حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا تحفظ کرے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ بیٹی نے اس کی جان بچائی ہو۔"

ڈوئل چونکتے ہوئے بولا۔ "وہ اتنی احمق نہیں ہے جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ اس نے بالکل صحیح قدم اٹھایا ورنہ میری جان چلی جاتی۔"

میں نے ڈورا پر نظر ڈالی اور بولا۔ "واقعی اس نے صحیح فیصلہ کیا اور تمہارے لیے ڈھال بن گئی۔"

میں نے ان دونوں کو وہیں چھوڑا اور اپنے کلینک کی جانب چل دیا۔ قبرستان کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈورا اپنی ماں کی قبر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی جواب میں ایسا ہی کیا۔

اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ڈوئل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ڈورا کو مناسب توجہ اور علاج کی ضرورت تھی اور ڈورا جیسی بہادر لڑکی کے لیے میں یہ کام بہ آسانی کر سکتا تھا۔

گمشدہ لاش

تنویر ریاض

وقت کا پہیا گھومتے گھومتے بالآخر ایک جگہ پہنچ کے اپنی رفتار دھیمی کر بیٹھتا ہے... وہ آزاد تھا... من پسند زندگی جینے کا حق رکھتا تھا... مگر دوسروں کو یہ آزادی دینا اسے سخت ناگوار تھا... اپنی عمل داری میں جذبات و احساسات اور جسموں کو تاراج کر دینے والے شخص کی زہریلی راتوں کا خوفناک احوال...

ماضی کی گہرائیوں میں دفن ہو جانے والی پراسرار داستاں کے اوراق...

یہ 1980ء کی بات ہے۔ ان دنوں میری رہائش ٹوکیو کے مضافاتی علاقے وگی کوبو میں تھی۔ میں اکثر کھانا کھانے ایک قریبی ریستوران میں جایا کرتا تھا۔ جہاں سیخ پر مرغ کے بھنے ہوئے تکے ملتے تھے۔ یہ ایک مخصوص جاپانی کھانا ہے جسے یاکی توری کہتے ہیں اور اسی نسبت سے یہ ریستوران بھی یاکی توری ہی کہلاتے ہیں۔ وہاں میری ملاقات ایک اور مستقل گاہک سے ہوئی جو اکثر وہاں کھانا کھانے آتا تھا۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہمارے درمیان

اجنبیت ختم ہوگئی اور ہم مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ وہ ایک پولیس سراغ رساں یوشی کی تھا اور اسے بھی میری طرح ناول پڑھنے کا چسکا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں جاسوسی کہانیاں اور ناول لکھتا ہوں تو وہ مجھ میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے غیر معمولی واقعات اور عجیب و غریب جرائم سے دلچسپی ہے اور میں ان کی کھوج میں رہتا ہوں تاکہ انہیں اپنی کہانیوں کا موضوع بنا سکوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ایک ایسا دلچسپ اور ناقابلِ یقین واقعہ سنائے گا جس پر ایک شاہکار کہانی لکھی جاسکتی ہے۔

''نیک کام میں دیر کیسی؟'' میں نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔ ''شروع ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا منگواتا ہوں۔''

اس نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں نے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے کہنا شروع کیا۔

''یہ واقعہ ہی بیا میں واقع ایک تجارتی کمپنی میں پیش آیا۔ واقعی یہ عجیب و غریب کیس تھا۔''

''اسی لیے تو میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پورا واقعہ تفصیل سے سناؤ۔'' کھانا آگیا تھا۔ یوشی کی نے اپنی پلیٹ میں سے ایک ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''ایک صبح کمپنی کا ایک کارندہ کسی کام سے اپنے باس کے کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے سامنے میز پر رکھے اونچی ایڑی کے جوتوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو۔ اس کا چشمہ پھسل کر ناک کے سرے پر آگیا تھا۔ وہ اپنی میز کا کونا پکڑے کھڑا تھا اور اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ کے ٹریڈنگ کمپنی کا دفتر ایک پرانی عمارت میں واقع تھا جس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ دیواروں کا رنگ جھڑ چکا تھا اور جس حصے میں کمپنی کا عملہ بیٹھتا تھا، وہاں کا فرنیچر بھی بوسیدہ ہو چکا تھا۔

اس کے برعکس اکتالیس سالہ باس شاشارو انوڈو کا ذاتی آفس شان و شوکت کا نمونہ تھا۔ اس کی دیواروں پر نیا رنگ و روغن کیا گیا تھا اور اس میں قیمتی درآمد شدہ فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک جانب قیمتی صوفہ اور دوسری جانب ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس قیمتی شراب کا ذخیرہ بھی تھا جو کھڑکی کے ساتھ مہاگنی کے کیبنٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اور اسے کام کے دوران بھی اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اس کے دفتر کی کھڑکی سے وہ مثلث نما سرسبز قطعۂ زمین صاف نظر آتا تھا جو کسی بھی پارک کے مقابلے میں بس تھوڑا سا ہی چھوٹا تھا۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ نصب تھا اور تینوں اطراف سڑک گزر رہی تھی۔ اس طرح یہ ایک چورنگی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جب انوڈو پہلی بار اس دفتر میں آیا تو وہ مثلث نما قطعہ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اس لیے پانچویں منزل سے یہ نظارہ بہت دلکش لگا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ پھول غائب ہو گئے اور وہاں گھاس لگا کر اس جگہ کو لان کی شکل دے دی گئی جس کے وسط میں درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ کیونکہ وہاں قریب میں کوئی بڑا پارک نہیں تھا اس لیے یہ جگہ قریبی دفاتر میں کام کرنے والی لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بن گئی، جو لنچ کے اوقات میں یا چھٹی کے بعد کچھ دیر کے لیے وہاں ستانے بیٹھ جاتی تھیں۔

انوڈو کی شخصیت بھی دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک کامیاب اور سنگ دل کاروباری شخص کے طور پر پہچانا جاتا تھا تو دوسری جانب اس کے کردار پر انگلیاں اٹھتی رہتی تھیں اور وہ عورتوں کے شکاری کے طور پر مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے ماضی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن بہت سے لوگ جانتے تھے کہ وہ کئی بار چھوٹے موٹے جرائم کے نتیجے میں بچوں کی جیل جا چکا تھا۔ بیس سال کی عمر میں اسے ایک پولیس آفیسر سے عشق ہو گیا لیکن جب اس لڑکی کے گھر والوں کو علم ہوا تو وہ اپنا شہر چھوڑ کر ٹوکیو آگیا۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے وہ کوئی معقول ملازمت حاصل کرنے سے قاصر تھا لہٰذا اس نے گزر اوقات کے لیے کاروئی زاوا کے تفریحی علاقے میں پھیری لگا کر چاکلیٹ اور ٹافیاں بیچنا شروع کر دیں۔

1960ء کی ایک گرم دوپہر وہ پھیری لگاتے ہوئے ایک باغ میں پہنچا جہاں ایک نوجوان لڑکی سفید بلاؤز اور پینٹ پہنے جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں ارد گرد کوئی دوسرا فرد نظر نہیں آرہا تھا لہٰذا انوڈو ہمت کر کے اس کے قریب چلا گیا اور اسے ایک چاکلیٹ پیش کی۔ لڑکی نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اخلاقاً اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ تھوڑی دیر میں ہی انوڈو نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے لڑکی کو قابو میں کر لیا۔ اتنی دیر میں وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ دونوں صرف باغ میں ہی تنہا نہیں بلکہ اس سے ملحقہ گھر میں

بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ لڑکی کو بہلا پھسلا کر باغ کے کونے میں لے گیا اور اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ لڑکی زیادہ دیر مزاحمت نہ کرسکی اور انوڈو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

اس لڑکی کا نام اکوکو تیکی تھا اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس واقعے کے بعد بھی انوڈو نے اس لڑکی کا پیچھا نہیں چھوڑا اور اس کا پیچھا کرتا رہا۔ اس نے کسی طرح یہ معلوم کرلیا کہ وہ کہاں رہتی اور کیا کرتی ہے۔ اس لڑکی کی شادی ایک معزز خاندان میں ہوگئی۔ اس کا شوہر سفارت کار تھا۔ انوڈو نے اسے بلیک میل کرنا شروع کردیا گو کہ جو کچھ ہوا اس میں لڑکی کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن شریف خاندان کی ہر لڑکی یہی چاہتی ہے کہ ایسی باتوں پر پردہ پڑا رہے چاہے اس کے لیے اسے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے شوہر تک یہ بات پہنچے۔ چنانچہ اس نے انوڈو کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے خاموشی سے اپنے حصے کی زمین کا ایک بڑا ٹکڑا بیچ دیا جو اسے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ انوڈو کے ہاتھ رقم آئی تو اس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر یہ کمپنی کھول لی۔ گو کہ وہ محض اس کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا لیکن اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ اس کمپنی کا صدر ہوگا۔

کچھ عرصے بعد اس نے شادی کرلی جس سے اس کے دو بچے ہوئے۔ اس کے باوجود وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس کا ایک بچہ مڈل اسکول اور دوسرا پرائمری اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ لیکن وہ اب بھی جوانوں کی طرح بن ٹھن کر گھر سے باہر نکلتا۔ اس نے اپنے دفتر کی تزئین و آرائش بھی اسی مقصد کے تحت کی تھی تاکہ وہ رات میں وہاں دوسری عورتوں سے ساتھ رنگ رلیاں منا سکے۔

اکوکو اسے ایک بڑی رقم ادا کرچکی تھی۔ پھر بھی وہ اس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے شوہر کا تبادلہ ہوگیا اور وہ اس کے ساتھ پیرس چلی گئی۔ پندرہ سال پیرس میں قیام کرنے کے بعد وہ واپس آئی تو انوڈو نے اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ سونے پر مجبور کیا۔ اکوکو کے لیے یہ ایک مشکل صورتِ حال تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ چنانچہ اسے مجبوراً انوڈو کا مطالبہ پورا کرنا پڑا۔ ویسے بھی اس کا شوہر ایک خشک مزاج شخص تھا اور وہ اس کے ساتھ ناآسودہ زندگی گزار رہی تھی چنانچہ وہ انوڈو کی خواہشات کی تکمیل کرتی رہی۔

انوڈو نے جب دیکھا کہ مچھلی اس کے جال میں پوری طرح پھنس چکی ہے تو اس کے مطالبات میں شدت آنے لگی۔ اکوکو کے لیے رات میں گھر سے نکلنا مشکل تھا چنانچہ انوڈو نے تجویز پیش کی کہ وہ دن میں اس کے دفتر آجایا کرے جب اس کا شوہر گھر میں نہ ہو۔ اکوکو نے یہ تجویز رد کردی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دن کے وقت دوسرے لوگوں کی موجودگی میں اس کے دفتر آئے۔ بہرحال وہ ایک معزز سفارت کار کی بیوی تھی اور ذرا سی لغزش اس کے شوہر کے کیریئر کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس کے باوجود انوڈو اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس نے اسے وہ چور راستہ بھی بتا دیا جہاں سے وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس کے کمرے تک پہنچ سکتی تھی۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اکوکو نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اس کے شوہر کو سب کچھ بتا دے گا۔ اب اکوکو مجبور ہوگئی اور اس نے وہی کیا جو وہ چاہتا تھا۔ وہ اس کے دفتر آتی تو وہ اندر سے کمرا بند کرلیتا۔ ماتحتوں سے اس کا واسطہ بہت کم پڑتا تھا، اسی لیے کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔

وہ تیسری بار اس کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد جانے لگی تو انوڈو نے اسے روک لیا اور کہا کہ وہ رات تک ٹھہر جائے۔ اکوکو رونے اور التجا کرنے لگی۔ اس کا شوہر شام کو گھر آجائے گا اور خادمہ اس سے بھی پہلے یعنی چھ بجے آجاتی تھی۔ اگر وہ ان دونوں کے آنے سے پہلے گھر نہ پہنچی تو بہت گڑبڑ ہوجائے گی۔ لیکن انوڈو پر اس کی التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اکوکو کا لباس اور کوٹ چھین لیا۔ اب اس کے جسم پر زیریں لباس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اکوکو نے اس سے اپنے کپڑے واپس لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی اور انوڈو نے وہ چیزیں سیف میں رکھ کر اس کا نمبروں والا تالا لگا دیا۔

”اس حلیے میں اگر جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔“ انوڈو نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

”خاموش ہوجاؤ۔“ اکوکو چلاتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ اب تم مجھ سے اور کیا چاہتے ہو؟“

”یہ رونا دھونا بند کرو۔ میں ایک میٹنگ میں جارہا ہوں اور میری واپسی سات بجے سے پہلے نہیں ہوگی۔ اس وقت تک تم یہیں رک جاؤ۔ میں واپس آنے کے بعد تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”اس طرح تو میں آٹھ بجے سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتی۔ اس وقت تک میرا شوہر آچکا ہوگا۔ میں یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے جانے دو۔“

”تم اسے فون کرکے بتادو کہ دیر سے گھر آؤ گی۔“

”کیا میں یہاں سے فون کرسکتی ہوں؟“

”تمہیں آپریٹر سے نمبر لینا ہوگا۔“

”میں ایسا نہیں کرسکتی۔ کسی کو میرے یہاں آنے کا علم نہیں ہونا چاہیے۔“

”پھر اس کے گھر جانے کا انتظار کرو۔ ساڑھے پانچ بجے کے بعد تم براہِ راست فون کرسکتی ہو۔“

”اس وقت تک بہت دیر ہوجائے گی۔“

”ٹھیک ہے پھر اسی حالت میں گھر چلی جاؤ۔ اس کمرے کا ایک دروازہ عقبی راہداری میں کھلتا ہے۔ اس سے گزر کر تم عمارت کے پچھلے دروازے تک پہنچ جاؤ گی جو رات کے نو بجے تک کھلا رہتا ہے۔“

”پلیز، ایسا مت کرو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

”تم میرے دفتر کے لوگوں سے بھی مدد مانگ سکتی ہو۔ ان میں کئی عورتیں بھی ہیں۔ شاید وہ تمہیں زنانہ لباس مہیا کرسکیں۔“

یہ کہہ کر اس نے الماری سے اپنا کوٹ نکالا اور اسے پہنتے ہوئے بولا۔ ”اب میں جارہا ہوں۔ اگر چاہو تو اندر سے دونوں دروازے بند کرلو۔ ہیٹر چل رہا ہے۔ اس لیے تمہیں سردی محسوس نہیں ہوگی۔ وقت گزاری کے لیے تم کوئی کتاب پڑھ سکتی ہو۔“

جب وہ سات بجے واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اکو کو جاچکی تھی۔ مرکزی ہال سے منسلک دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ کچھ ملازمین ابھی تک کام کررہے تھے۔ اس نے ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اکو کو نے چھ بجے کے قریب ایک عورت سے کہا تھا کہ وہ اسے کچھ کپڑے عاریتاً دے دے۔ اس وقت انوڈو کو تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا۔

دوسرے روز اس نے اس عورت کو بلا کر پوچھا کہ گزشتہ روز کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ چھ بجے کے قریب جب وہ گھر جانے کی تیاری کررہی تھی تو اسے ایک اسٹاف ممبر نے فون کرکے کہا کہ ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے دفتر میں ایک عورت موجود ہے جو دفتر میں کام کرنے والی کسی عورت سے بات کرنا چاہتی ہے۔ یہ سن کر وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گئی۔ اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور ایک درمیانی عمر کی عورت صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ کیا وہ اس کے لیے کپڑوں کا انتظام کرسکتی ہے۔ وہ واپس گئی اور اپنے لاکر سے اس عورت کے لیے کپڑے لے آئی۔

”یہ واقعہ کتنے بجے پیش آیا؟“ انوڈو نے پوچھا۔

”تقریباً چھ بجے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔“

”کیا اس نے کہا تھا کہ وہ آج کپڑے واپس کرنے آئے گی؟“

”نہیں۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”جب میں کپڑے لے کر آئی تو وہ یہاں نہیں تھی۔“

انوڈو یہ سن کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ”وہ کمرے میں نہیں تھی۔ کیا وہ گھر چلی گئی؟“

”میرا یہی خیال ہے۔“

انوڈو کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ کپڑوں کے بغیر کیسے جاسکتی تھی لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں پر آکر رک گئے۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آیا اور اس نے اپنی الماری کھول کر دیکھی۔ بظاہر اس کا کوئی کپڑا غائب نہیں تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ الماری میں اس کی سب چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔

اس نے ایک بار پھر سوچنا شروع کیا۔ گزشتہ شب جب وہ واپس آیا تو دفتر سے منسلک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن عقبی راہداری میں کھلنے والا دروازہ بدستور مقفل تھا لیکن اگر اکو کو دفتر سے گزر کر گئی تو وہاں دیر تک رک کر کام کرنے والے کسی فرد نے اسے ضرور جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگیا لیکن اس نے مزید شرمندگی سے بچنے کے لیے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔

یہ واقعہ نومبر 1979ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد انوڈو نے اسے کبھی فون نہیں کیا کیونکہ خاموش رہنے میں ہی اس کی بھلائی تھی۔ خدا جانے وہ کس حال میں اپنے گھر پہنچی اور اس نے شوہر کو دیر سے آنے کی کیا وجہ بتائی ہوگی۔ وہ خود کو اس معاملے سے دور رکھنا چاہتا تھا، اگر اس کے شوہر کو ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی تو وہ اس کے دفتر کی اینٹ سے اینٹ بجادیتا لیکن اگلے سال اٹھائیس جولائی کو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے حالات کا رخ ہی تبدیل کردیا۔

ہر روز کھانے کے وقفے کے دوران انوڈو اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس پانچ منزل نیچے واقع مثلث نما لان پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ دوسرے دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو گھورا کرتا جو گھاس پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھی ہوتی تھیں۔ مارچ کے بعد وہاں آنے والی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا تھا اور مئی کے آخر تک وہاں بیٹھنے کے لیے جگہ ملنا مشکل ہوجاتی۔ پھر

جب جولائی میں بارشوں کا موسم گزر جاتا تو درجۂ حرارت بڑھ جانے کی وجہ سے لڑکیوں کی تعداد کم ہونا شروع ہو جاتی۔

جولائی کے دوسرے ہفتے میں موسم ناقابلِ برداشت حد تک گرم ہو جاتا اور کام ختم ہونے کے بعد سب لوگ یہی چاہتے تھے کہ کسی ٹھنڈی جگہ بیٹھ کر مشروب سے دل بہلائیں۔ سوائے انوڈو کے جس کی سوچ اکوکو پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ گزشتہ آٹھ مہینے سے اس نے اسے نہیں دیکھا تھا اور اسے بُری طرح مس کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کئی مرتبہ اسے فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر اس پر عمل نہ کر سکا۔

چوبیس جولائی کو اسے دفتر کے پتے پر ایک خط ملا۔ اس نے لفافے کی پشت پر نظر ڈالی۔ وہ اکوکو کی طرف سے تھا۔

اس نے لفافہ کھول کر خط باہر نکالا جو صرف ایک صفحے پر مشتمل تھا لیکن خط پڑھنے سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ پہلی بار اس کی تحریر دیکھ رہا تھا اور اسے وہ کچھ عجیب سی لگی جیسے کسی اناڑی نے وہ خط لکھا ہو۔ اس میں لکھا تھا۔

مسٹر انوڈو! میں یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس مقصد کے تحت میں اٹھائیس جولائی کی شب تمہارے دفتر آؤں گی۔ براہِ کرم میرا انتظار کرنا۔ کیونکہ میں صرف رات کو ہی آسکتی ہوں۔ اس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔ اکوکو میکی۔

انوڈو یہ خط پڑھ کر دم بخود رہ گیا کیا وجہ تھی کہ اس نے دفتر آنے کا فیصلہ کیا اور وہ بھی رات میں۔ آخر ایسی کیا مجبوری تھی کہ وہ صرف رات کو ہی آسکتی ہے اور اس کی تحریر اتنی ناپختہ کیوں ہے؟ یوں لگتا ہے کہ جیسے اس نے بائیں ہاتھ سے وہ خط لکھا ہے۔ یا کنڈرگارٹن کے کسی بچے سے وہ خط لکھوایا گیا ہو۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس کے پاس اس کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ کیا کر سکتا تھا۔

اٹھائیس جولائی کو بھی موسم ناقابلِ برداشت حد تک گرم اور مرطوب تھا اور رات میں بھی اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ انوڈو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا ملازمین کو ایک ایک کرتے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ دفتر کا آخری فرد بھی چلا گیا اور اب وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے برانڈی کا ایک گلاس بنایا اور صوفے پر بیٹھ کر اکوکو کا انتظار کرنے لگا۔

ساڑھے آٹھ بج گئے لیکن وہ نہیں آئی۔ عمارت کا سامنے والا دروازہ پہلے ہی بند ہو چکا تھا اور انوڈو جانتا تھا کہ عقبی دروازہ بھی نو بجے بند کر دیا جائے گا۔ اس لیے اگر اکوکو اس سے پہلے نہ آئی تو اسے عمارت میں اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔

پھر اس نے عمارت کا مرکزی ائرکنڈیشننگ سسٹم بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کا درجۂ حرارت بڑھنے لگا چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کھڑکی کھول دی۔ ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا گو کہ ہوا میں نمی تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا کیونکہ وہ عمارت کی پانچویں منزل پر تھا۔ اس لیے وہاں مچھروں کے آنے کا بھی خطرہ نہیں تھا۔

اچانک ہی اس نے ایک عجیب سی آواز سنی جو کہیں دور سے آرہی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کہیں کوئی مشین چل رہی ہے لیکن جب اس نے غور سے سنا تو یہ جھینگروں کے بولنے کی آواز تھی پھر اس نے مرکزی ہال میں کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ لگ رہا تھا کوئی عورت اونچی ہیل کے جوتے پہنے چل رہی ہو اور یہ یقیناً گارڈ کے قدموں کی آواز نہیں تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا اور اسے ذرا سا کھول کر ہال میں جھانکنے لگا لیکن وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور سوچنے لگا کہ قدموں کی آواز کس کی ہو سکتی ہے۔ وہ صوفے کی طرف واپس جانے والا تھا کہ اس نے عقب سے کسی عورت کی آواز سنی جو اس کا نام لے کر پکار رہی تھی۔

وہ حیران ہو کر پلٹا تو اسے تاریکی میں ایک دبلی پتلی عورت کا سایہ نظر آیا۔ وہ عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کی جانب آرہی تھی اور اس کی ایڑیوں کی ٹھک ٹھک پورے ہال میں گونج رہی تھی۔ جب وہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آئی تو انوڈو بمشکل تمام اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روک سکا۔ یہ وہ عورت نہیں تھی جس کا اسے انتظار تھا۔ یہ وہ اکوکو نہیں تھی جس کے آنے کی وہ توقع کر رہا تھا بلکہ یہ وہ لڑکی تھی جسے اس نے بیس سال پہلے دیکھا تھا جسے اس نے بھلانے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اب اس لڑکی اکوکو اپنے سامنے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا پھر وہ اپنے حواسوں میں واپس آیا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔

اس نے جھجکتے ہوئے ایک بار پھر دروازے کی طرف

دیکھا۔ وہ ابھی تک وہاں موجود تھی۔ انوڈو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اب بھی ویسی ہی تھی جیسا کہ اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے وہی سفید کاٹن کا بلاؤز اور سفید پینٹ پہن رکھی تھی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ انوڈو کی آنکھیں اس کی عریاں ٹانگوں سے پھسلتی ہوئی اونچی ایڑی کے سیاہ جوتوں پر ٹک گئیں۔ یہ وہی جوتے تھے جو اس نے بیس سال پہلے کاروئی زاوا میں پہن رکھے تھے جہاں وہ دونوں پہلی بار ملے تھے۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب اس کا تصور ہے لیکن بہت زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکا کہ یہ سب واقعی میں ہو رہا ہے۔ وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھی، یہ وہی لڑکی تھی جسے کئی برس پہلے اس نے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ لیکن وقت بدل چکا تھا اور انوڈو نے بھی عمر کی کئی مسافتیں طے کر لی تھیں۔ اسے اس منظر پر یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ آٹھ ماہ پہلے وہ درمیانی عمر کی اکوکو سے مل چکا تھا پھر وہ دوبارہ جوان کیسے ہو گئی۔ یہ سوچ کر وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح خوب صورت تھی اور اس کی بے داغ جلد پر میک اپ کا نام و نشان بھی نہ تھا اور اس کی بھویں بھی غیر تراشیدہ تھیں۔

"تم کون ہو؟" انوڈو نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اکوکو ٹیکی۔" لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم کیا چاہتی ہو اور یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"مسٹر انوڈو! تم نے کئی برس پہلے میرے ساتھ کاروئی زاوا میں بہت بری حرکت کی تھی۔"

انوڈو کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ کا احساس ہونے لگا۔ اس لڑکی کے بولنے کا انداز بہت پُراسرار تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے اور لفظوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط کر رہی ہے۔

"تمہیں اس کا ازالہ کرنا ہوگا۔" وہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی۔

"مجھے افسوس ہے۔" انوڈو پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "میں غلطی پر تھا۔ اس کے لیے تم سے معافی چاہتا ہوں، واقعی مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔"

لڑکی نے آہستہ سے سر ہلایا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس دوران لڑکی نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹائیں پھر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور آہستہ آہستہ اس کی جانب قدم بڑھانے لگی۔ انوڈو تھر تھر کانپنے لگا جیسے اس نے ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگا دیا ہو۔

"تم ..... تم یہ کیا کر رہی ہو؟ یہاں کیوں آئی ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"تم نے قتل کیا۔ تم نے مجھے قتل کیا ہے۔"

"کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے تمہیں قتل نہیں کیا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے ہی مجھے قتل کیا تھا۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

لڑکی کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ اپنی چمکدار آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "کیا واقعی تم نے اکوکو ٹیکی کو قتل نہیں کیا؟"

"نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"لیکن وہ گزشتہ برس یہاں آئی تھی۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

انوڈو تھوڑا سا ہچکچایا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ یہاں آئی تھی لیکن واپس گھر چلی گئی تھی۔"

"وہ گھر نہیں گئی۔" لڑکی نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اکوکو گھر نہیں پہنچی۔"

انوڈو شش و پنج کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اکوکو گھر نہیں پہنچی تو کہاں چلی گئی۔ تبھی لڑکی نے اپنے بلاؤز کی جیب سے ایک زردی مائل کاغذ نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے وہ کاغذ لے لیا اور دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اخبار کا تراشہ تھا جس میں اکوکو کی گمشدگی کی خبر شائع ہوئی تھی اور اس کی سرخی تھی "سفارت کار کی بیوی کی پُراسرار گمشدگی" اس نے جلدی جلدی وہ خبر پڑھی جس میں لکھا تھا کہ اکوکو چوبیس جولائی کو کسی کام سے باہر گئی تھی لیکن گھر واپس نہیں پہنچی۔ یہ وہی دن تھا جب اس نے اکوکو کو اپنے دفتر میں بند کیا تھا۔

"تم کون ہو اور یہ اخبار کا تراشہ لیے کیوں پھر رہی ہو۔ تم نے مجھے کس طرح تلاش کیا اور تمہیں میرے دفتر کا پتا کس نے بتایا؟"

لڑکی چند لمحے خاموش رہی پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "ممانے۔"

"مما" انوڈو چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اکوکو کی بیٹی ہو؟"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اکوکو نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ اس کی کوئی بیٹی بھی ہے بلکہ اس کا تو یہ کہنا تھا کہ اس کا کوئی بچہ نہیں جو گھر پر انتظار کر رہا ہو اور اگر یہ اس کی بیٹی ہے تب بھی ماں نے اسے اپنا نام کیوں دیا؟

''تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔'' وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا گو کہ وہ خود ابھی تک بدحواس تھا لیکن آہستہ آہستہ صورت حال اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ اس نے غور سے لڑکی کی طرف دیکھا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ کوئی بھوت نہیں بلکہ جیتی جاگتی لڑکی ہے۔ حالانکہ پہلے وہ اسے بھوت ہی سمجھا تھا۔

وہ اٹھ کر کیبنٹ تک گیا اور اس میں سے برانڈی کی بوتل نکال کر اپنے لیے گلاس تیار کیا پھر لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا تم کچھ پینا پسند کرو گی؟''

فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر غلطی کی ہے کیونکہ وہ لڑکی دیکھنے میں نابالغ لگ رہی تھی۔

''ہاں۔'' اس کی توقع کے برعکس لڑکی نے جواب دیا۔

اس نے ایک گلاس میں تھوڑی سی وہسکی ڈالی اور اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ انوڈو کو ایسی عورتیں پسند تھیں جو اس کے ساتھ بیٹھ کر ڈرنک کرتی تھیں اور ان کی باتوں سے وہ لطف اندوز ہوا کرتا تھا لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا بلکہ لڑکی نے نشہ چڑھتے ہی مہمل گفتگو شروع کر دی۔ انوڈو نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ اس نے لفافے کی پشت پر اکوکو کا پتا ہی لکھا تھا۔ اسے انوڈو کے دفتر کا پتا معلوم کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس کے اور اکوکو کے تعلق کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ اب تک کہاں تھی۔ ممکن ہے کہ وہ یونیورسٹی کی طالبہ ہو۔ اسے لڑکی کے والدین پر بھی تعجب ہو رہا تھا جنھوں نے اتنی رات کو اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دے دی۔ اس لڑکی کی آنکھیں مسلسل کمرے میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ کیا پولیس نے تو اسے نہیں بھیجا کہ اکوکو کی گم شدگی سے متعلق کوئی سراغ مل سکے ورنہ اسے انوڈو اور اس کے دفتر کے بارے میں کس طرح معلوم ہو سکتا تھا۔

''تم یہاں کس لیے آئی ہو؟'' اس نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

''اکوکو کی میت کو واپس لے جانے کے لیے۔''

''لیکن میں تمھیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ یہاں سے گھر ہی گئی تھی۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ گھر نہیں پہنچی۔'' لڑکی کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں اور وہ سسکیاں لینے لگی۔

انوڈو اس رات کے بارے میں سوچنے لگا جب اس نے آخری بار اکوکو کو دیکھا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد اس پر کیا گزری۔ کیا اسے راستے میں کسی نے اغوا کر کے مار ڈالا یا اس نے خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا یا پولیس یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اکوکو کو قتل کیا ہے۔ کیا پولیس اس کے اور اکوکو کے تعلق کے بارے میں جانتی ہے۔ ان سارے سوالوں کے جوابات جاننا ضروری تھے۔ اس لیے وہ لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تمھیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''نوٹ بک۔'' لڑکی نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' انوڈو نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نوٹ بک۔ میرا مطلب ہے ڈائری۔'' لڑکی نے کہا پھر اس نے اپنا بیگ گھٹنوں پر رکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ جیسے ہی اس نے وہ ڈائری نکالی۔ انوڈو نے لپک کر اسے چھین لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یہ اکوکو کی ڈائری تھی۔ اس میں جگہ جگہ تاریخ وار چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے ہوئے تھے لیکن کہیں کہیں کئی صفحات پر مشتمل طویل تحریریں بھی تھیں۔ آخری اندراج 23 نومبر کو کیا گیا تھا جو کچھ خریداری کی فہرست تھی۔

''یہ کس نے لکھا ہے؟'' انوڈو نے جگہ جگہ اپنا نام اور کہیں کہیں صرف نام کا پہلا حرف 'آئی' دیکھ کر کہا۔

لڑکی نے حیران ہو کر اسے دیکھا جیسے اس نے کوئی ناممکن سوال پوچھ لیا ہو۔

''کیا یہ تم نے لکھا ہے؟'' انوڈو نے دوبارہ پوچھا تو لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں۔'' لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اکوکو کی تحریر ہے۔''

''تم نے یہ ڈائری کسی اور کو تو نہیں دکھائی؟'' انوڈو نے پوچھا۔

''نہیں، اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ یہ میرے پاس ہوتی ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''لیکن

پولیس والے اسے دیکھنا چاہ رہے ہیں۔''

''کیا؟'' وہ چونکتے ہوئے بولا۔ لڑکی کی بات سن کر وہ پریشان ہو گیا۔ اگر پولیس نے یہ ڈائری دیکھ لی تو وہ یقینی طور پر یہی سوچیں گے کہ اس نے ہی اکوکو کو قتل کیا ہے اور اگر انہوں نے یہ نہ سوچا تب بھی اس ڈائری میں ایسا مواد موجود ہے جس سے اس کے جبر اور دھمکی آمیز رویے کا اظہار ہوتا تھا۔

''پولیس والے کل یا پرسوں اکوکو کے گھر آنے والے ہیں۔'' لڑکی نے یہ کہہ کر اسے مزید ڈرا دیا۔

انوڈو کی بھویں سکڑ گئیں۔ اس نے اپنی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ اس صورت حال سے گھبرا گیا تھا اور جانتا تھا کہ اس کے پاس مزید وقت نہیں ہے۔ اب وہ کسی قیمت پر بھی اس لڑکی کو ڈائری سمیت گھر واپس جانے نہیں دے گا جس میں اس کی بلیک میلنگ کی تفصیلات سے لے کر اس کے دفتر آنے کے لیے عمارت کا عقبی دروازہ استعمال کرنے سے متعلق ہدایات درج تھیں لیکن اس ڈائری سے چھٹکارا حاصل کرنا کافی نہ ہوگا۔ وہ لڑکی بھی اس کے مندرجات سے آگاہ ہو چکی ہے۔ اس لیے اس سے بھی نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔

''کیا تم ہمیشہ اسی طرح رات کو باہر نکلتی ہو؟'' اس نے لڑکی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ برانڈی کے نشے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''کیا تم پہلی بار رات کے وقت گھر سے باہر نکلی ہو؟''

''ہاں۔'' لڑکی نے کہا۔

''تم نے گھر میں کسی کو نہیں بتایا کہ کہاں جا رہی ہو؟''

''نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''تم کوئی خط بھی چھوڑ کر نہیں آئیں؟''

''نہیں، ہاؤس کیپر اپنا کام ختم کر کے جا چکی تھی۔ اس لیے میں کسی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے چلی آئی۔''

انوڈو سوچنے لگا کہ اگر کل صبح اس لڑکی کی لاش پانچ منزل نیچے کنکریٹ کے فرش پر پائی گئی تو کیا ہوگا۔ کوئی بھی اکوکو کے ساتھ اس کے تعلق کو نہیں جانتا اور ڈائری غائب کر دی جائے تو اس لڑکی کے ساتھ اس کا تعلق بھی ظاہر نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی موت کے وقت دفتر میں انوڈو کی موجودگی ظاہر نہ ہو۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' لڑکی نے نشے کے اثر سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم تھک گئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں سو جانا چاہیے۔'' انوڈو نے کہا۔

اس نے دفتر کی بتیاں بجھا دیں اور خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ گارڈ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ انوڈو گھوم کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف آ گیا اور گراؤنڈ فلور میں واقع باتھ روم کے روشندان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس میں سے ایک آدمی بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ اس نے خالی کریٹ جمع کر کے اوپر تلے رکھے تاکہ ان پر چڑھ کر وہ روشندان تک پہنچ سکے اور واپسی میں بھی ان کے ذریعے اتر کر باہر آ سکے۔

وہ روشندان کے ذریعے اندر داخل ہوا پھر اس نے اپنے پیر لٹکا کر ٹوائلٹ کی سیٹ پر رکھے اور باتھ روم کے فرش پر اتر گیا پھر وہ دروازہ کھول کر ہال میں آیا اور لفٹ کے بجائے سیڑھیاں چڑھ کر پانچویں منزل پر پہنچ گیا۔ اس کی توقع کے مطابق عمارت میں بوڑھے گارڈ کے سوا کوئی نہ تھا اور وہ بھی گراؤنڈ فلور پر کرسی ڈالے سو رہا تھا۔ بالآخر وہ اپنے دفتر پہنچ گیا۔ البتہ اس نے یہ احتیاط ضرور کی کہ عقبی راہداری میں کھلنے والے دروازے کے بجائے وہ اس دروازے سے اندر داخل ہوا جو مرکزی ہال میں کھلتا تھا اور جہاں کمپنی کے دوسرے ملازمین بیٹھا کرتے تھے۔ وہ خالی میزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر آہستہ سے تالے میں گھمائی تاکہ لڑکی نہ جاگ پائے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہونے کے بعد اسے بند کر دیا پھر وہ صوفے کی طرف بڑھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔

پھر کمرے کی خاموشی میں ایک چیخ ابھری۔ انوڈو نے پلٹ کر دیکھا کہ وہ لڑکی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اوہ .... تو تم یہاں ہو۔''

وہ اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ اس نے کن انکھیوں سے میز کی طرف دیکھا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکی کا بیگ اور ڈائری وہاں موجود تھی۔ کھلے ہوئے دروازے سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی اپنے حواسوں میں آ گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔ اس نے لڑکی کو کندھوں سے پکڑا اور اسے کھڑکی کی طرف دھکیلنے لگا لیکن لڑکی سخت مزاحمت کر رہی تھی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ اس کی پنڈلی پر اپنے

جوتے سے ضرب لگاتے ہوئے بولی۔ وہ اپنے ناخنوں سے اس کے گال نوچ رہی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس کا چشمہ قالین پر گر گیا۔ انوڈو نے اسے فرش پر گرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے جھنجلا کر اس کے بلاؤز کا کالر پکڑ کر کھینچا اور وہ لڑکی بلاؤز کی قید سے آزاد ہو گئی لیکن جب اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس کا پاؤں بجلی کے تار میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ لڑکی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور کمرے کے وسط میں چلی گئی لیکن انوڈو اتنی دیر میں سنبھل چکا تھا۔ اس نے دوبارہ لڑکی کے بازو پکڑ لیے۔

”کیا تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

”ہاں، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ تبھی اس لڑکی نے ایک ایسی بات کہی کہ وہ ہل کر رہ گیا۔

”لیکن یہ ناممکن ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم مجھے نہیں مار سکتے۔“

انوڈو لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے پھر اس نے لڑکی کے کندھوں کو پکڑا اور اسے کھڑکی کی جانب دھکیلنے لگا۔ وہ سخت مزاحمت کر رہی تھی لیکن وہ اسے مسلسل دھکیلتا رہا۔ اس کشمکش میں اس کے جوتے کی ایڑی دبیز قالین میں پھنس گئی اور وہ لڑکھڑانے لگی۔ انوڈو نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے جسم کے اوپری حصے کو مضبوطی سے پکڑا اور اسے کھلی کھڑکی کی جانب دھکیل دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لڑکی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ فضا میں اس کی چیخ بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کسی کار کے پہیوں کے چرچرانے کی آواز بھی سنائی دی جیسے کسی نے اچانک بریک لگایا ہو۔

انوڈو نے کار کی آواز سن کر سر اٹھایا۔ کیا وہ زمین پر گری تھی یا وہاں سے گزرتی ہوئی کسی کار سے ٹکرائی تھی۔ عموماً اتنی رات گئے اس سڑک پر کاروں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ وہ کافی دیر تک قالین پر خاموش پڑا رہا۔ پھر اس نے کار کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ لیکن اس کا انجن چل رہا تھا پھر اس نے کار کے جانے کی آواز سنی اس نے تجسس سے مجبور ہو کر کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں بالکل خاموشی تھی اور وہ نہیں جان سکا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ آیا کار کا ڈرائیور لڑکی کو ٹکر مار کر بھاگ گیا تھا یا پولیس کو اطلاع دینے گیا تھا۔ ایسی صورت میں انوڈو کو فوراً وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ اس کا دفتر سے دور رہنا ہی بہتر تھا۔

اس نے قالین پر اپنا چشمہ ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے نہیں ملا۔ اس نے مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھلی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر آہستہ سے اسے بند کیا تاکہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ پھر اس نے چٹخنی لگائی اور دوبارہ چشمہ تلاش کرنے لگا لیکن اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف گیا اور محتاط انداز میں باہر جھانکنے لگا۔ اس زاویے سے وہ سڑک نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے مثلث نما باغ ضرور نظر آ رہا تھا جس کے وسط میں ایک درخت کار کی ٹکر سے گر گیا تھا اور اس کے برابر میں ہی لڑکی کی لاش پڑی ہوئی تھی لیکن اس کا اوپری حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ انوڈو نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔ وہ اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ گرتے وقت پہلے لڑکی کے پاؤں زمین سے ٹکرائے ہوں گے۔ جہاں حال ہی میں ایک پودا لگایا گیا تھا۔ لہٰذا اس کا نچلا دھڑ نرم زمین میں دھنس گیا ہو گا۔

لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس لیے وہ صرف اس کے بال دیکھ سکا۔ یہ ایک بہت ہی عجیب اور دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ بظاہر یوں لگتا جیسے وہ زمین پر بیٹھی عبادت کر رہی تھی۔ چشمہ نہ ہونے کے باوجود اس نے لاش کا بغور معائنہ کیا۔ وہ حرکت نہیں کر رہی تھی لیکن یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ محض زخمی یا بے ہوش ہوئی ہو۔ وہ نیچے جا کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔

وہ کار والے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے ضرور لڑکی کا آدھا دھڑ زمین میں دھنسا ہوا دیکھا ہو گا پھر وہ اسے اسپتال لے کر کیوں نہیں گیا۔ شاید وہ اپنے آپ کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتا تھا اسی لیے چلا گیا اس نے قالین پر سے لڑکی کا پھٹا ہوا بلاؤز اور اس کے ٹوٹے ہوئے بٹن اٹھائے اور انہیں لڑکی کے بیگ میں رکھ دیا۔ خوش قسمتی سے اس دوران اس کا چشمہ بھی مل گیا جسے اس نے رومال سے صاف کر کے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

انوڈو نے لڑکی کی ڈائری اٹھا کر اسی سیف میں رکھی جس میں چند ماہ قبل اس نے اکوکو کا لباس اور کوٹ مقفل کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے لڑکی کا بیگ بھی وہاں رکھ کر سیف کو تالا لگا دیا۔ اس نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور مطمئن ہو گیا کہ اس نے لڑکی کی آمد کے تمام ثبوت وہاں سے ہٹا

دیے تھے پھر وہ اس حصے میں گیا جہاں اس کا عملہ بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے دفتر کا دروازہ مقفل کیا۔ اب اسے جلد از جلد ... گھر پہنچنا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کے ذریعے نچلی منزل پر پہنچا۔ گارڈ حسب معمول کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے باتھ روم میں داخل ہو گیا اور جس طرح وہ اندر آیا تھا، اسی طرح وہ ٹوائلٹ سیٹ پر چڑھا اور روشندان کے ذریعے باہر نکل گیا۔ کریٹ ابھی تک اسی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے روشن دان کا فریم پکڑ کر جسم کو لٹکایا اور اس کے پیر کریٹ کو چھونے لگے۔ اس نے روشن دان بند کیا اور دائیں بائیں دیکھ کر اطمینان کرنے لگا کہ وہاں آس پاس کوئی شخص موجود تو نہیں ہے پھر اس نے وہ کریٹ اسی جگہ رکھ دیے جہاں سے اٹھائے تھے اور پھر اپنی راہ پر چل دیا۔

گلی سے باہر نکل کر اس نے بڑی سڑک پر قدم رکھا۔ اچانک ہی اس کی نظر مثلث نما باغ پر گئی جس کے وسط میں ایک فوارہ تھا اور اس کے قریب ہی لڑکی کی لاش سینے تک زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ چاند کی مدھم روشنی میں وہ خود بھی ایک مجسمہ کے مانند لگ رہی تھی۔ بظاہر وہ مردہ نظر آ رہی تھی لیکن انوڈو اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر لاش کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی سینے کی دیوار توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اسی طرح اس کی نبض بھی خطرناک حد تک تیز چل رہی تھی۔

اس نے لاش کو غور سے دیکھا تو اسے ایک غیر معمولی بات یہ نظر آئی کہ اس کا دایاں بازو بہت پتلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پانچویں منزل سے نیچے گرتے ہوئے لڑکی کا وزن اتنا کم کیسے ہو گیا۔ وہ گھوم کر لاش کے سامنے آیا اور لڑکی کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے چلانا چاہا لیکن آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ بری طرح دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا لیکن اس دوران اس کی آنکھیں لڑکی کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ وہاں سے جانا چاہ رہا تھا لیکن کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ اسے لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو لہٰذا وہ ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جو مکمل طور پر سوکھ چکا تھا۔ اب وہاں صرف کھلے ہوئے دہانے سے اس کے دانت صاف نظر آ رہے تھے جبکہ آنکھوں کی جگہ دو خالی سیاہ سوراخ بن گئے تھے۔ اس نے اپنی نظریں لاش پر سے ہٹائیں اور اس درخت کو دیکھنے لگا جو کار کی ٹکر سے گر گیا تھا۔ اس کے برابر میں ہی اونچی ایڑی کے جوتے پڑے ہوئے تھے۔

انوڈو رینگتا ہوا وہاں تک گیا اور دونوں جوتے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے گھاس پر ہی لوٹنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی اور اس مرتبہ کامیاب ہو گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا فوارے تک پہنچا اور پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے بال بالکل سفید ہو گئے ہوں۔ شاید چاند کی روشنی میں ایسا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور روتے ہوئے بولا۔ ''میں غلطی پر تھا۔ اکوکو مجھے معاف کر دو۔ میں غلطی پر تھا۔''

وہ بار بار یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ اس کی حالت ایک ایسے شخص کے مانند تھی جو اپنا سب کچھ ہار چکا ہو۔ یہاں تک کہ ہوش و حواس بھی۔ وہ باغ سے باہر آیا اور یونہی بے مقصد شہر کی سڑکوں پر صبح ہونے تک گشت کرتا رہا پھر وہ اپنے معمول سے ہٹ کر علی الصباح دفتر پہنچ گیا۔ جب دوسرے ملازمین کام پر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ کرسی پر بیٹھا پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا اور سامنے میز پر اونچی ایڑی کے زنانہ جوتے رکھے ہوئے تھے۔ اب وہ شخص پولیس کی زیر حراست پاگل خانے میں ہے اور اس کی صحت یابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔''

یہ داستان سنانے کے بعد یوشی کی نے بیئر کا گھونٹ لیا اور میں کافی دیر تک گنگ بنا بیٹھا رہا۔ کئی لمحے گزر جانے کے بعد اس قابل ہو سکا کہ کوئی سوال کر سکوں۔ یوشی کی نے جو قصہ بیان کیا، اس پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔ لہٰذا میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کیا یہ سچا واقعہ ہے؟''

''ہاں، میں نے ہی اس کیس کی تحقیقات کی تھیں۔'' یوشی کی نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ جو لڑکی اکوکو کی بیٹی بن کر اس سے ملنے آئی تھی، وہ دراصل مردہ اکوکو تھی؟'' میں نے شک کرنے کے انداز میں کہا۔ ''اور جب اسے کھڑکی سے پھینکا گیا تو وہ دوبارہ لاش میں تبدیل ہو گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے، عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔''

''انوڈو بھی یہی سمجھ رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ پاگل ہو گیا۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ جس لڑکی کو انوڈو نے کھڑکی سے دھکا دیا وہ دراصل اکوکو کی ہم

شکل اور اس کی حقیقی بیٹی تھی جو فرانس میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔ اس زمانے میں اکوکو کا شوہر بھی وہیں تعینات تھا اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسے جاپانی زبان پر کیوں عبور نہیں تھا اور وہ ٹھیک طرح سے جاپانی الفاظ نہیں لکھ سکتی تھی۔“

”اوہ، اب میں سمجھا۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دورانِ تعلیم بورڈنگ میں مقیم رہی جہاں نظم وضبط کی بہت پابندی ہوتی ہے۔ اس نے زندگی میں کبھی شراب نہیں پی تھی۔ اسی لیے جب انوڈو نے پہلی بار اسے برانڈی دی تو وہ غٹاغٹ اسے پی گئی اور اس کے بعد وہ اپنے حواس میں نہ رہی اور الٹا سیدھا بولنے لگی۔“

”کیونکہ وہ بچپن سے جوانی تک فرانس میں رہی۔ اس لیے انوڈو یہ سمجھتا رہا کہ اکوکو کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اکوکو نے یہ بات انوڈو سے چھپائی ہوگی کیونکہ اگر اسے معلوم ہوجاتا تو وہ نہ جانے اس لڑکی کے ساتھ کیسا سلوک کرتا۔ ہمیں بھی بعد میں اس بات کا پتا چلا کہ وہ انوڈو کی بیٹی تھی۔“

”نہیں، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

”یہ سچ ہے۔ وہ مئی 1961ء میں پیدا ہوئی تھی اور اگر تمہیں یاد ہو تو انوڈو نے اگست 1960ء میں اکوکو کی عصمت دری کی تھی۔ اس کے ٹھیک نو ماہ بعد اکوکو نے اس لڑکی کو جنم دیا۔“

”مان لیا کہ اکوکو نے یہ بات انوڈو سے چھپائی لیکن اس نے اپنے شوہر کو کیا بتایا ہوگا؟“

”یقیناً وہ شادی سے پہلے بھی اپنے شوہر سے ملتی ہی ہوگی۔ اس لیے وہ یہی سمجھا کہ یہ اس کی بیٹی ہے۔“

”یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اکوکو کی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ اس کی ہم شکل تھی لیکن اس نے انوڈو سے ملنے کے لیے اسی لباس یعنی سفید بلاؤز، شارٹ پینٹ اور اونچی ہیل کا انتخاب کیوں کیا جو اس کی ماں نے اس وقت پہن رکھا تھا جب کاروکی زاوا، میں اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ اس بارے میں کیا کہو گے؟“

”وہ ایک ڈراما تھا۔ اس طرح وہ انوڈو کو دہشت زدہ کرنا چاہ رہی تھی تاکہ وہ اس کی ماں کا پتا بتادے۔ جب اکوکو لاپتا ہوگئی تو اس وقت وہ لڑکی پیرس میں تھی۔ لیکن وہ امتحانات کی وجہ سے فوری طور پر یہاں نہ آسکی۔ جب وہ موسم گرما کی تعطیلات میں آئی تو اسے اپنی ماں کی الماری سے ایک ڈائری ملی۔ جس سے اسے اپنی ماں کے خفیہ رازوں کا پتا چلا اور اسے یقین ہوگیا کہ اکوکو کی گمشدگی میں انوڈو کا ضرور کوئی ہاتھ ہے اور درحقیقت اس میں کچھ سچائی بھی تھی۔“

”اوہ، اب میں سمجھا۔“ میں نے کہا۔ واقعات کی تہیں کھلنے کے ساتھ یہ کہانی مزید دلچسپ ہوتی جارہی تھی۔

”اس لڑکی کا خیال تھا کہ انوڈو نے اس کی ماں کو قید کر رکھا ہے یا مار ڈالا ہے۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ اگر وہ وہی لباس پہن کر انوڈو کے سامنے جائے جو اس کی ماں نے کئی سال پہلے پہنا تھا تو شاید انوڈو خوف زدہ ہوکر اعترافِ جرم کرلے۔“

”کیا اس نے یہ نہیں سوچا کہ رات کے وقت انوڈو کے پاس جانا خطرناک ہوسکتا ہے۔“

”بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے پولیس کو فون کیوں نہیں کیا جو کہ زیادہ مناسب طریقہ تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ اس نے بھی یہ بات سوچی ہوگی لیکن اس کی ماں کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ پولیس کے پاس جانے سے پہلے اپنے طور پر کوشش کرے۔“

”اس نے انوڈو سے ملنے کے لیے رات کا وقت کیوں منتخب کیا؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ وہ اس وقت تک گھر سے باہر نہیں جاسکتی تھی جب تک اس کی خادمہ کی یو واپس نہ چلی جاتی۔“

”اور وہ کسی بھوت کے مانند کیوں چل رہی تھی؟“

”تم یہ بات بھول رہے ہو کہ وہ کئی سالوں تک بورڈنگ میں رہی اور غالباً اس نے پہلے کبھی اونچی ایڑی کے جوتے نہیں پہنے تھے پھر اسے ایک دبیز قالین پر چلنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے اس کی چال بدل گئی تھی۔“

”میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اس حادثے کے بارے میں کیا کہو گے؟ اسے کھڑکی سے نیچے پھینکا گیا لیکن لان میں اس کی گلی سڑی لاش ملی جو کئی ماہ پرانی تھی۔“

”یہی اس کہانی کا دلچسپ موڑ ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”جانتے ہو وہ لاش اس کی ماں اکوکو کی تھی جو آٹھ ماہ پہلے مرچکی تھی لہٰذا اس کی گلی سڑی لاش کا ملنا سمجھ میں آتا ہے۔“

"تم نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ آٹھ مہینے بعد اکوکو کی لاش وہاں کیسے آگئی؟"

"اکوکو اس روز گھر نہیں پہنچی کیونکہ انوڈو اسے اپنے دفتر میں بند کر کے چلا گیا تھا۔ اس نے دفتر میں کام کرنے والی عورت سے کہا کہ وہ اسے اپنا کوئی لباس دے دے لیکن جب وہ عورت کپڑے لے کر آئی تو اکوکو کمرے میں نہیں تھی۔ شاید وہ اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکی چنانچہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دے۔"

"کسی نے اسے گرتے ہوئے نہیں دیکھا؟"

"پہلی بات یہ کہ رات ہو چکی تھی اور اس وقت لان تقریباً خالی ہوتا ہے۔ وہ لان کے وسط میں واقع درختوں کے جھنڈ پر آکر گری لہٰذا اندھیرے اور قریب سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کے شور میں کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔"

"گویا اس کی لاش وہیں پڑی سڑتی رہی؟"

"ہاں، آٹھ مہینے تک وہ لاش اسی حالت میں درختوں پر پڑی رہی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا کیونکہ وہاں آنے والے لوگ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نہیں گھومتے بلکہ پارک میں پڑی ہوئی بینچوں پر کچھ دیر بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ چند گز کے فاصلے پر درختوں کے اوپر ایک لاش موجود ہے۔"

"پھر وہ لاش اس رات کس طرح دریافت ہوئی؟"

"جب اکوکو کی بیٹی کھڑکی سے نیچے گری تو اس وقت وہاں سے ایک کار گزر رہی تھی۔ لڑکی کی چیخ سن کر ڈرائیور حواس باختہ ہو گیا اور اس نے کار فٹ پاتھ پر چڑھا دی جو لان کے وسط میں لگے ہوئے درختوں سے جا ٹکرائی اور اس کی دھمک سے لاش نیچے گر گئی۔ جہاں وہ لاش گری وہ جگہ بہت نرم تھی۔ اس لیے لاش کا نچلا حصہ زمین میں دھنس گیا۔ گو کہ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے لیکن ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔"

"یہ واقعی ایک ناقابلِ یقین کہانی ہے۔" میں نے واقعات کو اپنے ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے کہا البتہ ابھی کچھ باتیں وضاحت طلب تھیں۔ میں نے سراغ رساں سے پوچھا۔ "اکوکو کی بیٹی کا کیا بنا۔ کیا وہ بھی مر گئی؟"

"نہیں، اس کی قسمت اچھی تھی۔ وہ کار کی چھت پر آن گری۔ وہ کنورٹیبل کار تھی جس میں پانچ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے اور اس کی چھت بھی کافی بڑی ہے۔ کار کی چھت پر گرنے سے اس لڑکی کے بازوؤں اور پسلیوں پر چوٹیں آئیں لیکن وہ بچ گئی۔ خوش قسمتی سے ڈرائیور اس حادثے میں محفوظ رہا اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ کار سے باہر آیا اور اس نے لڑکی کو کار کی چھت سے اتارا۔ اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ ایک ہنگامی صورتِ حال تھی لہٰذا اس نے بھی وہاں موجود لاش نہیں دیکھی۔"

یوشی کی، کی اس وضاحت کے بعد مجھے اپنے تمام سوالوں کے جواب مل گئے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی ناقابلِ یقین کہانی نہیں سنی تھی لیکن اس دنیا میں ایسے واقعات بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اب تک میں ٹوکیو کو ایک بے کیف جگہ سمجھتا تھا جہاں زندگی بالکل سپاٹ تھی لیکن یوشی کی، کی کہانی سننے کے بعد میں اس شہر کو نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

میں وہاں کچھ دیر بیٹھا اس کہانی کو اپنے ذہن میں دہرا رہا تھا۔ بارش زوروں پر ہو رہی تھی اور میں کھڑکی سے بارش برسنے کا نظارہ کر رہا تھا۔ پھر میں نے سراغ رساں کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہونے لگا لیکن جیسے ہی میں نے ریستوران سے باہر قدم رکھا، ایک اور سوال میرے ذہن میں ابھرا، اور میں اس کا جواب جاننے کے لیے الٹے قدموں واپس آگیا۔ سراغ رساں ابھی تک وہیں بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔

"معاف کرنا یوشی کی، ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جب انوڈو اس لڑکی کو کھڑکی سے باہر پھینکنے والا تھا تو اس نے یہ کیوں کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ تم مجھے نہیں مار سکتے؟"

"کیونکہ اسے یقین تھا کہ جب وہ انوڈو کو بتائے گی کہ وہ اس کی حقیقی بیٹی ہے تو وہ اسے نہیں مار سکے گا لیکن اس لڑکی کو اتنی مہلت ہی نہ ملی اور انوڈو نے اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔"

میں واپس باہر کی جانب چل پڑا۔ اور جب میں نے سڑک کے آخری سرے پر پہنچ کر ریستوران کی طرف دیکھا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ ایک لڑکی سفید چھتری لیے ریستوران میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے سفید بلاؤز، سفید شارٹ پینٹ اور سیاہ اونچی ایڑی کے جوتے پہن رکھے تھے۔

زیرِ دام

امجد رئیس

مجرم شاطر تھا... اس کا ہر قدم نہایت تُلا اور اپنے ہدف کی طرف گامزن تھا... خوداعتمادی ...بھروسے اور یقین کی سیڑھیاں اسے منزل تک لے گئیں... اب وہ تھا... اور اس کا مطلوبہ شکار...

اعصاب میں سنسنی دوڑا دینے والے لمحات کی تیز رفتار کتھا

وہ ایک قدم دور تھا۔ محض ایک قدم... ایک واردات اور... آخری واردات۔ جس کے بعد وہ ”نمبرون“ کہلائے گا اور اس کا نام ریکارڈ بک میں محفوظ ہو جائے گا۔ سب سے آگے... نمبرون... سب سے عظیم... سب سے بہتر کاریگر۔

لیکن اب یہ اتنا سہل نہیں رہا تھا۔ ہر شکار کے بعد پولیس قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ قریب اور قریب... اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پولیس کا گھیرا تنگ سے تنگ ہو رہا تھا۔ پچھلے دو شکار گرانے میں اسے خاصی دشواریوں کا

سامنا کرنا پڑا تھا تاہم وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اہداف کو نشانہ بنا رہا تھا اور اب وہ ریکارڈ سے ایک قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک نمبر دور۔ تیرہ نمبر... وہ بہت قریب آگیا تھا لیکن تیرھویں ہدف کا حصول انتہائی مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ پولیس ہوشیار تھی، چوکنا تھی... اس کے بہت نزدیک تھی۔ شکار بھی حد درجہ محتاط ہو چکے تھے۔ تاہم اسے تو اپنا کام مکمل کرنا تھا۔ لازوال شہرت اس کی منتظر تھی۔ منزل کے قریب پہنچنے کے بعد اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ تیرھواں شکار اسے گرانا ہی تھا۔ جو بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا۔

اخبارات چیخ رہے تھے۔ میڈیا شور مچا رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ شہر میں خوف و دہشت کا راج تھا۔ پولیس پر بہت زیادہ دباؤ تھا... مگر وہ اپنے ہدف سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

سنہرے دراز گیسو، موت کی علامت بن چکے تھے۔ سنہری زلفوں والی نرسوں نے بال رنگنے شروع کردیے تھے۔ بارہ ہفتوں میں بارہ نرسیں قتل ہو چکی تھیں۔ نرسوں نے ڈیوٹی سے غائب ہونا شروع کر دیا تھا۔ ہر کوئی محتاط تھا اور پولیس نگراں تھی۔

اس نے منظرنامے پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ مطلوبہ ہدف کے حصول میں اسے شدید خطرات کا سامنا تھا۔ اخبارات کی سنسنی خیز سرخیاں اس کے لیے چٹخارے کا کام دے رہی تھیں۔ تیرھویں ہفتے کے دن ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ گزشتہ کئی ہفتوں میں بارہا اس نے سوچا کہ فل اسٹاپ لگا کے خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ تاہم خود کو حوالے کرنے کے لیے وہ کنفیوز تھا۔ درحقیقت اسے توقع تھی کہ وہ پکڑا جائے گا۔ تاہم وہ کئی بار بال بال بچا۔ دوسرے ریکارڈ بنانے کی حرص اس کے لیے مہمیز کا کام دیتی رہی اور وہ بارہ کے ہندسے تک جا پہنچا۔ اخبارات اور ٹی وی کی خبروں اور مسالے دار شوز بھی مستقل اسے اکساتے رہے... ہر دور کا وہ سب سے بڑا قاتل بننے جارہا تھا... نرسوں کا عظیم قاتل... ناقابلِ شکست اور انوکھا، تیرھواں شکار اس کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔

تیرھواں ہفتہ تیزی سے گزر رہا تھا۔ بہرحال اسے اپنے شیڈول کے مطابق اسی ہفتے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

☆☆☆

بالآخر اسے مطلوبہ نرس مل گئی۔ وہ احتیاط سے اپنے شکار پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نرس، پارک سلوپ کی فرسٹ اسٹریٹ پر رہائش پذیر تھی۔ جس میڈیکل سینٹر میں وہ کام کرتی تھی، وہ اس کی رہائش گاہ سے قریب تھا۔ وہ بہ آسانی پیدل میڈیکل سینٹر پہنچ سکتی تھی۔

ہفتے کا آخری دن شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ نرس اس علاقے میں نئی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا۔ اس کی قسمت ایک بار پھر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ نرس تمام مقتول نرسوں سے زیادہ خوب صورت تھی۔ تیز دھار چھری اس کے لباس میں پوشیدہ تھی۔ وہ چھری کو سہلاتے ہوئے ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ نرس کو کہاں ٹھکانے لگانا ہے۔ وہ نرس کی رہائشی بلڈنگ کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔

شام میں سنہرے بالوں والی نرس میڈیکل سینٹر سے نکل کر رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔ وہ تعاقب میں لگ گیا۔ دس منٹ بعد نرس بلڈنگ میں داخل ہو رہی تھی۔

تعاقب کے دوران میں، نیم تاریک سنسان سڑک پر نرس نے صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا تھا مگر وہ بروقت پھرتی سے ایک مجسمے کی آڑ میں سرک چکا تھا۔

عمارت کے اندر اس نے فاصلہ کم کر دیا۔ مذکورہ میڈیکل سینٹر میں نرسوں کی معقول تعداد تھی بلکہ بیشتر میڈیکل سینٹر میں نرس زیادہ تھیں۔ بیشتر انڈین یا کالی نرسیں تھیں۔ اس کا ہدف آئرش تھا۔

اس وقت وہ اپنے آئرش ہدف کو نشانہ بنانے کے لیے تیار تھا۔ عمارت دس منزلہ تھی۔ نرس کا اپارٹمنٹ ساتویں منزل پر تھا۔ وہ تیزی سے فاصلہ کم کر رہا تھا... نرس نے شاید محسوس کر لیا۔ وہ چونک کر پلٹی۔

وہ شائستگی سے مسکرایا۔ نرس اسے نگاہوں میں تول رہی تھی۔ ”تم شاید...“ وہ بولی۔

”ہاں، میں آٹھویں منزل پر ہوں... اینڈرسن، میرا نام اینڈرسن ہے۔“ اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ نرس بھی دلکش انداز میں مسکرائی۔

دونوں ایک ساتھ ایلیویٹر میں داخل ہوئے۔ اسے نرس کی مسکراہٹ پسند آئی تھی۔ نرس نے ساتویں منزل کا بٹن دبایا۔ اس نے نمبر آٹھ کو پش کیا۔ نرس مزید مطمئن ہوگئی۔

وہ قدرے حیران تھا کہ تیرھواں شکار اس کے خدشات کے برعکس بہ آسانی گرفت میں آگیا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ ساتویں منزل پر دروازہ کھلا۔ نرس نکلی اور اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چل پڑی۔ چلتے چلتے وہ چابی نکال چکی تھی۔ لاک میں چابی گھما کر اس نے دروازہ کھولا۔

شکاری کے اعصاب تن گئے۔ ایلیویٹر کا دروازہ بند ہونے سے قبل وہ ہوا کے مانند نکلا اور اڑتا ہوا نرس پر جا پڑا۔

دروازہ پورا کھل گیا تھا۔ دونوں اندر گرے۔ نرس کے حلق سے خوف زدہ مدھم آواز نکلی۔ اس نے اٹھ کر اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کیا اور گری ہوئی نرس کی طرف پلٹا۔ اس کے چہرے پر تاثرات بدل گئے تھے۔ شائستگی کی جگہ وحشت ناچ رہی تھی۔ نرس پر جیسے سکتہ طاری تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ چیخ سکی نہ ہی اٹھنے کی کوشش کی۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔

وہ نرس کے سر پر پہنچ گیا۔ تیور بدلے ہوئے تھے اور ارادے عیاں تھے۔ اس نے جھک کر نرس کی زلفوں کو چھوا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے لمبے پھل والی تیز دھار چھری نکالی۔

دفعتاً وہ جگہ تیز روشنی سے منور ہو گئی۔ ٹھک... ٹھک کی آواز کے ساتھ دو دروازے کھلے۔ ایک اندرونی کمرے کا اور دوسرا اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ، پلک جھپکتے میں ہی وہاں درجن بھر افراد نمودار ہوئے۔ وہ تمام مسلح تھے۔ جیسے کسی نے منتر پھونک دیا ہو۔

وہ ششدر رہ گیا۔ چند ساعت بعد وہ سکتے سے نکلا۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس کے لیے دام بچھایا گیا تھا اور وہ سیدھا آن پھنسا تھا۔ اس نے اطراف میں دیکھا، پھر نرس کی جانب نگاہ کی۔ نرس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

چھری اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ وہ خود چار افراد کی گرفت میں تھا۔ باقی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ پانچویں نے گن اس کے سر پر رکھ دی تھی۔

نرس نے اٹھ کر ایک ہاتھ سے سنہری زلفوں والی وگ اتار دی۔ اس کے بال سیاہ تھے۔

''تو یہ ہے تمہارا خوفناک ہتھیار جس کو تم نے بارہ عدد بے گناہ نرسوں پر آزمایا۔'' جعلی نرس نے چھری کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر اب مسکراہٹ کی جگہ نفرت نظر آ رہی تھی۔

شکاری کے اندر غصے کی لہر اٹھی، تاہم وہ خاموش رہا۔ جس نرس کو وہ آسان شکار سمجھ رہا تھا، وہ پولیس ٹریپ تھا۔ وہ پولیس کے نرغے میں تھا، ان میں کوئی بھی وردی میں نہیں تھا۔ شک و شبہ... آس و امید کی گنجائش نہیں تھی... خونریز ریکارڈ بناتے بناتے بالآخر وہ پولیس کے سادہ پوش اسکواڈ کے چنگل میں بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اس نے فی الفور نیا فیصلہ کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

''بولو، ایسا کیوں کیا تم نے؟ تمہیں اس کا انجام پتا نہیں تھا؟'' جعلی نرس نے اسے بولنے پر اکسایا۔

وہ خاموش رہا۔

اچھا آدمی

ایک صاحب جو ملک بھر میں بہت جھوٹے مشہور تھے۔ کسی شہر میں آئے تو ان کی شہرت سن کر ایک ستر سالہ بوڑھی عورت اس سے ملنے آئی اور بولی۔ ''بیٹے کیا تم وہی ہو جس سے بڑا جھوٹا اور کوئی نہیں؟''

جھوٹے نے جواب دیا۔ ''محترمہ چھوڑیے اس بات کو۔ میں آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ کمال ہے، یہ عمر اور اس پر یہ حسن، یہ جمال، یہ کشش۔ جواب نہیں آپ کا۔''

وہ خاتون شرما کر بولی۔ ''ہائے اللہ، لوگ کتنے جھوٹے ہیں جو ایک اچھے خاصے آدمی کو جھوٹا کہتے ہیں۔''

''تم شیطان ہو... ایک انسان نما درندے ہو۔'' نرس کے لباس والی نے سنہری وگ اس کے منہ پر ماری۔

وہ خاموش رہا۔

''تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا، جو تم نے نرسوں کے ساتھ کیا۔'' وہ غضبناک انداز میں بولی۔

وہ مسکرا اٹھا اور آہستہ سے بولا۔ ''میرے ساتھ کیا ہوگا، اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔''

''عدالت؟''

''ہاں، مجھے اپنے حقوق کا علم ہے۔ میں اپنے وکیل کو دیکھنا پسند کروں گا۔ تم لوگ مجھے گرفتار کر سکتے ہو۔ مجھے جو کہنا ہے، وہ میں وکیل کے سامنے کہوں گا، گن ہٹاؤ اور ہتھکڑی نکالو۔''

''اوہ... حقوق... وکیل...'' وگ والی نرس نے جوابی مسکراہٹ اچھالی۔ یہ ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ''گرفتاری... آئی سی... یعنی ہم تمہیں گرفتار کر کے حوالات کی نذر کر دیں، وہاں قانون کے مطابق تمہارے لیے وکیل کا بندوبست کیا جائے؟''

''ہاں، یہی تمہاری ڈیوٹی ہے۔'' وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

''ڈارلنگ!'' وہ ذو معنی انداز میں زہرخند سے گویا ہوئی۔ ''تم کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو... کیسے حقوق اور کہاں کا وکیل... تمہارے لیے ہم نے اپنا قانون نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے... آخر... تمہیں کس بات نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ہمارا تعلق پولیس سے ہے؟''

قسط 23

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔۔۔

بی آر بی جیسے اس حساس علاقے میں گولی چلنے کا دھماکا ہم سب کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ آناً فاناً یہاں کن بردار اہلکار وارد ہوسکتے تھے۔

”یہ بُرا ہو گیا دادا۔۔۔!“ میں نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

”جو ہونا تھا، ہو چکا۔ پتا چلنا چاہیے کہ گولی کیوں اور کس نے چلائی ہے؟“ وہ بولا اور اسی سمت آگے بڑھ گیا جہاں کُھر امڑ رہا تھا، جبکہ گولی کی آواز۔۔۔ سامنے کے رخ سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں اسی جانب پیش قدمی کرنا چاہیے۔ آخر پتا تو چلتا کہ یہ گولی چلنے کا معاملہ کیا تھا؟

کبیل دادا کھُرے کی رہنمائی میں آگے بڑھتا جارہا تھا۔ اُسے شاید میری طرح اپنے اصل ہدف تک پہنچنے کی جلدی تھی، وہ بغیر رُکے مگر محتاط روی کے ساتھ اپنی پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھا کہ اچانک اس نے پینترا بدلا اور پھر اس کا رخ اسی طرف ہو گیا جدھر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی، ایک ٹبے کی مختصر سی ڈھلوانی آڑ میں ہو کر وہ جم گیا اور مجھے بھی ساکت ہونے کا اشارہ کر دیا۔

اس نے مجھے سر نہیں اُٹھانے دیا تھا مگر خود ڈھلوانی آڑ سے تھوڑا سر اُبھار کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسی وقت دوبارہ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ اُبھری۔۔۔ اور غیر ارادی طور پر کبیل دادا نے اپنا سر جھکا لیا، میں دھک سے رہ گیا۔ میں یہی سمجھا شاید اسی پر کسی نے فائر کھولا ہے مگر کبیل نے دوبارہ سر اُبھار کر دیکھا اور ساتھ ہی مجھے بھی اشارہ کیا۔ میں بھی ذرا اُوپر کو سرکا اور دنگ رہ گیا۔

یادیُ المنظر میں وہ جنگ کا ہی میدان نظر آتا تھا۔ ہم سے لگ بھگ کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک بغیر ہڈ کی بھاری سی لمبی جیپ کھڑی تھی اور اُسے مورچا بنائے چند وردی پوش اہلکار پوزیشنیں سنبھالے، اپنے سامنے کے رخ پر بنے ایک بلند ٹیلے پر فائرنگ کر رہے تھے، اس طرف سے بھی جوابی فائرنگ کی جارہی تھی اور یہ وہی والی سمت تھی جس طرف میں اور کبیل دادا تھوڑی دیر پہلے پیش قدمی۔۔۔ جاری رکھے ہوئے تھے۔

”جلدی آؤ اِس طرف۔۔۔“ کبیل دادا گویا کسی خطرناک صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے بولا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔

”کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ ہمارے دُشمن بی ایس ایف والوں کی نظروں میں آچکے ہیں؟“ میں نے اس کے ہم قدم ہوتے ہی پوچھا مگر اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے محض اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی اور بولا۔

”ہمیں عقب سے ان پر جھپٹنا ہوگا، ورنہ بی ایس ایف والے ہمارا شکار چھین لیں گے۔“ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ”شکار“ کسے کہہ رہا تھا، اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ان مذکورہ تین بلیو ٹلسی ایجنٹوں کے ساتھ میرا باپ، جو مبینہ طور پر ان کی قید میں ایک یرغمالی ہی کی حیثیت رکھتا تھا، بی ایس ایف اہلکاروں کے ساتھ اس جنگ میں وہ بھی زد میں آسکتا تھا۔ یوں میرے باپ کی زندگی بھی شدید خطرے میں تھی۔ یہی سبب تھا کہ مجھے کبیل دادا کی ایسے نازک وقت میں یہ بات درست محسوس ہوئی۔ جیسے ہی یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا، میں نے بھی اپنی جگہ سے بہ سرعت حرکت کی۔

فائرنگ اب وقفے وقفے سے جاری تھی۔ میں اور کبیل دادا اپنی گنز سنبھالے اسی ٹیلے کے عقبی سمت سے گھوم کر ذرا قریب پہنچے تو ایک منظر ہمارا منتظر تھا۔

وہ منظر خاصا چونکا دینے والا تھا، مگر اس منظر نے میری نگاہوں کی تڑپ کو یک بیک جوش سے تمتماتی آگ میں بدل ڈالا تھا۔ ہمارے سامنے وہ تین افراد تھے جبکہ چوتھے کی ہیئت اس کی وضع قطع سے صاف عیاں تھی کہ اُن تینوں کی نظروں میں وہ کیا حیثیت رکھتا تھا۔۔۔ پھر میں خود کو نہیں روک سکا، میں یہ بھی نہیں سن سکا کہ کبیل دادا نے میری اس دیوانہ وار پیش قدمی پر مجھے کیا سرزنش کرنی چاہی تھی، میں اسنیک سلیپر ہاتھ میں تولتا اسی سمت دیوانہ وار دوڑتا چلا گیا جہاں اُن تین افراد میں سے ایک غالباً لاش کی صورت میں بھربھری مٹی پر لہولہان پڑا تھا، جبکہ دوسرا ٹیلے کی آڑ لیے ہوئے بی ایس ایف کے اہلکاروں پر جوابی فائرنگ کرنے میں مصروف تھا، انداز اس کا ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے تیسرے ساتھی کو وہاں سے بھاگ جانے کے لیے موقع فراہم کر رہا ہو۔ اس نے ۔۔۔۔۔۔۔۔ کسی بدحال سے نظر آنے والے آدمی کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا ہوا تھا۔۔۔ میرا دل ہی نہیں بلکہ میرا یقین بھی چیخ چیخ کر یہ گواہی دے رہا تھا کہ اس تیسرے شخص کے کندھوں پر ڈھلکا ہوا وہ بدحال سا آدمی اور کوئی نہیں ہوسکتا، ماسوائے میرے باپ کے۔۔۔ بس! اسی منظر نے میرے پورے وجود کی رگوں میں خون کی گردش کو کسی طوفان کی طرح تیز کر دیا تھا۔ میں نے اس تیسرے شخص کے تعاقب میں بے تحاشا دوڑتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک فضا میں ایک شے لہراتی ہوئی لپکتی نظر آئی، وہ شے کبیل دادا کو بھی نظر آگئی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں ایک بار پھر کبیل دادا کو چلاتے ہوئے سنا۔

''شہزی! رک جاؤ...'' اسی وقت وہ شے سنسناتی ہوئی کہیں قریب ہی زمین پر گری اور کان پھاڑ دھماکا ہوا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قدموں تلے زمین لرز گئی ہو، دھماکا بہت شدید تھا، میں بھربھری مٹی والی زمین پر گرا۔ اسی وقت ایک اور سنسناتی ہوئی آواز اُبھری اور ایک اور سماعت شکن دھماکے نے مجھے اعصاب زدہ سا کر کے رکھ دیا۔ یہی نہیں یکے بعد دیگرے اسی نوعیت کے دو دھماکے اور بھی سنائی دیے تھے، جو نسبتاً بہت فاصلے پر ہوئے تھے، شاید کسی قریبی آبادی ٹکوڑی وغیرہ میں داغے گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس سرحدی پٹی کے قریب لائن آف کنٹرول پر بھارت نے اچانک شدید گولہ باری کر ڈالی ہو، سرحد پار سے یہ مارٹرز داغے گئے تھے۔

ہر طرف بارود کی بُو اور گرد و غبار پھیل گیا تھا۔ بھارت کی طرف سے ایسی شر انگیزی معمول کی بات تھی، شاید یہ بھی اسی کا شاخسانہ تھا۔ میں اوندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ جب میں نے اُٹھنے کی سعی چاہی تو دو ہاتھوں نے مجھے سہارا دے کر اُٹھنے میں مدد دی۔ یہ کمیل دادا تھا مگر مجھے کہاں چین تھا، میرا تو رُواں رُواں جوشِ جذبات تلے تھرتھرا رہا تھا۔

میں نے اُٹھ کر سنبھلتے ہی دوبارہ اسی سمت کی طرف دوڑنا چاہا تھا مگر کمیل دادا نے اس بار مجھے اپنے دونوں بازوؤں کے نرغے میں لے لیا۔

''اوئے شہزی! یہ کیا پاگل پن کرنے چلا تھا؟ سنبھال خود کو، دیکھتا نہیں، گولہ باری ہو رہی ہے۔''

''چھوڑ دے مجھے کمیل!'' میں اس کی گرفت میں مچل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''وہ... وہ میرا باپ!'' میری متلاشی نظریں سامنے گردش کرنے لگیں مگر وہاں اب گرد و غبار کی کثافت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اوئے نہیں... نہیں شہزی! اُدھر خطرہ ہے، ہوش کر، میں تیرے ساتھ ہوں ذرا حالات کا جائزہ تو لینے دے مجھے۔'' کمیل دادا نے مجھے سمجھایا۔ تب میرے بے چین دل و دماغ میں ذرا ٹھہراؤ سا آیا۔

''لگتا ہے بھارت نے لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گولہ باری کر ڈالی ہے مگر یہ زیادہ دیر جاری نہیں رہے گی، ذرا صبر کر۔'' وہ بولا۔

اسی وقت اپنے سرحد کی چوکیوں سے بھی جوابی گولے اور فائرنگ کی گئی۔ جنگ کے سماں جیسا یہ میدانِ کارزار ابھی جاری تھا، کمیل دادا مجھے لیے ایک طرف کسی ٹیلے کی آڑ میں آ گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، جو ایسے وقت میں کسی گہری سوچوں میں ڈوبا محسوس ہوا۔ مجھے اپنے باپ کی فکر ہوئی۔

''کمیل! کچھ کر، یا پھر مجھے جانے دے...'' میں شدید بے چینی سے بولا تو وہ پُرسوچ خیالات کے بھنور سے یکدم اُبھر کر بولا۔

''شہزی! کہا ناں! تھوڑا صبر کر، سن! مجھے لگتا ہے سرحد پار سے یہ گولہ باری کسی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا شاخسانہ ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا...؟'' میں اس کی بات پر چونکا۔

''تھوڑی دیر کے لیے سوچ ذرا شہزی! کرنل سی جی بھجوانی اس وقت بھارتی سرحدی علاقے اٹاری کے انٹروگیشن سیل میں موجود ہے، ایسے میں اُسے یقیناً یہ اطلاع مل گئی ہوگی کہ ان کا کھیل بگڑنے لگا ہے اور یوں اس نے اسی مقام پر محض افراتفری ڈالنے کے لیے اپنی بارڈر سیکیورٹی فورسز کو حکم جاری کیا ہو...''

اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا تھا، بادی النظر میں شاید اس کی بات پر اتفاق کرنا مشکل سہی لیکن موجودہ حالات کی ہلچل، اس کے تجزیے کی صداقت پر دلیل کرتی تھی۔ بھجوانی نے اس ''ڈیل'' کے لیے میرے باپ کو اپنے جن تین آدمیوں کے حوالے کر رکھا تھا، وہ تینوں کسی وجہ سے پاکستانی فورسز کی نظروں میں آ گئے ہوں گے اور یوں ان کا کھیل بگڑنے لگا ہوگا، اور ان تینوں میں سے کسی ایک نے اس کی اطلاع یہاں سے کچھ دور سرحد پار واقع اٹاری میں مقیم بھجوانی کو دے ڈالی ہوگی اور یوں اس نے لوکیشن ٹریس کرنے کے بعد اسی طرف گولہ باری کروائی تاکہ اس کے تینوں ساتھیوں کو نکل بھاگنے کا موقع مل سکے۔ لیکن... میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکنے والے ایک خیال نے کمیل دادا کی اس بات کو رد کر دیا۔ میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''سی جی ایسا نہیں کر سکتا، کیا وہ نہیں جانتا اس میں اس کا اپنا بھی نقصان ہے۔ اس ڈیل کی ناکامی کا سب سے زیادہ اثر اسی پر پڑے گا، کیونکہ ابھی اس کا مطلوبہ آدمی ہمارے قبضے میں ہے اور ہمارا (میرا باپ) سرحد پار کر کے یہاں آ چکا ہے۔''

''ممکن ہے تمہاری بات درست ہو مگر مجھے نہیں لگتا کہ سی جی جیسا مکار و عیار، فریبی شخص اس طرح کا کوئی گھاٹے کا سودا بھی کر سکتا ہے۔ کچھ ایسا مجھے لگ رہا ہے کہ وہ اس کے پیچھے بھی کوئی گہری بلکہ دوہری چال کھیل رہا ہے...'' کمیل

دادا ایک وقت اپنے خیال کی نفی بھی کر رہا تھا اور تائید بھی۔

"تم شاید مجھ سے زیادہ اس فریبی اور رذیل کرنل کی چالیں سمجھ رہے ہو دادا...! مگر... ہم یہاں کس بات کا انتظار کر رہے ہیں...؟" میں نے اس کی کشمکش کے جواب میں کہا۔

"گولہ باری رکنے کا۔" کہیل دادا نے مختصراً جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جب یہ سلسلہ تھما تو ہم دونوں نے قدم آگے بڑھا دیے۔

گرد و غبار کی چادر فضا میں ہنوز تنی ہوئی تھی جبکہ میں اور کہیل دادا محض اندازے سے تقریباً دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہمارے اندازے کی حکمتِ عملی کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی۔ نسبتاً محفوظ جگہ کا تعین ہی اصل مرکز تھی، یہی سبب تھا کہ جلد ہی ہم دونوں دھوئیں اور مرغولوں کے بادلوں میں ڈوب گئے، جو اَب قدرے ماند پڑنے لگے تھے، حتیٰ کہ ہمیں اس کے درمیان دھول سے اٹے وہ دو افراد تیزی کے ساتھ ایک طرف بڑھتے دکھائی دیے، جن میں سے ایک کے کاندھے پر وہی مجبور سا شخص لدا ہوا تھا، پہلا اپنے "باربردار" ساتھی کو سہارا بھی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر خود اس کی اپنی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی، یعنی وہ خاصا زخمی نظر آ رہا تھا۔

ہدف تاڑتے ہی میرا جوش سوا ہو گیا اور پھر میں نہیں رکا۔ طوفانی رفتار سے آگے دوڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے جوشِ جنوں تلے سب سے پہلے اسی شخص پر چیتے کی طرح جھپٹا مارا، جو "باربردار" تھا۔ اس وقت میں بڑی عجیب ذہنی و جذباتی کیفیات کا شکار ہو رہا تھا، طیش، جوش، رقت آمیزی، یہ سب گڈمڈ ہو کر مجھے ایک عجیب انسان کا روپ دے رہے تھے۔

اپنے شکار پر جھپٹا مارتے سمے، اس امر کا دھیان رکھا جانا تھا کہ اس کے کاندھے پر لدا ہوا شخص گرنے نہ پائے۔ جیسے ہی میرا شکار لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا، اس کے کاندھوں پر لدا ہوا وہ عجیب اور اپنی ہیئت میں بدحال سا شخص میرے دونوں مضبوط بازوؤں کے حفاظتی حصار میں آ چکا تھا۔

یار، بیلی، دوست، سنگت، ساتھی، حتیٰ کہ عزیز رشتے دار، کجا بہن بھائی تک... بے شک ان کی قربت کا قرار اپنی جگہ اور ان کی پہچان و شناخت کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ لیکن ماں اور باپ کے وجود کی خوشبو اور راحت آمیزی کا احساس ان سب سے جداگانہ ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ خدائے بزرگ و برتر نے ان دونوں ہستیوں میں اپنی جھلک کا ایک پرتو شامل کر رکھا ہے، ہاں! ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے اور باپ کی ناراضی کو خدا کی ناراضی کہا گیا ہے... ماں باپ چاہے کتنے ہی ضعیف اور نحیف و نزار کیوں نہ ہوں، لیکن کسی گھر میں ان کے دم سے جوان اور صحت مند مکینوں کو ایک تحفظ اور روحانی سکھ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ تحفظ کا احساس صرف ایک صحت مند اور توانا بازوؤں میں ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے زیادہ، ماں باپ کے بوڑھے ہاتھوں میں بھی ہوتا ہے، جو ہر وقت اپنی اولاد کے لیے اللہ کے حضور دعا کے لیے اُٹھے رہتے ہیں۔ اس طاقت بے بہا کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے بھلا؟ یہی وہ سبب تھا جب میں نے اس بوڑھے، نحیف اور کمزور سے وجود کو اپنے توانا اور مضبوط بازوؤں میں بھرا... تو پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ہی نہیں پورا وجود بھی یکلخت عقیدت و احترام سے لبریز ہو گیا ہو، ایسے ہی وقت میرے بے قرار دل نے گویا چیخ کر گواہی دی تھی کہ، یہی تو وہ سبب ہے جو میری شناخت کا ضامن ٹھہرایا گیا تھا۔

یہی میرا باپ تھا، یہی میری شناخت تھی، وہ فخر تھا جس کے لیے میں آج تک خود کو مکمل شہزادا احمد خان... سمجھنے سے قاصر ہی رہا تھا اور آج یہ نام مکمل ہو گیا تھا۔

اپنے باپ کو سنبھالتے ہی میں بس چند ثانیے اس جذباتی سی کیفیات کا شکار رہا تھا۔ اس کے بعد ہوش مجھے تب آیا تھا جب عقب سے کہیل دادا نے اچانک اس دوسرے شکار کو دبوچا تھا جس کی اپنی حالت ناگفتنی تھی، کیونکہ وہ اپنا ہتھیار مجھ پر سیدھا کرنے کی کوشش میں تھا مگر فائر کرنے کی اُسے حسرت ہی رہ گئی، کہیل دادا نے اُسے جالیا تھا اور ایک ہی مخصوص جھٹکے سے شاید اُسے ہمیشہ کے لیے بے بس کر دیا تھا۔ جبکہ دوسرا جو میرے دھکے سے منہ کے بل گرا تھا، لیٹے لیٹے ہی اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لوٹنی کھائی تھی تاکہ کسی اندھے حملے سے فوری طور پر بچ سکے اور حملہ کرنے کی پوزیشن میں آسکے، مگر کہیل دادا بھی ایک کائیاں تھا، یہ حقیقت کا ادراک ہو جانے کے بعد کہ میرے ہاتھ گوہرِ مقصود سے لبریز ہو چکے ہیں، وہ پورا پورا میرے تحفظ میں اپنی جان لڑانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے دوسرے شکار کی طرف جست لگائی تھی، مگر تب تک وہ آخری حریف نہ صرف خود کو سنبھال چکا تھا بلکہ اپنا پستول بھی نکالنے کی کوشش کے دوران ہی اُس نے اپنی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتے ہوئے کہیل دادا پر راؤنڈ کک بھی چلا دی مگر کہیل دادا کے لیے اپنے ایک تربیت یافتہ حریف کی طرف سے یہ حملہ ہی نہیں بلکہ

مخصوص ٹرک بھی قطعاً غیر متوقع نہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ بروقت خود کو بہ سرعت جھکائی دے کر اس طوفانی کک سے صاف بچا گیا تھا، مگر حریف کے اگلے مرحلے سے میں واقف تھا اسی لیے مجھے بھی حرکت میں آنا پڑا، کیونکہ کک ناکام جاتے ہی حریف کے پستول کی نال کا رخ لامحالہ کمبل دادا کی طرف ہونا لازمی تھا، جس کا اندازہ شاید ابھی کمبل دادا کو نہیں ہو پایا تھا۔ مگر میں اس کا ادراک کرتے ہی چند قدم اس کی طرف بڑھ آیا تھا۔ جیسے ہی اس کے پستول کی نال کا رخ کمبل دادا کی طرف ہوا، کھڑے کھڑے میری لات حرکت میں آئی اور اس کا پستول فضا میں اُڑ کر کہیں دور جا گرا۔

میں اپنا کام کر چکا تھا، یہی وجہ تھی کہ کمبل دادا نے ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ حریف پر جھپٹا مارا، لیکن حریف نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے بغیر اس کا یہ حملہ بلکہ ہلا اپنے بازوؤں کے مخصوص اسٹائل پر روک دیا اور ساتھ ہی اس نے داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی ضرب کمبل دادا کے پیٹ پر رسید کردی۔ وہ اس جاں کش تکلیف سے دہرا ہو گیا۔

میں جان گیا تھا کہ کمبل دادا کے مقابلے میں کرنل سی جی بھجوانی کا کوئی عام کارپرداز نہیں بلکہ بلیو تکسی کا تربیت یافتہ ایجنٹ ہے، اس لیے کمبل کو اسے زیر کرنے میں خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ جس کا اس نازک وقت میں کم از کم میں تو متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ کمبل کو عارضی طور پر ہی سہی، ڈھا دینے کے بعد حریف میری جانب لپکا، میں اپنی جگہ سے ہلے بغیر، پل کے پل میں اس کے انداز جارح کو بھانپ کر اپنے باپ کے بے سُدھ وجود کو بہ دستور اسی طرح تھامے ہوئے اپنے جوتے کی ایڑی پر جتنی تیزی سے گھوم سکتا تھا، گھوم گیا اور یوں میں نے لفٹ کک حریف کے چہرے پر رسید کرنی چاہی تھی، لیکن وہ بھی بروقت میرے جوابی حملے کے انداز کو تاڑ کر بہ سرعت جھکائی دے گیا تھا اور اسی دوران اس نے مجھے سوئپ کر دیا، اپنے باپ کو زمین پر لٹائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اسے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ اسی اثنا میں میرا حریف رکوع کے بل جھک کر اپنی داہنی پنڈلی سے ایک مہلک اور تیز پھل والی قرولی نکال چکا تھا، میرے پاس وقت نہیں رہا تھا کہ میں اس کے مہلک وار سے خود کو بچا پاتا، وہ ایک ہاتھ میں قرولی سونتے میرے سر پر پہنچ چکا تھا، اب جب میں وہ مجھ پر وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اُسے ایک کریہہ سی چیخ کو کسی بیل کی ڈکراہٹ سے فضا بہ آواز میں خارج کرتے پایا اور اس کا قرولی والا ہاتھ فضا میں ہی اُٹھا رہ گیا، ایک تیز شکاری چاقو دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔ ضرب اور نشانہ ایسا کاری تھا کہ اس کے تکلیف کے مارے کھلے منہ سے خون اُبلتا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔

یہ بروقت حرکت زمین بوس کمبل دادا کی تھی جس نے شاید اسے پنڈلی کی طرف جھکتے دیکھ کر اس کے مقصد کو تاڑ گیا تھا اور یوں اس سے زیادہ اس نے پھرتی کا مظاہرہ دکھاتے ہوئے اپنا چاقو اُستادانہ مہارت سے اس کی طرف اُچھال دیا تھا۔

”خس کم جہاں پاک...“ کمبل دادا ہاتھ جھاڑتے ہوئے اُٹھا۔ ”چل شہزی! نکل چل یہاں سے، ورنہ لمبی پھڈیگ میں پڑ جائیں گے۔“ وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ میں فوراً سنبھلا اور ایک نگاہ اپنے باپ کے چہرے پر ڈالی، دل میں رقت بھری اور خوشی و غمی جیسے ملے جلے جذبات کا ایک جوار بھاٹا سا اُٹھا، میں بڑی محبت، احترام اور پُرعقیدت سے اس کا جائزہ لینے لگا، وہ نیم بے ہوش سا تھا، یا پھر کمزوری کے باعث وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا، اس کے بوڑھے لب سوکھ کر پپڑی ہو رہے تھے، چہرے پر ان گنت جھریوں کا جال تھا، داڑھی، مونچھیں کسی مجذوب کی طرح بڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اس کی شدید جسمانی کمزوری کو ظاہر کر رہے تھے، بال کھچڑی سے تھے اور مٹی دھول سے اٹے پڑے تھے۔

کپڑوں کی حالت اس سے زیادہ ناگفتہ بہ ہو رہی تھی بلکہ کپڑے کیا تھے، سوائے چیتھڑوں کے، جہاں سے میرے باپ کے ضعیف جسم کے کئی گوشے برہنہ نظر آرہے تھے، اور ان برہنہ گوشوں پر زخموں کے سیاہ داغ بتا رہے تھے کہ وہ کتنے پرانے ہو سکتے تھے۔ میرا دل بھر آیا۔ یہ میرا باپ ہی نہیں بلکہ وطن عزیز کا وہ بہادر اور محب وطن سپاہی بھی تھا جس نے اپنے ملک کی خاطر نجانے کتنی صعوبتیں اُٹھائی تھیں۔ میں نے فوراً اپنی بھاری جیکٹ اسے پہنا دی تھی۔

یہ کمزور وجود کس قدر طاقت ور تھا یہ میں ہی جانتا تھا، اس نے کیسے دُشمن کے دانت کھٹے کیے تھے، یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا... ان بوڑھے کپکپاتے ہاتھوں نے کبھی کس طرح آتش و آہن کے ساتھ پنجہ آزمائی کی تھی۔

”تو پہچان رہا ہے اس بابا جی کو...؟“ کمبل دادا نے میرے قریب آکر پوچھا۔

”میں نے کہا، میرے لہو نے گواہی دے ڈالی ہے کہ یہی میرا باپ ہے۔“ میں نے پورے یقین سے کہا تو دادا بولا۔

"چنگا! چل اُٹھ پھر، ہمیں واپس ہونا ہے۔" میں نے فوراً اپنے باپ کے بے سُدھ سے وجود کو اُٹھا لیا اور تیزی سے واپس کراڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اچانک میرا سیل گنگنایا۔ میں نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے کمیل دادا کو اپنی جیب سے سیل نکالنے اور کال اٹینڈ کرنے کا کہا۔ اس نے فوراً وہی کیا اور ایک نگاہ سیل کی اسکرین پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"خدا خیر کرے... اول خیر کی کال ہے۔" کہتے ہوئے اس نے فوراً سیل اپنے کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں! اول خیر... کیا بات ہے؟"

"ہاں... ہاں! وہ ٹھیک ہے اور میرے ساتھ ہے ہمارا مشن کامیاب ہو گیا ہے، مگر کسی وجہ سے وہ کال نہیں اٹینڈ کر پا رہا، تم بتاؤ؟ خیریت تو ہے ناں؟ یہ مجھے کیسی آوازیں آرہی ہیں؟" وہ بولتا رہا اور میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

"کیا...؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ مگر۔" کمیل دادا کا چہرہ یکلخت تاریک پڑتا دیکھ کر میں نے ایک ہاتھ سے سیل اس سے جھپٹ لیا اور کان سے لگا کر بولا۔

"ہاں اول خیر! کیا ہوا...؟" اس دوران میں کمیل دادا نے میرے باپ کو سہارا لیا تھا تاکہ میں اطمینان سے بات کر سکوں۔

"کاکے! یہاں ہم پر کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے اچانک ہلّہ بول دیا ہے، تم دونوں کہاں ہو؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پس منظر میں مجھے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے گئی تھیں۔ میری فراخ پیشانی پر یکلخت شکنوں کا جال سا بُن گیا اور میں نے فوراً پوچھا۔

"اول خیر! وہ کتنے لوگ ہیں اور..." میری آواز نامکمل ہی رہ گئی، کیونکہ دوسری طرف سے کال اچانک منقطع ہو گئی تھی۔ میں پریشان ہو گیا اور وحشیانہ انداز میں ہیلو... ہیلو، کرتا رہ گیا۔ دوسری جانب سے ٹوں... ٹوں، کی مخصوص آواز کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی تو میں نے فوراً شکیلہ کا نمبر ایمرجنسی والے ڈیجیٹ تو پریسیٹ کیے ہوئے کو پُش کیا، مگر شکیلہ نے بھی کال ریسیو نہیں کی تو میری تشویش فزوں تر ہونے لگی۔ میں نے کھڑے کھڑے کمیل دادا پر ایک نظر ڈالی۔ اُسے بھی وہاں کی صورتِ حال کا کسی حد تک اندازہ ہو چلا تھا، لہٰذا بہ یک ترنت بولا۔

"شہزی! ہمارا دوسرے کنارے تک پہنچنا ضروری ہے، وقت ضائع مت کرو۔"

یہ کہتے ہی وہ میرے باپ کو سنبھال کراڑے کی طرف دوڑا اور میں نے بھی آگے قدم بڑھا دیے۔ ہمارے عقب میں کہیں ذرا فاصلے پر ایک گولہ اور پھٹا تھا مگر ہم رُکے نہیں اور کراڑے پر پہنچ کر ہی دم لیا وہاں سے ہم کھسلتے ہوئے نیچے اُترے اور پھر پانی میں چھلانگنے سے پہلے ہی میں نے اپنے باپ کو سنبھالا اور جلدی جلدی اسے اپنا پیراکی کا لباس پہنایا، مقصد مقدور بھر حد تک پانی کی برودت اور سردی سے بچائے رکھنا تھا۔ کمیل دادا نے مجھے اپنا پیراکی کا لباس پہنانے کے لیے دینا چاہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ تاہم اس کے بعد میرے باپ کو دوبارہ اسی نے ہی سنبھال لیا تھا، اور میں نے بھی کسی قدر اسے سہارا دے رکھا تھا کہ ہم اسی طرح تیرتے ہوئے بالآخر دوسرے کنارے سے جا لگے تھے، جہاں اب اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ غیر معمولی سناٹا دیکھ کر میرا دل اندر سے ہول اٹھا تھا کہ یہاں ایسا کیا ہوا تھا؟ ہم اسی جانب بڑھے جہاں ہم نے اول خیر اور شکیلہ کو چھوڑا تھا اور کار کے اندر رسن بستہ حالت میں سندر داس موجود تھا۔

وہاں کا نقشہ بتا رہا تھا کہ یہاں دو گروپوں کے درمیان ٹھیک ٹھاک معرکہ آرائی ہوئی ہے۔ کار کی باڈی پر گولیوں کے ان گنت سوراخ تھے، ونڈ اسکرین اور کھڑکیوں کے شیشے چٹخے ہوئے تھے، تین ٹائر برسٹ نظر آرہے تھے، دو لاشیں اور خون پھیلا ہوا تھا، ایک سیل پڑا نظر آیا جو کمیل دادا نے لپک کر اُٹھا لیا۔ جبکہ مجھے مذکورہ دونوں لاشوں کی ذرا فاصلے سے ہی تصدیق ہو چکی تھی کہ یہ اُن نامعلوم حملہ آوروں کے ساتھیوں کی ہوں گی جن کے ساتھ یقینی طور پر اول خیر اور شکیلہ کے ساتھ معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھیوں اور بالخصوص سندر داس جیسے خطرناک قیدی کو غائب پا کر مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا اور اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

اس دوران میں میرے باپ کو پوری طرح ہوش آنے لگا تھا اور وہ بے چینی کے اظہار میں اپنے بوڑھے ہاتھ پیروں کو بار بار حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے منہ سے بے ربط آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ اس کی یہ مقدور بھر سعی خود کو مجھ سے چھڑانے جیسی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ وہ اتنے برس بعد اب کن محفوظ ہاتھوں میں تھا، نہ وہ یہ جانفزا حقیقت بھی جانتا تھا کہ جس ملک کی خاطر اُس نے اتنا طویل اور پُرآلام و پُرآزار عرصہ دُشمن ملک کی سرزمین کے ٹارچر سیل اور عقوبت خانوں میں گزارا تھا، وہ اب دوبارہ اسی

وطنِ عزیز کی محفوظ گود میں آچکا تھا۔ لیکن میرے پاس ابھی اسے اتنی بڑی خوش خبری سنانے کا وقت نہ تھا۔ سندرداس اور میرے دونوں ساتھیوں کے غیاب نے میری اس فتح پر اوس گرادی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا شہزی! یہ کرنل سی جی بھجوانی غضب کا مکار اور شاطر آدمی ہے۔" کمیل دادا کی کھرکھراتی آواز میری یک تک سماعتوں سے ٹکرائی۔

"اس نے ہمارے خلاف شطرنج جیسی چالیں اپنے پیادوں کے ذریعے چاردانگ چھوڑ رکھی تھیں۔ جہاں کس کا وارا لگتا ہے اس کے آخری پیادے کا وار الگ چکا ہے۔"

"کمیل دادا! میرا موڈ اس وقت سی جی بھجوانی کی تعریفیں سننے کا بالکل نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "لیکن... سمجھ میں نہیں آتا، بھجوانی کا یہ آخری مہرہ کیا سندرداس سمیت اول خیر اور شکیلہ کو بھی اپنے ساتھ یرغمال بنا لے گیا ہے یا ہمارے ساتھی اس مہرے کے تعاقب میں گئے ہیں؟"

"کال کے اچانک منقطع ہو جانے سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ دونوں بھی دشمن کے نرغے میں آچکے ہیں..."

"تم کھرا تلاش کر لیتے ہونا...؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "جلدی کرو، ہمیں اس مقام تک پہنچنا ہوگا، اسی وقت..." جوشِ غیظ سے میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں چیخ پڑا۔

"کمیل دادا! بحث نہیں چلے گی، کھرا تلاش کرو... تم نہیں جانتے سندرداس اس وقت کیسا بم ثابت ہو سکتا ہے میرے لیے..." میری طرف گھورتی ہوئی اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے برہمی کی چمک ابھری تھی، جو فوراً معدوم بھی ہو گئی اور پھر اس نے وہی کیا جس کا میں نے اسے حکم دیا تھا۔

وہ چند منٹوں تک وقوعے والی جگہ (اس جگہ کو میں اب یہی کہہ سکتا تھا) کا مختلف انداز میں طواف کرتا رہا، کبھی جھک جاتا، اور کبھی قدم آگے بڑھ جاتا، پھر راستہ کاٹتا اور دائیں بائیں مڑ جاتا اور واپس لوٹ آتا۔ میں سرتاپا ایک پُرتشویش بے چینی کا شکار تھا اور بڑی بے تابانہ نظروں سے ہونٹ بھینچے کمیل دادا کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہاں چار افراد نے ہلا بولا ہے، جو ایک چوڑے ٹائروں والی جیپ میں آئے تھے۔" بالآخر اس نے میرے قریب آکر بتانا شروع کیا۔

"لیکن... حیرت کی بات ہے کہ یہ کہیں باہر سے نہیں بلکہ کسی قریبی مقامی آبادی سے شب خون مارنے یہاں آئے تھے، جس کا مطلب ہے، وہ اس حملے کی پہلے سے ہی منصوبہ بندی کیے ہوئے تھے۔" میں اس کے انکشاف پر بُری طرح چونکا۔

"تمہارا مطلب ہے موضع تلواڑیاں کے کسی مقام سے آئے ہیں؟"

"ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر شاید، ہم پر آگے چل کر ایک اور بھی انکشاف ہونے والا ہے۔ آؤ، اس طرف سے آگے بڑھو، وہ آبادی قریب ہے جہاں سے میرے خیال کے مطابق حملہ آور آئے تھے۔" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اُدھر سرحد کی جانب ابتری معدوم ہونے لگی تھی، مجھے خدشہ تھا کہ تین سرحدی جاسوسوں کی کھوج میں بی ایس ایف والے قریبی آبادیوں کا رخ کر سکتے تھے۔ تاہم ایک اطمینان بھی تھا کہ ایسا شاید نہ بھی ہو کیونکہ ہم ان تینوں کو وہیں جہنم واصل کر آئے تھے، اور کوئی بعید نہیں تھا کہ ان کی لاشیں بی ایس ایف والوں کی نظروں میں آچکی ہوں، تاہم اس عقدے کا پتا چلانے کے لیے کہ آخر انہیں کس نے ہلاک کیا؟ وہ کوئی پٹرولنگ یا ٹارگٹڈ کارروائی عمل میں لا سکتے تھے۔

میں کمیل دادا کی انکشاف والی بات پر چونکا تھا اور کھد بد کا شکار تھا، جان تو گیا تھا میں بھی کہ وہ... کھرا تلاش کرنے کے دوران میں مزید انکشافات کی توقع رکھے ہوئے تھا۔

ایک خدشے نے میرے ذہن میں سر اٹھایا تھا کہ کہیں اُس مردود کرنل سی جی کے یہ آخری چار مہرے سندرداس سمیت میرے دونوں ساتھیوں کو بھی سرحد پار لے جانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اپنے اس خدشے کا اظہار میں نے تیز تیز قدموں سے ساتھ چلتے ہوئے کمیل دادا سے بھی کیا تھا، اس کا خیال بھی کم و بیش یہی تھا۔

اگر ایسا ہو جاتا تو سندرداس کو ہمارے لیے ڈھونڈنا گویا بھوسے میں سوئی تلاشنے والی بات ہو جاتی۔ انہی باتوں نے میرے اندر بلکہ میرے روئیں روئیں میں ہلچل اور سنسنی سی پھیلا دی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار میجر ریاض باجوہ کا چہرہ رقص کر رہا تھا اور اُن کی وہ تنبیہ بھی جو سندرداس کو میرے حوالے کرتے وقت کی تھی۔

"شہزی! تمہاری خاطر میں اپنے اُوپر ایک بہت بڑا رسک لے رہا ہوں، بے شک اس کے پیچھے بھی نیک نیتی اور ایک نیک مقصد ہی کارفرما ہے، لیکن اگر خدانخواستہ سندرداس ہاتھوں سے نکل گیا تو اس کی صفائی اور تمہید میں اعلیٰ حکام کو کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکوں گا، میرا کیریئر ختم ہو کر رہ جائے

گا، کورٹ مارشل تو ہوگا ہی میرا، غداری کا مقدمہ بھی مجھ پر قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ ایک فوجی افسر کے لیے غداری کا لیبل خودکشی سے کم نہیں ہوتا...“

یہ الفاظ یاد کر کے میرا ذہنی خلجان بڑھتا جا رہا تھا، حوصلہ شکنی کے مدار مجھے اپنی طرف کھینچنے لگے تھے، اور ایسے میں خود کو اس جاں گسل تصور سے چھٹکارا پانا ممکن نہ ہو رہا تھا۔

”شہزی...! کیا ضرورت تھی بھلا اتنا بڑا اور پُرخطر رسک لینے کی...؟ تم نے محض اپنی غرض کی خاطر جہاں ایک طرف خطرناک ملک دشمن ایجنٹ کو گنوا دیا، بلکہ اس کی پاداش میں ایک ذمے دار فوجی افسر کا بھی زندگی سمیت، سب کچھ داؤ پر لگا دیا، شہزی یہ تم نے کیا کر دیا؟ یہ کیسا جُوا کھیلا کہ تمہاری اس حرکت پر تو تمہارا اپنا باپ بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ اُس نے تو ملک کی خاطر تم سب کو قربان کر دیا اور تم نے...“

”نہیں... خدا کے لیے نہیں، ایسا نہیں ہوگا... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا...“

میں جذبات کی شدت سے چیخ اُٹھا، میرے آگے آگے گھرے پر نگاہ رکھے ہوئے کبیل دادا میری اس چیخ پر بری طرح ٹھٹک کر رُک گیا۔

میرا پورا وجود مرتعش تھا۔ کبیل دادا جو آنکھیں پھاڑے ایک وحشیانہ سی حیرت تلے میری طرف تکے جا رہا تھا، اُس سے بھی میری ہیجان خیز کیفیات چھپی نہ رہ سکی تھیں۔ باپ کا نحیف و نزار وجود میرے ہاتھوں میں تھا اور تب پھر مجھے قریب ہی چھایادار درخت تلے ایک کٹیا سی دکھائی دی، وہ شاید کسی فقیر کی مڑھی لگتی تھی، میں اپنے باپ کو لیے اسی جانب بڑھا تو کبیل دادا نے مجھے خبردار کیا۔

”شہزی! ٹھہرو، ایک گھرا مجھے اسی کٹیا کے اندر جاتے ہوئے ملا ہے، ہوسکتا ہے وہاں کوئی دشمن ہو، میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ تمہاری چیخ نے مجھے چونکا دیا۔“

مگر میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ میں وہاں کیا کرنے جا رہا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا، لیکن جب میں اس مڑھی کے داخلی دروازے پر پہنچا تو مجھ سے پہلے ہی کبیل دادا لپک کر دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ دروازہ کیا تھا، بس، مختصر سے داخلی راستے پر ایک پیوند زدہ ٹاٹ جھول رہا تھا، جسے پرے ہٹا کر اور پستول ایک ہاتھ میں لیے کبیل دادا ہی پہلے اندر داخل ہوا پھر میں، اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں ہی بری طرح ٹھٹکے تھے۔

☆☆☆

اگرچہ اندر کی وضع قطع ہمارے لیے غیر متوقع نہ تھی۔ وہ بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ کسی غریب یا فقیر کی کٹیا ہوسکتی ہے یعنی، کونے میں ایک جگہ صراحی اور اوپر جست کا ایک ٹیڑھا میڑھا سا گلاس دھرا پڑا تھا، زمین پر پرانی سی گدڑی بچھی ہوئی تھی، لیکن جس شے نے ہمیں بری طرح چونکنے پر مجبور کیا، وہ ایک بے سدھ جسم تھا، جو زخمی بھی تھا اور اُوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔

یہ شکیلہ تھی۔ میں نے اپنے باپ کو آہستگی سے اس میلی گدڑی پر لٹا دیا اور شکیلہ کی طرف لپکا، وہ کراہ رہی تھی اور زخمی بھی تھی، اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا اور ایک بازو پر بڑا سا گھاؤ نظر آرہا تھا۔ ٹانگ بھی گھٹنے کی طرف سے زخمی تھی، یوں لگا۔ جیسے اسے دوبدو لڑائی میں چوٹیں آئی ہوں۔ شکر تھا کہیں گولی کا نشان مجھے دکھائی نہیں دیا تھا، جس کا مطلب تھا اسے کوئی خاص جان لیوا زخم نہیں آیا تھا، لیکن بازو والے گھاؤ سے مسلسل خون بہنے کی وجہ سے اُس پر نقاہت ضرور طاری تھی اور اس کی نیم بے ہوشی کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنا رومال نکال کر اس کے بازو والے زخم پر باندھ دیا اور کبیل دادا کو صراحی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پانی کا گلاس بھرا اور مجھے تھما دیا۔ جو میں نے تھام کر فوراً شکیلہ کے لبوں سے لگا دیا۔ اس کے کپکپاتے لب وا ہوئے اور چند گھونٹ پانی کے حلق سے اُتارنے کے بعد اُسے کچھ ہوش و خرد کا یارا ہوا تو میں نے گلاس ہٹا لیا۔ وہ اب آنکھیں کھولے مجھے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، ابھی شاید اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ پوری طرح نہیں چھٹی تھی، تاہم میرے پکارنے پر اس کے ستے ہوئے چہرے پر کچھ شناسائی اور طمانیت کے تاثرات اُبھرے۔

”شکیلہ! تم ٹھیک تو ہونا... لو پانی پیو اور...“

میں نے دوبارہ پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا، اس بار اس نے سارا پانی پی لیا اور پھر یوں ہانپنے لگی جیسے اس کی سانسیں ابھی صحیح طرح بحال نہ ہوئی ہوں۔ اُس نے ذرا ہمت سے کام لیا اور اپنی گردن موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”تم بالکل ٹھیک ہو شکیلہ!“ میں نے اس سے ازراہِ تشفی کہا۔ ”ہم دشمنوں کے تعاقب میں جا رہے ہیں، کیا تم ہمیں کچھ بتا سکتی ہو کہ تم لوگوں کے ساتھ ہوا کیا تھا اور اول خیر کہاں ہے؟“

میری بات پر شکیلہ ہولے سے کراہی، وہ میری بات کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگی، میں اُسے بدستور

سہارنے کی تگ ودو میں لگا ہوا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی مگر اس کے زخموں نے اسے ہلنے جلنے سے بھی باز کر رکھا تھا، ایسے میں ہمارے سر پر کھڑے کبیل دادا نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شہزی! ہمارے پاس وقت کم ہے اور ٹھہرا زیادہ دیر نہیں چل سکتا...''

میں نے سر اُٹھا کر سوچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور شکیلہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا ''تم فکر نہ کرو۔ اور ہمارے آنے تک یہاں سے ہلنا بھی مت، ہم دشمنوں کے تعاقب میں جا رہے ہیں جو شاید زیادہ دور نہیں مگر تا خیر انہیں ہم سے دور ضرور کر دے گی۔'' یہ کہنے کے بعد میں نے قریب لیٹے اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا باپ ہے، تاج دین شاہ، اس کی بھی حالت تم سے مختلف نہیں۔ مگر یہ ابھی کسی کو نہیں پہچان پا رہا، تم کو اس کا بھی دھیان رکھنا ہے، تم سمجھ رہی ہو ناں میری باتیں؟''

شکیلہ نے ایک ذرا گردن موڑ کر اپنے دائیں جانب بے سُدھ لیٹے میرے باپ کی طرف دیکھا اور پھر ہولے سے اپنی گردن کو اثباتی جنبش دی۔ اس کے پاس سے اُٹھتے اُٹھتے... میں نے اول خیر کے بارے میں پوچھا تو وہ فقط یہی بتا سکی کہ ان پر جن نامعلوم حملہ آوروں نے ہلا بولا تھا، اور اپنا شکار (سندرداس) چھڑا کر لے گئے تھے، اول خیر انہی کے تعاقب میں گیا تھا مگر وہ خود بھی کم زخمی نہیں تھا، جبکہ وہ خود ایک دشمن سے دوبدو لڑائی میں زخمی ہو گئی تھی، اگرچہ مدِ مقابل بھی بری طرح گھائل ہو گیا تھا پھر اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش میں یہاں کی راہ لی تھی۔

میں نے اپنے بوڑھے باپ کی پیشانی کو چوما، میں نے دیکھا وہ اپنی گھنی نمیالی بھوؤں سے ڈھکی بوڑھی آنکھوں سے مجھے دیکھنے یا پھر شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد میں اور کبیل دادا تیزی کے ساتھ مڑھی سے باہر نکل آئے۔

آگے بڑھتے ہوئے میرا پورا وجود جھیروں جھیر ہونے لگا تھا۔ میں اپنے دل پر جبر و صبر کی بھاری سل رکھے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور جلد ہی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تو کبیل دادا ایک جگہ ٹھہر گیا۔

یہ نکواڑیاں کے قریب کا ایک اور چھوٹا سا دیہات تھا۔ کبیل نے مجھے اُسی چونکا دینے والے ایک اور انکشاف کے بارے میں بتایا کہ بی آر بی پار کرتے ہی ہم سے دشمن کے جن دو ایجنٹوں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور ان میں سے ایک تو میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا جبکہ دوسرا، پوچھ گچھ کے دوران ہمارے چنگل سے بھاگ نکلا تھا اور دریا میں چھلانگ لگا دی تھی، بعد میں ہم نے حفظِ ماتقدم کے تحت اس کی اطلاع سیل پر اول خیر وغیرہ کو بھی دے دی تھی۔ اب کبیل دادا نے جو انکشاف کیا تھا، اس کے مطابق وہ مفرور دشمن، جس کے بارے میں ہمارا قوی خیال یہی تھا کہ وہ اپنے ایک دوسرے ساتھی کی طرف رخ کرے گا جسے نہر کے دوسرے کنارے پر ہمارے خلاف ہی کسی ''مہم جوئی'' کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسا اُس نے نہیں کیا تھا۔ کبیل دادا کو اسی بات کی... حیرت تھی کہ اگر وہ دشمن تھا تو پھر اس نے اول خیر اور شکیلہ کی طرف رخ کرنے کے بجائے، کسی اور جگہ کا کیوں رخ کیا تھا...؟

اس کی قلعی اب کھلی تھی۔ منصوبے کے مطابق وہ پہلے یہاں آیا تھا جدھر اس کے اور بھی ساتھی (پانچ ساتھی، جن میں سے دو اول خیر وغیرہ کے ساتھ لڑائی میں ہلاک ہو چکے تھے) ایک خفیہ ٹھکانے پر پہلے سے موجود تھے، وہ انہیں لے کر بذریعہ جیپ اُس مقام تک پہنچا اور اول خیر وغیرہ پر ہلا بول دیا۔

کبیل دادا نے بالکل صحیح کُھرا تلاشا تھا اور اب ہم دونوں تیزی کے ساتھ اسی ٹھکانے کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔

دن ڈھلنے لگا تھا، آسمان پر سرمئی پن نمودار ہونے لگا تھا اور سردی کی کاٹ میں بھی اضافہ ہو چلا تھا مگر ہماری رگوں کی تیز گردش، میرے اور کبیل دادا کے توانا جسم کو گرمائے ہوئے تھا۔ یہ آبادی دور اُفتادہ سرحدی پورہ میں ہونے کے باعث سرِ شام ہی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی، یوں بھی سخت سردی کی اس... شام میں کون باہر نکلتا تھا۔

کبیل دادا کے کہنے کے مطابق، دشمن مہروں نے اُسی جیپ میں واپسی اختیار کی تھی، جس میں وہ ہلا بولنے آئے تھے۔ کبیل دادا نے مجھے پوری اُمید دلائی تھی کہ دشمن مہرے اپنے ٹھکانے پر مل سکتے تھے۔ یہ سن کر مجھے یک گونہ سکون ملا تھا۔

چند ٹیڑھی میڑھی بے ترتیب اور گارے مٹی سے اَٹی پڑی کچی دیواروں والے گھروں کی مختصر مختصر گلیوں سے ہم دونوں گزرنے لگے۔ ان دیواروں پر کہیں کہیں گوبر تھپے ہوئے تھے۔

''اِدھر ٹھہرنا ذرا...'' اچانک ایک گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر کبیل دادا نے رکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا اور ساتھ ہی اپنے ایک ہاتھ کا اشارہ بھی دیا۔

"اوئے شہزی! مبارکاں! وہ جیپ کھڑی ہے جس کا مطلب ہے، دشمن اندر موجود ہیں۔" کمیل دادا نے ذرا اور آگے جھانکنے کے بعد جوشِ مسرت تلے کہا تو میرا دل بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اول خیر کی فکر بھی ستائے ہوئے تھی وہ نجانے کہاں اور کس حال میں تھا جبکہ شکیلہ کی طرف سے مجھے کچھ تسلی ہو چکی تھی۔

ابھی ہم آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک میں نے اس مکان سے کچھ افراد کو نکلتے دیکھا۔ میرے وجود میں جنبش ہوئی، میں ان پر شب خوں مارنے کے لیے بے تاب ہو گیا، کمیل دادا نے میری کیفیت بھانپ کر اپنے ایک ہاتھ سے میرا شانہ دھیرے سے دبایا۔

وہ تین افراد تھے، ایک خاصا زخمی تھا مگر اس کی مرہم پٹی کی ہوئی نظر آتی تھی، جبکہ باقی دونوں افراد ایک ایک آدمی سنبھالے ہوئے تھے' اسے پہچان کر میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔

ان دونوں سہارے ہوئے افراد میں ایک تو اول خیر تھا جو رسن بستہ حالت میں تھا جبکہ دوسرا اسندروا اس تھا، وہ خاصا چاق وچوبند بھی مگر اس کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا، جس سے اُسے چلنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، شاید اسے گولی لگی تھی اور وہ اپنے ایک ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چل رہا تھا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں اپنے ساتھیوں کی مرہم پٹی کے لیے رکے تھے، سب سے آخر میں جو شخص کچھ سازوسامان اُٹھائے برآمد ہوا، اُسے دیکھ کر تو میں اور کمیل دادا بری طرح چونکے تھے، یہ وہی مہرہ تھا، جو ہمارے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے کمیل دادا کی ذہنی فراست کا بھی قائل ہونا پڑا تھا، اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا کہ یہ بھگوڑا دشمن ہماری سوچ سے بھی زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا، کیونکہ اس نے اول خیر یا شکیلہ پر خود ہی ہلا بولنے کے بجائے قریبی آبادی میں کسی خفیہ ٹھکانے پر موجود اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اُنہیں بروئے کار لایا تھا جو یقیناً پہلے سے سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق ۔۔۔ وہاں موجود تھے، یوں بہ قول کمیل دادا کے کرنل سی جی نے ہمارے ساتھ آخری جوا کھیلنے کی کوشش چاہی تھی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی رہا تھا۔

"کمیل! یہ یہاں سے کوچ کر رہے ہیں اور اول خیر کو انہوں نے کسی مقصد کے لیے یرغمال بنا رکھا ہے۔ یہ جانے نہ پائیں یہاں سے۔"

"میں تیار ہوں، ہمیں دو مختلف سمتوں سے ان کو گھیرنا پڑے گا۔"

"ہاں اگر دھیان رہے کمیل! اسندروا اس کو زندہ پکڑنا ہے۔ باقیوں کو جہنم واصل کر دینا اور اول خیر کے سلسلے میں بھی احتیاط رکھنا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"ایک بات اور۔۔۔" میں نے فوراً کہا۔ "موقع ملتے ہی دشمنوں کے ساتھ، ان کی گاڑی کے کم از کم دو عدد ٹائروں کو بھی نشانہ بنانا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" وہ یہ کہہ کر ایک طرف کو رینگ گیا میں نے سیدھے ہاتھ کی جانب پیش قدمی کی، میرا اسنیک سلیئر ہاتھ میں دہاڑنے کے لیے بے چینی سے تھرکنے لگا۔

اسی وقت جب یہ لوگ مرحلہ وار اس ڈبل کیبن پک اپ نما جیپ میں سوار ہونے لگے اور آخر میں جس نے اول خیر کو رسن بستہ حالت میں دبوچ ہوئے تھا، اس کے سر کا نشانہ لے کر میں نے ڈبل شاٹ پر ٹریگر دبا دیا، میرے مہیب اسنیک سلیئر کی تلے اُوپر نالوں نے کسی ڈریگون کی طرح شعلے اُگلے۔ ساعت شکن دھماکا ہوا، بیک وقت ایک گولی شکار کی گردن اور دوسری اس کے سر پر لگی تو جیسے چیتھڑوں کی صورت میں اس کا سر ہی کاندھوں سے بکھر کر غائب ہو گیا۔ اول خیر کے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے تھے، پھر جیسے اس نے بھی پل کے پل صورتِ حال کو بھانپ لیا اور گاڑی کی باڈی کی اوٹ میں خود کو جھکا دیا، وہ اس طرح ہمیں دشمنوں پر کھل کر حملہ کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا اور میں اس کی بروقت حاضر دماغی پر ہولے سے زیرلب مسکرایا تھا۔

جیپ میں سوار ہونے والوں کے لیے ہمارا یہ حملہ یقیناً اسی طرح اچانک تھا جس طرح انہوں نے کراڑے کے قریب اول خیر اور شکیلہ پر ہلا بولا تھا۔ گویا سیر کو سوا سیر پڑ چکے تھے۔

اسی وقت یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے، میں نے جیپ کی اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالتے ہوئے حریف کا سر جھکتے اور بعد میں اس کا جسم لڑھکتے دیکھا۔ یہ کمیل دادا کا شاخسانہ تھا۔ جو میرے والے شکار کے ڈھتے ہی موقع پا کر مکان کی جنوبی دیوار کی آڑ میں آ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود دشمن کو مار گرانے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے اور تیسرے نے اندر سے ہی فائر کھول دیا، ان کا نشانہ یقینی طور پر کمیل دادا ہی تھا مگر میں نے دیکھا، وہ جیپ کے اندر محبوس رہتے ہوئے

گرجدار فائر کرنے والے کو بھی تلاشنے کی کوشش کر رہے تھے، جو میں ہی تھا۔ ان کے ساتھ سندر داس بھی حرکت میں آچکا تھا۔ اسی وقت دوسرے اور تیسرے فائر پر میں پھر چونکا۔ اس فائر کے سنگم میں مجھے جیپ کے دو ٹائر برسٹ ہونے کے دھماکے بھی سنائی دیے تھے۔ کیپٹل دادا کی ہوشیاری پر میں زیرِ لب مسکرا دیا۔

اول خیر کی جان خطرے میں تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں میرے اندر اچانک ہی سر اٹھانے والے خطرے نے دشمن کی اگلی چال کی تصدیق کر ڈالی۔

خطرناک بلوچستی ایجنٹ سندر داس نے جیپ کا اسی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور بغیر مجھے دکھائی دیے نیچے اُتر گیا تھا، اس کا اندازہ اُس وقت ہوا جب میں نے اُس کی گرفت میں اول خیر کو دیکھا تھا، اس نے اُسے گن پوائنٹ میں لے لیا تھا۔ اول خیر کو ایک موقع تو ملا تھا، مگر اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ بروقت خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا اور سندر داس کے نرغے میں آگیا تھا۔

اس نے اسے ڈھال بنا لیا تھا اور اب اس سمیت دوبارہ جیپ میں سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، اس وقت جیپ میں اپنی جگہ سے حرکت کر چکا تھا اور شام کی ٹھٹھرتی ملگجی تاریکی کا فائدہ اُٹھائے گاڑی کی ایک سائڈ کی جانب بڑھا، مگر سندر داس کے دوسرے ساتھی کی نظروں میں آگیا جو جیپ کی کھڑکی سے وقفے وقفے سے اپنا سر اُبھارے اسی سمت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں سے میرے اسنیک سلیفر کے گرجنے کی آواز اُبھری تھی۔

گولیوں کے دھماکوں سے لوگ یقیناً جاگ گئے ہوں گے مگر خوف سے اندر ہی دبکے رہ گئے تھے۔

میں اس کی نگاہوں میں آگیا تھا، اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر مجھ پر فائر جھونک مارا، متوقع خطرے پر میں بھی نظر رکھے ہوئے تھا، یہی وجہ تھی پیش قدمی کرتے وقت خود میں نے بھی نظریں بدستور اسی جانب مرکوز رکھی تھیں اور میں نے اس کے چہرے کے ساتھ ہی نال کی جھلک دیکھتے ہی لڑھکنی لگائی تھی، گولی میرے کہیں قریب ہی بھربھری مٹی والی زمین میں پیوست ہوئی تھی اور اسی وقت دوسرا فائر ہوا، اس کی بھی مجھے پوری توقع تھی کیونکہ جانتا تھا کہ ایک بار دشمن کی متلاشی نگاہ میں آنے کے بعد وہ مجھے اتنی آسانی سے نکلنے نہیں دے گا، اسی لیے لڑھکنی لگاتے ہی میں نے دوسرا انداز اختیار کیا اور... پھر صرف ایک پل کا موقع پاتے ہی میں نے گاڑی کے بونٹ تک رسائی حاصل کر لی اور اسی کی آڑ میں اس پر فائر کر دیا...... دو دھماکے ہوئے اور جیپ کی ونڈ اسکرین کے پرخچے اُڑ گئے، ساتھ ہی مجھ پر فائر داغنے والا بھی۔ میرے اس بھیانک پسٹل کی زد میں آنے والے کسی شکار کو بھی ذرا آواز نکالنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

سندر داس اپنے ساتھیوں کے اس خوفناک انجام کے بعد خاصا نروس ہو گیا تھا اور اس نے وہی بزدلانہ قدم اُٹھایا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس کا اب ایک آخری وہی ساتھی باقی بچا تھا جو خاصا زخمی تھا، اس نے خود کو شاید گاڑی کی کسی سیٹ کے نیچے دبکا رکھا تھا۔

ادھر سندر داس، اول خیر کو ڈھال بنائے جیپ سے اُتر آیا، وہ میری جھلک دیکھ چکا تھا اور یہ اندازہ بھی اُسے... غالباً پہلے سے ہی ہو چکا تھا کہ ان پر حملہ کرنے والے کون ہو سکتے تھے۔

"خبردار شہزادا! خود کو میرے حوالے کر دو... ورنہ میں اس کے سر میں گولی اُتار دوں گا۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخا۔ میں نے دیکھا، اس مردود نے اول خیر کی کنپٹی سے اپنے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ میں بھی اسی طرح اپنا مہیب پسٹل اس پر تانے دھیرے دھیرے اس کے سامنے نمودار ہو چکا تھا۔

میری اور سندر داس کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر جیسے اپنی متوقع فتح پر اس کے بدہیئت ہونٹوں پہ مکروہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ یہ بدبخت شکست خوردگی کے عالم میں اور انتقاماً کہیں اول خیر کو گولی ہی نہیں مار دے اسی لیے میری عقابی نظریں بار بار اس کے چہرے اور اس کے پستول کی لبلبی پر ٹکی ہوئی اُنگلی کی ایک ذرا جنبش کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"سنا نہیں! میں کہتا ہوں، پستول پھینک دو..." وہ پھر مجنونانہ انداز میں چلّایا۔ اس نے ایک لمحے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرے ایک ہاتھ میں دبے ہوئے تلے اُوپر نال والے اس بھیانک پسٹل کو بھی دیکھا تھا۔

"میں پستول پھینک رہا ہوں... تم اسے چھوڑ دو۔" میں نے اپنے پستول کو اسی طرح اس پر تانے رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میرا نشانہ اس کا سینہ ہی تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی اور پسٹل پھینک دو، میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں، ابھی اسی وقت پستول پھینک کر اپنے سارے ساتھیوں کو میرے سامنے... آنے کی ہدایت

دو۔'' وہ دہاڑا۔

اس بات کا اور اپنی اہمیت کا اس مکار کو بھی پوری طرح احساس تھا کہ میں نے اور کھیل دادا نے جس طرح اس کے ساتھیوں کی لاشیں گرائی تھیں، ہم اسے کسی صورت بھی... ہلاک نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ یہ ہمارا قیدی تھا اور قیدی بھی ایسا کہ اپنی ذات میں بغیر ہتھیار کے بھی یہ ہمارے لیے کسی بھی وقت ایک بم بن سکتا تھا۔ ورنہ مجھے پتا تھا کہ اس کی پشت کے پیچھے ہی کھیل دادا مکان کی دیوار کے پیچھے کسی موقع کا منتظر تھا، میں نے اُسے سخت تاکید کی تھی کہ وہ اس پر کسی صورت میں بھی گولی چلانے کا مجاز نہیں ہوسکتا، یوں بھی خود کھیل دادا کو بھی اس حقیقت کا اندازہ تھا اس لیے وہ بھی کوئی ''ایسی ویسی'' حرکت کرنے سے سر دست قاصر تھا۔

لیکن بے خبر سندر داس بھی نہیں تھا اس جگہ سے، کیونکہ اُسے اندازہ تھا، اس طرف میرا ایک ساتھی (کھیل دادا) موجود ہے۔ یوں بھی وہ ایک گھاگ ایجنٹ تھا، اب تک اُسے خود بھی اس ''تبادلۂ فائرنگ'' سے اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میرے ساتھ صرف ایک ہی ساتھی تھا۔

''تم کیسے یہاں سے نکل سکتے ہو؟ جبکہ تمہاری گاڑی کے ٹائر فلیٹ ہو چکے ہیں؟'' میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''گاڑی کے صرف دو ٹائر برسٹ ہوئے ہیں اور اتنے ہی فاضل ٹائر اندر موجود ہیں۔ تم میری نظروں کے سامنے رہو گے اور تمہارا ساتھی ٹائر بدلے گا۔''

اس کی بات پر میرے رگ و پے میں یکایک مسرت کی لہر اُٹھی تھی، اس کا مطلب تھا کہ وہ... فوری طور پر یہاں سے نکلنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور نہ ہی اس کے پاس ایسا کوئی متبادل راستہ تھا، ورنہ ایک اندیشہ تھا کہ شاید اس کے اور بھی ساتھی یہاں پہنچنے والے ہوں یا کرنل سی جی نے خود ہی کوئی ایسا بندوبست اس کے لیے کر رکھا ہو، مگر... فی الحال ایسے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری باتیں منظور ہیں، میرے ساتھ صرف ایک ہی ساتھی ہے۔ میں اُسے ابھی آواز دے کر بلا لیتا ہوں لیکن تم میرے ساتھی کی کنپٹی سے یہ پستول ہٹا دو...''

''ہرگز نہیں...'' وہ ایک بار پھر وحشت سے چلّایا۔

''یاد رکھو! اس وقت میرے ہاتھ میں ترپ کے دو پتے ہیں، ایک تمہارا یہ ساتھی (اول خیر) اور دوسرا میں خود...''

یہ کہتے ہوئے اس نے پستول کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ دی۔ یک لخت میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

''میں جانتا ہوں، تمہارے اس ساتھی (اول خیر) کی طرح میں بھی تمہارے لیے اتنا ہی اہم ہوں... مت بھولو کہ ہم جیسوں کے پاس آخری آپشن خودکشی ہوتا ہے، اب وقت ضائع کیے بغیر جو میں نے کہا ہے وہ کرو...''

میں اس کی بات سن کر سنسنا اُٹھا، وہ میری سوچ سے زیادہ چالاک اور اس سے کہیں بڑھ کر ''خطرناک'' بھی ثابت ہو رہا تھا، وہ میری دُکھتی رگ سے واقف تھا اور مجھے اس کا بھی ادراک تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، وہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا، اُس کی اپنی زندگی تو داؤ پر لگی ہی ہوئی تھی اور یہ کہ وہ اپنی زندہ سے زیادہ ''مردہ'' اہمیت سے بھی بالکل اسی طرح واقف تھا جیسے مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔

اب میرے لیے اس خبیث کا حکم ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا، قدرے جھک کر اپنا پسٹل اس کی طرف اُچھال دیا اور سیدھا ہو کے کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک میں نے اسے چیتے کی طرح پلٹتے دیکھا، اور ساتھ ہی اس نے اپنے عقب میں گولی چلا دی، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے کھیل دادا کی کرب ناک آواز سُنی اور میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

یہی وہ نازک وقت تھا جب اول خیر نے بھی اس خطرناک سچویشن کو بھانپتے ہوئے رسن بستہ ہونے کے باوجود، لمحے بھر کو سہی اس کے گن پوائنٹ سے ''آؤٹ'' ہوتے ہی اسے اپنے کاندھے کی ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی، سندر داس کا دھیان لمحے بھر کو کھیل دادا کی خفیہ پیش قدمی اور اس پر گولی داغنے کے باعث بٹا تھا، اسی لیے وہ اول خیر کی اس اچانک اور زوردار ٹھوکر پر لڑکھڑا گیا۔ پل کے پل میں اسی لمحاتی سنہری موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تیزی سے اس کی جانب لپکا، اس نے سنبھلنے کی سعی چاہتے ہوئے اپنے پستول کی نال کا رخ میری جانب کر دیا مگر تب تک اسے دیر ہو چکی تھی، میں اپنی جگہ سے لانگ جمپ لگا چکا تھا، مگر اس طرح کہ اس کے نشانے سے خود کو بچاتا ہوا اس پر جا پڑا تھا، وہ مجھ سمیت پشت کے بل گرا، گولی بھی چلی مگر وہ ہوا ہو گئی، اس کے گرتے ہی...... پستول بھی اس کی گرفت سے نکلتا چلا گیا، میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک ہارڈ پنچ رسید کر دیا، وہ جھنجھنا سا گیا اور کچھ وقت کے لیے بے حس و حرکت ہو گیا، میں اُٹھ کر کھیل دادا کی طرف دوڑا۔

''دو... دادا...!'' میں کرب ناک آواز میں چیخا۔

وہ زمین پر گرا پڑا تھا اور کراہ رہا تھا، اسی اثنا میں اول خیر بھی

قریب آ گیا، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر نائلون کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے، وہ میں نے جلدی جلدی کھول ڈالے۔ ہم دونوں کبیل پر جھکے، وہ جیسے اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا، میرے اور اول خیر کے چہرے پر کرب اور تشویش کے تاثرات نمایاں تھے۔

”گگ... کبیل... کبیل دادا!“ میں اسے سنبھالتے ہوئے پکارنے لگا اور فوراً گولی لگنے کے مقام کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ باعثِ اذیت اپنے دائیں پہلو پر رکھے ہوئے تھے، وہاں سے تیزی کے ساتھ بہتے خون نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ سندر داس کو قابو کرنے کے لیے کبیل نے اپنی جان داؤ پہ لگا دی تھی۔ اس نے اپنے تئیں اس کی جانب جارحانہ پیش قدمی چاہی تھی، مگر نجانے کیسے سندر داس کی عقابی نظروں میں آ گیا تھا۔ وہ شاید محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے سائے سے بھی محتاط تھا۔

”کاکا! جلدی سے وڈے استاد کو اندر لے چلو، وہاں مرہم پٹی کا سارا سامان موجود ہے۔“ اول خیر نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی اپنے ”بڑے اُستاد“ کو اس حالت میں دیکھ کر فرطِ غم سے لرز رہا تھا۔

”اول خیر! تم سندر داس کو قابو کرو، یہ زیادہ دیر بے حس و حرکت نہیں رہے گا۔“

میں نے ہانپتی سی آواز میں کہا اور زمین پر پڑے کراہتے ہوئے کبیل دادا سے بولا۔

”دادا... ! حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اول خیر میری ہدایت کے مطابق سندر داس کو اسی ڈوری سے اچھی طرح کس چکا تھا، جس سے تھوڑی دیر پہلے اس کے بازوؤں کو باندھا گیا تھا۔

میں زخمی کبیل دادا کو اُٹھائے ہوئے آگے بڑھا۔ اول خیر نے میری رہنمائی کر دی تھی۔ میں زخمی کبیل دادا کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے دروازے کی طرف لپکا اور اسے لات رسید کر کے کھولا، اندر داخل ہوا، مکان زیادہ بڑا نہیں تھا، عام سا یہ مکان ایسا ہی دکھتا تھا، جیسے یہاں عرصہ دراز سے کوئی نہ رہتا ہو۔ مختصر سے صحن کے بعد سامنے کے رخ پہ فقط دو ہی کمرے نظر آتے تھے، دونوں کھلے پڑے تھے۔ صحن میں مدھم روشنی تھی، کمرے تاریک تھے، اول خیر نے مجھے بتا دیا تھا کہ کون سے کمرے میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ دشمن خاصی جلدی میں تھے۔ انہیں اپنے ساتھیوں کی مرہم پٹی کر کے نکلنے کی جلدی بھی کیونکہ یہ سارا سامان اسی طرح ہی بکھرا ہوا تھا۔ ایک پرانے سے پلنگ پر کبیل دادا کو ڈالنے کے بعد میں نے تیزی کے ساتھ ہاتھ پیر چلائے، مرہم پٹی کا سامان ایک جگہ اکٹھا کیا اور کبیل دادا کی جیکٹ اور قمیص اُتاری۔ اسی دوران اول خیر بھی بے سدھ سندر داس کو کاندھے پر لادے اٹھا لایا۔ پھر وہ بھی میری مدد میں شامل ہو گیا۔ میں نے زخم کا معائنہ کیا۔ شکر تھا کہ گولی ”چھاؤ“ ہو کر نکل گئی، اور زخم زیادہ گہرا نہیں تھا، میں اسے کبیل دادا کی خوش قسمتی ہی تعبیر کروں گا کہ وہ اتنے قریب سے موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھا، لیکن زیادہ خون کے بہہ جانے پر مجھے تشویش تھی۔

میں نے اسپرٹ اور اینٹی سیپٹک قسم کے ایک محلول سے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کر کے زخم تو بھر دیا تھا اور جریانِ خون بھی رک گیا تھا، مگر کبیل دادا مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ ”شاک“ میں نہ چلا جائے۔ اول خیر اس کے منہ میں پانی اُنڈیلنے اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرسٹ ایڈ کی پوری کٹ موجود تھی اس میں کچھ انجکشن بھی رکھے تھے، جن کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہ تھا، تاہم مجھے ان میں ایک ”کورامائن“ ڈراپ اور امونیا اسپرٹ نظر آ گیا، ڈراپ کے چند قطرے کسی طرح کبیل دادا کے منہ میں ٹپکا دیے تاکہ وہ شاک میں نہ جا سکے، جبکہ امونیا اسپرٹ کو میں نے روئی کا ایک پھایا بنا کر اس میں اُنڈیلا اور اس کے نتھنوں سے وقفے وقفے سے لگا دیا، تاکہ ماؤف پڑتے دماغ اور مختل اعصاب جاگ جائیں اور وہی ہوا، کبیل دادا کو تھوڑا ہوش آنے لگا، درد کش کی گولیاں میں نے پیس کر پانی سے اس کے حلق میں انڈیل دی تھیں۔

کبیل دادا کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی تو اول خیر نے مجھ سے کہا۔

”تم اِدھر رکو میں گاڑی کے ٹائر بدلنے کی کوشش کرتا ہوں، ہمیں نکل جانا چاہیے، کہیں کوئی نیا فسانہ نہ کھڑا ہو جائے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن چند سیکنڈوں بعد میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا، ایک نگاہ قریب فرش پر دھرے پڑے رسن بستہ سندر داس پر ڈالی، وہ ہوش میں آنے لگا تھا، کچھ سوچ کر میں نے اسے گھسیٹ کر کاندھوں پر اُٹھایا اور مکان سے باہر آ گیا۔

گاؤں کے کچھ لوگ ہمت کر کے اور ڈرتے ڈرتے اس طرف نکل آئے تھے، ایک تو باقاعدہ ٹائر تبدیل کروانے میں اول خیر کی مدد بھی کرنے لگا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ اول خیر نے ان سے یہی کہا تھا کہ جو لاشیں وہ دیکھ رہے ہیں یہ بھارتی جاسوسوں کی ہیں اور ہم سرکاری اہلکار ہیں وغیرہ...

جلد ہی یہ کام نمٹا لیا گیا۔ سندر داس کو میں پیچھے ڈال چکا تھا، اور اول خیر کو اس کی رکھوالی پر بٹھا دیا تھا، جبکہ گبیل دادا کو عقبی سیٹ پر آرام سے لٹا دیا گیا تھا۔ خود میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ احتیاط میں فرسٹ ایڈ کا بکس بھی لے آیا تھا اپنے ساتھ۔

میں نے ادھر کا ہی رخ کیا تھا جدھر وہ مڑھی تھی...

وہاں پہنچنے میں ہمیں تھوڑی ہی دیر لگی تھی، اندر شکیلہ موجود تھی اور بابا جان ابھی اسی حالت میں بے سدھ لیٹے تھے۔ شکیلہ کی حالت بھی کچھ سنبھلی ہوئی تھی، میں بابا جان کا جائزہ لینے لگا اور اول خیر شکیلہ کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا، کم و بیش ہمیں پندرہ بیس منٹ لگے، اس کے بعد جب ہم سب مڑھی سے نکل کر جیپ میں سوار ہونے لگے تو میرے سیل فون کی بیل بجی، میں نے اول خیر کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا اور خود اس کی جگہ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ سندر داس کے منہ اور چہرے پر میں نے کپڑے کا ایک گٹھا بنا کر لپیٹ دیا تھا، اور نتھنوں کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔

کال زہرہ بانو کی تھی اور میں نے انہیں مختصراً بتا دیا تھا کہ اب تک کیا ہوا تھا، اس دوران اول خیر جیپ آگے بڑھا چکا تھا، زہرہ، گبیل دادا کے زخمی ہونے پر فکر مند تھی۔ تاہم آگے بولی۔

"تم لوگوں کے لاہور روانہ ہوتے ہی اپنے دو آدمی میں نے چند گھنٹوں بعد ایک کار میں تمہاری طرف روانہ کر دیے تھے..."

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" میں نے کہا۔ "ہمارا مشن کامیابی سے ہمکنار ہو چکا ہے، گبیل دادا کی طرف سے ذرا پریشانی ہے کہ اُسے بہت جلد ہاسپٹلائز کرنا پڑے شاید۔"

"اس کی فکر نہیں کرو، منظور اور جمشید گبیل دادا کو سنبھال لیں گے۔ وہ لاہور میں ایک ٹھکانے پر موجود ہیں۔"

"لیکن گبیل دادا کو اسپتال لے جانا ضروری ہے، اس کا بہت سا خون بہہ چکا ہے۔ ملتان تک میں اسے اس حالت میں نہیں لا سکتا۔ جبکہ خود میرا سندر داس کو جلد از جلد ملتان لانا ضروری ہے۔"

"میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات..." دوسری طرف سے وہ بولی۔ "میں ابھی جمی اور منظورے کو اس سلسلے میں ہدایت کیے دیتی ہوں اور تمہیں ان کا نمبر سینڈ کرتی ہوں، وہ تمہیں لاہور میں مل جائیں گے۔"

کچھ مزید گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع ہوا تو میں نے اول خیر کو ساری بات بتائی۔ وہ کچھ مطمئن ہوا مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا، میں گبیل دادا جیسے اہم آدمی کو مذکورہ ان دونوں آدمیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا، کیونکہ اب تک کے حالات کی ہلچل سے مجھ پر یہ حقیقت تو اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ کرنل سی جی بھگوانی اور وزیر جان کے ابھی تک آپس میں گٹھ جوڑ قائم تھے اور کوئی "لنک" بھی۔

میرا خیال تھا تازہ تر حالات کے بعد وہ مجھ سے ایک بھرپور دھمکیوں بھرا رابطہ کرے گا، لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا، وہ شاید اپنے زخم چاٹ رہا تھا یا پھر کسی نئے جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ وزیر جان بے شک خود مفرور سہی لیکن بہر حال اُس کی "بیک" پر لولوش جیسے بین الاقوامی گینگسٹر کا ہاتھ تھا، جبکہ خود وزیر جان، بلیو تلسی کو کسی نہ کسی صورت میں سپورٹ کر رہا تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ تھے، یہ الگ بات تھی کہ میں نے ان کا ایک بڑا منصوبہ (ہینڈلر ایجنٹ والا) بری طرح ناکام بنا دیا تھا۔ یہی نہیں ان کا ایک مشترکہ مہرہ سندر داس بھی میرے قبضے میں تھا اور اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔

میں نے اول خیر کو ساری بات بتائی تو اس نے بھی یہی کہا کہ کرنل سی جی اس وقت وزیر جان کے ساتھ بدستور رابطے میں ہوگا اور وہ اپنی اس دوسری شکستِ فاش پر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔

"لیکن یار! میرا ملتان پہنچنا اور گبیل دادا کا لاہور میں علاج دونوں ہی ضروری ہیں۔" میں نے فکر مندی سے کہا۔ "مجھے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر سندر داس کو باجوہ صاحب کے حوالے کرنا ہے کیونکہ وہ اسے انٹیلی جنس والوں کے سپرد کرنے والے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے، تم اور شکیلہ وغیرہ ملتان نکل جاؤ۔" اول خیر بولا۔ "میں جمی اور منظورے کے ساتھ گبیل دادا کے پاس رہوں گا اور انہی کے ساتھ ہی ملتان آ جاؤں گا۔"

مجھے اس کی یہ تجویز معقول لگی۔ پھر میں نے اس معاملے میں تاخیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور لاہور پہنچتے ہی میں

نے جی وغیرہ سے رابطہ کیا، جن کا نمبر زہرہ بانو نے مجھے ذرا دیر بعد ہی ایس ایم ایس کر دیا تھا۔

پھر کمیل دادا کو اول خیر سمیت ان کے حوالے کر کے میں اسی گاڑی میں راتوں رات ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ کمیل دادا کو زہرہ بانو کے ان دونوں مذکورہ آدمیوں اور اول خیر کے حوالے کر کے میں مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ اسے کسی بھی اسپتال میں چوبیس گھنٹے یا اس سے زیادہ ہاسپٹلائز کرنے کے بعد ملتان لوٹ آتے۔

پو پھٹنے تک میں ملتان پہنچ گیا۔ سندرداس کی حالت خارش زدہ کتے جیسی ہو رہی تھی اس لیے کہ چٹ بھی ان کی ہوئی تھی اور پٹ بھی۔ وہ اپنی لب بام فتح کے بعد ناکامی پر بری طرح تلملا رہا تھا اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں اس کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا کہاں تھا۔

میں نے سب سے پہلے سندرداس کو ایک بھرپور شکریے کے ساتھ میجر باجوہ صاحب کے حوالے کیا تو انہوں نے بھی سکون کا ایک گہرا سانس لیا اور میری اس شاندار کامیابی پر مبارکباد دی، نیز میرے باپ کو انہوں نے بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ سیلوٹ بھی پیش کیا تھا۔ باقی قانونی معاملات انہوں نے سنبھالنے کا مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا اور میں نے ان سے کمیل دادا سے متعلق کیئر کا بھی کہہ دیا تھا جو لاہور کے ایک مقامی اسپتال میں داخل تھا۔ (اس کے بارے میں اول خیر نے مجھے تھوڑی دیر بعد راستے میں ہی بتا دیا تھا) باجوہ صاحب نے اسی وقت لاہور میں واقع اپنی ایک رینک کمپنی کو کمیل دادا کے لیے اسپیشل کیئر کے سلسلے میں کہہ دیا تھا۔ آخر کو اس مشن میں کمیل دادا نے اپنی جان پر کھیل کر میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

آخر میں رخصت ہوتے وقت باجوہ صاحب نے مجھے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ میں اپنے باپ تاج دین شاہ کو کل صبح ہیڈ کوارٹر لے کر ضرور پہنچوں، کیونکہ وہ ریکارڈ روم سے میرے بابا کا سارا بائیو ڈیٹا فنگر پرنٹس سمیت نکال کر ”ری ویو“ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور قانوناً اس بات کی تصدیق ہو جانے کے بعد کہ۔۔۔ یہی وہ بہادر محب وطن مگر گمنام سپاہی تاج دین شاہ تھا تو اسے جلد ہی سرکاری سطح پر ڈیکلیئر کر دیا جائے گا، نہ صرف یہ بلکہ اس کے لیے صدر مملکت اور چیف منسٹر کی طرف سے کسی ملکی اعزاز سے بھی نوازے جانے کا اعلان کیا جا سکتا تھا۔

میں نے دشمنوں کی گاڑی وہیں ہیڈ کوارٹر میں چھوڑی اور میجر صاحب کی دی ہوئی ایک دوسری کار میں بابا اور شکیلہ کے ساتھ بیگم ولا پہنچا تو خود میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اتنے طویل عرصہ بیت جانے کے بعد ماں اپنے سہاگ کو اپنے سر کے تاج کو، اس حال میں دیکھ کر کیسا محسوس کرے گی۔ اپنے اُس شریک حیات کو جس نے اپنی زندگی، اپنا سب کچھ ایک عظیم مقصد کے لیے قربان کر دیا، آج وہ اس کی آنکھوں کے سامنے آنے والا تھا۔ خود میری اپنی حالت ابھی تک ناگفتنی سی ہو رہی تھی، فرط جذبات سے میرا خود پہ قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

بیگم ولا میں سب سے پہلے زہرہ بیگم نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ بابا جان کو ساتھ دیکھ کر ایک لمحے کو وہ بھی مبہوت سی رہ گئی تھی۔ اس کے کپکپاتے لبوں سے بے اختیار یہ الفاظ برآمد ہوئے۔

”دشش... شہزی! ای ی... یہ کک... کون؟“ اس کی بات پر میرے ہونٹوں پہ ایک مجبوری مسکراہٹ ابھری اور اسی لہجے میں بہت دھیرے سے بولا۔

”زہرہ...! یہ میرے بابا ہیں... تاج دین شاہ...“

”او... میرے خدا!“ ایک بار پھر اس کے مرتعش لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ”کک... کیا واقعی ایسا ہے؟“ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

”ہاں زہرہ! یہی وہ میری شناخت ہے جس نے اب تک میرے شخص کو نامکمل رکھا ہوا تھا، وہ آج تکمیل کو پہنچا۔ انہیں آرام اور مناسب علاج کی ضرورت ہے۔ ابھی آپ ماں جی سے کچھ مت کہنا، پہلے ان کی حالت ذرا سنبھل جانے دو۔“

اس نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا اور اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

زہرہ بانو نے اسی وقت ایک فی میل اور میل نرس کا بندوبست کرنے کی ہدایت جاری کی اور ساتھ ہی اپنے ایک مشہور فیملی فزیشن کو کال کر ڈالی۔ بابا جان اس وقت... ہوش میں تو تھے۔ مگر کمزوری اور نقاہت کے باعث ان سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا، وہ بھی اپنی بوڑھی آنکھوں سے مجھے اور اطراف میں حیران سی نظروں کے ساتھ دیکھنے لگتے تو کبھی یک دم خالی الذہنی کی کیفیت کی حالت میں اپنے گرد و پیش سے لاتعلق سے ہو جاتے۔ اس وقت میں نے بھی ان سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں جانا تھا، انہیں ایک صاف

ستھرے کمرے میں لے جا کر آرام دہ بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ مذکورہ دونوں ملازموں کو زہرہ بانو نے کچھ خاص ہدایت و تاکید کی اور پھر میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئی۔ شکیلہ کو بھی آرام کی ضرورت تھی، اُسے بھی اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا اور ایک جوان مستعد لڑکی کو اس کی ڈریسنگ وغیرہ کی ہدایت کر دی۔

میں خود بھی تھکا ہوا تھا۔ میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ میں زہرہ بانو کے ساتھ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا، اُس نے بھی میری پُرتکان مسافت کا اندازہ لگا لیا تھا اور مجھے بھی آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی بھی دو تین بار کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو پایا۔ نئے حالات کو فیس کرنے کے لیے میرا آرام کرنا ضروری تھا لہٰذا میں بیڈ پر گرتے ہی سو گیا۔

☆☆☆

صبح میں تقریباً دن چڑھے سوتا رہا تھا اور خود ہی نیند پوری ہونے کے بعد آنکھ بھی کھل گئی تھی، میرے سیل پر تین عدد مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ ایک تو آنسہ خالدہ کی تھی، دوسری میجر باجوہ اور تیسری انجان کال تھی۔ میں نے سب سے پہلے آنسہ خالدہ کا نمبر ملایا اور شکر تھا کہ اس سے رابطہ ہو گیا۔

کچھ معذرتی کلمات کے بعد اسی نے... گفتگو کی ابتدا کی... ”مسٹر شہزاد...! آج سے ٹھیک نو روز بعد عابدہ کو کورٹ میں پیش کیا جانے والا ہے۔ تم نے عارفہ کی گواہی کے سلسلے میں کیا کیا...؟“ عابدہ کے ذکر پر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ اسے کورٹ میں پیش کرنے کی خبر سن کر میری پیشانی پر پُرتشویش سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”میں نے اس سلسلے میں عارفہ سے ملاقات کی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ یہ کہتے ہوئے ایک گولا سا میرے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

”پھر کیا ہوا...؟“ آنسہ خالدہ کے لہجے میں بھی تفکر آمیز بے چینی تھی، جسے محسوس کرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔

”عارفہ کے بارے میں تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میری اس کے ساتھ کچھ کنڈیشنل قسم کی صورتِ حال ہے، اُس کی مرضی کو اپنی راہ میں ہموار... کرنے کے لیے مجھے کچھ مخصوص ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جس کی میں بہرحال کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی

چمڑی جائے پر دمڑی نا جائے

ایک یہودی بسترِ مرگ پر پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ بیوی اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ مرنے سے چند منٹ قبل اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا اور بیوی سے بولا۔ ”ڈارلنگ میرے کمرے میں اس وقت اور کون موجود ہے؟“

”سبھی موجود ہیں۔“ بیوی نے جواب دیا۔

”کیا شائل بھی یہیں ہے؟“

”ہاں شائل بھی ہے۔“

”کیا ڈیوڈ بھی ہے؟“

”ہاں ڈیوڈ بھی ہے۔“

”کیا جیکب بھی موجود ہے؟“

”ہاں جیکب بھی موجود ہے۔“

یہودی کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی۔ ”پھر دکان پر کون ہے؟“ اور اس چیخ کے ساتھ ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

محمد عفان آزاد، کراچی

نظم راشد

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمک دوڑ گئی اور وہ چیخ کر کہنے لگے۔

”راشد صاحب! راشد صاحب! ذرا باہر تشریف لائیے۔“ شور سن کر ن م راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے گرد جمع ہو گئے۔

”راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔“ منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل، خدا کی قسم! سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔“

قاران اظہار، حیدر آباد

صورت نکل آئے گی۔'' یہ کہتے ہوئے خود مجھے اپنی آواز اور لہجہ بد اعتمادی کا شکار محسوس ہوا تھا۔ دوسری جانب سے آنسہ خالدہ نے فوری جواب نہیں دیا تاہم ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ہمکاری خارج کرنے کے انداز میں وہ بولی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں اب، وہاں کی کیا صورت حال ہے، یہ تم ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو، میں نے تمہیں انفارم کرنا تھا، جتنی جلد ہو سکے، عارفہ کو عابدہ کے عدالت میں پیش ہونے سے کم از کم تین دن قبل امریکا میں ہونا چاہیے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا...'' میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے جواب دینے کی کوشش چاہی تو دوسری جانب سے اس کی بھی کچھ تھکی تھکی سی آواز اُبھری۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو... میں اور عابدہ کا وکیل اب بے چینی سے عارفہ کے منتظر ہیں۔ اور کوئی بات...؟''

اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا تو مجھے فوراً ہی یہ تکلیف دہ سا احساس ہوا کہ آنسہ خالدہ بھی میری طرف سے کچھ مایوس سی ہو رہی تھی۔ میں اُس سے مزید کچھ کہہ سکا نہ پوچھ پایا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

آنسہ خالدہ کوئی معمولی خاتون نہ تھی۔ امریکی میڈیا اور خبر رساں ادارے کی بین الاقوامی رپورٹر تھی۔ محض تسلیوں اور تاویلوں سے خوش ہونے کے بجائے حقیقت پر نگاہ رکھتی تھی، کس وقت کیا اور کیسے ہونا چاہیے، اس کا اُسے بہ خوبی ادراک تھا۔ کسی بھی قسم کی تمہید و توضیح میں پڑے بغیر وہ صرف مقاصد پر نگاہ رکھتی تھی۔

عارفہ نے مجھ سے سوچنے (بالفاظ دیگر سیٹھ نوید سانچے والا سے مشورہ لینے) کی مہلت مانگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے کافی مہلت دے چکا ہوں اور اب اس کا جواب مجھے حاصل کرنا چاہیے تھا۔

بابا جان کی بازیابی کے بعد میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے اعتماد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ یہ اعتماد مجھے اپنے آپ سے زیادہ اس پاک ذات رب کریم پر تھا جو ہر کڑے وقت میں میری دست گیری فرماتا تھا، مجھے اُمید تھی کہ وہ عابدہ کے سلسلے میں بھی میری مدد ضرور کرے گا۔ رب کریم پر یہی اعتماد میری ان گنت پریشانیوں کا بوجھ ہلکا کیے ہوئے تھا۔

دوسری مسڈ کال میجر باجوہ صاحب کی تھی، لہٰذا خالدہ سے بات کرنے کے بعد میں نے ان سے بھی رابطہ کر لیا اور بتایا کہ میں اُٹھا ہوا نہیں تھا۔

''کوئی بات نہیں جنٹلمین!'' وہ ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے بولے۔ مشن کی کامیابی اور اپنا اہم ''قیدی'' سندر داس حاصل کرنے کے بعد ان کی خوش دلی لوٹ آئی تھی۔ وہ مزید بولے۔ ''میں سمجھ گیا تھا اسی لیے میں نے خود ہی کال ڈس مس کر ڈالی تھی، خیر! یہ بتاؤ ہمارا ہیرو کیسا اور کس حال میں ہے؟'' میں جان گیا کہ وہ ''ہیرو'' کسے کہہ رہے تھے۔ اس میں کیا شک تھا کہ بابا جان ملک و قوم کے ہیرو ہی تو تھے۔ ایک ایسے ہیرو جو غازی تھے۔

''وہ بالکل خیریت سے ہیں اور ایک ڈاکٹر جو فزیشن اور ماہر امراض ضعیفاں بھی ہیں، ان کے لیے بلائے گئے ہیں۔''

''ویل جنٹلمین! یہ بہت اچھا کیا۔'' وہ بولے۔ ''ہماری ایک میڈیکل کور کی ٹیم تاج دین شاہ کا میڈیکل چیک اَپ کرنا چاہتی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہم ذرا اپنے طور پر کچھ تصدیق اور تجزیے کے بعد اپنے اس عظیم ہیرو کو قومی سطح پر ڈکلیئر کرنا چاہتے ہیں... برا نہ منانا جنٹلمین! یہ ایک جسٹ انفارملٹی ہوگی، ورنہ بھلا ایک باپ کو اپنا بیٹا اور ایک بیوی کو اپنا شوہر پہچاننا ہی کافی ہے مگر کچھ قانونی معاملات نمٹانے کا بھی اپنا ایک انداز ہوتا ہے۔''

''جی سر! میں سمجھ گیا۔ اس میں برا منانے کی بات نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ بتائیں کیا آپ کی ٹیم ادھر ہی معائنہ کرنا چاہتی ہے یا...'' میں نے کہتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ یک بیک ترنت بولے۔

''یہ معائنہ ہیڈ کوارٹر کے میڈیکل سیکشن میں کیا جائے گا جہاں ہمارے کچھ اعلیٰ افسران کے علاوہ صدر مملکت بھی شامل ہوں گے، کیونکہ میں نے کہا تھا ناں کہ تاج دین شاہ کے لیے اعلیٰ اعزاز کا بھی ادھر ہی فیصلہ کیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے سر! تو میں بابا جان کو لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔''

''بالکل نہیں، میں اس عظیم ہیرو کو لینے کے لیے خود آؤں گا... اپنی ٹیم کے ساتھ، اور ہاں ایک اور بات...'' وہ بولے۔ ''تمہیں تو موجود ہونا ہے، لیکن تمہاری والدہ صاحبہ کی بھی اس میں شرکت لازمی ہوگی۔ اسی لیے اب تم مجھے بتاؤ گے کہ میں کب تک آ جاؤں؟'' میں ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ انہیں معلوم ہی تھا کہ میرا آج کل کہاں ٹھکانا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں نے ابھی تک ماں جی کو بابا جان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ کچھ سوچ کر بولا۔

''سر! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے تو

بڑی خوشی کی بات ہوگی کہ بہ حیثیت من حیث القوم کے ہم اس عظیم ہیرو کو خراج تحسین پیش کریں، لیکن سر! مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہوگا، ایک تو میں ابھی تک کسی وجہ سے ماں جی کو اس حقیقت کے بارے میں نہیں بتا سکا ہوں، دوسرا یہ کہ میں خود ابھی ذرا دیر پہلے ہی سو کر اُٹھا ہوں، بس، سر! آپ مجھے صرف آدھا گھنٹا عنایت کر دیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے اس سے پہلے ہی خود رابطہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔"

"رائٹ! کوئی بات نہیں ہم انتظار کر لیتے ہیں۔ بیسٹ آف لک۔" کہنے کے بعد اُنہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں بیڈ سے اُٹھا اور اپنے دھیان میں واش روم کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک کچھ یاد کر کے میں رکا، اور پلٹا، سیل اُٹھا کر دیکھا، میں اس تیسری مسڈ کال کو بھولنے لگا تھا، جو اَن نون نمبر کی تھی۔ نہ جانے یہ کس کی کال تھی؟ پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا سیل بے پروا انداز میں خالی بیڈ پر... پھینکا ہی تھا کہ میرا سیل گنگنایا۔ میں چونکا، جھک کر سیل اُٹھا کر ڈسپلے پر دیکھا اور یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا، کال اسی "اَن نون" نمبر سے آرہی تھی۔

"ہیلو..." بالآخر میں نے سیل اپنے کان سے لگاتے ہوئے کہا تو دوسری طرف سے ایک شناسا سی گمبھیر آواز اُبھری۔

"تم یقیناً اپنی شان دار کامیابی کا جشن منا رہے ہوگے... بدھائی ہو... میں نے تمہیں اس کی مبارکباد دینے کے لیے فون کیا تھا۔"

کرنل سی جی بھجوانی کی آواز سن کر جانے کیوں میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کے بہ ظاہر ٹھہرے ٹھہرے طنزیہ لہجے سے بھی صاف عیاں تھا کہ وہ اندر سے کس قدر خار کھائے ہوئے ہے۔

"کامیابی کا جشن تو میں اس وقت ہی مناؤں گا جب میں تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کروں گا سی جی کتے!" میں نے پُرغیظ لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے اس کی بھی بھیڑیے جیسی غراہٹ لیے آواز اُبھری۔

"بہت زعم ہے تمہیں اپنے آپ پر... نیڈی ایجنٹ! ایک لنگڑے لولے اپاہج اور بے کار آدمی کو پا کر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی خطرناک غلطی کبھی مت کرنا۔ نہیں جانتے تم کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ دشمنوں کی یہ چھوٹی موٹی فتوحات ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ رہی بات میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کی تو میں اس گھڑی کا بے چینی سے منتظر رہوں گا لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک تحفہ ضرور دینا چاہتا ہوں..."

اس مردود خبیث کی آخری بات پر میں اندر سے بے چین ہو گیا کہ نجانے یہ کون سا "تحفہ" دینے کی بات کر رہا تھا؟ اب اس کے پاس میرے لیے کیا باقی بچا تھا بھلا...؟

تاہم مجھے اس خبیث کے لہجے میں چھپی ایک گیدڑ بھبکی محسوس ہوئی تھی، جسے بھانپ کر میں نے بھی اسے ترکی بہ ترکی جواب دے ڈالا۔

"ابھی تو تم میرے اس تحفے کے چھن جانے کا جشن مناؤ سی جی بھجوانی! جس کا خواب تمہارے لیے شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہو سکا اور... جس کے حصول کے لیے تم نے نجانے کیسے کیسے اوچھے ہتھکنڈے بھی استعمال کر ڈالے تھے، لیکن چچ... چچ... افسوس!"

میں نے آخر میں استہزائیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ اَدھورا چھوڑا تو دوسری طرف سے اس کی خار کھائی ہوئی غراہٹ کے سوائے کچھ سنائی نہ دیا، تاہم ایک لمحے کے بعد ہی اس کی پھنکارتی آواز اُبھری۔

"کرنل سی جی بھجوانی کا دوسرا نام بھنیر ہے نیڈی! جو اپنا انتقام لینا کبھی نہیں بھولتا، خاطر جمع رکھو، بہت جلد میں سود کے ساتھ تمہیں یہ سب لوٹانے والا ہوں..."

یہ کہتے ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے اپنے کان سے فون ہٹا دیا اور چند ثانیے اسی طرح اسے ہاتھ میں پکڑے، ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے سرسراتے اور زخم خوردہ لہجے میں چھپی آتش انتقام کی تپش کوئی گل کھلانے کا ہی پیش خیمہ لگتی تھی۔ جو وہ کسی "تحفے" کی صورت مجھے دینا چاہتا تھا۔ وہ تحفہ کیا تھا؟ مجھے اس کا ابھی تک کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے اس پر اور اس کے تحفے پر لعنت بھیجی اور سیل دوبارہ بیڈ پر پھینک کر واش روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

بارہ بجے تک میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ ایک خوش کن خبر میری منتظر تھی۔ اول خیر وغیرہ بھی کمیل دادا کو لے کر بہ خیریت بیگم ولا پہنچ چکے تھے اور اس کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔ زہرہ اور شکیلہ جاگ چکی تھیں اور انہی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ لوگ سب آج گیارہ بجے تک پہنچ چکے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ "بیگم ولا"

صرف ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی عظیم الشان کوٹھی ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ایک چھوٹی اسٹیٹ کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے رقبے میں ہی نہیں بلکہ اس میں موجود دیگر سہولیات کے علاوہ جدید خطوط پر اس کی سکیورٹی الارمنگ سسٹم سے لے کر اسے قلعے جیسی مضبوطی کے بھی اقدامات اُٹھائے جاتے رہے تھے۔ اب یہ ایک قلعہ نما اسٹیٹ ہی کا منظر پیش کرتی تھی۔ اس میں جدید طبی سہولیات سے لے کر ہر قسم کے ضروری اور فوری روابط کے علاوہ ایسے اہم کو ٹیکنکس بھی نتھی کیے گئے تھے جو ایمرجنسی کی صورت میں مستعمل ہوتے تھے۔

میں سب سے پہلے ماں جی سے ملا، وہ اپنے کمرے میں تھیں۔ یہاں ان کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر خوشی و طمانیت کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔

"کیسا ہے تو شہزی پتر؟ کدھر غائب رہتا ہے سارا سارا دن؟" وہ ممتا بھری شفقت سے بولیں اور میں بڑی محبت اور عقیدت سے ان کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ماں جی کتنا خوش ہوں گی جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کا سہاگ زندہ سلامت اسی چھت تلے موجود تھا، جہاں وہ خود بھی موجود تھیں بلکہ میرا باپ... وہ کتنا خوش ہوگا، جب وہ اپنے برسوں بچھڑے کنبے کو ایک چھت کے نیچے دیکھے گا... کس قدر دیدنی منظر ہوگا یہ ہم ماں بیٹے اور باپ کے لیے... نہیں ہوگا تو ایک لئیق شاہ... آہ... کاش! میرا یہ دلارا بھائی بھی آج زندہ ہوتا تو... یہ سوچ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیا ہوا میرے لعل...؟ تو... رونے لگا، کیوں...؟" ماں کی ممتا بھری نگاہوں سے میرے آنسو بھلا کیسے چھپے رہ سکتے تھے۔ وہ مجھے اس طرح روتا دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے چند قدم بڑھائے اور ماں کے پائنتی بیٹھ کر ان کے قدم چھو کر محبت بھری رقت سے بولا۔

"ماں! یہ خوشی کے آنسو ہیں... سمجھو تو آج خوشی کا دن ہے، لیکن ڈرتا بھی ہوں کہ... کہ آپ پتا نہیں اس خوشی کو کیسے برداشت کر پائیں گی؟ اس لیے کچھ کہہ نہیں پا رہا، کچھ بتا نہیں پا رہا ہوں میں..." میری بات پر ماں کے پُرنور چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزرا۔ وہ بیڈ کے گاؤ تکیے کے ساتھ اپنی پشت لگا کر اُٹھ بیٹھی تھیں، اور ایک اُلجھن آمیز حیرت کا رنگ لیے وہ پہلے تو یک ٹک میرا چہرہ تکتی رہیں پھر اسی لہجے میں بولیں۔

"پتر شہزی! تت... تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں سمجھ نہیں رہی؟"

میں نے اپنی جذباتی کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کی اور مسکرا کر کہا۔ "ماں جی! آج واقعی خوشی کا دن ہے، آپ کے لیے بھی اور میرے لیے بھی، بس! خوشی کی برکتوں کے لیے دعا کریں، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں..."

یہ کہہ کر میں ماں کے قدموں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے جھک کر ان کی پیشانی کو چوما اور پلٹ کر ان کے کمرے سے باہر آ گیا۔

زہرہ بانو میری منتظر تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی... ڈاکٹر کے بارے میں پوچھا تو وہ ہولے سے مسکرا کر بولی۔ "وہ آیا تھا اور بابا جانی کو دیکھ کر جا بھی چکا۔"

"کیا کہا اس نے بابا جان کے بارے میں؟ کوئی ایسی تشویش والی بات تو..."

"بالکل نہیں۔" وہ میرا جملہ اُچک کر بولی۔ "بابا جانی اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں، بس! ذرا کمزوری اور پیش آمدہ حالات کی وجہ سے کچھ کھوئے کھوئے اور خالی الذہنی کی کیفیات سے دوچار ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان نے تسلی دی ہے کہ ان کی یہ کیفیت عارضی ہے، اُنہوں نے کچھ ضروری ہدایات کے ساتھ دوائیں تجویز کی ہیں، جو میں نے اُسی وقت منگوالی تھیں، جن کے باقاعدگی کے استعمال سے وہ بہت جلد بھلے چنگے ہو جائیں گے۔"

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔ تاہم زہرہ بانو کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے استفسار یہ بولا۔

"ان کی یادداشت سے متعلق ڈاکٹر سلیمان نے کوئی اُمید دلائی ہوگی...؟"

"ہاں! کیوں نہیں، اُمید تو دلائی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ سب اتنی جلدی تو ممکن نہیں مگر وقت گزرتے کے ساتھ ان شاء اللہ... بابا جانی کی یادداشت بحال ہو جائے گی۔"

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ کچھ بول بھی نہیں پا رہے ہیں؟ کہیں خدانخواستہ ان کی زبان..." میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ بولی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلیمان نے ان کا اچھی طرح جسمانی معائنہ بھی کیا ہے، انہوں نے اس کے بارے میں بھی وہی تسلی دی ہے کہ یادداشت کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ گویائی بھی متاثر ہوئی ہے، وہ بھی آہستہ

آہستہ ہی بحال ہو جائے گی، درحقیقت ظالموں نے انہیں بہت ٹارچر کیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے بڑے سائنٹیفک طریقے استعمال کیے تھے، ان کی زبان کھولنے کے لیے طرح طرح کے انجکشن لگائے گئے تھے، مائنڈ کنٹرول ٹیکنالوجی کے حربے بھی آزمائے گئے تھے مگر یہ غیر معمولی قوتِ ارادی تھی ان کی کہ دشمنوں کو کامیابی نہ ہو سکی لیکن بے فکر رہو، ڈاکٹر سلیمان کو میں جانتی ہوں وہ کبھی بھی جھوٹی تسلی نہیں دیتے، یہ جلد ری کور ہو جائیں گے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" میرے اندر دل کی گہرائیوں سے یہ آواز برآمد ہوئی تھی۔

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" زہرہ بانو بولی اور میں نے زیرِ لب آمین کہا، پھر اسے میجر باجوہ کی باتوں سے آگاہ کیا تو وہ بھی خوش ہو کر بولی۔

"یہ تو واقعی اچھی بات ہے۔ زندہ قوموں کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔"

"بے شک۔" میں زیرِ لب مختصراً بولا اور بابا جان کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مجھے لیے اُن کے کمرے میں آ گئی۔

وہ خاصا کشادہ اور آرام دہ کمرا تھا، ضرورت کی ہر شے سے مزین اور آراستہ بھی۔ کمرے میں اے سی کے علاوہ گیس ہیٹر بھی نصب تھا۔ سردی کی وجہ سے ہیٹر آن تھا اور کمرے کی فضا گرم اور سکون آور ہو رہی تھی، بابا جان جاگ رہے تھے اور ایک بڑے سے آرام دہ نرم بیڈ پر گاؤ تکیے کے ساتھ پشت ٹکائے بیٹھے تھے اور ایک نرس باؤل ہاتھ میں لیے ان کے قریب موجود تھی اور چمچ کے ذریعے کوئی رقیق سی قوت بخش خوراک انہیں کھلا رہی تھی۔ زہرہ بانو نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

میری نظریں بابا جان پر جم کر رہ گئی تھیں... بلاشبہ ان کا یہاں پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ بابا جان کی اب سنبھلی سنوری حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ انہیں غسل وغیرہ کے ساتھ ان کے داڑھی مونچھوں کی کٹنگ بھی کرا دی گئی تھی اور نئے اُجلے کپڑے بھی پہنا رکھے تھے۔ اس "تراش خراش" کے بعد ان کی جو صورت نکلی تھی، اس کی شبیہ مجھ پر پڑتی تھی۔ میں انہیں دیکھ کر چند لمحوں کے لیے مبہوت رہ گیا تھا۔

"دیکھو تو ذرا شہزی!"

ایسے میں اچانک میرے قریب کھڑی زہرہ بانو جیسے کہیں کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ اس کی نگاہیں بھی خالی خالی نظروں سے ہماری طرف تکتے ہوئے بابا جان پر جمی ہوئی تھیں۔

"بالکل وہی چہرہ، وہی آنکھیں اور ایسا ہی دراز قامت، چوڑے کاندھے، فراخ پیشانی اور ویسی ہی عزم حوصلے سے سرشار روشن آنکھیں، جیسا میرا لئیق شاہ تھا... اور... اور... جیسے تم ہو... شہزاد احمد خان... عرف شہزی...

"سنو شہزی! میجر صاحب سے کہنا کہ ان کا تجزیہ کروانے کی کیا ضرورت ہے بھلا...؟ میرا دل چیر کر وہ دیکھ لیں، جو اس عظیم انسان کو دیکھ کر کہہ رہا ہے کہ یہی میرے لئیق شاہ کا اور تمہارا باپ اور وطن کا بہادر و دلیر سپاہی... تاج دین شاہ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے فرطِ جذبات سے زہرہ بانو کی آواز لرزنے لگی۔

"بے شک زہرہ! تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔" میرے ہونٹوں سے بھی بے اختیار برآمد ہوا۔ "جب میں نے انہیں پہلی بار چھوا تھا تو ان کے لمس سے مجھے بھی ایک نرم، میٹھی اور مہربان سی غیر مرئی شفقت کا احساس ہوا تھا اور میرا دل بھر آیا تھا، تب پھر اسی وقت جیسے خون کی کشش نے جوش مارا تھا اور میری رگوں میں ایک جوار بھاٹے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی، بالکل اسی طرح جیسے مدوجزر کے وقت کھلے آسمان تلے طاق چاند کو چھونے کے لیے بیکراں سمندر کی موجیں جوبن پر آنے لگتی ہیں اور پورے چاند کی کشش اُسے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں۔"

"آؤ شہزی! قریب آؤ ان کے... شاید تمہاری طرح ان کا خون بھی اپنے لختِ جگر کو دیکھ کر جوش مارنے لگے۔" کہتے ہوئے زہرہ بانو نے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے بابا جان کے بیڈ کے قریب بڑھنے لگے۔

میں نے دیکھا بابا جان اسی طرح یک ٹک اور اپنی گم صم سی آنکھوں سے ہم دونوں کو دھیرے دھیرے اپنی جانب بڑھتے خاموشی سے تکے جا رہے تھے۔

قریب پہنچنے کے بعد میں اور زہرہ جدا ہوئے۔ وہ اُن کے بائیں طرف جا کر قریب آہستگی سے بیٹھ گئی اور میں... بابا جان کے دائیں بازو پر اُن کے قریب بیٹھ گیا۔

میرے ہونٹوں پر ایک عقیدت بھری مسکراہٹ تھی اور میری اس مسکراہٹ میں ایک فخر کی کیفیت بھی تھی اور اس کی تہ میں دبی دُکھ کی کسک بھی۔ زہرہ بانو نے ازراہِ احترام، ان کا بوڑھا اور کمزور ہاتھ بڑی محبت سے اپنے دونوں

ہاتھوں میں تھام لیا تھا جبکہ میں نے قدرے آگے جھک کر بابا جان کی روشن پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور پھر اپنا ایک بازو آہستگی سے ان کے گلے کے گرد حائل کر دیا۔
وہ کبھی حیران اور کبھی خالی خالی نظروں سے میری طرف اور کبھی زہرہ بانو کی طرف دیکھنے لگتے۔ جب مجھ پر ان کی نظریں ٹک سی گئیں تو میں نے مسکراتے ہوئے انہیں پکارا۔
''بابا!''
اُن کی دودھیاں پڑتی سفید بھوؤں میں ایک ذرا جنبش اُبھری تھی۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں کسی نامعلوم سے تاثر کی کھوجتی ہوئی کسک نے جاگنے کی کوشش چاہی تھی۔ ضعیف لبوں پر کسی نوائے خروش نے تھرتھراہٹ جگانے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کے بعد وہی اجنبیت اور ویرانی سی اُتر آئی۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ البتہ کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں میں جنبش سی اُبھرتی مگر عبث...
''زہرہ... اتم اِدھر ہی بیٹھو، میں ماں جی کو یہاں لاتا ہوں۔'' میں نے زہرہ بانو سے کہا تو اس نے میری طرف دیکھ کر دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا ماں کے کمرے میں پہنچا۔
ماں جی ابھی تک حیران و پریشانی کی سی کیفیت میں بیٹھی تھیں، وہ بے چاری شاید انتظار کرتی رہی تھیں میرا کہ میں انہیں کب آکر کون سی خوش خبری سناتا ہوں؟
''آؤ ماں جی! آپ کو ایک نظارہ کراتا ہوں...''
کہتے ہوئے میں نے انہیں سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد ان کا ایک ہاتھ تھامے انہیں آہستہ آہستہ بابا جان کے کمرے کے قریب لے آیا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔
کمرے میں داخل ہوتے ہی ماں کی نگاہیں سامنے بیڈ پر بیٹھے بابا جان پر پڑیں اور پھر جیسے زمین نے ان کے قدم پکڑ لیے۔ وہ ایکا ایکی سکتے میں آگئیں، بس ایک ٹک اُنہیں دیکھتی رہ گئیں۔ میں ان کا ہاتھ تھامے، ساتھ کھڑا دُزدیدہ نظروں سے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا ماں جی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر زہرہ بانو بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کی بھی نگاہیں ماں جی پر جم کر رہ گئی تھیں۔
میں نے دیکھا ماں جی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہہ نکلیں، وہ اب کبھی گردن گھما کر میری جانب تکنے لگتیں تو کبھی بابا جان کی طرف موڑ لیتیں۔ تب ہی مجھے ان کی دم بخودسی لرزیدہ آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔ لہجہ گلوگیر تھا۔
''ششش... شہزی پتر! گگ... کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی...؟ مجھے بتا پتر! گگ کیا یہ منظر میری نظروں کا دھوکا تو نہیں ہے...؟''
''نہیں ماں جی! آپ اپنی نظروں کے سامنے جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ نظروں کا دھوکا نہیں، اسی طرح حقیقت ہے جیسے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں...'' میں نے جواب دیا اور تب ماں نے میرا ہاتھ چھوڑا... بے اختیار بابا جان کے بیڈ کی طرف بڑھیں... ان کے قدم ڈگمگائے... وہ گرنے کے قریب تھیں... میں انہیں سنبھالنے کو فوراً لپکا... مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ بابا جان کے بیڈ کے پائینتی پہنچ کر یوں گری تھیں کہ ان کا سر آپوں آپ میرے بابا جان کے قدموں میں جا پڑا تھا۔
اور پھر اُنہوں نے وہاں سے اپنا سر نہیں اُٹھایا، پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں وہ... میں انہیں سنبھالنے کو جھکنا ہی چاہتا تھا کہ زہرہ بانو نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں اور زہرہ اب یہ جذباتی منظر مغموم سی خاموشی سے دیکھنے لگے۔
ایک خاتون کو اپنے قدموں پر یوں جھکے دیکھ کر بابا جان کی آنکھوں میں پہلے اُلجھن اور پھر حیرت سی اُمڈنے لگی۔ ان کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ماں کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اُنہوں نے سر اُٹھا کر اشکبار آنکھوں سے اپنے سرتاج کو دیکھا۔ کچھ حیرانی سی ان کی آنکھوں میں چمکی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے انہیں ابھی بابا جان کی یادداشت متاثر ہونے سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔
''تت... تاج دین! مم... میرے سر کے تاج! مم... مجھ الم نصیب کو نہیں پہچان رہے؟ میں نویدہ ہوں... تمہاری شریک سفر... تقدیر نے ہمیں ایک طویل جدائی اور کڑی آزمائش کے بعد ملایا بھی تو کس حال میں کہ... کہ...'' ماں جی کا لہجہ رُندھ گیا۔ وہ چادر کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ ان کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر میں بھی رنجور ہو گیا۔ وہ یقیناً ایسے موقع پر اپنے بڑے بیٹے اور میرے بھائی کلیق شاہ کو یاد کر کے غمگین ہو گئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ میری جانب گردن موڑ کر بولیں۔
''شہزی پتر! یہ... یہ، مجھے پہچانتے کیوں نہیں...؟''
زہرہ بانو نے آہستگی سے اُن کے شانوں کو چھو کر کہا۔

''ماں جی! یہ ابھی کسی کو بھی نہیں پہچان پا رہے ہیں، شہزی کو بھی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ماں جی کو مختصراً بتا دیا اور ڈاکٹر سلیمان کی تشفی آمیز اُمید دلانے کا بھی ذکر کر دیا۔

ماں جی اُٹھی نہیں، وہیں بیٹھی رہیں۔ میں نے زہرہ بانو کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اُسے میجر ریاض باجوہ کی بات یاد دلائی تو زہرہ نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور مجھے کمرے سے باہر چلنے کا خفیف سا اشارہ کیا۔

''ڈاکٹر سلیمان نے یہ بھی کہا تھا کہ بابا جان کے قریبی اور شناسا لوگ جس قدر ان کے قریب رہیں گے اُتنی ہی جلدی ری کوری اور بہتری کے امکانات ہوں گے۔''

اپنے کمرے میں آکر زہرہ بانو نے مجھ سے کہا۔ ''اس لیے ماں جی کو تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ رہنے دیا جائے، ہاں! میں کچھ دیر بعد جاکر ماں جی کو سمجھا کر لے آؤں گی۔''

میں چپ ہو رہا۔ تب تک میں نے شکیلہ اور کپیل دادا کی خبر لی۔ وہ ہوش میں آچکا تھا اور مجھ سے باتیں بھی کیں اس نے۔ میں نے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا، اس کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اول خیر بھی جاگ گیا تھا۔ شکیلہ کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور ٹانگ کے زخم پر بینڈ ایج لگا دی تھی۔

ہم سب وہیں آبیٹھے تھے، جدھر کپیل دادا کا بستر لگا ہوا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر کچھ دوائیں اور انجکشن رکھے نظر آرہے تھے۔ اتنی دیر میں زہرہ بانو بھی وہیں آگئی، اُسے دیکھ کر کپیل دادا... صاحبِ فراش ہونے کے باوجود اس کے احترام میں، ذرا کسمسا کر سر تکیے سے لگا کے اپنی پشت لگانے کی کوشش کرنے لگا تو زہرہ بانو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''آرام سے لیٹے رہو... اب کیسی طبیعت ہے تمہاری...؟'' زہرہ بانو نے بردبارانہ متانت سے پوچھا اور میرے قریب والی کرسی اول خیر نے چھوڑی تو وہ اس پر براجمان ہوگئی۔

''کافی بہتر ہوں بیگم صاحبہ!'' اس نے ہولے سے جواب دیا۔ لہجہ مودبانہ ہی تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے دیکھ کر، ایسے میں ایک بار پھر میرے دماغ میں وہی بات گردش کرنے لگی جس کے بارے میں، میں کچھ دن پہلے ماں جی والے ''مسئلے'' سے متعلق میں اپنے تئیں ایک حل نکالنے کے بارے میں غور کرنے لگا تھا، مگر اس سے پہلے میں اول خیر سے ایک مشورہ ضرور کر لینا چاہتا تھا...

خوش گوار اور پُرطمانیت والے ماحول میں ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں، سب سے زیادہ خوشی ہمیں اپنی اہم ترین مہم کی کامیابی اور بابا جان کے زندہ سلامت یہاں لوٹ آنے کی تھی۔ اس دوران میں ممتاز خان اور وزیر جان کے بارے میں بھی بعض سنجیدہ نوعیت کی گفتگو ہوئی، ممتاز خان تو انٹیلی جنس والوں کی گرفت میں جا چکا تھا جبکہ وزیر جان مفرور تھا، اس کی تلاش جاری تھی۔

میجر باجوہ کی معلومات کے مطابق وہ چوہدری ممتاز خان کی بیٹی نوشابہ کے ساتھ درپردہ ''عوامی کارڈ'' کھیلنے کی سازش میں بھی مصروف تھا۔ اس دوران میں عابدہ کے بارے میں طویل گفتگو بھی ہوئی۔ طے یہی پایا کہ عارفہ سے ایک آخری ملاقات ضروری تھی۔ نیز اس کے ''ساجھے دار'' سیٹھ نوید احمد ساہنے والا... کا ذکر بھی زیرِ بحث آتا رہا۔ اس سلسلے میں خبریں یہی تھیں کہ وہ اپنی ضمانت وغیرہ کے سلسلے میں توڑ کوشش کر رہا تھا اور پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے موجود ساتھیوں کے باہمی مشورے سے میجر ریاض باجوہ سے فون پر رابطہ کر کے انہیں آگاہ کر دیا۔ اُنہوں نے دو تین دن بعد بابا جان، ماں جی اور مجھے لینے کے لیے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ کوشش تھی کہ تب تک بابا جان کی طبیعت بھی سنبھل جاتی۔ ان کا ارادہ اپنی میڈیکل ٹیم کے ذریعے پہلے بابا جان کی مکمل اور ماضی کے حالات و واقعات کی تصدیق کے بعد، اپنے اعلیٰ افسران سمیت صدرِ مملکت کو بھی آگاہ کرنے کا تھا۔ اس کے لیے انہیں کچھ ضروری نوعیت کے اُمور نمٹانے تھے۔

میجر صاحب چاہتے تھے کہ وطن کے اس گمنام اور بہادر محبِ وطن سپاہی کو پورے اعزاز کے ساتھ ملک و قوم کے سامنے متعارف کروایا جائے، جو اُن کا حق بھی تھا۔ ساتھ ہی باجوہ صاحب نے مجھے بھی یہ اُمید دلائی تھی کہ ممکن ہے مجھے بھی آرمی یا رینجرز کور میں کوئی اچھا سا عہدہ تفویض کر دیا جائے، مجھے ایسا کوئی لالچ نہیں تھا مگر میں خاموش رہا۔

اس دوران میں نے اول خیر کو اشارہ کیا اور اسے لیے اپنے کمرے میں آگیا۔

''او خیر...! کاکے! لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔'' وہ اندر آتے ہی بولا۔ خوشی کے اس موقع پر اس کی بھی خوش دلی لوٹ آئی تھی۔ میں نے کہا۔

''اول خیر! تم سے ایک سنجیدہ معاملے پر مشورہ کرنا تھا۔''

"ہاں... بول! کیا بات ہے؟ کیسا معاملہ...؟"
"دیکھ یار...! تمہیں ماں جی والی بات کا تو پتا ہی ہے ناں..."
"کون سی بات؟"
"وہی یار...! زہرہ بانو کے ساتھ میری شادی والی..." میں نے اُسے یاد دلایا تو بے اختیار اور حسبِ عادت اُس کے منہ سے نکل گیا۔
"او... خیر!"
"خیر کیسی...؟" میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ تھوڑا گڑبڑا گیا۔
"بالکل خیر نہیں ہے مگر... لگتا ہے تُو نے اس سلسلے میں کچھ سوچ لیا ہے۔" وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا۔ میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں اس کے سامنے یہ تجویز رکھ دی جو میں نے کچھ دن پہلے سے سوچ رکھی تھی۔ اول خیر نے پہلے تو میری تجویز کو بڑے غور سے سنا، اور بعد میں اچانک اس کا پُرسوچ سا چہرہ یکدم ایک زلزلے کی کیفیات سے دوچار ہوگیا۔ ہونق سی شکل بنا کر پہلے تو وہ مجھے تکتا رہا پھر تشویش زدہ لہجے میں بولا۔
"او خیر... کاکے ای ای... تجھے اتنی خطرناک پٹی کس نے پڑھا دی...؟ ضرور یہ اس کم عقل شکیلہ کا کام ہوگا؟"
"خبردار جو میرا تم نے نام لیا..." اس بلبلاتی آواز پر میں اور اول خیر دونوں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے جہاں شکیلہ ایک اسٹک کے سہارے کھڑی سلگتی نگاہوں سے اول خیر کی طرف گھور رہی تھی۔ مجھے اور اول خیر کو وہاں خاموشی سے اُٹھتے دیکھ کر وہ شاید بدک گئی تھی اور کب سے دروازے کے پیچھے لگی ہماری باتیں سنتی رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اول خیر کی طرح وہ بھی میری رازداں تھی، اور میرا اُس سے بھی اس نازک موضوع پر بات کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اس کی حالت دیکھ کر میں نے سرِدست اول خیر سے ہی صلح مشورے کا سوچا۔
"یا اللہ خیر..." اسے دیکھ کر اول خیر زیرِلب بڑبڑایا تھا۔
"میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم یہاں میری غیر موجودگی میں شہزی کے ساتھ میری غیبت کرنے میں مصروف ہو گے۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولی تو میں مسکرا کے اس سے بولا۔
"آہ... شکیلہ! ایسی کوئی بات نہیں، دراصل تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسی لیے میں نے سوچا پہلے اول خیر سے بات کرلی جائے تو بعد میں تم سے بھی۔"
"میں بالکل ٹھیک ہوں اور معاف کرنا... میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ میرا مشورہ بھی ہے کہ تمہاری تجویز سولہ آنے ٹھیک ہے۔" بڑے دبنگ انداز میں یہ کہتے ہوئے شکیلہ میرے خفیف سے اشارے پر اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے قریب آگئی۔
"نہیں کوئی بات نہیں، تمہیں تو بتانا ہی تھا۔" میں نے مصالحانہ پالیسی اختیار کرنا چاہی، کیونکہ جانتا تھا ان دونوں کے درمیان مہا بھارت چھڑ گئی تو اصل بات کا مقصد ہی "ہوا" ہوجائے گا۔
"او خیر... نہ سوچا نہ سمجھا اور سولہ آنے بات درست ہونے کا عندیہ دے ڈالا۔" اول خیر نے بسورتے منہ سے کہا۔ "او بی بی! یہ گڈی گڈے کا کھیل نہیں ہے، سوچ سمجھ کے بات کرو اور اگر کوئی مناسب تجویز نہیں دے سکتی تو منہ بند رکھو اپنا۔"
"مجھے بھی سب معلوم ہے اچھی طرح..." وہ تنک کر بولی۔ "اس میں برائی کیا ہے اگر... گبیل دادا اور زہرہ بانو..."
"اوئے... اوئے کاکی! آہستہ بول، مروائی گی کیا ہمیں؟ کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی جوتے پڑوائے گی یہاں... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، جیسے تُو ہمارے کان کتر کے یہاں اچانک آن ٹپکی ہو۔"
"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں... ایک طرح سے کارِخیر ہے یہ..."
"ٹھیک ہی تو میں تمہیں عقل کی کھوتی کہتا ہوں..." اول خیر اس مرتبہ اُسے غصے سے گھور کر بولا۔ "کارِخیر ادا کرنے کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں... اور فی زمانہ یہ عمل اُلٹی آنتیں گلے پڑنے کے بھی مترادف ہوتا ہے، غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں اور جدائیاں ہوجایا کرتی ہیں۔"
"تو میں نے کب کہا کہ ابھی جا کر زہرہ بانو یا گبیل دادا سے.... یہ سب کہہ ڈالو۔" شکیلہ تڑخ کر بولی۔ "ابھی تو میں نے صرف شہزی کی تجویز کی صرف تائید ہی کی ہے، کوئی مشورہ تو نہیں دے ڈالا کہ ایسا ہی کرو..."
"تم دونوں اگر اسی طرح بحث میں اُلجھے رہے تو اصل بات اپنے وسیع مقصد سمیت غارت ہوجائے گی۔" بالآخر مجھے درمیان میں کودنا پڑا تو دونوں خاموش ہوگئے۔
میرا خیال تھا کہ میں ماں جی کا "اصل" مسئلہ یا یوں

کہا جائے کہ اُن کی زہرہ بانو سے متعلق روایتی ماؤں والی ''فکر'' کو سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ ماں سے اس سلسلے میں میری دوسری بار ہونے والی گفتگو پر مجھے بھی ماں سے اپنے دل کی بات (عابدہ سے متعلق) کہنے کا خاطر خواہ موقع ملا تھا۔ وہ بھی اب میرے اور عابدہ سے متعلق اس ''تعلقِ خاطر'' کو سمجھنے لگی تھیں، پھر اسی دوران میں اُنہوں نے زہرہ بانو سے اپنی ''فکر'' سے متعلق مجھ سے جو گفتگو کی تھی تو تب ہی اچانک میرے ذہن میں کمیل دادا سے متعلق پہلا خیال یہی آیا تھا کہ... زہرہ بانو کے لیے کمیل دادا سے اچھا، پیار کرنے والا، بے لوث اور مخلص جیون ساتھی بھلا اور کون ہوسکتا تھا؟ یوں تو کمیل دادا کی زہرہ بانو سے محبت، یک طرفہ اور خاموش سہی... لیکن وہ اُسے بھولا نہیں تھا، کسی معصوم مگر خوف زدہ سے بچے کی طرح اس نے اپنی یک تہی محبت کو زہرہ بانو سے اب تک چھپا رکھا تھا... اُسے ڈر تھا کہ اس کا اظہار کہیں اُسے اپنے محبوب سے دور نہ کردے۔ وہ اس کی صرف چھایا تلے، قریب رہنے کو ہی اب تک کافی سمجھے ہوئے تھا۔ کمیل دادا صرف ایک بہادر اور دلیر آدمی ہی نہیں وفادار بھی تھا، وہ اپنی ''بیگم صاحبہ'' کی ہر ایک جنبشِ ابرو تلے اپنا سر خم کرنے کو تیار رہتا تھا، یہ کیا کم بات تھی کہ وہ مجھے اپنا رقیب سمجھے ہوئے تھا مگر جہاں ''بیگم صاحبہ'' کے حکم کی بات آتی، وہ سب کچھ بھول کر میرے سامنے دوزانو ہوجاتا تھا، یہی حال اس کا لئیق شاہ کے ساتھ بھی رہتا تھا۔

کمیل دادا منہ کا کڑوا سہی مگر دل کا کھرا اور سچا آدمی تھا، اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اگر میں کمیل دادا یا زہرہ بانو سے اس سنجیدہ مسئلے سے متعلق کوئی بات کروں اور وہ بن جائے تو اس سے بڑھ کر خوشی کی بھلا اور کیا بات ہوسکتی تھی۔ ماں جی کے دل کو بھی قرار مل جاتا اور زہرہ بانو کی کربِ انگیز تنہائی کو بھی کچھ سکون مل جاتا، مگر اصل بات تو یہ تھی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون اور کیسے باندھے؟ مجھ سے یہ ہی نہیں طے ہو پا رہا تھا کہ یہ نازک اور حساس بات پہلے کس سے کی جائے؟ کمیل دادا سے یا زہرہ بانو سے...؟

''میرا خیال ہے پہلے ماں جی سے یہ بات کہی جائے، وہ بہتر سمجھیں تو پھر وہ خود ہی زہرہ بانو کو یہ مشورہ دیں۔'' بالآخر شکیلہ نے آئیڈیا دیا تو حسبِ عادت اول خیر نے اُسے زچ کرنے کی خاطر، پہلے تو اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں اپنے منہ سے باریک سی آواز خارج کی، پھر بولے سے بولا۔

''یہ ماں جی سے بھی جوتے پڑوائے گی۔''

''تو پھر تم ہی کوئی صائب مشورہ کیوں نہیں دے دیتے شہزی کو...؟'' شکیلہ نے کڑوے لہجے میں اس سے کہا تو وہ بولا۔

''میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اس نازک موضوع کو سرے سے چھیڑا ہی نا جائے۔''

''نہیں، اول خیر! تم خود بتاؤ آخر ایسا کب تک چلے گا؟'' میں نے کہا۔ ''ماں جی کو سب سے زیادہ زہرہ بانو کی فکر کھائے جارہی ہے اور میں ایک طرف انہیں بھی دکھی ہوتا نہیں دیکھ سکتا، یوں بھی اگر زہرہ بانو اور کمیل دادا ایک بندھن میں بندھ جاتے ہیں تو میرا خیال ہے اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟''

''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں... یہ بہت اچھا کام ہو گا۔ زہرہ بانو کی عمر نکلی جارہی ہے، کمیل دادا ایک طرح سے ان کے انتظار میں بوڑھا ہونے لگا ہے، یہ الگ بات ہے کہ دونوں دیکھنے میں صحت مند اور جوان ہی لگتے ہیں، ہائے اللہ کتنا مزہ آئے گا، بیگم ولا میں ایک بار پھر شادیانے بجیں گے۔'' شکیلہ چہک کر بولی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میں پہلے اس سلسلے میں کمیل دادا سے بات کرکے دیکھتا ہوں، وہ کیا کہتا ہے۔'' بالآخر میں نے ایک گہری سانس خارج کرکے حتمی لہجے میں کہا اور اول خیر میرا چہرہ تکنے لگا۔ تاہم اس نے میری اس بات کی تائید ہی کی کہ مجھے پہلے کمیل دادا کو اس سلسلے میں اعتماد میں لینا چاہیے۔

آج ہی رات میں نے کمیل دادا سے اس اہم موضوع پر تبادلہ خیال اور اس کا ''عندیہ'' لینے کا فیصلہ کرلیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کمیل دادا کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بے تاثر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ کر کھلے دل سے مسکرایا تھا، میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں کہ ایکا ایکی جانے کیوں مجھے اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک عجیب قسم کا کم صم پن سا محسوس ہوا، جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی کسی گہری اور پُرتفکیر سوچ میں غلطاں رہا ہو۔ تاہم میں خاموشی سے اس کے بیڈ کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند رسمی کلمات کے بعد میں ابھی اصل بات کی طرف آنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بولا۔

''اچھا ہوا تم آگئے شہزی! میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔'' میں اس کی بات پر چونکا... کہ بات تو میں اس

سے کرنے آیا تھا مگر یہاں تو یہ مجھ سے پہلے ہی بات کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔

"ہاں... ہاں... کہو، کیا بات ہے؟" میں نے اُلجھے بغیر اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا اور ساتھ ہی کچھ بھانپتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

اس کا چہرہ بہ ظاہر مجھے سپاٹ نظر آرہا تھا لیکن اندر جانے اس کے کیا کیا ہلچل مچی ہوئی تھی، مجھے اس کا شائبہ تو محسوس ہوا تھا، مگر سبب نامعلوم تھا۔ اس نے ایک ذرا اپنی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں بھی ایک کرب ناک سا تاثر کروٹیں لیتا دکھائی دیا۔ مجھے ایک چپ سی لگ گئی، گویا میں بے چینی سے اس کے بولنے کا منتظر ہو رہا...

"شہزی! ایک بات آج مجھے سچ بتانا، جھوٹ مت بولنا، وعدہ کرو سچ بولو گے میرے ساتھ۔" میں اس کی عجیب بات پر حیران رہ گیا، آج سے پہلے کبھی میں نے اسے اتنا آزردہ خاطر اور مغموم نہیں دیکھا تھا، جتنا آج وہ مجھے نظر آرہا تھا۔

"ارے یار! کیسی بات کرتے ہو؟ میں تم سے کیا، کسی سے بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ہاں! کسی سے ناراضگی ہو تو منہ پہ ضرور بول دیا کرتا ہوں دل میں نہیں رکھتا کہ یہی میری فطرت ہے۔" میں نے جواب دیا تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

"تو پھر مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو...؟"

میری سمجھ سے یہ بات قاصر تھی کہ کمیل دادا جیسا سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی جو مجھ سے بھی بڑا لیے دیے رہتا تھا، یہ اچانک آج اسے کیا ہوا تھا؟ کیا وہ آج اپنا آپ مجھ پر کھولنے والا تھا...؟" ایک سوالیہ نشان میرے سامنے تھا۔ لہٰذا میں بھی کھلے دل اور بھرپور دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

"کمیل دادا! سچی بات کہوں گا کہ تمہاری تعریف کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ تم واقعی دادا... ہو۔ دل کے دادا، سچائی و جاں نثاری کے دادا... اور کیا کہوں تمہاری تعریف میں؟"

"سچ کہہ رہے ہو...؟"

"اللہ کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں... اور بولو؟"

"لل... لیکن میں نے تو... کبھی بھی تم سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ تمہیں برا بھلا ہی کہا، پھر بھی تم مجھے اچھا سمجھ رہے ہو؟ کیوں...؟ ایک بار پھر سوچ لو... شہزی! اگر تم مجھے اسی لیے اچھا کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہارے مرحوم بھائی لئیق شاہ کے ساتھ اور بعد میں تمہارے ساتھ جو اچھا کیا بھی تو یہ تمہاری بھول ہوگی، میں نے صرف بیگم صاحبہ کا حکم بجا لانا ہی اولین سمجھا اور بس..."

"تو کیا تم مجھے اتنا ہی نادان سمجھ رہے ہو کہ میں اتنی سی بات نہیں سمجھ رہا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کی بے تاثر سی آنکھوں میں حیرت سی جاگی اور اسی لہجے میں بولا۔

"تت... کیا، تم پھر بھی مجھے اچھا سمجھے ہوئے ہو...؟"

"یہ... آج تم کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو دادا...؟ کیا تم نے میرے رویے سے کبھی ایسا کچھ محسوس کیا ہے جس سے تم اندازہ لگا سکو کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا، یا نفرت کرتا ہوں تم سے؟"

"نہیں۔" اس نے بھی جواب دیا۔

"تو پھر؟ تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ دیکھو... تم اچھے انسان ہو، میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہاں! تم نے دوستی تو دوستی، دشمنی کا بھی ایک معیار قائم کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ تم میرے سلسلے میں ایک چھوٹی سی غلط فہمی کا شکار ضرور رہتے ہو اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ آج تم میری طرف سے اپنا دل صاف کرلو... حیرت کی بات نہیں یہ کہ تم جانتے بھی ہو کہ..."

"شہزی! مجھے تم سے کچھ کہنا تھا..." وہ میری بات کاٹ کر یکدم بولا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنی کہہ چکے اور میں اپنی صفائی پیش کر چکا...؟ اور کیا کہنا باقی ہے دوست! وہ بھی کہہ ڈالو، آج شہزادا احمد شہزی سے کچھ نہیں چھپاؤ، اسے آزما کر دیکھو، یہ تو دشمنوں تک کو معاف کر دینا والا آدمی ہے اور یاروں کا یار بھی ہے... بولو۔"

"شہزی! تم... بیگم صاحبہ سے شادی کرلو..."

کمیل دادا نے ایک دم جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا اور میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا...

☆☆☆

یہ حقیقت تھی کہ مجھے کئی ثانیے تک تو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ کمیل دادا نے مجھ سے یہ کہا کیا تھا؟ اور کیوں...؟ میں تو خود اس سے یہ سب کہنے آیا تھا اور پھر مجھے تو اس کی طرف سے اس طرح کہنے کی رتی بھر بھی اُمید نہ تھی اور ہوتی بھی بھلا کیسے...؟ کمیل دادا اور میری آپس

کی رنجش ورقابت کی بنیاد ابتدا سے ہی اسی بات پر تو تھی کہ وہ زہرہ بانو سے محبت کرتا تھا۔ اس کی یہ محبت میرے آنجہانی بھائی لئیق شاہ سے بھی پہلے کی تھی۔ مگر وہ لئیق شاہ کو چاہنے لگی تھی اور کمیل دادا اپنی خاموش وفا کو اسی طرح اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا، پھر لئیق شاہ کی صورت میں جب اس نے مجھے دیکھا اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ زہرہ بانو کا جھکاؤ میری طرف زیادہ ہوتا تھا تو یہ بات اسے سخت کھلا کرتی تھی، آج وہی کمیل دادا مجھے زہرہ بانو سے شادی کا مشورہ دے رہا تھا جو میرے لیے بہرحال غیر متوقع ہی بات تھی۔

''یہ یہ... تم کیا کہہ رہے ہو کمیل دادا...؟ ہوش میں تو ہو تم...؟''

بالآخر میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور میرے لہجے میں سختی بھی عود کر آئی۔

''میں پوری طرح سے ہوش میں ہوں اور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں...''

''بکواس کر رہے ہو تم۔ یہ ناممکن ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ میں کسے چاہتا ہوں؟''

''جانتا ہوں، تم عابدہ کو چاہتے ہو مگر وہ...'' کمیل دادا اچانک کچھ کہتے کہتے رکا، پھر اپنا سر تکیے پر سیدھا ٹکا دیا اور بڑے حزن وملال کی سی کیفیت میں بولتا چلا گیا۔

''شہزی! تم نہیں جانتے کہ بیگم صاحبہ ہر روز کس کرب سے گزرتی ہیں۔ لئیق شاہ کے مرنے کے بعد سے اب تک وہ اُسے ایک پل کے لیے بھی نہیں بھول سکی ہیں۔ میں نے ان کا بہت دل بہلانے کی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہا، پھر تم سامنے آگئے۔ مجھے ان کا زخم ایک بار پھر ہرا ہوتا محسوس ہوا۔ مجھے تم سے اس بات کی چڑ نہیں تھی کہ تمہیں میں اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ جسے سمجھتا تھا وہ تو چلا گیا تھا دنیا سے مگر تم سے میری رقابت کی وجہ اور تھی شہزی...'' وہ اتنا کہہ کر رکا، میری یک ٹک نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، اس کا فقط آدھا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا تھا، باقی نصف تکیے کے دوسرے رخ پر تھا، اور میں اس کی ایک آنکھ سے آنسو بہتا دیکھ رہا تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ کمیل دادا جیسا خاموش طبع، لیے دیے رہنے والا، آج میرے سامنے خود کو پرت در پرت کھول رہا تھا... اور میں بھی خاموشی سے اس کی سن رہا تھا، تاکہ وہ آج پوری طرح میرے سامنے کھل جائے، اپنا بار اپنے دل کا بوجھ اُتار پھینکے...

''شہزی! میں تم سے صرف اسی لیے خار کھاتا تھا کہ تمہاری وجہ سے بیگم صاحبہ کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا تھا۔ تم اس کے لیے ایک طرف تو راحت کا باعث تھے تو دوسری طرف ان کے دل کا کرب بھی جگانے کا سبب تھے۔ میں اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ ہوسکے تو تم بیگم صاحبہ کو اپنا لو... میں اُنہیں مزید دُکھی اور غمگین نہیں دیکھ سکتا...''

میں کمیل دادا کی اس ادا پر اش اش کر اٹھا۔ کیسا سچا عاشق تھا یہ... جو اپنے محبوب کی خوشی کی خاطر اپنی محبت کو کس انوکھے طریقے سے قربان کر رہا تھا۔ آفرین ہے اس شخص پر، جس نے نجانے کتنے عرصے تک یک طرفہ محبت کی صلیب کو اپنے گلے سے لٹکائے رکھا تھا اور... وہ آج صحیح معنوں میں ایک سچے محبوب کی تصویر نظر آرہا تھا مجھے۔

میں نے کہا۔ ''کمیل! مجھ سے جھوٹ مت بولنا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم بیگم صاحبہ سے محبت کرتے ہو، شدید محبت۔'' میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکا سا خوف کا شائبہ نمودار ہوا، وہ مجھ سے جیسے نظریں چرانے لگا۔ بولا کچھ نہیں، شاید اندازہ اُسے بھی تھا کہ بھلا عشق و مشک کب چھپتا ہے لیکن یہاں معاملہ کمیل دادا کا یک طرفہ عشق تھا اور اُسے اسی لیے بھی زعم تھا کہ یہ راز اس کے سینے میں ہی چھپا رہے گا۔ اس کی ''چپ'' کو ایک اعترافی خاموشی پر محمول کرتے ہوئے میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''کمیل دادا! تمہارا اپنا اس بارے میں کیا خیال ہے...؟''

''کس بارے میں؟'' اس نے ایک بار پھر تکیے پر اپنا سر رکھے رکھے میری جانب گردن گھما کر دیکھا تو میں بولا۔

''کیسی عجیب بات ہے کمیل دادا کہ جس نازک موضوع پر میں تم سے بات کرنے آیا تھا تم نے بھی آج وہی موضوع چھیڑ دیا... مجھے تو ڈر سا لگ رہا ہے کہ نجانے تقدیر اور کتنے گل کھلانے والی ہے...''

''تم مجھ سے کون سی بات کہنا چاہتے تھے؟'' اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی اور بالآخر میں نے اس سے وہی کہہ ڈالا جس کا میں ارادہ کر کے یہاں تھا۔ وہ میری بات سنتے ہی جیسے بھونچکا... سا رہ گیا، کئی لمحے تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا... اور پھر میں نے دیکھا کہ۔ اگلے ہی لمحے ایک عجیب بات ہو گئی... کمیل دادا دوبارہ اپنا سر تکیے پر سیدھا کر کے ہنسنے لگا اور ہنستا ہی چلا گیا... یوں جیسے پاگل ہو گیا ہو...

''کیا بات ہے؟ ہنس کیوں رہے ہو تم؟'' میں نے

قدرے متانت سے کہا تو وہ اپنی ہنسی کو ایک دم روک کر اسی طرح لیٹے لیٹے خالی نظروں سے چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔

"جو بات میں پچھلے کئی سالوں سے لے کر اب تک بیگم صاحبہ سے نہ کر سکا وہ بھلا اب کیا کروں گا؟"

"تم بزدل ہو، محبت کرنے والے شیر جیسا دل رکھتے ہیں۔" میں نے ازراہِ تفنن کہا۔

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر مجھے بذلہ سنجی سے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا، تاہم دوسرے ہی لمحے سنجیدگی سے بولا۔

"تم نے بات تو مذاق میں ہی کہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقت بھی یہی ہے... میں واقعی اس معاملے میں کورا اور بزدل ہوں۔ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا اور اتنا ہی میرے دل میں یہ خوف بھی گھر کر گیا کہ کہیں میرا اظہارِ محبت مجھے اپنے محبوب سے دور ہی نہ کر دے۔"

میں نے اسے بغور دیکھا۔ بیڈ پر دراز لمبے چوڑے جثے اور میچورڈ سی شخصیت کا مالک، اس سے یہ بات کہتے ہوئے مجھے بالکل ایک چھوٹا سا معصوم بچہ ہی نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔ "اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اگر تم کہو تو ہم اس سلسلے میں کچھ کریں؟"

"ہم کون؟" اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اور... کون کون ہے تمہارے ساتھ؟ کک کیا اُنہیں بھی معلوم ہے کہ..." وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ میں درمیان میں بول پڑا۔

"کون کون نہیں، سب اپنے ہی ہیں، اور تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے دل کی بات بھلا چھپی رہ سکتی ہے؟"

"جب بیگم صاحبہ سے آج تک چھپی ہوئی ہے تو... بھلا دوسرا کوئی کس طرح جان سکتا ہے..."

"یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے..." میں نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر اچانک اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں سی نمودار ہوگئی، بالکل بچوں جیسا خوف۔

"کک... کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ہاں... یہ تمہاری بھول کہ زہرہ بانو یعنی بیگم صاحبہ کو تمہاری اس ادا کا علم نہیں ہے" بالآخر میں نے کہا۔

رفتہ رفتہ میرے اور کمیل دادا کے درمیان ہونے والی گفتگو نازک مرحلے میں داخل ہونے لگی تھی۔ کیونکہ اس بات کا انکشاف کمیل دادا پر کوئی معمولی بات نہ ہوتی کہ اس کے سینے میں چھپی آتشِ عشق سے زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) بے خبر ہے۔ میں درحقیقت اس کا حوصلہ بڑھانا چاہ رہا تھا۔

"تت... تمہیں کیسے پتا؟"

"بس! ہے پتا مجھے۔"

"تمہیں پتا ہے، تم کیا کہہ رہے ہو...؟"

"چھوڑو یہ باتیں کمیل! بہت پرانا ہو چکا یہ سب... تم کہو تو میں اور ماں جی زہرہ بانو سے اس سلسلے میں بات کریں؟"

"نہیں، پہلے مجھے بتاؤ۔ اتنی بڑی بات تم کس برتے پر اتنے یقین سے کر رہے ہو؟" وہ اب تکیے سے پشت لگا کر ذرا اُٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اُسے بتا دیا کہ زہرہ بانو مجھے بہت پہلے جب اپنی ماضی کی داستان سے تفصیلاً آگاہ کیا تھا تو اس بات کا بھی اُنہوں نے مسکراتے ہوئے اظہار کیا تھا کہ تم اُسے ایک "باس" سے زیادہ "چاہت" کی نظر سے دیکھتے ہو...

پہلے تو کمیل دادا کو میری اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب میں نے اُسے اس کے اپنے ماضی سمیت، اپنے بھائی لئیق شاہ اور زہرہ بانو، چوہدری الف خان، ممتاز خان وغیرہ کے بارے میں مختصراً بتایا تو کمیل دادا کے بشرے پر سناٹا چھا گیا، وہ کئی ثانیوں تک گم صم بیٹھا میرا چہرہ تکتا رہ گیا۔ اُس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اور میں اس کی اس کیفیات دگرگوں کو سمجھ رہا تھا۔ لہٰذا ایک گہری ہنکاری خارج کر کے اس سے بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، تم مجھے اجازت دو، تو میں اور ماں جی، زہرہ بانو سے تمہارے سلسلے میں..."

"نہیں، ہرگز نہیں۔" وہ یک دم انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"آخر کیوں؟"

"مجھے اعتراف ہے کہ تمہیں ماضی سے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہو چکا ہے، لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں شہزی! جن کا صرف علم میں ہی ہونا کافی نہیں ہوتا، ان کا ادراک کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے، اور تمہیں وہ نہیں ہے۔" وہ عجیب فلسفیانہ لہجے میں بولا۔

"مثلاً؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"بیگم صاحبہ کی نگاہوں کے سامنے میری حیثیت صرف ایک ملازم کی سی ہے، دوست کی تمہیں۔"

’’تم اُن کے سب سے زیادہ قریبی اور وفادار، جاں نثار ساتھی ہو۔ وہ تم پر اندھا اعتماد کرتی ہیں اور یہ سب ایک ملازم کے لیے نہیں سچے دوست کی صفات میں شمار ہوتا ہے۔‘‘

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش چاہی تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ’’بیگم صاحب کا برتاؤ میرے ساتھ بھی دوستانہ نہیں رہا، ماسوائے ایک باس کے حکم کے، ہاں! تم اپنی بات کر سکتے ہو، تمہارے ساتھ ان کا رویّہ دوستانہ... بلکہ اس سے کچھ آگے کا رہا ہے، چاہے کسی بھی حوالے سے سہی۔‘‘ میں نے اس کی ذومعنی بات پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، یہ الگ بات تھی کہ اس کی بات نے مجھے لاجواب سا ضرور کر دیا تھا، بہرکیف میں اسے صرفِ نظر کرتے ہوئے بولا۔

’’اچھا، سنو! ہم تمہاری طرف سے بات نہیں کرتے، ماں جی سے... میں کہوں گا کہ وہ خود ہی اپنی بات تجویز کے طور پر بیگم صاحبہ کے سامنے رکھیں، دیکھیں پھر وہ کیا کہتی ہیں؟‘‘

میرا یہ داؤ چل گیا کیونکہ کبیل دادا خاموشی کے ساتھ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے مزید کہا۔ ’’کبیل! حوصلہ کرو، آخر ایسا کب تک چلے گا، یہ ایک اچھی بات ہوگی، تمہارے لیے بھی اور خود بیگم صاحبہ کے لیے بھی، اُنہیں تمہارے جیسا محبت کرنے والا شوہر مل جائے گا اور تمہیں تمہاری ازلی محبت... اس سے بڑھ کر ہمارے لیے بھی خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ ہم سب بھی تو اس بات پر متفق ہیں۔‘‘ وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا۔ اس کی خاموشی بدستور اسی طرح ہی قائم رہی تو میں فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ذرا قریب جا کر کاندھے پر ہولے سے تھپکی دی اور جب دروازے کی طرف پلٹنے لگا تو کبیل دادا نے میرا ہاتھ تھام لیا، میں قدرے چونک کر اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

’’تمہارا بہت شکریہ شہزی! اگر یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا تو... سمجھ لینا، یہ دادا، ہمیشہ کے لیے تمہارا غلام ہو جائے گا۔‘‘ جواباً میں مسکرا کر بولا۔

’’مجھے بھی خوشی ہو گی لیکن تمہارے غلام بننے کی نہیں بلکہ دوست بننے کی...‘‘

کبیل دادا کے کمرے سے آ کر میں نے اول خیر اور شکیلہ کو ساری بات بتا دی، شکیلہ تو مطمئن اور خوش تھی لیکن جانے کیوں اول خیر چپ چپ سا تھا۔ میں نے اُسے اسی کے حال پر چھوڑا اور ماں جی کے کمرے میں آ گیا۔ وہ جاگ رہی تھیں۔ میں اُن کے قریب بستر پر بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔

’’ماں جی! آپ کو یاد ہو گا میں نے کہا تھا کہ میں زہرہ بانو کے سلسلے میں کوئی راہ نکال لوں گا...‘‘

’’ہاں پُتر! یاد ہے مجھے، بول کیا کہنا چاہتا ہے تو؟‘‘ وہ ممتا بھرے لہجے میں بولیں تو میں نے کبیل دادا سے متعلق انہیں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اتنا عرصہ یہاں بیگم ولا میں رہتے ہوئے ماں جی بھی کبیل دادا کو اچھی طرح جاننے لگی تھیں۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ تاہم اُنہوں نے جب اس سلسلے میں مثبت ہامی بھری تو میں نے بتا دیا کہ اُنہیں کس طریقے سے زہرہ بانو سے بات کرنی ہو گی، وغیرہ۔

ماں جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر زہرہ سے ضرور بات کریں گی۔

☆☆☆

اگلے دن میرا ارادہ عارفہ کے ہاں جانے کا تھا۔ اس کے لیے میں نے اول خیر کو اپنے ساتھ جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

بیگم ولا سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے عارفہ کو فون کرنا ضروری سمجھا تھا۔

اس کے سیل فون پر جانے والی دوسری رِنگ کے بعد ہی اس حرافہ کی مختصر سی آواز اُبھری۔

’’ہیلو!‘‘ انداز سپاٹ اور قدرے سرد مہر تھا۔ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

’’میں شہزاد احمد بول رہا ہوں۔ ڈیل سے متعلق آپ نے کیا فیصلہ کیا؟‘‘ یہ پوچھتے ہوئے میری اپنی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ ایسا عموماً ہوتا ہے، اپنے کسی سب سے زیادہ قابلِ نفرت دُشمن سے ہمکلام ہوتے وقت انسان کا دل ہی نہیں دماغ بھی سُلگ رہا ہوتا ہے، اور دشمن بھی کیسا، ایک احسان فراموش دشمن۔ یہی حال اس وقت میرا ہو رہا تھا۔

’’میں ابھی تک سیٹھ نوید سے اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں کر سکی ہوں۔‘‘ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

’’کیا مطلب...؟‘‘ اس کی بات سن کر میرا دماغ بری طرح بھنّا گیا۔ مجھے اس کے لہجے سے منافقت، جھوٹ اور فریب کاری کی بو آتی محسوس ہوئی۔ میں زہریلے طنز سے بولا۔

’’ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ تم نے اتنے اہم ایشو پر اس سے اب تک کوئی بات ہی نہ کی ہو؟ اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم تھانے تو اس سے ملنے روز ہی جاتی ہو گی۔‘‘

''تھانہ...؟ کیسا تھانہ؟'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب...؟'' اس کے جی جلانے والے استہزائیہ پر میں میرا دماغ گرم ہونے لگا تھا۔

''اس کی ضمانت ہو چکی ہے اور وہ اس وقت اپنی رہائش گاہ پر آرام کر رہا ہے۔'' اس حرافہ کا لہجہ تفاخر آمیز غرور سے لبریز ہو رہا تھا اور اندازِ تخاطب بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے یہ ''خوش خبری'' سنا کر تصور ہی تصور میں میری جلتی سلگتی کیفیات سے حظ اُٹھا رہی ہو۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس خبر پر مجھے شاک پہنچا تھا۔ جس نے چند ثانیے کے لیے مجھے سناٹے میں مبتلا کر دیا تھا۔

''کب کی بات ہے یہ...؟''

''اِٹ اِز، نان آف یور بزنس۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ خدشہ اس بات کا مجھے پہلے تھا کہ سیٹھ نوید پیسے اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر اپنی ضمانت کروانے کی کوشش تو ضرور کرے گا۔ لہٰذا میں اپنے ابال پر قابو پاتے ہوئے بہ ظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا معاملہ خالصتاً تمہارے اور میرے بیچ ہے، کیا تم خود کو اتنا ہی بے اختیار سمجھ رہی ہو کہ تمہیں اس سلسلے میں سیٹھ نوید سے مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے؟ تم خود کیوں نہیں فیصلہ کر لیتیں؟'' یہ بات کہنے کا میرا ایک مقصد تھا، تاکہ میں اسے آئینہ دکھا سکوں۔

''اب جب کہ تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ نوید اور میں مستقبل کے جیون ساتھی بننے والے ہیں تو اس سے میں ہر معاملے میں مشورہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ انداز بدستور اس ناگن کا مجھے جلانے والا تھا۔ میں نے بھی بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ تو وقت ہی بہتر بتائے گا کہ دوسروں کی خوشیوں کو اپنے مفادات پر تاراج کرنے والے کس طرح مسرتوں کے محل تعمیر کریں گے، لیکن اس وقت معاملے کی بات ہو جائے تو اچھا ہے، تم خود ہی فیصلہ کر لو... کیونکہ کچھ ہی دنوں بعد عابدہ کی پیشی ہے اور اس کے لائر نے مجھے بتایا ہے کہ تمہیں کم از کم اس سے پہلے امریکا میں ہونا چاہیے۔''

''آئی ڈونٹ کیئر... یہ میرا ہیڈ ایک نہیں ہے۔'' وہ پُرغرور لہجے میں بولی۔

''کیا...؟'' اس کے جواب پر میں جیسے سرتاپا سلگ اٹھا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟''

''مائنڈ یور لینگویج مسٹر شہزاد احمد خان...! تمہیں عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟'' دوسری جانب سے اس کی غصیلی آواز اُبھری۔ مجھے اسی وقت اس کے بدلے ہوئے تیور اور روکھے لب و لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے عاشق سیٹھ نوید سے اس بارے میں مشورہ کر چکی ہے اور اب اسی رذیل کے کہنے پر اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ ورنہ تو کہاں اڑیسہ کمپنی کے شیئرز حاصل کرنے کے لیے اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی اور اندازِ گفتگو بھی اس کا میرے ساتھ چاپلوسانہ ہوتا تھا۔

''وہ واقعی عورتیں ہی ہوتی ہیں جن سے تمیز سے بات کی جائے اور تم عورت تو کیا انسان کہلوانے کے لائق بھی نہیں ہو... بلکہ تم ایک ناگن ہو زہریلی ناگن...'' میں بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یاد رکھو ایک بات میری... عابدہ کی مدد کرنا تم پر فرض اور واجب ہے۔ میں جانتا ہوں اچھی طرح سے کہ تمہیں کس نو دولتیے سیٹھ نے یہ نئی پٹی پڑھائی ہے۔ اس سے تو میں نمٹ ہی لوں گا اچھی طرح لیکن تم سے نمٹنے کے لیے میں ابھی پہنچ رہا ہوں...'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور طیش میں آ کر اپنا سیل فون دور اُچھال دیا۔ مارے غیظ و غضب کے میرا پورا وجود جل رہا تھا، میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ آج جس انداز میں اس حرافہ نے میرے ساتھ گفتگو کی تھی، اگر وہ ناگن میرے سامنے ہوتی تو میں اس کی گردن دبوچ لیتا۔

''ہولا رہ کاکے! یہ وقت غصے کا نہیں ہے۔'' اول خیر نے کہا اور آگے بڑھ کر میرا سیل اُٹھا لیا۔ جو فرش پر بچھے دبیز قالین کی وجہ سے ٹوٹا تو نہیں تھا مگر کھل ضرور گیا تھا اور اس کی بیٹری نکل کر باہر آن پڑی تھی۔ اول خیر نے اسے اُٹھا کر دوبارہ جوڑ دیا۔

''مجھے سرمد پاپا مرحوم اور ان کے دونوں چھوٹے معصوم پوتے پوتی (پنکی، دانی) کا خیال آ جاتا ہے، اول خیر! ورنہ میں اس حرافہ کو ایسا سبق سکھاتا کہ اسے اپنی اصل اوقات یاد آ جاتی۔'' میرا غیظ کم نہیں ہوا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا، آخر یہ لالچی عورت ایک دم بدل کیسے گئی؟'' اول خیر جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہاں تو اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا سن کر یہ ہماری بات پر فوراً آمادہ ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے سیٹھ نوید نے انتقاماً اسے منع کر دیا ہے ہمارے ساتھ ڈیل کرنے سے؟ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس خبیث سیٹھ نے عارفہ کو ہم سے بددل کرنے کے لیے یہی کہا ہوگا کہ ہم اس کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں۔''

"اس خبیث کی ضمانت ہو چکی ہے۔"
"او ہو..." اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"اسی لیے تو یہ حرافہ زیادہ اُچھل رہی ہے، ضرور اسی نوید نے اسے پٹی پڑھا دی ہو گی۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، نوید کا بھی تو اس میں مفاد شامل ہے؟"
"مجھے یہ کچھ اور معاملہ لگتا ہے اول خیر...!" بالآخر میں نے اپنے اُبال پر قابو پاتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا اور آگے بولا۔ "جیسا کہ مجھے شبہ ہے، سیٹھ نوید احمد سانچے والا خود بھی نہیں چاہتا ہو گا کہ یہ شیئرز عارفہ کے ہاتھ لگیں، کیونکہ وہ انہیں لولوش کی ملکیت سمجھے ہوئے ہے اور وہ یہ اُسی کے حوالے کرنا چاہتا ہو گا۔ کیونکہ اس ڈیل کے بعد ظاہر ہے میں اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے قانونی طریقے سے، عابدہ کے حق میں اس کے گواہی دینے کے بعد میں یہ شیئرز واقعی عارفہ کے نام کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔"
"ممکن ہے یہ بات بھی رہی ہو۔" اول خیر نے کہا۔ "لیکن اب بھی کچھ گڑبڑ ایسی لگتی ہے جس کی وجہ ابھی ہمیں معلوم نہیں ہو پا رہی۔"
"آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے ایسی؟"
"پہلی تو یہی وجہ ہو گی کہ اس سیٹھ نے عارفہ کو ہم سے ڈرا دیا ہو گا کہ ہم اپنا کام نکلوانے کے بعد شیئرز اُسے دینے سے مکر جائیں گے اور دوسرے یہ کہ..." اول خیر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
"کون؟ آ جاؤ۔" میں نے کہا تو زہرہ بانو اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی لفافہ تھا اور چہرے پر کچھ اُلجھن آمیز تاثرات تھے۔ میری نظریں اس کے ہاتھ میں تھمے ایک بڑے سے لفافے پر مرکوز تھیں جو وہ میرے قریب آنے کے بعد میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
"یہ خط تمہارے نام ہے، کورٹ کا لگتا ہے، کیا معاملہ ہے یہ...؟" میری پیشانی پہ شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ میں نے خط لیا اور جب اسے کھول کر پڑھا تو میرا دماغ جل اُٹھا۔
"سمجھا!" میں دانت پیس کر زہرخند لہجے میں بڑبڑایا۔
"کیا ہے یہ شہزی! کوئی عدالتی نوٹس لگتا ہے؟" زہرہ بانو نے میرے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔
"اُس حرافہ نے سرمد بابا کی وصیت کو کورٹ میں چیلنج کر دیا ہے، اسی سلسلے میں میری تین روز بعد عدالت میں پیشی ہے۔"
"اوہ..." زہرہ بانو کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا اور میں نے اسے مزید تازہ صورتِ حالات سے بھی آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر وہ بھی واقعی متفکر سی ہو گئی اور پھر اسی لہجے میں بولی۔ "ایسی صورت میں تو بے چاری عابدہ کے لیے اور بھی مشکل پیدا ہو جائے گی۔"
"یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے مقدمے میں پھنسانے کا مقصد یہی ہے دشمنوں کا تاکہ میں عابدہ کے سلسلے میں ضروری اقدامات اُٹھانے سے دور رہوں۔"
"مجھے تو لگتا ہے یہ عارفہ، سیٹھ نوید اور اُس عالمی گینگسٹر لولوش کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔" زہرہ بولی۔
"اور یہی دونوں کسی دن اسے ٹھکانے لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔
"تم نے عارفہ کو اس انداز میں سمجھانے کی بھی کوشش نہیں کی؟"
"اُس بے وقوف کو ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ میرے لہجے میں قدرے جھلاہٹ آمیز سی بے بسی عود کر آئی تھی۔ "مگر اس عیار دماغ سیٹھ نوید سانچے والا نے اُسے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے اور وہ اب وہی کرتی ہے جس کا وہ اُسے کرنے کا کہتا ہے۔"
"گویا عارفہ مکمل طور پر اس کے ٹرانس میں آئی ہوئی ہے۔"
"ہاں۔"
"تم اور میں چلیں اس کے ہاں!" زہرہ نے کہا۔ "میں بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔"
"وہ نہیں مانے گی۔" میں نے سر جھٹک کر کہا۔ "میں عارفہ کا نفسیاتی مسئلہ سمجھ گیا ہوں، اُس نے ایک خاصا طویل عرصہ بیماری اور تنہائی میں کاٹا ہے، اس دوران یہ لو دولتیا عیار سیٹھ نوید ایک "دولت مند بیوہ" پر ڈورے ڈالنے کی کوشش میں لگا رہا تھا، مگر سرمد بابا کی وجہ سے... اس نامراد کی ایک نہ چل سکی تھی، کیونکہ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے، ان کے مرنے کے بعد ہی سیٹھ نوید کو اپنی دال گلانے کا موقع ملا، تو صحت یابی اور آزادی کے بعد عارفہ نے بھی خود کو سیٹھ نوید کے سپرد کر دیا۔ میں نے ان کی خلوت کی گفتگو بھی سن رکھی ہے، اس لیے اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں کہ ان دونوں کا مستقبل قریب میں کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن اس وقت وہ کمینہ عارفہ کو میرے خلاف استعمال کر رہا ہے اور اس میں لولوش ہی کی ہدایات کارفرما ہے۔"
"سندر داس والی کامیاب مہم اور اسپیکٹرم کا ایک بڑا

منصوبہ خاک میں ملانے پر لولوش نے ہمیں مکمل طور پر نشانے پر رکھ لیا ہے۔'' اول خیر نے کہا تو زہرہ بولی۔

''لیکن لولوش کی ایک کمزوری اڑیسہ کمپنی کی صورت میں ابھی تک تمہارے ہاتھ میں ہے شہزی...!''

''اس کے لیے اس نے یہ حل جو نکالا ہے...'' میں نے کورٹ کا جاری کردہ نوٹس زہرہ کے سامنے لہرایا۔

''یہ ضروری تو نہیں کہ اس میں وہ کامیاب بھی ہو۔'' اول خیر بولا۔ ''ہمارا کیس مضبوط ہے، سرمد بابا کا وکیل ہماری رہنمائی کرسکتا ہے... کیا نام تھا اس کا شہزی؟''

''ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی...'' میں نے بتایا۔

''تم ایسا کرو اسے یہاں بلوا لو'' زہرہ فوراً مجھ سے بولی۔ ''یوں بھی اب بے قانونی طور پر اس نئی صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔''

''مجھے اس مقدمے کی کوئی فکر نہیں، نہ ہی اڑیسہ کمپنی کے شیئرز سے میں کوئی دلچسپی رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن... اس وقت مجھے سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہو رہی ہے کہ آنسہ خالدہ کے مطابق عابدہ کو نو روز بعد کورٹ میں پیش کیا جانے والا ہے اور عابدہ کا کیس اس کے حق میں کرنے کے لیے اس عارفہ کی گواہی اشد ضروری ہے، اس کا کیا کیا جائے...؟'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ کمرے میں یکلخت خاموشی سی چھا گئی۔ خود میرا اپنا چہرہ بھی عارفہ کے انکار اور اس پر مستزاد مجھ پر کیس کرنے پر اُترا اُترا سا نظر آنے لگا تھا۔ مجھے مضطرب الحال اور آزردہ خاطر دیکھ کر اول خیر نے میرے شانے کو حوصلہ افزا انداز میں ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ٹینشن نہ لے کاکے! اللہ بہتر کرے گا... بیگم صاحبہ اور ہم کوئی نہ کوئی صورت نکال لیں گے۔''

''یار! اب کیا صورت نکلے گی بھلا...'' میں نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا۔ ''عابدہ کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے، وہ دیارِ غیر میں نجانے کن حالوں میں ہو گی غریب، کون ہے وہاں اس کا سوائے خدا کے... وہ میرے کہنے پر اور خدا ترسی کے نیک جذبے کے ساتھ کسی بیمار کو شفا دلانے کی غرض سے گئی تھی، اور خود دردِ لادوا کی تفسیر بن کر رہ گئی ہے وہاں... وہ ایک ایسے شکنجے میں جکڑ دی گئی ہے کہ شاید وہ بے چاری اپنی زندگی سے بھی مایوس ہو چکی ہو اور ادھر میں ابھی تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، کتنا بے بس اور بے مایہ انسان ہوں یار میں کہ ابھی تک عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ بھی تو نہیں کرسکا ہوں...''

مجھے رنجیدہ اور دکھی دیکھ کر زہرہ بانو تڑپ سی گئی اور بے اختیار چند قدم میری طرف بڑھی، غیر اختیاری طور پہ وہ میرے مزید قریب آنا چاہتی تھی لیکن پھر اول خیر کی موجودی کے باعث وہ میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔

''شہزی! کیوں اتنے رنجیدہ ہوتے ہو؟ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم کہو تو میں اس عارفہ کو ایسا سبق سکھاؤں گی کہ وہ خود امریکا جا کر عابدہ کے حق میں گواہی دینے پر مجبور ہو جائے گی۔'' میں اس کی بات پر بولا۔

''یہی تو سب سے بڑی مجبوری ہے اس مسئلے کی کہ یہ کام زور زبردستی میں نہیں ہو سکتا، ورنہ تو میں ہی عارفہ کو سبق سکھانے کے لیے کافی تھا۔''

''ہم ایک ڈراما کرتے ہیں۔'' وہ بولی اور میں اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ آگے بولی۔ ''اس کے دونوں بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔''

زہرہ بانو کی بات پر میں نے سختی سے اپنا سر انکار میں جھٹک دیا۔ ''عارفہ کو اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کرسکتا، اور کروں گا بھی تو وہ محض ڈراما ہی ہو گا، وہ بڑی کائیاں عورت ہے، سب جانتی ہے، ورنہ سرمد بابا اپنی وصیت میں مجھے اتنی بڑی ذمے داری کیوں سونپتے۔ یوں بھی بچوں پر اس طرح غلط اثرات مرتب ہوں گے۔''

''بہت ہی بے ضمیر اور بے حس عورت ہے یہ...'' زہرہ بانو دانت پیس کر نفرت خیز لہجے میں بولی۔ ''یہ جانتی بھی ہے کہ تم اس کے دونوں بچوں سے کس قدر مخلص ہو اس کے باوجود...''

''میرے ذہن میں ایک اور حل آتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے شاید اب اس سلسلے میں سیٹھ نوید سے بات کرنی چاہیے۔''

''تم کیا بات کرو گے؟'' زہرہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اُس سے شیئرز کے سلسلے میں یہ معاہدہ کروں گا کہ... وہ میری لولوش سے بات کرائے، میں عابدہ کے بدلے میں اُسے اڑیسہ کمپنی کے سارے شیئرز دینے کو تیار ہوں۔'' اس پر اول خیر نے مجھے اپنی ایک پرانی تجویز یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''او خیر... کاکے! یہ مشورہ تو میں بہت پہلے ہی تمہیں دے چکا تھا کہ...'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی، زہرہ

نے اُلجھے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔
"ایک منٹ۔۔۔! لولوش سے بھلا، عابدہ کے مسئلے کا کیا تعلق بنتا ہے؟" اس کی بات پر میں نے ایک گہری سانس لی، اسے شاید بہت سی باتوں کا ادراک نہ تھا، یا پھر وہ بھول رہی تھی۔ میں نے اُسے بتایا۔
"لولوش، سی آئی اے افسر باسکل ہولارڈ کا چہیتا داماد ہے، اس کی اکلوتی بیٹی انجیلا کا شوہر ہے وہ۔۔۔"
"اوہ۔۔۔ شاید تم نے مجھے یہ بتایا تھا۔۔۔" وہ قدرے چونک کر بولی۔ "حیرت ہے، سی آئی اے کا ایک ذمے دار افسر اور اتنے بڑے عالمی گینگسٹر سے اس طرح کی رشتے داری۔۔۔"
"سی آئی اے کا اصل طریقہ کار یہی تو ہوتا ہے، وہ اپنے بعض وسیع تر مفادات میں ایسے لوگوں سے بھی کام لینے میں کوئی عار نہیں سمجھتی۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تاہم باسکل ہولارڈ کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں، وہ فطرتاً ایک کینہ پرور اور متعصب یہودی ہے۔ خود پسندی، برتری اور طاقت کا زعم رکھنے والی یہودی قوم کی بھرپور عکاسی اس کے کردار سے جھلکتی ہے۔ مجرمانہ اور متعصب ذہنیت کا حامل یہ شخص انسان کہلوانے کے لائق نہیں۔ کمزوروں پر ظلم کے پہاڑ توڑنا اس کی جبلت کا خاصہ ہے۔ خود کو منوانے اور امریکا کے کلیدی اہم اداروں میں اپنا اثرورسوخ قائم کرنے کے لیے اس خبیث انسان نے باغی امریکی ریاستوں میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون ناحق بہایا۔"
"مائی گاڈ!" زہرہ بانو کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ "یہ ی۔۔۔ یہ سب تمہیں کیسے پتا چلا شہزی۔۔۔؟"
"آنسہ خالدہ سے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہی وہ ایک فرشتہ صفت مسلم خاتون ہے جس نے عابدہ کے معاملے کو بہت ہائی لائٹ کیا ہے، ورنہ تو وہ مردود باسکل ہولارڈ، عابدہ کو تفتیش کے بہانے اب تک نجانے کہاں گم کر چکا ہوتا۔ یہ خالدہ کی کاوشوں کا ہی ثمر ہے کہ عابدہ کا کیس عدالت تک پہنچا۔ تاکہ اُسے منظر سے غائب نہ کیا جائے، مگر یہاں بھی وہی مخدوش صورتِ حال ہے کہ اگر عابدہ کے حق میں عارفہ کی گواہی نہیں گئی تو دشمن اس گھناؤنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر نجانے وہ عابدہ کا کیا حشر کریں۔"
"میرے خدا!" زہرہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "یقین نہیں آتا کہ بے چاری معصوم عابدہ۔۔۔ نادانستگی میں اتنی بڑی سازش کے جال میں پھنس چکی ہے، اللہ رحم کرے اس معصوم غریب پر۔۔۔"
"پھنسی نہیں بلکہ پھنسادی گئی ہے۔" میں نے کرب انگیز تلخی سے کہا۔
"جے بی سی اب اپنا مکروہ چہرہ چھپانے کے لیے باسکل ہولارڈ کو آگے کھسکا چکی ہے، جو اُس وقت سے ہی عابدہ کو نشانہ بنانے کا پہلے ہی ارادہ باندھ چکا تھا جب وہ عارفہ کے ساتھ امریکا کے ایک اسپتال میں رہتی تھی۔ جب میری عابدہ سے فون پر باتیں ہوتی تھیں تو وہ اس خدشے کا اظہار بھی کرتی تھی مجھ سے۔۔۔ لیکن میں اسے ایک عام کارروائی خیال کر کے اس بے چاری کو خام تسلیاں ہی دیتا رہ گیا، اور وہ جال میں پھنسادی گئی۔۔۔" میرا لہجہ غمگین ہو گیا۔ زہرہ بانو اور اول خیر مجھے تسلیاں دینے لگے اور اسی دوران اول خیر نے دوبارہ اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔
"تمہاری تجویز بُری نہیں لیکن لولوش سے رابطہ کرنے کا واحد ذریعہ سیٹھ نوید سانچے والا ہی ہے۔"
"چلو پھر اسی بدبخت پر پتا چیک کر دیکھتے ہیں۔" اول خیر کہا۔ "ممکن ہے وہ ہم سے عارفہ کی غیر موجودگی میں کوئی خفیہ معاملہ داری طے کرنے کی کوشش چاہے۔ وہ کون سا عارفہ کے ساتھ مخلص ہے۔"
دوپہر کا کھانا میں نے زہر مار کیا اور سیٹھ نوید سے ملنے کے لیے اول خیر کے ساتھ میں بیگم ولا سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

باہر جاڑے کی دھوپ چمک رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کا سیل رواں تھا۔ ہماری کار عیدگاہ روڈ پر آ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اول خیر بیٹھا تھا اور میں اس کے برابر میں بیٹھا خیالوں میں گم تھا۔
ذرا دیر بعد اول خیر نے کار کو عیدگاہ روڈ سے شاہ شمس پارک کراس کرنے کے بعد حسین آگاہی روڈ کی طرف موڑا اور رفتار بڑھا دی مگر جلد ہی اسے بریک پر پاؤں رکھنا پڑے۔ ہمارے عقب سے ایک سیاہ رنگ کی ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی لکس، بہت تیزی کے ساتھ ہمیں کراس کر کے نکلی تھی، اور اس کی سائڈ ہماری کار کو لگتے لگتے بچی تھی۔ اول خیر نے اسی لیے فوراً بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا تھا۔
"لعنت ہے، نشے میں گاڑی چلا رہا تھا اُلو کا پٹھا!" اول خیر غصیلے لہجے میں ڈبل کیبن کے ڈرائیور کو کوستے ہوئے بڑبڑایا۔ میں بھی اس افتاد پر ذرا ہڑبڑا گیا تھا اور خیالات کے بھنور سے نکل کر سامنے دیکھنے لگا، تو دوسرے ہی لمحے ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا۔
طاقت ور انجن والی ٹویوٹا ہائی لکس کے ٹائر سمع خراش

آوازوں سے چرچرائے تھے۔ ہائیڈرولک ہیوی بریک سسٹم اور پاورفل باڈی کے زور پر ڈبل کیبن فوراً جامد ہوگئی تھی، اگرچہ اول خیر نے بھی غیر ارادی طور پر کار کی رفتار بتدریج کم کردی تھی لیکن...... پھر سامنے والی گاڑی کو اپنے راستے پر آکر جام ہوتے دیکھتے ہی اس نے بھی بریک پر پاؤں رکھ دیا تھا پھر اچانک ڈبل کیبن کا انجن غرایا اور وہ تیزی کے ساتھ ریورس ہوگئی، ہماری کار رکتے رکتے بھی اس کے عقبی حصے سے ٹکرائی، ہمیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ تحمل پڑتے حواسوں کو قابو کرتے تک ڈبل کیبن ہماری کار کو پیچھے کی طرف رگیدتی لے گئی، اور رک گئی۔ ہماری کار عجیب مضحکہ خیز انداز میں ترچھی ہوکر رک گئی، میں اور اول خیر ابھی.... خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہی تھے کہ اچانک ڈبل کیبن سے کسرتی بدن کے قدرے دراز قامت افراد ہاتھوں میں پستول لیے ہماری طرف لپکے اور قریب آتے ہی ایک نے غراہٹ آمیز آواز میں کہا۔

''ہالٹ، کوئی حرکت مت کرنا، گاڑی سے باہر نکلو فوراً...''

تخاطب کے یکسر اجنبی لب ولہجے اور برآمد ہوتے انگریزی الفاظ سن کر میرا ماغ بھک سے اُڑ گیا۔ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایک نے دوسری جانب کی کھڑکی سے اول خیر کو اپنے پستول کی نال سے اپنی جگہ محبوس رہنے پر مجبور کررکھا تھا، جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے اپنے پستول کی نال کا رخ میرے چہرے کی طرف کررکھا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میرے تیزی سے دھڑکتے دل میں ایک ہی لفظ اُبھرا تھا...

''ٹائیگر ٹیگ...''

یہ لفظ محض غیر ارادی طور پر ہی نہیں میرے دل و دماغ میں اُبھرا تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک ٹھوس وجہ بھی تھی۔ آنسہ خالدہ کے ساتھ عابدہ کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ٹیلی فونک رابطے کے دوران، اُسی نے مجھے یہ انفارمیشن دے رکھی تھی کہ سی آئی اے (باسکل ہولارڈ) عنقریب اپنے اسالٹ ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے دو ٹاپ ایجنٹ میری خفیہ گرفتاری یا اغوا کے لیے امریکا سے پاکستان ''لانچ'' کرنے والے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کی اجنبی اور غیر ملکی صورتیں دیکھ کر پل کے پل میرا دھیان اسی طرف چلا گیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ...؟'' میں نے اپنی کھڑکی پر جھکے اس غیر ملکی چہرے والے سے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا تو اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے ہونٹ بھینچ کر میری کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی کہ ان کا تعلق انہی مذکورہ دو ایجنٹوں سے تھا، میں نے دانستہ کسی جارحانہ حرکت سے گریز ہی کیا تھا۔ عابدہ کے حوالے سے ایسا کوئی بھی قدم مجھے از خود محتاط روی پر مجبور کردیا کرتا تھا۔

وہ مجھے بازو سے پکڑے اپنی گاڑی کی طرف لے گیا اور عقبی کھلے دروازے سے وہ مجھے لیے اندر سوار ہوگیا۔ اس دوران میں اس کا گہری اور بھانپتی ہوئی نظروں سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جلد کا رنگ سپید تھا۔ برطانوی تو نہیں لگتا تھا کہ ان کی سپیدی میں سُرخی گھلی ہوتی ہے، قد دراز اور میرے برابر تھا، جسم بھی کسرتی اور مضبوط ہی دکھتا تھا، چہرہ قدرے لمبوترا اور جبڑے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، آنکھیں باریک اور کوتے کھنچے ہوئے تھے، آنکھوں کا رنگ ہلکا براؤن مائل نیلا تھا۔ سر کے بال ''کریو کٹ'' تھے، جبکہ اس کا دوسرا ساتھی، جس نے اول خیر کو گن پوائنٹ پہ لیے، ہنوز کار کی سیٹ پر محبوس کررکھا تھا، نسبتاً درمیانی جسامت کا مگر جسم اس کا بھی ورزشی ہی لگتا تھا، جبکہ چہرہ قدرے گول تھا، سر گنجا۔ دونوں نے سوٹ کوٹ پہن رکھے تھے۔

''میں بغیر کوئی مزاحمت کیے تم لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ میرے ساتھی کو چھوڑ دیا جائے۔'' میں نے اس سے کہا۔ میرا خیال تھا مجھے اپنی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد اول خیر کو بھی ساتھ لایا جائے گا، مگر ایسا نہ ہوا تو میں نے اس اندیشے پر کہ کہیں یہ لوگ اول خیر کو کسی قسم کا جسمانی نقصان نہ پہنچادیں تو وہ بولا۔

''ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ...''

اس دوران میری عقابی نظریں گاڑی کے بیک ویو مرر پر بھی اُٹھ رہی تھیں جہاں سے میں عقب میں اپنی آڑی ترچھی کھڑی کار پہ بھی نظر رکھے ہوئے تھا، اور... تب ہی میں نے دیکھا کہ اس کا دوسرا ساتھی، بہ ظاہر بڑے مطمئن انداز میں مگر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اکیلا ہی بڑھا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تو، اول خیر مجھے سیٹ پر ایک طرف لڑھکا ہوا دکھائی دیا۔ میرا ماغ بھنا گیا۔

''یہ کیا حرکت کی ہے میرے ساتھی سے تمہارے آدمی نے...؟'' میرے درشت لہجے میں پریشانی اور تشویش کا عنصر بھی غالب تھا۔

''کچھ نہیں کیا اسے۔'' وہ بولا۔ ''محض دستہ مار کے بے ہوش کیا ہے، اس نے ضرور کوئی جارحانہ حرکت کرنے کی

کوشش کی ہوگی، ورنہ میرا ساتھی اس جوابی کارروائی میں اپنا وقت برباد کرنے کا عادی نہیں۔" اس کی بات سن کر میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اس کا دوسرا گنجے سر والا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ پستول اب اس کے ہاتھ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس دوران میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، میں پوری طرح اندازہ نہیں کر پارہا تھا کہ فی الوقت یہ مجھے کہاں اور کس کے پاس لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے؟

گنجے سر والے آدمی نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی، گاڑی کے شیشے ڈارک تھے اسی وقت میرے ساتھ بیٹھے کریو کٹ نے میری آنکھوں پر کپڑے کا ایک عجیب سا غلاف چڑھا دیا۔ "عجیب سا" اس لیے میں نے کہا کہ یہ بڑا آرام دہ اور چبھن سے عاری تھا، مگر اہم بات یہ تھی کہ... اس کے پہناتے ہی ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی، اور میرا سر گھومنے لگا تھا۔ پھر مجھے کسمسانے کا بھی موقع نہ ملا تھا کہ اگلے ہی لمحے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں نہیں جانتا تھا کہ کب اور کہاں میری آنکھ کھلی تھی۔ لیکن جہاں بھی کھلی تھی، وہ ایک چھوٹا سا کمرا ہی تھا۔ جس کے در و دیوار مجھے لکڑی کے ہی محسوس ہوئے تھے، کیونکہ دیواروں کی سطح پر "فارمیکا شیٹ" کا ہی گماں ہوتا تھا۔

سر کے بھاری پن اور ماؤف پڑتے ذہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں کافی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ ممکن تھا مجھے ایک مقررہ مدت کے بعد کلوروفارم کی دوسری ڈوز بھی دی گئی ہو۔

غلاف میرے چہرے سے اب ہٹا ہوا تھا۔ شاید اس کے ناک اور منہ والے حصے کو کلوروفارم میں بھگویا گیا تھا، جسے پہناتے ہی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے تسلی تھی کہ اول خیر کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ ایک تشفی اور بھی میری سمجھ میں آتی تھی۔ یہ مجھے کسی قسم کا کوئی گزند پہنچانے کا ارادہ بہر حال نہیں رکھے ہوئے تھے، ورنہ وہ اول خیر کی طرح میری کنپٹی پر بھی پستول کا آہنی اور کند دستہ "وجا" کر مجھے اٹا غفیل کر سکتے تھے۔

بے ہوشی سے ہوش مندی کے وہ تمام مندرجات، جو مکمل حواسوں کے ضامن ہوتے ہیں، جیسے جیسے میں ان کے قریب جا رہا تھا، بہ عین مجھ پر بہت سی چونکا دینے والی باتوں کا بھی انکشاف ہونے لگا تھا۔ پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ میں سطح زمین پر نہیں تھا، مگر خلا میں بھی نہیں تھا۔ میں ہلکورے کھا رہا تھا جیسے کسی کشتی میں سوار ہوں۔

میں پشت کے بل ایک بنک بیڈ (bunk bed) پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ فولادی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے جس کی ایک چین بنک کی آہنی راڈ سے منسلک تھی گویا میں بنک بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ تو سکتا تھا اور اُتر کر کھڑا بھی ہو سکتا تھا مگر اس سے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سر دست ایسا ہی کیا اور بنک سے اُتر گیا، فرش پر پاؤں رکھتے ہی میرے قدم لڑکھڑائے تھے، یہ ہلکورے لینے کے باعث ہوا تھا یا پھر سر میں چکر آنے کے سبب کہ میں نے خود کو بنک کے سہارے ہی سنبھالے رکھا اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ کمرا مجھے قدرے تکون شیپ کا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی چھت قدرے نیچی تھی، جس پر ایک دیوار کے تلے اُوپر یہ دو ہی بنک بیڈ بنے ہوئے تھے۔ جس پر میں تھا اس کے اُوپر ایک اور بنک تھا۔ اُس پر میری نظر پڑی تو میں بری طرح چونک گیا۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ میں اکیلا ہی اس کابک نما کمرے میں قید تھا، لیکن یہاں تو ایک اور شخص بھی تھا جسے دیکھ کر مجھے حیرت کا ہی نہیں بلکہ پریشانی کا جھٹکا بھی لگا کہ کہیں یہ میرا کوئی اپنا ساتھی تو نہیں تھا؟ اول خیر کا نام سب سے پہلے میرے ذہن میں اُبھرا تھا، تاہم اس کے بارے میں مجھے ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

کمرے میں ہلکے بلب کی روشنی ہو رہی تھی، سیدھے ہاتھ کی دیوار پر ایک "پورٹ ہول" (گول کھڑکی) دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ باہر ملگجی سی تاریکی تھی جس کے پس منظر میں تھوڑا غور سے دیکھنے پر ہلکورے لیتی لہروں کا شائبہ بھی محسوس ہوتا تھا۔ کمرا بدستور اسی طرح ہلکورے لیتا محسوس ہو رہا تھا اور اب تو صاف اندازہ مجھے بھی ہو چلا تھا کہ میں کسی لانچ میں ہوں۔

میرا دھیان پھر دوسرے بنک پر دراز آدمی کی طرف چلا گیا، وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ ہتھکڑی نما زنجیر سے بندھے ہوئے تھے جس کا ایک سرا بنک بیڈ کے آہنی راڈ سے جڑا ہوا تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ میرا کوئی اپنا ساتھی نہ ہو، دھڑکتے دل سے اس کا دیوار کی طرف ڈھلکا ہوا چہرہ اپنی جانب کیا تو چونک پڑا... وہ میرا کوئی ساتھی تو نہیں تھا مگر... میرے چونکنے کی وجہ کچھ اور تھی...

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

جواب

کاشف زبیر

انگیٹھی میں آگ دہکتی رہے تو درو دیوار حرارت سے پُر رہتے ہیں... لیکن گر دیوار میں باقی رہ جائے معمولی رخنہ بھی تو انگیٹھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور سرد خیزی ہر شئے کو جما دیتی ہے... اس کے دل میں بھی ایک ایسی ہی آگ دہک رہی تھی... اور وہ کسی طور اس دہکتی آگ کو سرد نہیں کرنا چاہتا تھا... تاوقتیکہ اپنا مقصد نہ پالیتا...

جان و مال کے لٹیروں میں گھر جانے والے مسافروں کی دردناک کہانی

میں بس اڈے پر تھا۔ یہاں سے بسیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں۔ ایک ہوٹل کے چھپر تلے رکھی میزوں اور کرسیوں پر مسافر یا آنے جانے والے لوگ بیٹھے تھے۔ میرے سامنے چائے کا کپ رکھا ہوا تھا مگر مجھے اس بدذائقہ چائے سے دلچسپی نہیں تھی، ایک گھونٹ لیتے ہی میرا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا۔ صبح کا وقت تھا اور بیشتر لوگ دن میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ سندھ کے اس حصے میں ڈاکو راج ہے۔ یہ راج کبھی ہلکا

پڑ جاتا ہے، جب سرکار ذرا تیزی دکھاتی ہے تو ڈاکو پہلے ہی دور جنگلوں میں اپنے محفوظ ٹھکانوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ پکڑ دھکڑ میں چھوٹے موٹے ڈاکو یا بے گناہ پکڑے جاتے ہیں۔ جب اخباروں میں تصویریں چھپ جاتی ہیں اور پولیس والوں میں تمغے اور انعامات تقسیم کردیے جاتے ہیں تو ڈاکو پھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کا سب سے آسان نشانہ سڑک پر سفر کرنے والے عام لوگ ہوتے ہیں۔

شکار پور سے کشمور تک گھنے جنگل اور دشوار گزار علاقے ہیں جو ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہیں اور ان کے کوئی نصف درجن بڑے گروہ سرگرم ہیں۔ ہر گروہ میں ایک سے دو درجن ڈاکو شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے گروہ ہیں جو چھپ چھپا کر واردات کرتے ہیں کیونکہ انہیں پولیس کے ساتھ ساتھ بڑے ڈاکو گروہوں سے بھی خطرہ رہتا ہے۔ بڑے گروہوں کے پاس تیز رفتار گاڑیاں ہوتی ہیں جو ہر قسم کے راستوں پر چل سکتی ہیں۔ اسی طرح جدید ترین اسلحہ ہوتا ہے جس میں راکٹ لانچر بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان کے پاس رابطے کے لیے جدید ترین آلات ہوتے ہیں۔ اب تو موبائل نے رابطہ آسان کردیا ہے مگر ڈاکو احتیاطاً اس کا استعمال کم کرتے ہیں کیونکہ اس سے سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے پاس درمیانے اور طویل فاصلے پر کام کرنے والے واکی ٹاکی ریڈیو ہوتے ہیں۔ بڑے ڈاکو گروہوں کے تنخواہ دار مخبر ہوتے ہیں جو انہیں موٹی آسامیوں کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں۔

رات کے وقت سفر کرنا ڈاکوؤں اور موت کو دعوت دینے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ سورج ڈھلتے ہی علاقے سے قانون کا راج ختم ہوجاتا ہے اور ڈاکو راج شروع ہوجاتا ہے۔ اس لیے سفر کرنے والے شام ہونے سے پہلے پہلے اس علاقے سے نکل جانا پسند کرتے ہیں۔

مجھ سے دو میز آگے ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ گورا رنگ اور ذرا تیکھے سے لیکن خوب صورت نقوش تھے۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی جو ہلکے بھورے رنگ کی تھی اور اس کے چہرے پر اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر بڑے شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ موسم کی مناسبت سے ہلکی جیکٹ اور سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس میں اس کے بال چھپ گئے تھے۔ اس کے پاس لیدر کا ایک بیگ تھا جو اس نے ۔۔۔ میز پر رکھا ہوا تھا۔ نیچے مٹی تھی یہ قیمتی بیگ تھا خراب ہوجاتا اسی لیے اس نے میز پر رکھا ہوا تھا۔ مگر اس طرح یہ نمایاں ہورہا تھا اور یہاں کوئی قیمتی چیز نمایاں کرنا اچھی بات نہیں تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی سامان نظر نہیں آرہا تھا۔

اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے مگر یاد نہیں آرہا تھا۔ میری یادداشت تیز ہے اور میں بہت کم کسی کو بھولتا ہوں مگر اس نوجوان کو دیکھ کر بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے کہاں اور کب دیکھا ہے۔ جب مجھے یاد نہیں آیا تو میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ سورج بلند ہوگیا تھا مگر دھند کی وجہ سے دھوپ نمایاں نہیں تھی۔ میں نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹوٹا چائے کے کپ میں ڈال دیا۔ اسی لمحے نوجوان کی نظر مجھ سے ملی اور وہ بلا ارادہ مسکرادیا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ کر اپنا بیگ لیا اور اس کے پاس آگیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟''

''کیوں نہیں سائیں۔'' اس نے صاف لہجے میں کہا۔ وہ پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ جیکٹ کے نیچے اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں موزے اور اعلیٰ درجے کے پمپ شوز تھے۔ اس کی کلائی پر راڈو گھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں نیلم جڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً دولت مند تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی اگر اس کے پاس دولت تھی تو اسے اپنی گاڑی میں ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح بس میں سفر کرنا ڈاکوؤں کو دعوت دینا تھا۔ اس کی وجہ سے دوسرے بھی مارے جاتے۔ ویسے گاڑی میں سفر کرنے والے بھی محفوظ نہیں تھے۔ اس کے سامنے بھی چائے کا کپ پورا بھرا رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''یہاں کی چائے بکواس ہے۔ اس ہوٹل میں آکر پچھتا رہا ہوں۔''

''جی سائیں ایک گھونٹ سے زیادہ نہیں پی جاسکتی ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ بس اڈے کے سب سے قریب یہی ہوٹل ہے۔ دور جاؤ تو بس کے جانے کا پتا نہیں چلتا۔''

''تم کہاں جارہے ہیں؟''

''کشمور۔''

''بس میں؟''

''جی سائیں میری گاڑی ہے لیکن وہ چند میل پہلے خراب ہوگئی۔ ایکسل ٹوٹ گیا تھا اب مرمت کے لیے ایک ورکشاپ میں چھوڑی ہے۔ جانا بھی ضروری ہے اس لیے بس میں جارہا ہوں۔''

میں نے آس پاس دیکھا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ آپ اپنا بیگ گود میں یا نیچے رکھ لیں، یہاں ایسی چیزوں کا نمایاں ہونا اچھی بات نہیں ہے۔''

وہ چونکا اور کسی قدر مضطرب انداز میں کہا۔ ''کیوں۔۔۔ یہاں خطرہ ہے؟''

''ڈاکوؤں کا۔'' میں نے بدستور دھیمی آواز میں کہا۔

''مگر وہ تو راستے میں ہوتا ہے۔''

''ان کے مخبر یہیں ہوتے ہیں اور وہ بندہ تاڑ کر ڈاکوؤں کو اطلاع کرتے ہیں کہ آسامی آرہی ہے اور وہ راستے میں روک لیتے ہیں۔''

بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے جلدی سے بیگ اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ یک دم ہی چوکنا نظر آنے لگا تھا اور اس کی نظریں آس پاس دیکھ رہی تھیں جیسے ڈاکوؤں کے ممکنہ مخبر کو کھوج رہی ہوں۔ مگر مخبر کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا ہے اور وہ ہوتا بھی عام طور سے بس اڈے پر کام کرنے والوں میں سے۔۔۔ ہے جیسے ہوٹل کا بیرا یا گاڑی صاف کرنے والے لڑکے یا پھر بھیک مانگنے والے۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ یوں چوکنا ہو کر بھی نہ بیٹھے کہ دور سے نمایاں ہو۔ مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا کہ یہ زیادہ ہی دخل اندازی ہوتی۔ وہ میری طرف سے مشکوک ہو سکتا تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو میں نے موبائل نکال کر دیکھا۔ موتل کال کر رہی تھی۔ موتل میری بیوی اور میرے دو سال کے بیٹے کی ماں ہے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں کال کی ہے؟''

''سائیں تم کب آؤ گے؟'' موتل نے وہی سوال کیا جو وہ پچھلے ایک ہفتے سے کر رہی تھی۔

''آج۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا۔

''سائیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ''یہ تو تم ایک ہفتے سے کہہ رہے ہو۔''

''آج پکا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بابو کیسا ہے؟''

ہمارے بیٹے کا نام دیار شاہ ہے مگر ہم پیار سے اسے بابو کہتے ہیں۔ موتل نے بتایا۔ ''تم کو بہت یاد کرتا ہے۔ کل رات اتنا رویا کہ میرے لیے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔''

بیٹے کے رونے کا سن کر میں تڑپ گیا۔ ''بس آج ضرور آؤں گا۔''

موتل شوخ ہونے لگی۔ ''بیٹے کا سن کر تڑپ گئے اور بیوی کا خیال ہی نہیں ہے۔''

''تیرا خیال تو ہر لمحے رہتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''بس فکر مت کر آج رات تک آجاؤں گا۔''

کال کاٹ کر میں نے موبائل رکھا تو نوجوان مسکرا رہا تھا۔ ''بیوی ہوگی؟''

اگرچہ میں کسی غیر آدمی سے اپنی بیوی کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا ہوں لیکن اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ مجھے برا نہیں لگا۔ میں جواباً مسکرایا۔ ''ہاں بیوی تھی۔''

''جب آدمی گھر سے باہر ہو تو بیوی سب سے زیادہ بے چین رہتی ہے۔''

اس بار میں ہنسا۔ ''لیکن یہی آدمی دو دن گھر بیٹھ جائے تو بھی سب سے زیادہ بے چین بھی بیوی ہوتی ہے۔''

وہ بھی ہنسا۔ ''ہاں سائیں۔۔۔۔ یہ بیویاں بھی عجیب مخلوق ہوتی ہیں۔ مرد کو اپنے پاس بھی دیکھنا چاہتی ہیں اور اسے گھر میں بھی کم برداشت کرتی ہیں۔''

''تم شادی شدہ ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جی سائیں، تب ہی تو بیوی کے بارے میں اتنا جانتا ہوں۔ میری بیوی بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ میں گھر میں رہوں تو اسے بے چینی ہوتی ہے کہ کام پر کیوں نہیں جا رہا اور باہر نکلوں تو بار بار مجھے کال کرکے پوچھتی ہے کہ واپس کب آؤں گا۔''

کشمور جانے والی کوچ تیار ہو رہی تھی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کراس کو چیک کر رہے تھے۔ آئل، ریڈی ایٹر کا پانی اور ٹائروں کی ہوا دیکھی جا رہی تھی۔ راستے میں ان میں سے کوئی چیز کم ہوجائے تو بڑا مسئلہ ہوجاتا ہے۔ اس سڑک پر تو ڈرائیور رفتار بھی کم نہیں کرتے ہیں۔ کنڈیکٹر عام طور سے چھت پر ہوتا ہے تاکہ اگر راستے میں ڈاکوؤں نے کوئی رکاوٹ ڈالی ہو تو دور سے نظر آجائے اور وہ ڈرائیور کو خبردار کردے۔ اگرچہ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکو اب تمام چیزوں کا سوچ کر آتے ہیں اور ان سے بچنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ نوجوان نے میری نظروں کا تعاقب کیا۔

''سائیں تم بھی اسی بس سے جا رہے ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''میرا گھر کندھ کوٹ کے پاس ہے، میں وہاں اتر جاؤں گا۔''

نوجوان اسی بس میں جا رہا تھا۔ اس کا سوال ہی بتا رہا تھا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا اور اس نے ہارن دیا۔ یہ اشارہ تھا کہ اس بس میں سفر کرنے والے آجائیں۔ اصل میں یہ بس تیس کلومیٹرز دور سکھر سے چلتی تھی اس کا روٹ کشمور سے ہوتے ہوئے راجن پور تک کا تھا۔ کچھ مسافر سکھر سے بیٹھے اور کچھ یہاں سے بیٹھتے۔ ہارن بجتے ہی مختلف

میزوں پر بیٹھے لوگ اٹھنا شروع ہو گئے۔ میں اور نوجوان بھی اٹھ گئے۔ ٹکٹ میں پہلے ہی لے چکا تھا۔ میں نے اپنا بیگ کنڈیکٹر کے حوالے کیا جس نے اسے سامان والے خانے میں رکھ دیا اور مجھے پرچی بنا کر دینے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے ایک سگریٹ اور سلگالیا۔ بس میں میں سگریٹ پینے سے گریز کرتا تھا کیونکہ اس سے دوسروں کو دھواں لگتا تھا اور لوگ شور مچاتے تھے۔ میں لڑائی جھگڑے اور نمایاں ہونے سے گریز کرتا تھا۔ نوجوان اندر چلا گیا تھا۔ تقریباً تمام مسافر بس میں سوار ہو گئے اور ڈرائیور نے آخری بار ہارن دیا۔

میں نے آخری کش لے کر سگریٹ پھینک دیا اور اندر آ گیا۔ ڈرائیور نے ہینڈل کھینچ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ کنڈیکٹر باہر رہ گیا تھا اور اب وہ چھت پر جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا خیال درست نکلا تھا۔ میں نے سیٹوں کا جائزہ لیا تو مجھے حیرت ہوئی میری سیٹ نوجوان کے برابر والی تھی۔ ٹکٹ پر یہی لکھا تھا۔ یہ درمیان میں دائیں طرف کی راہداری والی سیٹ تھی۔ کھڑکی کی طرف نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ بس کی اسّی فیصد نشستیں بھری ہوئی تھیں اور کوئی پندرہ کے قریب خالی تھیں۔ میں چاہتا تو ان میں سے کسی پر بھی بیٹھ سکتا تھا لیکن میں نوجوان کے پاس آ گیا، اس کے برابر میں بیٹھا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”سائیں لگتا ہے اس سفر میں ہم ساتھ ہی رہیں گے۔“

میں نے اعتراف کیا۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میرا ٹکٹ اس سیٹ کا ہے۔“

اب تک ہمارے درمیان تعارف نہیں ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا پھر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”مجھے عنایت اللہ قریشی کہتے ہیں۔ سکھر کا رہنے والا ہوں۔“

”عامر شاہ۔“ میں نے اپنا تعارف کرایا۔

وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سائیں پولیس میں کام کرتے ہو؟“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”کچھ عرصے میں بھی فورس میں رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب نہیں ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رشی کو پسند نہیں تو میں نے چھوڑ دی۔“

میں نے جھجک کر پوچھا۔ ”رشی کون؟“

”میری بیوی راشدہ... میں اسے رشی کہتا ہوں۔“

”بچے ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، اللہ نے دو بار امید دی لیکن پھر پوری ہونے سے پہلے واپس لے لی۔ اب کوئی امکان نہیں ہے۔ رشی ماں نہیں بن سکتی ہے۔“

مجھے افسوس ہوا۔ ”تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”نہیں کر سکتا۔“

”اس لیے کہ اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟“

اس نے مبہم سے انداز میں سر ہلایا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس نے اقرار کیا تھا یا انکار۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ یہ اے سی کوچ تھی جس کی کھڑکیاں نہیں ہوتی ہیں۔ شیشے فکس تھے اور کیونکہ سردی کا موسم تھا اس لیے اے سی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سردی بھی اتنی نہیں تھی کہ ہیٹر چلانے کی ضرورت پیش آتی۔ بس کے اوپر مختصر سامان رکھنے کے لیے خانے بنے ہوئے تھے لیکن اس نے اپنا لیدر بیگ اپنے پاس رکھا تھا۔ یہ اس نے پاؤں کے پاس کھڑکی کے عین نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”اب کیا کرتے ہو؟“

”سائیں اپنا آبائی کام۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہم ذات کے قریشی ہیں۔ ادھر سکھر میں گوشت کی ساری مارکیٹیں ہماری ہیں۔“

میرا اندازہ تھا کہ وہ کشمور جانور لینے جا رہا ہے۔ ادھر بلوچستان اور اوپر سرحد تک سے بیوپاری اپنا مال لاتے تھے۔ ڈاکو راج کی وجہ سے وہ آگے آتے ہوئے گھبراتے تھے اس لیے کشمور تک ہی اپنا مال فروخت کر کے چلے جاتے تھے۔ عنایت اللہ نے کچھ دیر بعد مجھ سے پوچھا۔ ”سائیں آپ کی پوسٹنگ کہاں ہے؟“

”جیکب آباد میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”سائیں ادھر ڈاکو پولیس کے دشمن ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر کوئی پولیس والا مل جائے تو ساتھ لے جاتے ہیں۔ بدلے میں اپنے آدمی رہا کراتے ہیں یا پھر مار دیتے ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اسی لیے میں سادہ لباس میں ہوں۔ بیلٹ اور اسلحہ وہیں چھوڑ کر آیا ہوں۔ بال بھی بڑھائے ہوئے ہیں۔“

”کارڈ ہوگا؟“

”وہ ہے لیکن ایسی جگہ چھپایا ہے کہ کوئی تلاش نہیں کر

سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے تم نے مجھے فکرمند کردیا ہے میں سوچ رہا تھا کہ کوئی مجھے پولیس والے کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتا۔"

"عام آدمی نہیں کرسکتا، لیکن میں فورس میں رہ چکا ہوں۔"

"فورس کب چھوڑی؟"

"دوسال ہوگئے ہیں۔"

"آفیسر تھے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نوکری بھی مزے کی تھی زیادہ تر فارغ بیٹھے رہتے تھے۔"

"جب آرام سے بیٹھ کر کرنے والی نوکری تھی تو کیوں چھوڑی؟"

"آرام والی تو تھی پر خطرہ بھی تھا اور رشی سے یہ برداشت نہیں تھا۔ شادی کے فوراً بعد اس نے نوکری چھوڑنے اور اپنا کام کرنے کو کہنا شروع کردیا تھا۔"

"یہ تو ہے پولیس کی نوکری کتنے ہی آرام والی کیوں نہ ہو اس میں خطرہ تو ہوتا ہے۔"

"سائیں تم خطرناک علاقے میں ڈیوٹی کررہے ہو، تم کو پتا تو ہوگا۔"

"ہاں بھائی ادھر ہم پولیس والوں کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ بازار بھی جاتے ہیں تو دوتین اور مسلح ہوکر جاتے ہیں۔ آج کل ڈاکو سخت دشمن بنے ہوئے ہیں۔"

"آپریشن کے بعد سے ایسا ہورہا ہے۔" اس نے کہا۔ "پچھلی بار جب میں کشمور جارہا تھا تو راستے میں کچھ دیر پہلے ہی پولیس کی موبائل پر فائرنگ کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں دو پولیس والے مارے گئے تھے اور تین زخمی ہوئے تھے۔ بعد میں وہ بھی مرگئے تھے۔"

"بس اسی سے اندازہ لگالو کہ ہم کتنے خطرناک حالات میں کام کررہے ہیں۔"

"پر سائیں حقیقت تو یہ ہے کہ خود ہمارے اندر کالی بھیڑیں ہیں۔ جو ڈاکوؤں سے ملی ہوئی ہیں۔ اپنے ہی بھائیوں کو مرواتے ہیں مخبری کرکے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "پولیس والوں کے قتل میں اکثر اندر کے لوگ ہی شامل ہوتے ہیں۔ یہ مخبری کرتے اور ڈاکوؤں کو ان کے بارے میں بتاتے ہیں۔ پچھلے ایک سال میں صرف سکھر ڈویژن میں بائیس پولیس والے گھات لگا کر ماردیے اور ایک کا قاتل بھی ہاتھ نہیں آیا۔"

"دولت بُری چیز ہے سائیں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔ "یہ بھائی کے ہاتھ بھائی کو مروادیتی ہے۔ سچی بات ہے کہ ان باتوں نے بھی فورس سے میرا دل خراب کیا اور میں نے جاب چھوڑ دی۔ کیا فائدہ جب آدمی برسوں کسی کے ساتھ رہے اور وہ تھوڑے سے پیسوں کی خاطر آپ کا سودا کرلے۔"

بس شکارپور سے خاصی آگے نکل گئی تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے پون گھنٹا ہوگیا تھا۔ غوث پور نزدیک آرہا تھا اور اس کے بعد کندھ کوٹ تھا۔ میرے موبائل نے ایس ایم ایس ٹون دی۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا۔ ایک میسج آیا ہوا تھا۔ میں جواب دینے لگا۔ عنایت اللہ نے منہ دوسری طرف کرلیا تھا۔ وہ دوسروں کی پرائیویسی کا خیال رکھنے والا آدمی تھا۔ میں نے میسج کا جواب دیا اور موبائل رکھا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا اور مسکرایا۔ "بھابی کا میسج ہوگا۔"

"اسے چین کہاں ہے۔ پوچھ رہی تھی کہ کہاں ہو، میں نے بتایا کہ راستے میں ہوں۔"

اس نے باہر دیکھا۔ "اب زیادہ فاصلہ نہیں رہا ہے غوث پور آنے والا ہے۔ اس کے بعد کندھ کوٹ تک مشکل سے آدھے گھنٹے کا سفر ہے۔ شکر ہے ادھر سڑک ٹھیک ہوگئی ہے۔"

"اسٹاپ سے میرا گھر رکشے میں دس منٹ کے فاصلے پر ہے۔"

"ایسا لگ رہا ہے کہ تم گھر کم جاتے ہو؟"

"ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "پچھلے چھ مہینے میں بس دو ہفتے گھر میں گزارے ہیں۔"

"بھائی بیٹے کو ادھر جیکب آباد لے جاؤ۔"

"سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پر اس صورت میں بچت مشکل ہوجائے گی۔"

"کندھ کوٹ میں اپنا گھر ہے؟"

"ہاں باپ کی زمین ہے۔ بھائی دیکھتا ہے۔ میرے حصے کے بدلے وہ میرا گھر بھی چلاتا ہے۔ ادھر سے چلا گیا تو کچھ رقم پکڑا دے گا۔ وہ زیادہ کام نہیں آئے گی۔"

"یہ تو ہے۔" عنایت اللہ نے سر ہلایا۔ "آدمی اپنے علاقے سے جتنا دور جاتا ہے، اخراجات اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں۔ پوسٹنگ کے دور میں، میں کشمور میں رہا ہوں۔ رشی کو ساتھ رکھا ہوا تھا اور مجھے وہاں رہنا مہنگا پڑتا تھا۔ سمجھ لو کہ ساری تنخواہ وہیں خرچ ہوجاتی تھی۔"

کشمور کے نام پر میں چونکا اور میرے ذہن میں کوئی

بات آئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ واضح ہوتی، اچانک شور بلند ہوا۔ کنڈیکٹر بس کی چھت پر ہاتھ مار کر چلا رہا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے بھی اچک کر دیکھنا چاہا تھا کہ جھٹکے سے بس کے رکنے سے میں آگے والی سیٹ سے ٹکرایا اور پھر واپس اپنی سیٹ پر گرا۔ دوسرے کھڑے ہونے والے بھی گر رہے تھے۔ شور میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے عنایت اللہ کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ڈاکو ہیں؟“

”نہیں کوئی اور بات ہے۔“ میں نے کہا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

”ڈاکو ہیں۔“ اس بار اس نے اطلاع دی۔ ”ایک بڑی جیپ اُدھر کچے سے نکل کر بس کے پیچھے آئی ہے۔“

میں ایک بار پھر اٹھا تو مجھے سڑک پر پڑا ہوا تنا نظر آ گیا۔ وہ کوئی دو سو گز آگے تھا اور اس کا سائز ایسا نہیں تھا کہ دور سے نظر آتا مگر بس کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے کافی تھا۔ اب میں نے پیچھے دیکھا تو جیپ بس کے بالکل عقب میں آ گئی تھی اور اس سے مسلح افراد اتر رہے تھے۔ عنایت اللہ کی بات درست تھی۔ دوسرے مسافروں نے بھی مسلح افراد کو دیکھ لیا تھا اور سب ہی ڈاکو ڈاکو بول رہے تھے۔ کچھ اپنی نقدی اور دوسرا قیمتی سامان چھپانے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ سب بیکار تھا۔ ڈاکو ہر فرد کی اور پوری بس کی تلاشی لیتے۔ اگر کسی نے کچھ چھپایا ہوتا اور وہ نکل آتا تو چھپانے والے کی شامت آ جاتی اور اس کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ جو ایسا کر رہے تھے، وہ لٹنے کے ساتھ ساتھ پٹنے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ عنایت اللہ نے گھبرا کر کہا۔ ”اب کیا کریں میرے پاس تو بڑی رقم ہے۔“

میں نے اس کے چرمی بیگ کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہاں چھوٹا سا پرس بھی نہیں چھپا سکتے۔ یہ تو بہت بڑا بیگ ہے۔ ویسے کتنی رقم ہے؟“

”ساڑھے چار لاکھ کی رقم ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ لٹنے کے خیال سے اس کا سفید رنگ اور سفید پڑ گیا تھا۔ ”نوٹ بھی زیادہ تر سو والے ہیں۔ دو ہی گڈیاں پانچ سو کی ہیں۔ اگر ہزار کے نوٹ ہوتے تو میں کپڑوں میں ہی چھپا لیتا۔ چھوٹے نوٹوں کی وجہ سے یہ بیگ لانا پڑا۔“

میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ابھی تم دیکھ لو گے کہ یہ کس طرح لوگوں کی تلاشی لیتے ہیں، نقدی بہت بڑی چیز ہے یہ سکے تک تلاش کر لیتے ہیں۔“

اس دوران میں ڈاکو بھاگتے ہوئے دروازے تک آئے اسے کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد ڈرائیور کو باہر سے رائفل دکھائی تو اس نے گھبرا کر ہینڈل کھینچ دیا اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار ڈاکو دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اندر آتے ہی آگے والے نے چلا کر کہا۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ سب اپنے ہاتھ اوپر کر لیں جس کا ہاتھ نیچے ہوا اسے کاٹ کر رکھ دوں گا۔“

سب نے بلاچوں چرا اپنے ہاتھ یوں اوپر کر لیے کہ ڈاکوؤں کو واضح نظر آئیں۔ ایک ڈاکو نے ڈرائیور کو بس چلانے کو کہا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”کیسے چلاؤں آگے، تنا پڑا ہوا ہے۔“

اس پر ڈاکو نے بڑی فحش بات کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت گندی ذہنیت والے لوگ تھے۔ ڈرائیور نے بس آگے بڑھائی۔ ڈاکوؤں کی جیپ پیچھے آ رہی تھی پھر اس نے بس کو اوورٹیک کیا اور تنے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ اس سے دو افراد اترے اور انہوں نے پھرتی سے تنا سڑک سے ہٹایا اور دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ڈاکو چلتی بس میں تسلی سے لوٹ مار کرنا چاہتے تھے۔ ایک عقب میں چلا گیا۔ ایک ڈرائیور کے سر پر تھا اور باقی دو مسافروں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ کسی مسافر کا ہاتھ ذرا بھی نیچے جاتا تو ان میں سے کوئی گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہاتھ اوپر کرنے کا حکم دیتا۔ عنایت اللہ نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ”یہ بہت گندے لوگ ہیں ان کو عورتوں کا خیال بھی نہیں ہے۔ کیسی زبان استعمال کر رہے ہیں؟“

”یہ ڈاکو ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”ان کا اخلاق اور تمیز سے کیا تعلق؟“

”تم دونوں اپنی زبانیں بند رکھو۔“ نسبتاً قریب کھڑے ڈاکو نے ہمیں حکم دیا۔ اس نے ہماری سرگوشیاں سن لی تھیں۔ مگر شاید الفاظ نہیں سن سکا تھا ورنہ اتنی شرافت سے خاموش رہنے کا حکم نہ دیتا۔ ہمیں گالیاں پڑ جاتیں۔ جس وقت ڈاکو بس میں سوار ہو رہے تھے اور سڑک پر تنا پڑا ہوا تھا اتفاق سے اس وقت سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آئی۔ گویا کسی کو پتا نہیں تھا کہ اس وقت ہماری بس میں ڈاکو سوار تھے۔ جب تنا ہٹنے کے بعد بس آگے روانہ ہوئی تو ڈاکوؤں نے ڈرائیور کو رفتار تیس میل فی گھنٹا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی بس کی کھڑکیوں کے ساتھ لگے پردے برابر کیے جانے لگے۔ یہ کام ڈاکو خود کر رہے تھے۔ پردے برابر کرنے کے دوران مسافروں کے ہاتھ اوپر ہی

تھے۔ موبائل سب کے پاس ہوتا ہے۔ شاید ان لوگوں کو خطرہ تھا کہ کوئی مسافر خاموشی سے پولیس کا نمبر نہ ملا دے۔
اگرچہ اول تو پولیس والے نمبر اٹھانے کی زحمت نہیں کرتے ہیں لیکن اس کا امکان تھا کہ کسی مسافر کا کوئی پولیس والا رشتے دار یا واقف کار ہو اور وہ اسے کال کر دے۔ اپنے چیٹی بند بھائی کے لیے پولیس حرکت میں آسکتی تھی اس لیے مسافروں کے ہاتھ اوپر کرائے ہوئے تھے۔ ڈاکو سب پر عقابی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جس منظم طریقے سے کام کر رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا ہر فرد کو پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ پردے برابر کرنے کے بعد ایک ڈاکو نے بڑا سا کپڑے کا تھیلا لیا اور آگے سے شروع کیا۔ پہلے وہ بائیں قطار کی طرف آیا۔ اس نے مسافروں سے کہا۔ ”سوائے تن کے کپڑوں کے سب اس میں ڈال دو۔ یہ بات یاد رکھنا بعد میں تلاشی لی جائے گی اگر کسی کے پاس سے کچھ نکل آیا تو ہم اسے ساتھ لے جائیں گے اور آرام سے اس کے کپڑے اور اس کے بعد اس کی کھال اتاریں گے۔ جو اپنی کھال بچانا چاہتے ہیں، وہ سب اس میں ڈال دیں۔“

یہ سن کر مسافروں کی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ سب اپنا سب کچھ تھیلے میں ڈالنے لگے۔ یاد کر کے اور جیبوں کی تلاشی لے کر چیزیں نکال رہے تھے کہ بعد میں کھال کی محرومی سے بچ سکیں۔ جو پیچھے تھے، انہوں نے پہلے ہی چیزیں نکالنا شروع کر دی تھیں۔ اپنے موبائل، پرس، رومال، مرد انگوٹھیاں اور گلوں میں پہنے تعویذ یا چین، عورتیں اپنا زیور اور پرس تھیلے میں ڈال رہی تھیں۔ جیسے جیسے ڈاکو پیچھے کی طرف آرہا تھا، تھیلا بھرتا جارہا تھا۔ وہ پیچھے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ تھیلا پوری طرح بھر گیا۔ اس نے تھیلے کے سرے پر موجود رسی کو کھینچ کر اسے بند کیا اور ڈرائیور کے پاس موجود ساتھی کے حوالے کر کے دوسرا تھیلا نکالا اور جہاں سے سلسلہ چھوڑا تھا وہیں سے دوبارہ شروع کیا۔ جو مسافر چیزیں دیتے جا رہے تھے، ان کو ہاتھ نیچے کرنے کی اجازت مل رہی تھی۔

چوتھا فرد جو فارغ تھا، وہ ٹہلنے کے انداز میں تمام مسافروں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ جہاں کوئی ذرا سی حرکت کرتا وہ اس کے سر پر پہنچ جاتا۔ تھیلے والا آخر سے ہو کر اب دائیں قطار کی طرف آگیا تھا اور پیچھے سے آگے آرہا تھا۔ میں اور عنایت اللہ اسی قطار میں تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ بیگ کو پاؤں سے سرکا کر سیٹ کے نیچے کر دے۔

اگرچہ یہ کوشش بیکار ہی تھی کیونکہ ڈاکو کہہ چکے تھے کہ وہ چیک کریں گے اور تلاشی لیں گے۔ بس دھیمی رفتار سے چل رہی تھی اور غوث پور کی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ بس کا یہاں اسٹاپ نہیں تھا اس لیے وہ ہائی وے پر رہی۔ ویسے اگر اسٹاپ ہوتا بھی تو ڈاکو کون سا اسے یہاں رکنے دیتے۔ سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور دھند تقریباً غائب ہو گئی۔ میں سامنے ونڈ اسکرین سے پار دیکھ رہا تھا۔
ڈاکوؤں کی جیپ کچھ فاصلے پر جا رہی تھی۔ یہ خاصی بڑی والی جیپ تھی جس میں آگے پیچھے سیٹوں کے ساتھ ہی عقبی حصے میں بھی خاصی جگہ ہوتی ہے۔ ڈاکو بہ ظاہر چھ تھے لیکن اس کا امکان تھا کہ ان کی اصل تعداد اس سے زیادہ ہو۔ جیپ کی حالت گرد مٹی سے خراب تھی مگر یہ تقریباً نئی جیپ تھی۔ میں نے کہا نا کہ یہاں ڈاکوؤں کے پاس جدید ترین اسلحہ اور گاڑیاں تھیں جن پر وہ اس علاقے میں دندناتے پھرتے تھے۔ پولیس والوں کے پاس پرانے طرز کی خستہ حال موبائلز تھیں جو چل جاتیں تو اسے ہی غنیمت سمجھا جاتا۔ البتہ اسلحہ کسی قدر بہتر دے دیا گیا تھا۔ ایس ایم جی اور جدید رائفلیں آئی تھیں۔ اس طرح غیر ملکی پستول تھے۔ اس کے باوجود ڈاکوؤں کے پاس زیادہ جدید اسلحہ تھا۔ عنایت اللہ نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر تم اپنی سرکاری گن لے آتے تو اس وقت مزاحمت کر سکتے تھے۔“
”شکر ہے کہ میں نہیں لایا ورنہ یہ باقی کسی کو کچھ نہیں کہتے مگر مجھے ضرور ساتھ لے جاتے اور ایک گن سے میں بھلا کیا کر لیتا۔ یہاں تو چار گنز ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور پھر ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا کیونکہ تھیلے والا ڈاکو نزدیک آگیا تھا۔ اس نے ہماری پچھلی سیٹ پر بیٹھے جوڑے سے کہا۔
”چل نکال جلدی جو کچھ تیرے پاس ہے۔“
عورت منمنا رہی تھی شاید منت سماجت کر رہی تھی۔ مرد اسے سمجھا رہا تھا شاید اس کے پاس کوئی چیز تھی اور وہ دینے کو تیار نہیں تھی۔ اچانک ڈاکو نے دہاڑ کر کہا۔ ”دیتی ہے یا ہاتھ کاٹ کر اتار لوں۔“
”دے دے۔“ مرد نے برہمی سے کہا۔ ”اب یہ تیرا ہاتھ پکڑے گا۔“
”اور تو بے غیرت دیکھتا رہے گا۔“ عورت نے تنک کر کہا۔
”تو کیا جان دے دوں۔“ مرد بولا۔
”لو یہ چار چوڑیاں بچی تھیں، یہ تم لے لو۔“ عورت

نے غصے سے چوڑیاں اتار کر تھیلے میں ڈال دیں اور پھر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ مرد نے بھی اپنی ساری چیزیں تھیلے میں ڈال دی تھیں۔ کسی نے عورت کے رونے دھونے پر توجہ نہیں دی کیونکہ وہاں سب ایسے ہی حالات سے گزر رہے تھے۔ غوث پور گزر رہا تھا۔ ڈرائیور کے پاس کھڑے ڈاکو نے اسے حکم دیا۔

''رفتار اور کم کر لے پچیس میل سے اوپر نہ جائے۔''

غالباً ڈاکو لوٹ مار کے لیے مزید وقت چاہتے تھے۔ چلتی بس میں لوٹ مار سے یہ فائدہ تھا کہ اگر کہیں پولیس سے سامنا ہو جاتا تب بھی اسے شک نہ ہوتا۔ شکار پور کے بعد اگلی پولیس چوکی جہاں بس کو روک کر چیک کیا جاتا، کندھ کوٹ میں تھی۔ وہ کندھ کوٹ پہنچنے سے پہلے پہلے اپنا کام کر لینا چاہتے تھے۔ اب ہماری باری تھی جیسے ہی ڈاکو تھیلا لے کر ہمارے پاس آیا، میں نے جیب سے اپنا پرس اور موبائل نکال کر اس میں ڈال دیا۔ ڈاکو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ اور ہے تو ابھی ڈال دے بعد میں مال بھی دے گا اور پچھتائے گا بھی۔''

''جو میرے پاس تھا، وہ دے دیا ہے اب ایک بیگ ہے جس میں سامان اور کپڑے ہیں، وہ بس کے سامان والے خانے میں ہے۔''

ڈاکو نے عنایت اللہ کی طرف دیکھا۔ ''چل تو بھی نکال جو کچھ ہے۔''

اس نے اپنا پرس، موبائل، انگوٹھی اور گھڑی اتار کر تھیلے میں ڈال دی۔ ''بس یہی ہے۔''

اتنی دیر میں ڈاکو چرمی بیگ دیکھ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اڑے مسخری کرتا ہے۔ یہ کیا چھپایا ہوا ہے؟''

غالباً پوری بس میں کسی اور کے پاس ایسا بیگ نہیں تھا۔ ڈاکو نے اپنے فارغ ساتھی کو آواز دی۔ ''اڑے نمبر چار ادھر آ دیکھ سیٹھ کے پاس کیا ہے؟''

وہ لپک کر آیا اور بیگ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی چمک آ گئی تھی۔ اس نے جھپٹ کر بیگ اٹھایا اور بے تابی سے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ ''اڑے یہ تو لاک ہے۔''

''چابی کدھر ہے۔'' تھیلے والے ڈاکو نے عنایت اللہ سے پوچھا۔

''میرے پرس میں۔'' اس نے جواب دیا۔ اتنی بڑی رقم اور اپنا سب کچھ جاتے دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ گھڑی، موبائل اور انگوٹھی قیمتی تھی۔ اس کے پرس میں بھی یقیناً خاصی رقم ہو گی لیکن اصل مال تو بیگ میں تھا اور وہ اب ڈاکوؤں کے پاس جا چکا تھا۔ تھیلے والے ڈاکو نے تھیلے میں جھانکا اور بدمزگی سے بولا۔ ''اب اتنے سارے پرسوں میں سے تیرا کہاں تلاش کروں۔ اس میں ہے کیا؟''

''ساڑھے چار لاکھ روپے۔'' عنایت اللہ نے مردہ لہجے میں کہا تو ڈاکو کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے چیخ کر کہا۔

''سردار اپنا جیک پاٹ لگ گیا ہے۔ اڑے اس بیگ میں ساڑھے چار لاکھ روپے ہیں۔''

سردار جو ڈرائیور کے سر پر تھا، وہ ساڑھے چار لاکھ کا سن کے لپک کر آیا اور اس نے بیگ اپنے ساتھی سے جھپٹ لیا۔ اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''اسے ٹھکانے پر چل کر دیکھیں گے۔ ابھی تو باقی کام کرو۔''

ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ چھوٹے درجے کے ڈاکو تھے جنہیں ایک واردات سے شاید لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے اور اتنی ہی مالیت کی قیمتی اشیا مل جاتی تھیں۔ ان کے لیے ساڑھے چار لاکھ خاصی بڑی رقم تھی۔ یہ انہیں دو تین مہینے کے لیے واردات سے بے نیاز کر دیتی۔ سردار نے بیگ سینے سے لگائے لگائے واپس ڈرائیور کا رخ کیا۔ تھیلے والا اب عجلت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی باقیوں سے بھی چیزیں وصول کرنا شروع کر دیں۔ آگے جاتے جاتے یہ تھیلا بھی بھر گیا تھا۔ اگرچہ اس میں کام کی چیزیں کم تھیں۔ یعنی نقدی، سونا اور قیمتی چیزیں جیسے موبائل، گھڑیاں وغیرہ۔ کیونکہ ڈاکوؤں نے سب تھیلے میں ڈالنے کو کہا تھا اس لیے لوگوں نے ہر چیز دے دی تھی۔ سب سے زیادہ جگہ عورتوں کے پرسوں نے بھری تھی تقریباً ہر عورت کے پاس بیگ سائز کا پرس تھا۔

اب ان کے پاس تھیلے نہیں تھے اس لیے تھیلے والے ڈاکو نے ایک مسافر کا بڑا سا رومال لیا اور باقی سامان اس میں جمع کرنے لگا۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈاکوؤں نے عنایت اللہ کے بیگ کے علاوہ بھی خاصا مال حاصل کر لیا تھا۔ جب تک مسافر لٹ رہے تھے، وہ خاموش اور سہمے ہوئے تھے مگر لٹنے کے بعد ان کا غصہ ابھرنے لگا تھا۔ وہ دھیمی آوازوں میں اس کا اظہار کر رہے تھے۔ جب یہ آوازیں ایک حد سے بلند ہونے لگیں تو فارغ ڈاکو دہاڑا۔ ''بک بک بند کرو۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔ شکر کرو مال گیا کھال بچ گئی ہے۔''

اس کی دہاڑ سن کے سب کی سٹی ایک بار پھر گم ہو گئی۔۔۔۔ پھر سردار نے حکم دیا کہ ساری عورتیں پیچھے چلی

جائیں۔ اس پر مسافروں نے احتجاج کیا۔ ”عورتیں کیوں پیچھے جائیں ---- ہم اپنی عورتوں کو پیچھے نہیں بھیجیں گے ---- تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“

جواب میں ڈاکوؤں نے اپنی گنز تان لی تھیں۔ مسافروں کے پاس ان کا جواب نہیں تھا۔ مجبوراً تمام عورتیں اٹھ کر پیچھے چلی گئیں۔ اب عورتوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے دبے ہوئے احتجاج اور رونے دھونے سے ہوا تھا۔ اس پر مرد بھی شور کرنے لگے مگر ڈاکوؤں نے تمام عورتوں کی تلاشی لے کر ہی انہیں چھوڑا تھا۔ اس کے بعد مردوں کی باری آئی۔ ان کی تلاشی لی جاتی اور انہیں آگے بھیج دیا جاتا۔ ان کی خالی ہونے والی جگہوں کی بھی تلاشی لی جا رہی تھی کہ کسی نے سیٹوں یا ان کے نیچے کچھ چھپا نہ دیا ہو۔ ڈاکو جیبوں والی جگہوں پر ہاتھ مار رہے تھے، پوری جسمانی تلاشی نہیں لے رہے تھے۔ پتا نہیں عورتوں کی انہوں نے کیسے تلاشی لی تھی۔ وہ جس طرح کے لوگ تھے ان سے بعید نہیں تھا کہ انہوں نے عورتوں کے ساتھ برا سلوک کیا ہو۔ جب میری تلاشی لے لی گئی اور مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا تو میں نے کہا۔

”تم لوگوں نے جو لینا تھا، وہ لے لیا ہے اب جاؤ۔“

”بکواس نہ کر۔“ سردار غرایا۔ ”ابھی سامان باقی ہے۔“

”ایسا نہ ہو تم لوگ سامان کے چکر میں ہاتھ آئے مال سے بھی جاؤ۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کنڈہ کوٹ زیادہ دور نہیں رہ گیا ہے اور وہاں پولیس چوکی ہے۔“

سردار کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ ساڑھے چار لاکھ روپے ہاتھ آگئے ہیں اور ڈیڑھ دو لاکھ کا دوسرا مال ہے اس لیے زیادہ کا لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ مگر اسے سامان کا خیال بھی تھا۔ بہت سے لوگ سفر کے دوران اپنا روپیہ یا کوئی قیمتی چیز بڑے سامان میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ وہ آسانی سے تلاش نہ کیا جا سکے۔ اس طرح اگر ڈاکا پڑے تو یہ چیز ڈاکوؤں سے بچ جاتی کیونکہ وہ سارا سامان نہیں لے جا سکتے اور اتنا وقت بھی نہیں ہوتا ہے کہ سامان کی مکمل تلاشی لیں۔ وہ صرف اسی مال پر اکتفا کرتے ہیں جو مسافروں کے پاس سے مل جائے۔

سردار میری بات کے بعد سوچ رہا تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے ڈرائیور سے بس روکنے کو کہا۔ ڈرائیور نے اسے سڑک کے کنارے کرتے ہوئے رفتار کم کر دی۔ فوراً ہی آگے جاتی جیپ کی رفتار کم ہوئی اور وہ بس سے پہلے رک گئی۔ بس اس کے تقریباً پیچھے رکی تھی۔ ڈاکوؤں نے لوٹ کا مال اٹھایا اور دروازے کے پاس جمع ہونے لگے۔ جیسے ہی بس رکی اور ڈرائیور نے ہینڈل کھینچ کر دروازہ کھولا تو سردار نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ”بس اس وقت تک یہیں رکے گی جب تک ہماری جیپ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتی اس سے پہلے بس حرکت میں آئی تو ہم واپس آجائیں گے۔“

”اب کیا لینے آؤ گے؟“ ایک نوجوان نے ہمت کر کے پوچھا تو سردار غرایا۔

”تیری جان۔“

نوجوان واپس سیٹ پر دبک گیا۔ سردار کے باقی ساتھی اتر گئے تھے مگر وہ ابھی بس میں تھا۔ اس نے اترنے سے پہلے میری طرف دیکھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرے ہاتھ پر ایک ہاتھ آگیا۔ یہ عنایت اللہ کا ہاتھ تھا اور اس کا ایسا انداز تھا جیسے وہ مجھے منع کر رہا ہو۔ میں نے سوچا اور پھر غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا اور سردار نیچے اتر گیا۔ اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے جیپ کی طرف چلے گئے جیسے ہی سردار نیچے اترا۔ میرے برابر میں بیٹھا ہوا عنایت اللہ حرکت میں آگیا۔ اب میں نے اس کا بازو پکڑا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا تھا مگر عنایت اللہ نے اس سے پوچھے بغیر ہینڈل کھینچ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا کر رہے ہو ---- وہ ابھی دور نہیں گئے ہیں۔“

عنایت اللہ نے اس کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”خاموش بیٹھے رہو۔“

میں دم بہ خود سا بیٹھا ہوا تھا۔ عنایت اللہ نیچے اتر گیا تھا۔ ڈاکوؤں کی جیپ روانہ ہونے والی تھی۔ پھر وہ حرکت میں آئی لیکن شاید بیس گز آگے گئی تھی کہ اچانک دھماکا ہوا اور جیپ سے شعلے نکلنے لگے۔ جیپ کے ساتھ میں بھی اچھل پڑا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے جیپ سے شعلے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ جیپ کے دروازے اڑ گئے تھے اور عقبی دروازے کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ مگر اس میں سوار افراد میں سے کسی کو نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بس میں موجود لوگ کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گئے اور پھر انہوں نے شور مچانا شروع کیا تھا کہ عنایت اللہ واپس اندر آیا اور اس نے ہینڈل کھینچ کر دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ ”چلو اب رکنے کی

ضرورت نہیں۔"
ڈرائیور ہوش میں آیا اور اس نے بس اسٹارٹ کر کے ذرا پیچھے کی اور پھر جلتی جیپ سے ممکن حد تک دور سے نکال کر اسے آگے لے گیا۔ عنایت اللہ میرے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ جب وہ بس سے اتر رہا تھا تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا اور واپس آتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ جیب میں تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور تاثرات ایسے تھے کہ میں چاہنے کے باوجود اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے گرم ٹوپی اتار دی تھی اور ماتھے کے ہلکے سے پسینے سے لگ رہا تھا کہ وہ گرمی محسوس کر رہا ہے۔ تب میں نے پہلی بار اس کی کنپٹی پر زخم کا پرانا لیکن گہرا نشان دیکھا۔ جیپ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اندر دھماکے نے ڈاکوؤں کے پرخچے اُڑا دیے تھے اور ان کے بچ جانے والے جسم اب جل رہے تھے۔ کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی دھماکے میں بچ بھی گیا تھا تو اس شدید آگ سے کیسے بچتا؟
ہم کچھ آگے نکلے ہوں گے کہ جیپ میں موجود ایمونیشن آگ کی وجہ سے پھٹنے لگا اور گولیوں کی آواز آرہی تھی۔ اس بار ڈرائیور نے تیزی دکھائی اور دس منٹ بعد ہم کندھ کوٹ کی پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ وہاں ڈرائیور اور مسافروں نے ڈاکے اور پھر ڈاکوؤں کی جیپ کے دھماکے سے تباہی کی رپورٹ کی تھی۔ پولیس نفری جائے وقوع کی طرف روانہ کر دی گئی تھی۔ یہاں پولیس زیادہ نہیں تھی اس لیے بڑے تھانے سے پولیس منگوائی گئی۔ آس پاس کی پولیس چوکیوں کو بھی خبردار کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بس اور اس کے سارے مسافروں کو روک لیا گیا کہ بیان اور اپنے کوائف دیے بغیر وہ یہاں سے نہیں جاسکتے تھے۔ کچھ فیملی کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور انہوں نے احتجاج کیا مگر یہ کارروائی بھی ضروری تھی۔ تمام مسافروں کو چوکی کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔
دوپہر کے بعد بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسافر بتا رہے تھے کہ ان کا کیا گیا تھا۔ فیملی والوں کو پہلے فارغ کیا گیا۔ اس کے بعد اکیلے سفر کرنے والوں کی باری آئی۔ جب میری اور عنایت اللہ کی باری آئی تو ہم نے پرس، موبائل اور معمولی اشیا لوٹے جانے کی رپورٹ کرائی۔ عنایت اللہ نے اس بیگ کا ذکر نہیں کیا جس میں ساڑھے چار لاکھ روپے تھے۔ شام گئے مسافروں کو وہاں سے جانے کی اجازت ملی تھی۔ مگر اب مسافر کہاں جاتے ان کے پاس نہ سفر کے لیے کچھ تھا اور نہ رہائش کے لیے۔ یہ کام انتظامیہ کر رہی تھی۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ گھر نزدیک ہی تھا۔ میرا پولیس کا حوالہ کام کر گیا اور مجھے شام تک جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں عنایت اللہ کی وجہ سے رکا رہا۔ اس کی باری خاصی دیر میں آئی اور جب اسے اجازت ملی اور وہ چوکی سے باہر آیا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ مجھے منتظر پا کر وہ ٹھٹک گیا۔ "تم گئے نہیں ابھی تک، تم تو یہیں رہتے ہو۔"
"تمہاری وجہ سے رکا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت کہاں جاؤ گے، میرے ساتھ چلو۔"
اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ایک شرط پر؟"
"میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔" میں نے اس کے کہنے سے پہلے کہا۔ "ہاں اگر تم خود بتانا چاہو تو تمہاری مرضی۔"
میں نے ایک رکشا کیا اور عنایت اللہ کے ساتھ گھر پہنچ گیا۔ میری آواز سن کر مول اتنی خوش ہوئی کہ اس نے دروازہ کھول دیا اور پھر عنایت اللہ کو دیکھ کر جھجک کر جلدی سے دروازے کے پیچھے ہو گئی۔ مول اندر گئی تو میں عنایت اللہ کو مہمان خانے میں لے آیا۔ اسے وہاں چھوڑ کر اندر آیا۔ مول اور بابو سے ملا جو مجھ سے یوں چمٹا جیسے میرے جسم کا حصہ بن جانا چاہتا ہو۔ مول بھی خوش تھی۔ میں نے اسے عنایت اللہ کے بارے میں بتایا کہ وہ مہمان ہے اور اس ...... کے لیے رات کے کھانے میں کچھ اچھا بنائے۔ میں بابو کے ساتھ واپس مہمان خانے میں آگیا۔ عنایت اللہ نے بابو کو پیار کیا اور پھر اس نے اپنے موزے میں پنڈلی کے ساتھ لپٹے ہزار کے چند نوٹوں میں سے ایک نکال کر بابو کو دیا۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے مہمان ہو۔"
اس نے سر ہلایا۔ "یہ ہماری روایت ہے۔"
شام ہوتے ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے مہمان خانے کے لیے ایک انگیٹھی جلائی اور جب وہ اچھی طرح سلگ گئی تو اسے اندر لے آیا۔ دروازے، کھڑکیاں بند کرنے سے مہمان خانہ گرم ہونے لگا۔ کچھ دیر میں مول نے کھانا تیار کر لیا۔ اس نے بکرے کا بھنا گوشت اور ساگ بنایا تھا۔ میں نے عنایت اللہ کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد میں اس کے لیے چائے بنوا کر لایا۔ مول بابو کو سُلا رہی تھی۔ عنایت اللہ نے کھانے اور چائے کی دل کھول کر تعریف کی۔ "شاہ سائیں تم خوش قسمت ہو جو ایسی بیوی ملی ہے۔"

"ہاں اللہ کا احسان ہے جو اس نے مجھ جیسے گناہ گار پر اتنی عنایت کی ہے۔"

"تمہارا بچہ بھی بہت پیارا ہے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"بابو میں میری جان ہے۔" میں نے کہا۔ "موہل میری بیوی ہے پر مجھے اس سے بھی اتنی محبت نہیں ہے جتنی کہ بابو سے ہے۔"

گفتگو کے دوران میں اچانک میرے موبائل کی بیل بجی اور میں نے موبائل نکالا تو عنایت اللہ چونک گیا۔ ایک جاننے والا کال کر رہا تھا۔ اس سے بات کر کے میں نے موبائل واپس رکھا تو عنایت اللہ نے سرسری انداز میں کہا۔ "شاہ جی آدمی کے لیے دو نوکریاں مشکل ہو جاتی ہیں۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ "ٹھیک کہا مگر بعض اوقات آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔"

"پیسے سے؟"

"نہیں بیوی بچوں سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کی وجہ سے آدمی دوسروں کی بہت سی باتیں ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں بھی بہت مجبوری میں تھا۔ پر اب اللہ کا شکر ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "کیوں سائیں اب مجبوری باقی نہیں رہی ہے؟"

"ہاں اب مجبوری باقی نہیں رہی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اس کے لیے میں تمہارا بھی شکر گزار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے چائے کا کپ ٹرے میں رکھا۔ "میں نے جو کیا، وہ اپنے لیے کیا۔"

"نہیں سائیں تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔" میں نے اصرار کیا۔ "ورنہ شاید آج میں زندہ نہ ہوتا۔"

"اگر میں نے کچھ کیا ہے تو اس کی وجہ تمہاری بیوی بچہ اور ان سے تمہاری محبت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں اٹھ رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "ڈاکے میں تمہاری کوئی اہم چیز یا کاغذ تو نہیں گیا؟"

وہ مسکرایا۔ "درحقیقت میرا کچھ بھی نہیں گیا۔ گھڑی اور انگوٹھی نقلی تھی اور پرس میں کچھ نہیں تھا۔"

"موبائل؟"

"ڈمی تھا۔"

"اور چرمی بیگ؟"

شیخ سعدی

شیخ سعدیؒ صبح جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ ایک دن ان کے والد محترم کے علاوہ باقی کے تمام لوگ سو رہے تھے۔ شیخ سعدی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

"افسوس صبح کا وقت ہے اور عبادت کا وقت ہے مگر یہ سب لوگ مُردوں سے شرط لگا کر سو رہے ہیں۔"

آپ کے والد نے جواب دیا۔ "بیٹا دوسروں کے عیب نکالنے سے بہتر تھا کہ تم بھی سو رہے ہوتے۔"

اٹک سے عبدالغفور خان ساغری ختک کا تحفہ

"اس کے بارے میں مت پوچھو۔" اس نے کہا۔

"اگر وہ اسے وہیں کھول لیتے؟"

"تب بھی انہیں اوپر نوٹوں کی گڈیاں ہی ملتیں مگر وہ سب جعلی نوٹ ہوتے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ پوری پلاننگ سے آیا تھا۔ میں اندر آیا تو موہل بے تابی سے میری منتظر تھی، وہ دو مہینے سے مجھ سے دور تھی۔ اس سے جدائی کی کسر پوری کرتے کرتے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا کہ صبح میری آنکھ موہل کے جھنجھوڑنے سے کھلی۔ اس نے شوخی سے کہا۔ "سائیں کتنا سوؤ گے۔ اپنا نہیں تو مہمان کا خیال کر وہ بے چارہ بھوکا پیاسا ہوگا۔"

مگر جب میں مہمان خانے میں آیا تو عنایت اللہ وہاں نہیں تھا۔ کمرا خالی تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ وہ شاید صبح چہل قدمی کرنے نکلا ہو۔ حاجت کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ مہمان خانے کے ساتھ ہی باتھ روم تھا۔ اسے آس پاس دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ چھوٹے بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ "بھائی تمہارا مہمان صبح سویرے چلا گیا۔ مجھ سے ملا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم سے معذرت کر لوں، اسے اچانک جانا پڑ رہا ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ عنایت اللہ اچانک کیوں چلا گیا تھا، اسے ڈر تھا کہ میں پولیس والا بن کر انکوائری پر نہ اتر آؤں مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہرحال اس نے جو مناسب سمجھا، وہ کیا۔ میں نے موہل یا کسی کو نہیں بتایا تھا کہ آتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی نہیں بتایا تھا۔ دوپہر

کو میں گھر سے نکلا اور اپنے ایک واقف کار کو کال کی جو کندھ کوٹ تھانے میں تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے ڈاکے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”شاہ سائیں اس میں منگی گروہ ملوث تھا۔ وہ سب جیپ میں ہونے والے دھماکے میں مارے گئے۔ خیال ہے کہ ان کی جیپ میں دھماکا خیز مادہ تھا جو غلطی سے پھٹ گیا۔ ڈاکو منگی سمیت اس کے چھ ساتھی مارے گئے۔ سمجھ لو کہ پورا گروہ ختم ہو گیا۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ منگی کے کُل چھ ہی ساتھی تھے جو اس کے ساتھ ڈاکوں میں حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ ان کا ایک ساتھی اور بھی تھا جو اُن کے لیے شکار تلاش کرتا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں چار دن کی چھٹی پر آیا تھا۔ ان چھٹیوں کا زیادہ وقت میں نے گھر میں گزارا تھا۔ اس دوران میں بس ڈاکے کا کیس پولیس نے تفتیش کی حد تک مکمل کر لیا تھا اور ڈاکوؤں کی جیپ کی تباہی کو حادثہ قرار دیا تھا۔ صرف دو افراد جانتے تھے کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا ہوا واقعہ تھا۔ چار دن بعد میں واپس جا رہا تھا تو مول اور بابو دونوں رو رہے تھے۔ میں نے اس بار سوچ لیا تھا اور میں نے مول سے کہا۔ ”تو تیار رہ..... میں وہاں جاتے ہی کوئی مکان تلاش کرتا ہوں اور پھر تجھے اور بابو کو اپنے پاس بلا لوں گا۔“

مول رونا دھونا بھول گئی۔ ”سچ کہہ رہا ہے نا؟“

”بالکل سچ، اب میں بھی تم لوگوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ زیادہ نہیں ہفتہ پندرہ دن لگیں گے بس تم لوگ اپنی تیاری پوری رکھنا۔“

واپسی پر میں شکارپور اترا مگر جیکب آباد کے بجائے میں نے سکھر جانے والی بس پکڑی اور سکھر میں پولیس ہیڈ کوارٹر آیا۔ وہاں ڈی آئی جی انویسٹی گیشن کے دفتر میں میرا بچپن کا دوست عطا حسین کام کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ چائے اور سموسے منگوائے اور ہم گپ شپ کرتے رہے پھر بات منگی گروہ کی ہلاکت کی طرف مڑ گئی اور میں نے کہا۔ ”اس کے کارنامے بھی بہت زیادہ ہیں۔“

”کم سے کم تیس بندوں کا قتل اُن کے نام پر ہے۔“ عطا نے انکشاف کیا۔ ”صرف بندوں کے نہیں، یہ عزتوں کے بھی لٹیرے تھے۔ عورتوں کے اغوا اور زیادتی کے بھی درجن کیس ان کے نام پر ہیں۔ اتفاق سے آج ہی ڈی آئی جی نے فائل منگوائی تو میں نے دیکھا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔“

”فائل کہاں ہے؟“

”ابھی میرے پاس ہے۔“ اس نے میز کی دراز سے ایک موٹی فائل نکالی۔ ”ذرا کرتوت دیکھو ان کمینوں کے۔“

سچی بات ہے کہ میں خود اسی چکر میں آیا تھا مگر عطا نے بغیر کہے ہی فائل میرے سامنے رکھ دی تھی۔ میں فائل دیکھ رہا تھا کہ اسے صاحب نے کسی کام سے بلا لیا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے تیزی سے دو سال پہلے کا ایک کیس نکالا۔ ڈاکو منگی اور اس کے ساتھیوں نے کشمور سے آنے والی ایک گاڑی کو روکا تھا۔ گاڑی میں ایک جوڑا تھا۔ شوہر کا تعلق پولیس کے بم ڈسپوزل یونٹ سے تھا اور وہ ایس آئی تھا۔ اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی بیوی بہت حسین اور کمسن تھی۔ منگی کی رال ٹپک گئی۔ اس نے عورت کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ شوہر نے مزاحمت کی تو اس کے سر پر شدید ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ ڈاکو اس کی بیوی کو لے گئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ گاڑی لے کر نزدیکی پولیس چوکی پہنچا اور جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو پولیس فوری حرکت میں آ گئی۔

پولیس نے عورت کی بازیابی کے لیے منگی کے مشکوک ٹھکانوں پر چھاپے مارنا شروع کیے مگر منگی اور اس کے ساتھی نہیں ملے۔ البتہ عورت کی لاش ایک گاؤں کے نزدیک کھیت سے مل گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے ساتھ کئی دن تک اجتماعی زیادتی کی گئی تھی اور اس کی موت اسی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم اور دوسری ضروری کارروائیوں کے بعد لاش شوہر کے حوالے کر دی گئی۔ وہ اسے لے کر چلا گیا تھا۔ ایف آئی آر منگی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کاٹی گئی تھی مگر وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے حتیٰ کہ دستِ اجل نے انہیں آ لیا۔ سرکاری رپورٹ یہیں تک تھی۔ اس میں عورت اور اس کے شوہر کی تصویریں بھی تھیں۔ بیوی واقعی بہت حسین اور کمسن تھی۔ شوہر بھی کم نہیں تھا۔ دونوں کا جوڑا بہت اچھا تھا مگر شیطان صفت ڈاکوؤں نے انہیں برباد کر دیا۔

مجھے شوہر کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کتنی کوشش کی اور بہت محنت کر کے وہ بالآخر ان ڈاکوؤں تک پہنچ گیا جو اس کی بربادی اور اس کی بیوی کی موت کے ذمے دار تھے۔ اس نے ان سے بدلہ لے لیا تھا مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ حالانکہ میں ان کا ساتھی تھا اور میں ہی ان کو شکار کے بارے میں بتاتا تھا۔ ایک بار پولیس آپریشن کے دوران میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر منگی کے ہتھے چڑھ گیا تھا، اس نے اس

شرط پر میری جان بخشی کی تھی کہ میں اس کے لیے کام کروں گا۔ دوسری صورت میں وہ میری بیوی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو نہیں چھوڑے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً میں اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اگرچہ دل میں اس سے اور اس کے آدمیوں سے نفرت کرتا تھا۔ ان کی موت پر عنایت اللہ کے بعد اگر کوئی فرد خوش ہو سکتا تھا تو، وہ میں تھا۔

عنایت اللہ نے اپنا نام غلط بتایا تھا، اس کا اصل نام اشفاق خان تھا۔ برادری کے بارے میں بھی غلط بتایا تھا۔ البتہ وہ سکھر کا ہی رہنے والا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ سب کیسے کیا۔ یقیناً وہ میری مدد سے منگی تک پہنچا تھا کیونکہ میں نے اس کا بیگ تاڑ کر اس کو اطلاع دی تھی۔ اس نے راستے میں میسج کر کے مجھ سے کنفرم کیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اشفاق بے خبر ہے مگر اسے سب معلوم تھا۔ میں اس کے ہاتھوں استعمال ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں اپنی موت کا سامان خود لیے جا رہا تھا۔ اگر اشفاق عین موقع پر نہ روک لیتا تو اس وقت میری بھی جلی ہوئی ادھوری لاش کہیں پڑی ہوتی۔ اپنے طور پر میں نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اور تھیلے میں ڈمی پرس اور موبائل ڈالا تھا۔ وہ جانتا تھا اور میں اس وقت تک بے خبر رہا تھا جب تک اس نے بس سے اتر کر بیگ میں موجود بم کا ریموٹ استعمال نہیں کیا۔ بم لازمی ریموٹ سے اڑنے والا تھا۔ اس کے بغیر وہ بیکار رہتا۔ وہ بم ڈسپوزل میں تھا جہاں بموں کو ناکارہ بنایا جاتا ہے مگر ساتھ ہی وہ بم بنانا بھی جانتے ہیں۔ بم اشفاق نے خود بنایا تھا۔

کسی کو نہیں معلوم کہ وہ بس سے نیچے کیوں گیا تھا۔ عام طور سے منگی اور اس کے ساتھی مجھے بہ ظاہر یرغمال بنا کر لے جاتے تھے۔ اس طرح میں پولیس کا سامنا کرنے سے بچ جاتا تھا۔ میرے بارے میں کسی کو علم نہیں ہوتا تھا اور اگر اتفاق سے بس میں کوئی واقف کار نکل آئے تو میں پکڑ رک جاتا تھا۔ یہ منگی نے مجھ پر چھوڑا ہوا تھا وہ جانے سے پہلے اسی طرح آنکھوں میں مجھ سے پوچھتا تھا اور میں اسے جواب دیتا تھا۔ شاید اشفاق نے مجھے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ میں اس کی بیوی کی موت کا براہِ راست ذمے دار نہیں تھا۔ یا پھر اس نے میرے بیوی بچے کی وجہ سے مجھے بخش دیا تھا جیسا کہ اس نے مجھ سے مہمان خانے میں کہا تھا۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، آج میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش اور مطمئن ہوں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○

جو پیدا ہوا ہے، اسے لوٹ کر اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے۔ آج کوئی اور، تو کل ہماری باری ہے۔ ادارے سے اپنا قلمی کیریئر شروع کرنے اور مسلسل وابستہ رہنے والے ہونہار، نوجوان، باشرع، پیروں سے معذور مگر عزم و حوصلے کے پیکر اور صاحبِ طرز کہانی نگار، کاشف زبیر کئی ہفتوں تک علالت سے نبرد آزما رہنے کے بعد 22 فروری کی سہ پہر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○

ادارہ اور اس کے جملہ اراکین مرحوم کے پسماندگان کے اس صدمے اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں کہ رب العزت انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

بیچ کا آدمی

عکسِ فاطمہ

کاروبار کرنے کے لیے ذہانت کے ساتھ کثیر سرمایہ بھی اشد ضروری ہے...اس کے پاس ذہن تھا...اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ نہایت شاطرانہ انداز میں سرمایہ کشید کررہا تھا...

دو افراد کے درمیان معاہدہ کرانے والے بیچ کے آدمی کے کارہائے نمایاں

''خفیہ چھان بین؟'' مسز ہیری برائٹ نے تعجب سے کہا۔ ''کیا یہ کچھ، میرا مطلب ہے۔ گندہ نہیں ہے؟''

مائیک جو اس کے سٹنگ روم کی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے اپنی ریشمی ٹائی درست کی اور کھڑکی سے جھانک کر اپنی سلور کار کو دیکھنے لگا جسے اس نے بڑی احتیاط سے بیلگریوا اسکوائر کے نیچے پارک کیا تھا۔

''ممکن ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تمہیں نیچے سڑک پر بھی دیکھنا چاہیے۔ کیا پتا کوئی شخص...''

"اتنا مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم قابلِ احترام شخص ہو۔" وہ اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی جس میں بیش قیمت انگوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔

"اب یہاں آکر بیٹھ جاؤ۔ مجھے ایک بجے لنچ پر جانا ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو وہ لوگ مجھے معاف نہیں کریں گے۔"

مائیک بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ ایک خوب صورت دن تھا۔ اسے یونہی خیال آیا کہ اگر یہاں سے ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ سیدھا بکنگھم پیلس کے باغ میں جاکر گرے گا لیکن اگر وہ کسی کو لگ گیا تو اس کا بہت خطرناک نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہٰذا اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا اور کھڑکی چھوڑ کر مسز ہیری برائٹ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جو بظاہر بہت سادہ اور خوب صورت لگ رہا تھا لیکن وہاں رکھی ہوئی کوئی بھی چیز پانچ ہزار پونڈ سے کم کی نہ تھی بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ قیمتی ہوں گی۔ مثلاً دیواروں پر آویزاں پینٹنگز وغیرہ۔

مائیک کا قد لمبا اور بالوں میں چاندی جھلک رہی تھی۔ اس نے عمدہ تراش کا نفیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر مسز ہیری کو اپنے انکل فریڈی یاد آگئے جو اسی کی طرح کم سخن اور مہذب انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ وہ بمشکل ساٹھ کے پیٹے میں ہوگا۔۔۔۔ اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا۔ گو کہ اس کی ٹائی سوٹ سے میچ نہیں کر رہی تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھی اور اس کے بارے میں ہیری کا اندازہ تھا کہ یہ بھی ہمارے جیسا ہی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ شخص کون ہے اور کہاں سے آیا ہے بلکہ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ ایک معزز مہمان اس سے ملنے آیا ہے۔

"مسٹر مائیک!" ہیری نے کہنا شروع کیا۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن اب ہمیں مطلب کی بات کرنا چاہیے۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمہاری پراسرار بلکہ منحوس کال نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔"

اس نے ڈرامائی انداز میں اپنی آنکھیں پھیلائیں اور اپنی گردن سہلانے لگی۔ مائیک اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ وہ کوئی نوجوان لڑکی نہیں تھی لیکن چار شادیوں اور تین طلاقوں کے باوجود اسے ایک خوب صورت عورت کہا جاسکتا تھا۔ شاید اس کی ہڈی ہی ایسی تھی کہ وقت کی دھوپ اس پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک تراشیدہ ہیرے کے مانند لگ رہی تھی جسے بڑی صفائی اور مہارت سے انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں مائیک پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے سنہرے بال سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

"مسز ہیری برائٹ" مائیک ایسی عورتوں کو اچھی طرح جانتا تھا جو محض دکھاوے کے لیے اپنے ساتھ شوہر کا نام لگا لیتی ہیں۔ "میں جو کچھ تمہیں بتانے والا ہوں۔۔۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھے ایلوڈی کے نام سے پکارنا چاہیے۔" مسز ہیری نے کہا۔ "کیونکہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنے انکل فریڈی یاد آگئے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میں تمہیں۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے ایک نظر مائیک کے کارڈ پر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "سیباسٹین کہوں گی۔"

"بہت اچھا ایلوڈی۔ پہلے میں تمہیں اپنے پس منظر کے بارے میں بتادوں۔"

ہیری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں سُن رہی ہوں۔"

"جیسا کہ تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں ایسے شعبے سے منسلک ہوں جسے تفتیش کا نام دیا جاتا ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کبھی کسی کی ازدواجی زندگی یا گھریلو نوعیت کے معاملات میں نہیں پڑتا بلکہ بین الاقوامی اور تجارتی معاملات دیکھتا ہوں لیکن کبھی کبھی پوری کوشش کے باوجود ایسے کیس گلے پڑ جاتے ہیں جنہیں سیاسی کہا جاسکتا ہے اور مجھے سرکاری ایجنسیوں کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم گیرتھ بلیک لی کو ضرور جانتے ہو گے۔ وہ بھی خفیہ پولیس میں ہے۔"

"نہیں، بدقسمتی سے میں اسے نہیں جانتا لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور ویسے بھی میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر ہونے والی گفتگو صرف ہمارے درمیان ہی رہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ یہ باتیں دوسرے لوگوں تک پہنچیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

مسز ہیری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے اندر سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ وہ صوفے پر بل کھانے لگی۔ اسے مزہ آتا تھا جب مرد اس کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

"جیسا کہ کارڈ پر لکھا ہوا ہے کہ میرا کاروبار خفیہ ہے۔ اگر تم اس میں دیے ہوئے نمبروں پر فون کرو گی تو دوسری طرف سے کوئی انشورنس ایجنٹ بول رہا ہوگا۔ اس سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں اپنے معاملات کتنے خفیہ رکھتا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔"

"ہاں، یقیناً۔" اس نے کہا۔ "میں اپنی زبان بالکل بند رکھوں گی۔"

"اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے میں بتانا چاہوں گا کہ حال ہی میں مجھے کچھ پارٹیوں کی نگرانی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ یہ ایک آسان سا معاملہ تھا اور اس طرح کے کام میں عام طور پر کرتا رہتا ہوں۔ تفصیل میں جائے بغیر اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس کا تعلق ہوٹل کے کمرے میں دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے کچھ لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کرنے سے تھا۔ اس ویڈیو ریکارڈنگ کے لیے میں نے ایک خفیہ کیمرے اور ساؤنڈ سسٹم کا انتظام کیا تھا۔"

اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ مائیک کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن مائیک نے اشارے سے اسے روک دیا اور بولا۔ "اس طرح کی خفیہ چھان بین کو ہماری اصطلاح میں کی ہول سرجری کہا جاتا ہے۔ اس میں ہم کیمرے کو ہوٹل سے کافی فاصلے پر خفیہ طریقے سے نصب کرتے ہیں۔ اس میں ایک ٹائمر لگا ہوا ہوتا ہے جس کے ذریعے کیمرا مقررہ وقت پر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔"

مسز ہیری حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مائیک اسے یہ سب کیوں سنا رہا ہے۔ مائیک نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا اور بولا۔ "میں اسی طرف آرہا ہوں۔" جب میں نے ویڈیو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کریکٹر بدل گئے تھے۔ مجھے جس میٹنگ کی گفتگو ریکارڈ کرنا تھی لیکن وہ ایک روز پہلے منسوخ ہوگئی اور وہ کمرا کسی اور کے نام بک کر دیا گیا۔"

ہیری نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا۔ "یقیناً یہ ایک دلچسپ کہانی ہے لیکن میں بہت مصروف ہوں۔ کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے؟"

"بالکل، اس سے تمہارا تعلق ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن کسی حد تک، اس کا براہِ راست تعلق تمہارے شوہر سے ہے۔"

ہیری نے بڑی مشکل سے جمائی روکی اور بے چین ہوتے ہوئے بولی۔ "کینتھ! او میرے خدا۔ اب کیا ہو گیا؟ کوئی جوئے کا مسئلہ تو نہیں؟"

مائیک پیچھے کی طرف جھکا اور اپنی جیب سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھا لیا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تھوڑا بہت تو تمہیں بھی معلوم ہوگا۔ کیا میں تمہارے شوہر کے بارے میں کچھ حقائق بیان کر سکتا ہوں؟"

وہ تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ میں جو کچھ جانتا ہوں وہی بتا رہا ہوں اور اگر کہیں غلطی کروں تو مجھے ٹوک دینا۔"

مسز ہیری نے بادلِ ناخواستہ سر ہلا دیا۔ اب وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ مائیک نے جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اس کے صفحات پلٹتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارا شوہر برائٹ عمر میں تم سے چھوٹا ہے۔"

"سات سال۔" مسز ہیری نے جلدی سے کہا۔

مائیک نے سر ہلا دیا جبکہ اس کی نوٹ بک میں چودہ سال لکھے ہوئے تھے۔ "اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک اداکار ہے یا پہلے کبھی تھا؟"

"ہاں اور بہت ہی باصلاحیت بھی۔" ہیری نے فخریہ انداز میں کہا۔

"بے شک، تمہاری شادی 1996ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اداکاری ترک کر دی اور فلمیں بنانے لگا لیکن اس کی کوئی بھی فلم کامیاب نہ ہو سکی۔"

ہیری کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بولی۔ "وہ اپنے لیے راستہ بنا رہا ہے۔"

"بالکل، لیکن اس کی تمام سرگرمیوں کے لیے تم ہی پیسے دیتی ہو؟"

ہیری نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں ہمیشہ سے صلاحیتوں کو آگے بڑھانے پر یقین رکھتی ہوں۔"

"اس کا کریڈٹ تمہیں ملنا چاہیے لیکن اب میں کچھ اور حقائق بتانا چاہتا ہوں۔"

ہیری اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"بات یہ ہے کہ تم نے مسٹر برائٹ سے شادی کے موقع پر اپنے وکیلوں سے قبل از شادی ایک معاہدہ تیار کرنے کے لیے کہا۔"

ہیری یہ سنتے ہی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ کیا اس خنزیر نے تم سے کوئی بات کی ہے حالانکہ ہم اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ کبھی اس معاہدے کا تذکرہ نہیں کیا جائے گا۔"

"یقیناً مسٹر برائٹ نے اس پر بات کی ہوگی لیکن مجھ سے نہیں۔ اس معاہدے کی رو سے طلاق یا قانونی علیحدگی کی صورت میں وہ کسی قسم کا مطالبہ نہیں کر سکے گا۔"

ہیری نے کچھ نہیں کیا بس کندھے اچکا کر رہ گئی۔

مائیک نے ایک بار پھر اپنی نوٹ بک پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”اس کے ساتھ ہی تم نے یہ وصیت بھی تیار کروائی کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے نام پر بیمہ پالیسی بھی لیں گے۔“

”اس میں کیا برائی ہے۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔“

مائیک نے اپنی نوٹ بک بند کی اور بولا۔ ”میں بتاتا ہوں کہ اس میں کیا برائی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ابھی میں نے جو کچھ بیان کیا وہ کسی قاتل کا منشور ہے۔“

ہیری کو اس کے ذہنی توازن پر شک ہونے لگا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔“

”تمہاری نظر میں مضحکہ خیز ہو سکتی ہے لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ طلاق کے بجائے تمہاری موت کی صورت میں مسٹر برائٹ کہیں زیادہ فائدے میں رہیں گے اور اگر تم میری بات کا برا نہ مناؤ تو مجھے یہ کہنے دو کہ گزشتہ چند ماہ کے دوران میں تم دونوں کے تعلقات میں شدید بگاڑ آ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ تم سے وفاداری نبھانے پر آمادہ نہیں ہیں۔“

وہ ابھی تک اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی لیکن مائیک سمجھ گیا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔

”کیا تمہارے پاس ویڈیو کیسٹ پلیئر اور ٹیلی وژن ہے؟“

”کیا؟“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر آتش دان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے وہاں ہوگا۔“

مائیک آتش دان تک گیا۔ اس نے دونوں چیزیں چیک کیں پھر اپنے بریف کیس سے ایک کیسٹ نکال کر ویڈیو پلیئر میں لگا دیا اور واپس اپنی کرسی پر آ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول بھی تھا۔

”جب میں نے یہ ٹیپ دیکھی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تو اس وقت میں اکیلا تھا اور میرے سوا کسی اور نے اس ٹیپ کو نہیں دیکھا۔ میں صرف اس کا ایک حصہ تمہیں دکھاؤں گا جو ایک طویل انٹرویو پر مشتمل ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ ایک یا دو سیکنڈ بعد اسکرین پر ایک ہوٹل کا کمرا نظر آیا۔ گو کہ روشنی بہت اچھی نہیں تھی لیکن اس میں دو آدمیوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک صوفے اور دوسرا آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں آگے کی طرف جھکے ہوئے کافی بنا رہے تھے۔ صوفے پر بیٹھے شخص نے پیالی اٹھائی اور پشت سے ٹیک لگا دی۔ وہ ایک دراز قد شخص تھا۔ مسز ہیری اسے دیکھ کر یوں اچھلی جیسے اسے دو سو چالیس وولٹ کا جھٹکا لگ گیا ہو۔

”یہ تو کینتھ ہے۔ میرا شوہر۔“ اس نے کہا۔

”بالکل وہی ہے۔“ مائیک نے کہا۔

”اور دوسرا کون ہے؟“ مسز ہیری نے پوچھا۔

پردے پر وہ دونوں آدمی باتیں کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مائیک نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”شش، میں تمہیں بعد میں اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم صرف دیکھو اور سنو۔“

کینتھ برائٹ کہہ رہا تھا۔ ”تم سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ دوسرا بولا۔ ”ہاں، میں سمجھ گیا۔“

”پھر کیا کہتے ہو؟“

”کیا کہوں، سنو میں بتاتا ہوں کہ کیا سمجھا ہوں۔ تم نے مجھے ایک ہوٹل کے کمرے میں بلایا جبکہ میں تم سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا اور تم نے شور مچانا شروع کر دیا۔“

”لیکن تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

”ہاں جانتا ہوں لیکن تم اپنے اندر ہمت پیدا کرو اور مجھے بتاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف جھکا اور برائٹ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری ایک بیوی بھی ہے۔“

”ہاں اور میں چاہتا ہوں۔ میں... میں...“

”اور تم چاہتے ہو کہ وہ اوپر چلی جائے۔ کیا ایسا ہی ہے؟“

کینتھ برائٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”زبان سے کہو۔“

”میں چاہتا ہوں کہ وہ مر جائے۔“

”بہت اچھے۔ اب ہم مزید بات کر سکتے ہیں۔“

مسز ہیری نے مائیک کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”اسے بند کرو۔“

مائیک نے ایک بٹن دبایا اور دوسرے آدمی کا چہرہ کیمرے کی طرف ساکت ہو گیا۔ مسز ہیری کا چہرہ دہی کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ دوسرا آدمی کون ہے؟“

''اس تصویر کو غور سے دیکھ لو۔ یہ سرسم ہورجا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا اصل نام نہ ہو لیکن وہ اسی نام سے پہچانا جاتا ہے۔''
مسز ہیری نے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کی جگہ ایک باریک سی لکیر تھی۔
''یہ کون ہے؟'' مسز ہیری نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔
''یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ آدھا فرانسیسی اور آدھا عراقی ہے لیکن پکا بدمعاش ہے۔ یہ کون ہے؟ اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔''
''لیکن تم اس کے نام اور چہرے سے واقف ہو۔''
وہ اس کی جانب مڑا۔ اس کا چہرہ گمبھیر ہو گیا تھا۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں اور میرے پاس اس کی معقول وجہ ہے۔ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے اور کئی کام کیے ہیں۔ لیکن کبھی کسی سے خوف زدہ نہیں ہوا جتنا کہ اس شخص کے چہرے کو دیکھ کر ہوا۔ یہ شخص پیدائشی قاتل ہے اور لوگوں کو اس طرح مار ڈالتا ہے جیسے میں اور تم چائے پیتے ہیں۔''
''تم اس سے مل چکے ہو؟''
''ہاں، میرے لیے یہ باعثِ شرم ہے۔ وہ سرکاری اور پرائیویٹ دونوں طرح کام کرتا ہے۔ کئی بار سرکاری سطح پر بھی اس کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ کوئی اس بدمعاش کا خاتمہ کرسکے گا لیکن وہ یہاں موجود ہے اور تمہارے شوہر کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔''
ہیری نے اس کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''دوبارہ چلاؤ۔ میں بقیہ کیسٹ بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔''
مائیک نے ریکارڈر آن کیا اور وہ منظر دوبارہ شروع ہو گیا۔ ہیری بھی آگے کی طرف جھک گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ رکھے تھے اور وہ بڑے انہماک سے اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھی اور کان اسکرین سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔
ہورجا نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنا معاوضہ لیتا ہوں؟''
کینتھ برائٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں۔ مجھے کسی نے اس بارے میں بتا دیا تھا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ معاوضہ زیادہ ہے؟''
''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔''
''چالیس ہزار پاؤنڈ کچھ زیادہ نہیں ہیں جبکہ یہ معلوم ہو کہ کام ہو جانے کے بعد تمہیں اس سے کہیں زیادہ ملے گا۔''
برائٹ نے دوبارہ اثبات میں سر ہلا دیا۔
''ٹھیک ہے۔ بات پکی ہو گئی۔ میں بیس ہزار پیشگی لوں گا۔ تمہارے پاس اتنی رقم ہے؟''
ہیری ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھلی اور سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی۔ ''اس کے پاس بیس ہزار پاؤنڈ کہاں سے آئے؟''
مائیک نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔
ہورجا نے پوچھا۔ ''اپارٹمنٹ میں کیا کچھ ہے؟''
''جو چیز تم لے جاسکو وہ تمہاری ہے۔ وہاں کچھ قیمتی تصویریں بھی ہیں۔''
ہورجا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''صرف پینٹنگز۔ جیولری بھی ہوگی؟''
برائٹ نے اقرار میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ یہ کام کب کیا جائے گا؟''
''جتنی جلد ممکن ہوسکے۔'' برائٹ نے کہا۔
''وقت کی بہت اہمیت ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ طلاق کی کارروائی شروع کردے۔''
برائٹ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''
ہورجا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میں مکمل معلومات حاصل کیے بغیر کسی کام میں ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے مسٹر برائٹ! ٹھیک ہے۔ میں یہ کام کردوں گا۔ تمہاری خاطر تمہاری بیوی کو قتل کردوں گا۔ بظاہر یہ اناڑی پن سے کی جانے والی ڈکیتی ہوگی اور اس دوران میں کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔ میں تم سے کس نمبر پر رابطہ کرسکتا ہوں؟''
برائٹ نے اسے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا پکڑا دیا۔
''جب تیاری مکمل ہو جائے گی تو تم سے رابطہ کروں گا۔ اس سے پہلے نہیں تاکہ تم کسی دوسری جگہ اپنی موجودگی ظاہر کرسکو لیکن پریشان مت ہو۔ یہ کام جلد ہو جائے گا۔ میں بہت تیزی سے کام کرتا ہوں۔ لاؤ

ایڈوانس نکالو۔‘‘
برائٹ نے صوفے کے پیچھے رکھا ہوا ایک بریف کیس نکالا اور اس کے حوالے کر دیا۔ ہورجا اسے کھولتے ہوئے بولا۔
’’اگر تم برا نہ مناؤ تو میں انہیں گن لوں؟‘‘
مائیک نے ٹیپ بند کر دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے آف کا بٹن دبا دیا۔
ہیری بالکل مفلوج نظر آرہی تھی۔ مائیک اٹھ کر سائڈ بورڈ تک گیا اور دو گلاسوں میں برانڈی انڈیلی۔ اس نے ایک گلاس ہیری کو پکڑا دیا۔ اس نے مشکوک انداز میں برانڈی کی طرف دیکھا اور ایک لمبا گھونٹ لے لیا۔ وہ اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
مائیک نے کہا۔ ’’مجھے یہ موضوع چھیڑنے کا بہت افسوس ہے لیکن تم سمجھ سکتی ہو کہ میں صرف درمیان کا آدمی ہوں اور اس ٹیپ میں جو کچھ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔‘‘
وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہی تھی۔ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ’’اس ٹکے آدمی کی کیا حیثیت ہے دو ٹکے کا بھی نہیں ہے۔‘‘ وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ مائیک صبر کے ساتھ اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر وہ اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔
’’میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم یہ ٹیپ لے کر یہاں کیوں آئے ہو اور تمہیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟‘‘
’’بہت آسان سی بات ہے۔ اس ٹیپ کو دیکھنے کے بعد میرے لیے یہ معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا کہ ہوٹل کا وہ کمرا تمہارے شوہر کے نام پر بک تھا۔ باقی تفصیلات اس ٹیپ سے معلوم ہوگئیں اور جو اس میں نہیں تھیں وہ میں نے اپنے ذرائع سے پتا کرلیں۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔ میں آج بلکہ ابھی اس خنزیر کو جیل بھجوانے کا بندوبست کرتی ہوں۔‘‘
مائیک اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
’’کس بنیاد پر؟‘‘
وہ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’وہ اس ٹیپ میں موجود ہے اور روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ میرے شوہر نے مجھے قتل کرنے کے لیے ایک پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کی ہیں اور اسے آدھا معاوضہ پیشگی ادا کردیا ہے۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے؟‘‘
’’ایلوڈی! مجھے ڈر ہے کہ اس میں ایک چھوٹا سا مسئلہ آسکتا ہے۔‘‘
’’وہ کیا؟‘‘
مائیک ویڈیو ریکارڈر تک گیا اور اس میں سے کیسٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ’’اس ویڈیو ریکارڈنگ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ کسی کو نہیں دکھائی جاسکتی۔‘‘
’’یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟‘‘ وہ غصے سے بولی۔
’’تمہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ میں جس کام پر مامور تھا۔ اسے کسی پر ظاہر نہیں کرسکتا اور جس کی وجہ سے یہ ریکارڈنگ ہوئی ہے اسے بھی کسی کو نہیں دکھایا جاسکتا۔ ایسی صورت میں مجھے پولیس کو سارا پس منظر بتانا ہوگا اور اس کے نتائج بہت برے نکل سکتے ہیں۔‘‘
وہ اسے حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
’’تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ پہلے تم نے ایک ٹیپ دکھائی جس میں دو آدمی میرے قتل کی منصوبہ بندی کررہے ہیں اور اب تم کہہ رہے ہو کہ ہم یہ ٹیپ لے کر پولیس کے پاس نہیں جاسکتے۔‘‘
مائیک نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’اگر مجھ پر بات آئی تو میں ایسی کسی ریکارڈنگ کے وجود سے ہی انکار کردوں گا۔‘‘
وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ’’لیکن یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک آدمی میرے قتل کی منصوبہ بندی کررہا ہے جسے تم نے خود سنا اور اب تم کہہ رہے ہو کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ حالانکہ اس بنیاد پر ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ میں باڈی گارڈز رکھ سکتی ہوں... میں...‘‘
مائیک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’تم سمجھ نہیں رہی ہو کہ تمہارا واسطہ جس شخص سے ہے۔ اس کا نام سرسم ہورجا ہے۔‘‘
’’وہ کوئی سپر مین نہیں ہے کہ کسی عمارت کو ایک دھکے سے گرادے۔ بہرحال وہ ایک انسان ہی ہے۔‘‘
’’نہیں، وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ تم چاہے کتنے ہی باڈی گارڈز بھرتی کرلو۔ وہ اپنا کام ضرور پورا کرے گا۔ وہ کبھی نہیں سوچتا کہ اسے کس کو یا کتنے لوگوں کو قتل کرنا ہے۔ اس کا معاہدہ ہوچکا ہے اور وہ پیشگی معاوضہ بھی قبول کرچکا ہے۔ لہٰذا وہ اس پر ضرور عمل کرے گا چاہے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آئیں۔‘‘
ہیری کا چہرہ چاک کے مانند سفید ہوگیا اور وہ خوف

زدہ انداز میں بولی۔ ''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے؟''

مائیک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ایلوڈی، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس ٹیپ کو دیکھنے کے بعد میں اسے صاف کرسکتا تھا۔ اسے بھول جاتا لیکن میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں ایسے شوہروں کو بالکل پسند نہیں کرتا جو اپنی بیویوں کو قتل کروانے کے لیے کرائے کے قاتلوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے میں ہوپ کو بھی پسند نہیں کرتا۔''

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں؟''

''ہاں، میرے پاس ایک حل ہے یہ کہہ کر وہ اٹھا اور بریف کیس میں کیسٹ رکھنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ ''ہمیں ایک لالچی شخص سے نمٹنا ہے جو پیسے کے لیے کام کرتا ہے اور پیسا ہی اس کا مقصدِ حیات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پیسوں کے لیے قتل کرتا ہے اور اس سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔''

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

''میں نے اس مسئلے پر بہت سوچا ہے۔ تم فوری طور پر طلاق کی کارروائی شروع کرسکتی ہو۔ اپنی وصیت تبدیل کرسکتی ہو۔ انشورنس پالیسی منسوخ کرسکتی ہو لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنا کام کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ اس لیے ہمیں جلدی بلکہ بہت جلدی کچھ کرنا ہوگا۔''

''لیکن تمہارے تو بہت تعلقات ہیں، تم یقیناً کئی لوگوں کو جانتے ہوگے۔''

''ہاں، اور شاید بچت کا بھی ایک طریقہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں کسی دوسرے شخص کے ذریعے پیغام بھیجوں کہ وہ مسز ہیری برائٹ کو قتل نہ کرے اور ہم اسے اس سے زیادہ رقم دیں گے جس کا اس نے مسٹر برائٹ سے معاہدہ کیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم کینتھ کے مقابلے میں زیادہ اونچی بولی لگائیں۔''

مائیک نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''اگر تم پسند کرو تو یہ جان چھڑانے کا بہتر طریقہ ہے لیکن یہ تمہیں مہنگا پڑے گا کیونکہ حقیقت جان لینے کے بعد وہ تم سے منہ مانگی قیمت وصول کرے گا۔''

وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ واقعی تم اس تک پہنچ سکتے ہو؟''

''ہاں، مجھے پورا یقین ہے۔ اس تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں۔ میں تمہارے لیے بیچ کے آدمی کا کردار ادا کرسکتا ہوں۔''

وہ کھڑکی کی طرف گئی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر پلٹ کر بولی۔ ''میرے پاس اس سے بہتر آئیڈیا ہے۔''

''وہ کیا؟''

مسز ہیری نے کہا۔ ''کیسا رہے گا اگر ہم اسے خریدنے کے بجائے ایک نیا معاہدہ کرلیں۔''

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔''

''اگر ہم اس سے یہ کہیں کہ وہ کینتھ کا خیال رکھے۔''

''مجھے اپنی کم عقلی پر افسوس ہے لیکن تم کیا چاہ رہی ہو؟''

''ٹھیک ہے۔ میں آسان لفظوں میں سمجھاتی ہوں۔ میں صرف یہ نہیں چاہتی کہ وہ مجھے قتل نہ کرنے بلکہ میری خواہش ہے کہ وہ کینتھ کا کام تمام کردے۔ میں اس شخص کو مردہ حالت میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

مائیک کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھے حیران کردیا۔ میں نے اس امکان پر غور نہیں کیا تھا۔ تم واقعی ایک غیر معمولی عورت ہو۔''

''تم جو چاہو کہہ لو۔ وہ شخص مجھے مروانا چاہتا ہے تو اب میں بھی یہی چاہتی ہوں۔''

''اور تم چاہتی ہو کہ میں اس کا بندوبست کروں۔''

''ہاں، اور وہ بندوبست ایسا ہونا چاہیے کہ وہ مجھے دوبارہ نظر نہ آئے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ کہیں غائب ہو جائے۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟''

''ہاں، ایسا ممکن ہے۔''

''گویا اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ مجھے اس کی کتنی قیمت ادا کرنی ہوگی۔''

''مجھے ڈر ہے کہ وہ قیمت بہت زیادہ ہوگی۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

☆☆☆

مائیک نے اپنی گاڑی دریا کے کنارے واقع ایک پرانی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی وکٹورین طرز کی عمارت

کے باہر پارک کی۔ اس کا دفتر عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا جس کے باہر ایس پی فریٹ فارورڈنگ کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس دفتر میں ایک پرانی میز، فائل کیبنٹ اور ایک کرسی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مہمانوں کے لیے بھی کوئی کرسی نہیں رکھی گئی تھی۔ شاید کوئی مہمان بھولے سے ہی اس دفتر کا رخ کرتا ہوگا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے کاغذات ایک طرف کیے۔ اپنا بریف کیس رکھا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس نے ایک نمبر ملایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''غالباً تم میری آواز پہچان گئے ہوگے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو وہ بولا۔ ''سب کچھ اطمینان بخش طریقے سے ہوگیا۔ پیسے کل مل جائیں گے۔ ہاں نقد کی صورت میں۔''

اس نے دوسری طرف والے کی آواز سنی اور اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔ ''پندرہ لاکھ پاؤنڈ۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کردیا۔ بیس فیصد کمیشن کاٹ کر بقیہ رقم تمہارے حوالے کردوں گا۔''

دوسری طرف کا جواب سن کر وہ بھڑک اٹھا۔ ''تمہیں یہ بات پہلے سوچنا چاہیے تھی اور میں تمہیں یہ یاد دلا دوں مسٹر برائٹ کہ پندرہ لاکھ کی رقم اس سے کہیں زیادہ ہے جو طلاق کی صورت میں تمہیں ملتی۔''

مسٹر برائٹ نے اونچی آواز میں کچھ کہا تو وہ بولا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری بیوی کے دل میں کوئی اور بات نہیں ہے۔ تمہاری پرفارمنس لاجواب تھی اور تمہارے نوجوان دوست نے بھی اپنا کردار خوب نبھایا جس کی فیس تمہارے حصے میں سے ادا کی جائے گی۔ نہیں، تم فکر مت کرو۔ وہ یہ ٹیپ دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوگئی اور اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔''

دوسری طرف سے کچھ اور کہا گیا تو وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا لیکن جیسا کہ ہمارے درمیان طے ہو چکا ہے کہ تم کسی سے ایک لفظ کہے بغیر فوری طور پر روپوش ہو جاؤ گے۔ تمہیں کسی دور افتادہ ملک میں جانا ہوگا جہاں کسی کو تمہاری ہوا بھی نہ لگے۔ میرے خیال میں جنوبی افریقا ٹھیک رہے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کی فلمی صنعت بہت تیزی سے پھل پھول رہی ہے۔ وہاں تمہارے لیے بہتر امکانات ہیں۔ مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ اب ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔''

اس نے ٹیلی فون رکھ کر ایک طویل سانس لی۔ برائٹ کے سوالوں نے اسے زچ کردیا تھا۔ کسی طرح اس کے شبہات اور پریشانیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوا تھا کہ اس نے پکا کام کیا ہے اور ایلوڈی کسی بھی صورت میں وعدہ خلافی نہیں کرے گی۔ اس نے پیار سے اپنے بریف کیس کو تھپتھپاتے ہوئے سوچا اور اگر اس نے ایسا کیا تو وہ انتقامی کارروائی کے طور پر اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ دکھا دے گا جس میں وہ اپنے شوہر کے قتل کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ کسی ہوشیار ایڈیٹر کی مدد سے وہ ایسا انتظام کردے گا کہ اس کا چہرہ نظر نہ آنے پائے۔

لیکن فی الحال یہ کارڈ کھیلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق پوری رقم ادا کردے گی۔ اس کے بعد اس کے منصوبے کا اگلا حصہ شروع ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ برائٹ کے غائب ہو جانے کے چھ ماہ بعد جب کسی کا نام و نشان بھی نہ مل سکے گا تو مسز بیری برائٹ کو کسی مناسب شخص کے ذریعے ترغیب دی جا سکتی ہے کہ وہ اس گھٹیا اور شاطرانہ منصوبہ کا ثبوت ایک معقول رقم کے عوض خرید لے ورنہ اگر یہ ثبوت پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ اپنے شوہر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار ہوسکتی ہے۔

یہ مرحلہ ابھی دور تھا۔ فی الحال اسے دوسرے کاموں پر توجہ دینا تھی۔ اس نے میگزین کا نیا شمارہ اٹھایا اور وہ تصویر ڈھونڈنے لگا جس پر اس کی گزشتہ روز نظر پڑی تھی۔ یہ تصویر کسی تقریب میں کھینچی گئی تھی جس میں ایک ممتاز بینکر اپنی قدرے نوجوان بیوی کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ یہ تصویر بڑی واضح تھی۔ جس انداز میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کے درمیان سب ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں بداعتمادی اور ناپسندیدگی کا عنصر نمایاں نظر آرہا تھا۔

''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے خالی کمرے کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ''مسٹر سرسم ہور جا کے لیے ایک اور کام نکل آیا۔''

اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور ابتدائی خفیہ معلومات حاصل کرنا شروع کردیں۔ پیچ کا آدمی ہونے کے سبب اسے اپنی ذمے داریوں کا پورا احساس تھا۔

میں نے پڑوسی کی اونچی حفاظتی باڑھ کی درمیانی خلا سے اس کے مکان کے سامنے باغیچے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تو چلتے چلتے حیرانی سے رک گئی۔

ڈارلا اپنے خوب صورت بنگلے کے پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی سگریٹ پی رہی تھی۔ میرے اس طرح اچانک رکنے پر میری پالتو کتیا میسی کو بھی رکنا پڑا اور وہ افسردہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں جھک کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔

پھر میں نے سیدھے کھڑے ہو کر دوبارہ ڈارلا کی طرف دیکھا۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے پکار کر پوچھا۔ ”ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارا کوئی بہترین دوست کھو گیا ہے۔“

ڈارلا کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی۔ ”وہ ٹومی۔۔۔۔ وہ اس لڑکی ٹفینی کی خاطر مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ لڑکی اسے اپنا سکتی ہے، مجھے اس کی پروا نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے اپنے سائڈ کے باغیچے میں خودرو گھاس پھوس کی چھنٹائی کرنی ہے۔“

مجھے ڈارلا کی بات سن کر جھٹکا لگا۔ میرے بیس برس قبل پڑوس میں آنے سے پہلے ہی سے ڈارلا اور ٹومی اس مکان میں رہ رہے تھے۔ بعض اوقات مجھے ان کے درمیان لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے علم تھا کہ ٹومی اکثر دیگر عورتوں کے ساتھ بھی میل جول رکھتا ہے۔ لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ دونوں عمر کے اس حصے میں علیحدگی کے بارے میں کبھی نہیں سوچیں گے۔

باغ تلے

علی اسد

حسن و خوب صورتی کسی قید کے محتاج نہیں... یہ کہیں بھی کسی بھی صورت آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتے ہیں... باغ بانی کا شوق کئی طرح سے مفید ہے... اول ان ننھے منے پودوں کے ساتھ وقت گزارنے سے نہ صرف سکون و طمانیت کا احساس ابھرتا ہے... بلکہ ذہنی و جسمانی تھکاوٹ دور کرکے طبیعت کو ہشاش بشاش بنا دیتا ہے... یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا بیشتر وقت ہرے بھرے اور خوب صورت باغ میں گزارتا تھا... اور پھر ایک دن...

زمین کی گہرائیوں میں دفن ایک راز کی پراسرار بازگشت

ڈارلا کو باغبانی سے شدید لگاؤ تھا۔ لہٰذا مجھے یہی امید تھی کہ مشرقی ٹیکساس کے خزاں کے اس گرم دن میں باغیچے میں کام کرنے سے ڈارلا کو اپنا غم بہلانے میں ضرور مدد ملے گی۔

میں ٹہلتے ہوئے اپنے چھوٹے سے ٹاؤن کی واحد کافی شاپ میں چلی گئی اور باہر بیٹھ گئی۔ میری پالتو کتیا میسی میرے ساتھ تھی۔ جب میں کافی پی رہی تھی تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا جب میں نے اس لڑکی کفینی کو جس کے بارے میں ڈارلا نے کہا تھا کہ وہ اس کے شوہر ٹومی کو لے کر بھاگ گئی ہے، سڑک پر ٹہلتے ہوئے جنرل اسٹور کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ وہ تنہا تھی۔ ٹومی اس کے ہمراہ نہیں تھا۔

اگلے روز صبح ڈارلا ایک بار پھر اپنے پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں رک گئی۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں نے تمہیں پہلے کبھی اسموکنگ کرتے ہوئے نہیں دیکھا؟“

میری پالتو کتیا میسی مجھے پورچ کی جانب گھسیٹنے لگی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑی لیکن ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا کہ اسے اطاعت کی ٹریننگ والے کسی اسکول میں داخل کرنا پڑے گا۔ تاکہ یہ فرماں برداری سیکھ لے۔

ڈارلا خالی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ابتدائی تیس سال کی عمر میں تمباکو نوشی چھوڑ دی تھی لیکن ٹومی کے جانے کے بعد پھر شروع کر دی ہے۔“

میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا ڈارلا کو یہ بتا دوں کہ میں نے گزشتہ روز تفینی کو کافی شاپ کے باہر سڑک پر جنرل اسٹور کی جانب آتے ہوئے دیکھا تھا؟

اتنے میں میسی نے ایک جھٹکے سے اپنی رسی چھڑائی اور ڈارلا کے تازہ بوئے ہوئے پھولوں کی کیاری کی مٹی کو کھودنا شروع کر دیا۔ ”رک جاؤ“ میں نے چیخ کر کہا۔

”اسے یہاں سے ہٹاؤ، جیسمین۔“ ڈارلا اٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ ”یہ میرے باغیچے کو تباہ کر دے گی۔“

اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی اسے کیاری کھودنے سے روکتا، میسی نے نرم مٹی میں سے کوئی شے کھینچ کر باہر نکالی اور فاتحانہ انداز میں اسے دانتوں میں دبوچے رہی پھر پنجوں کے بل بیٹھ کر اسے دانتوں سے کترنے کی کوشش کرنے لگی۔

ڈارلا کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی اور میں جھک کر اس شے کا قریب سے جائزہ لینے لگی۔ ”یہ تو کولہے کی ہڈی سی دکھائی دے رہی ہے۔“

درحقیقت مجھے معلوم تھا کہ یہ کولہے کی ہڈی ہی ہے۔ آخر کو میں ایک نرس ہوں اور ان چیزوں کو بہ آسانی شناخت کر سکتی ہوں۔

میں نے ڈارلا پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تو اس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ میں نے اس کا بازو تھام کر اسے سیڑھیوں پر بیٹھنے میں مدد دی اور پھر اپنے سیل فون سے نائن ڈبل ون کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

حیرت انگیز طور پر پولیس کی ایک پٹرول کار دس منٹ میں ہی آ گئی اور دو پولیس افسران کار سے اتر کر دو قدمی چال چلتے ہوئے روش پر ہماری طرف بڑھنے لگے۔

”کتیا نے کوئی ہڈی تلاش کی ہے؟“ ان میں سے ایک افسر نے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ساتھ ہی جھک کر ہڈی کو غور سے دیکھنے کے بعد اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میسی غرانے لگی۔

میں تقریباً ہنس پڑی۔ ”تم ڈٹی رہو لڑکی،“ میں نے دل ہی دل میں میسی سے کہا۔ ”اس موٹے برے آدمی کو اپنے ہاتھ سے ہڈی مت لے جانے دینا۔“

”تم اسے باز رہنے کو کہو۔“ دوسرے افسر نے کتیا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ ”رچرڈ، یہ انسانی ہڈی کے مانند دکھائی دے رہی ہے۔ شاید کولہے کی ہڈی ہے۔“

رچرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اسے چھوڑ دو۔“ میں نے میسی سے تین مرتبہ کہا تب کہیں اس نے وہ ہڈی چھوڑی۔ عجیب ضدی قسم کی کتیا تھی۔ میں اسے کھینچ کر باغیچے سے دور لے گئی۔

دونوں پولیس افسر دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحوں تک اس ہڈی کو بہ غور دیکھتے رہے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ رچرڈ نے اپنے شانے پر لگا ہوا ریڈیو اتارا اور کسی سے بات کرنے لگا۔

جلد ہی یہ جگہ پولیس کے لوگوں سے بھر گئی۔ ڈارلا اور مجھے دونوں کو مختلف سوالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے رچرڈ کو سنا جو ڈارلا سے پوچھ رہا تھا کہ اس کا شوہر کہاں ہے۔ اس نے کیا جواب دیا، وہ میں سن نہ سکی کیونکہ میں نے ایک پولیس افسر کو مٹی میں سے ایک اور ہڈی نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پھر تو انہوں نے اس کیاری کو مزید کھودنا شروع کر دیا۔

جب پولیس نے مجھ سے سوال و جواب کا سلسلہ مکمل کر لیا تو میں میسی کو لے کر جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا، اپنے گھر کی جانب چل پڑی۔

اگلے روز صبح میں ڈارلا کو اپنے پورچ کی سیڑھیوں پر ایک بار پھر اسی طرح بیٹھا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کی نظریں اپنے اجڑے ہوئے باغیچے پر جمی ہوئی تھیں جس کو پولیس کے پیلے رنگ کے انتباہی ٹیپ نے اپنے نرغے میں لیا ہوا تھا۔ رات میں درجہ حرارت نیچے گر چکا تھا اور میں کانپ رہی تھی۔

''تمہارا کیا حال ہے؟'' میں نے رک کر ڈارلا کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اپنا یہ سوال بڑا عجیب سا لگا۔

''بس بہتر ہی سمجھو۔'' اس نے اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

''کیا ٹومی کی کوئی خیر خبر ملی؟''

''نہیں۔ اور ظاہر یہ ہو رہا ہے کہ وہ اس عورت لفینی کے ساتھ غائب نہیں ہوا ہے۔ پولیس لفینی سے بات کر چکی ہے۔ کیونکہ وہ یہاں موجود ہے۔ البتہ ٹومی غائب ہے۔''

''کیا وہ تمہارے لیے کوئی پیغام چھوڑ گیا تھا؟''

''ہاں، لیکن میں نے اسے جلا دیا تھا۔'' ڈارلا نے اپنا سگریٹ لائٹر بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پولیس کو شک ہو رہا ہے۔''

میں قدرے ہچکچائی، پھر پوچھا۔ ''کیا ان باقیات کے بارے میں انہیں کچھ پتا چلا؟''

''وہ اس پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں شبہ ہے کہ وہ ٹومی کے بھائی کی باقیات ہیں۔ تمہیں ٹومی کا بھائی کی یاد ہے؟''

میرے پیٹ میں مروڑ سی اٹھنے لگی اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بھی اور مجھے یاد نہ ہو؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ اس لیے کہ ہمارے درمیان ایک برس کے لگ بھگ معاشقہ رہا تھا۔

اتنے میں گاڑی کے انجن کی آواز نے ہماری توجہ اس جانب مبذول کرالی۔ چند لمحوں بعد رچرڈ اور اس کا پارٹنر چلتے ہوئے ڈارلا کے پاس آ گئے۔

رچرڈ نے ڈارلا کو تلاشی کا وارنٹ دکھایا اور بولا۔ ''ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ وہ ہڈیاں کس کی ہیں۔''

ڈارلا نے چونک کر استفہامیہ نظروں سے پولیس افسر کی طرف دیکھا۔

''وہ ہڈیاں تمہارے شوہر کے بھائی کی ہیں۔'' رچرڈ نے بتایا۔ ''یہ تو اچھا ہوا کہ بوڑھے ڈاکٹر میک آرتھر نے ابھی تک اپنی ڈینٹل پریکٹس جاری رکھی ہوئی ہے۔ اس کے ریکارڈ سے دانتوں کے ذریعے شناخت میں آسانی ہو گئی۔ چونکہ تمہارا شوہر بھی غائب ہے اس لیے چیف نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے باقی تمام باغیچے کو بھی کھود دیا جائے۔''

''نہیں۔'' ڈارلا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اوہ، نو! میرا خوب صورت باغیچہ!'' ساتھ ہی اس نے اپنی سگریٹ رچرڈ کی جانب اچھال دی جو اس کے پیروں کے پاس جا گری۔

رچرڈ نے سلگتی ہوئی سگریٹ کو اپنے جوتے سے مسل دیا اور میری جانب گھومتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ آخری مرتبہ یہ اپنے باغیچے میں کس جگہ کام کر رہی تھی؟''

''سائڈ گارڈن میں۔'' میں نے اشارے سے بتایا۔

یہ الفاظ بہ مشکل تمام میرے ہونٹوں سے ادا ہوئے تھے۔

رچرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اتنے میں پولیس کے مزید لوگ آ گئے اور انہوں نے باغیچے کو ایک بار پھر سے کھودنا شروع کر دیا۔

ابھی انہوں نے باغیچے کی نصف کھدائی ہی مکمل کی تھی کہ میری نگاہ ٹومی پر پڑی جو اپنی سرخ اسپورٹس کار میں سوار ڈرائیو وے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے کار روکی اور اتر کر تیزی سے آگے آتے ہوئے چیخ کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے، ڈارلا؟''

''انہوں نے مکی کو تلاش کر لیا ہے۔'' ڈارلا نے جواباً چیخ کر کہا۔ ''ہمارے باہر کے باغیچے میں۔ اور میں سمجھی کہ تم لفینی کے ساتھ چلے گئے ہو۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر دوڑتی ہوئی ٹومی کے پاس پہنچی اور اس کے سینے سے چمٹ گئی۔

''نہیں، میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔'' میں نے ٹومی کو یہ کہتے سنا۔ ''میں نے وہ پیغام تو محض تمہیں غصہ دلانے کے لیے لکھا تھا... انہوں نے مکی کو تلاش کر لیا ہے؟ اور وہ اتنے برسوں سے ہمارے اپنے باغیچے میں تھا؟''

ڈارلا روتے ہوئے ٹومی کے سینے سے علیحدہ ہو گئی۔

''ہاں، ہاں۔ لیکن وہ باغیچے کی مٹی میں پہنچا کیسے؟ وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ....''

میری نظریں بے ساختہ ڈارلا کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی نظریں جمائے رکھنے کی کوشش کی۔ میں چاہ رہی تھی کہ اس کی نظروں سے نظریں ملائے رہوں لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔

میری آنکھیں دھندلانے لگیں اور آوازیں گڈمڈ سی سنائی دینے لگیں۔

بس مجھے اتنا پتا تھا کہ پولیس بچے کھچے باغیچے کو اپنے وزنی جوتوں تلے روندتی ہوئی میری جانب بڑھ رہی تھی۔

مجھے احساس ہو چکا تھا کہ آئندہ مجھے کھلی فضا میں سانس لینے اور کسی باغ باغیچے کو دیکھنے کا اتفاق اب شاید ایک طویل عرصے کے بعد ہی ہو گا۔ آہ میرا راز فاش ہو گیا تھا۔

بے داغ گواہی

تمکین رضا

زندگی مسرت... دل لگی... اور فرصت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے... جو لوگ ان کے زیر اثر رہتے تھے... وہ بیزار اور اکتا جاتے ہیں... ایک ایسی ہی لڑکی کا ماجرا جو حد سے بڑھ جانے والی زیادتی کا تدارک چاہتی تھی...

قتل کی ایک انوکھی اور منفرد گواہی کا مختصر قصہ

لیفٹیننٹ جیفری نے اس مردہ شخص کی طرف دیکھا جو منہ کے بل لفٹ میں پڑا ہوا تھا۔ لاش کی پشت میں اس کے بائیں شانے کے نیچے ایک چاقو گھسا ہوا تھا جس کا پھل قدرے ترچھے زاویے پر دکھائی دے رہا تھا۔ لاش کے قدموں کے پاس تہ کیا ہوا ایک اخبار بھی نظر آ رہا تھا۔

مرنے والے شخص کا نام بی جے پاورز تھا۔

''اوکے۔'' سراغ رساں جیفری نے اس دلکش سنہری زلفوں والی ریسپشنسٹ سے کہا جو اپنی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"مجھے بتاؤ کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟"

مارگریٹ کیلر نے نظریں اٹھا کر لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "مسٹر پاورز ہر روز صبح اپنی چابی سے اپنی پرائیویٹ لفٹ کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو کر یہاں اوپر دسویں منزل پر آتے تھے۔ جب وہ نیچے لفٹ کا دروازہ کھولتے تھے تو یہاں وہ بلب روشن ہو جاتا تھا۔"

مارگریٹ نے لفٹ کے دروازے کے اوپر لگے ہوئے بلب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب میں بلب کو روشن ہوتے دیکھتی تھی تو میرے پاس ایک منٹ کا وقت ہوتا تھا۔ میں اس ایک منٹ میں ان کے لیے کافی کا کپ تیار کر کے لفٹ کے سامنے جا کھڑی ہوتی تھی۔ آج بھی میں معمول کے مطابق ان کی کافی کا کپ لے کر لفٹ کے سامنے کھڑی تھی تو دروازہ کھلا اور میں نے انہیں لفٹ میں پڑے ہوئے پایا...... وہ مر چکے تھے۔"

"کیا لفٹ میں ان کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا؟"

"اوہ، نہیں۔ مسٹر پاورز اس معاملے میں بے حد سخت گیر تھے۔ کسی کو بھی ان کی پرائیویٹ لفٹ استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔" مارگریٹ نے بتایا۔

"کیا یہ ایکسپریس لفٹ ہے؟"

"ہاں، ایک بار لفٹ میں سوار ہونے کے بعد جب مسٹر پاورز بٹن دبا دیتے تھے تو لفٹ کہیں پر بھی رکے بغیر سیدھا یہاں اوپر دسویں منزل پر آجاتی تھی۔ درحقیقت جن فلورز پر یہ لفٹ کھلتی ہے وہ صرف یہ فلور اور لابی ہے۔"

"جب تم نے ان کی لاش دیکھی تو پھر کیا ہوا؟"

"میرا خیال ہے کہ میں چیخ پڑی تھی۔ ان کی لاش دیکھ کر مجھے ایسا شاک پہنچا تھا کہ مجھے حقیقت میں کچھ یاد نہیں۔ پھر مسٹر فارلے پبلک لفٹ سے یہاں اوپر پہنچے اور لفٹ سے باہر آئے، جب دیکھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے تو پھر انہوں نے پولیس کو فون کر دیا۔"

لیفٹیننٹ جیفری نے بی جے پاورز کی پرائیویٹ لفٹ کے برابر کی لفٹوں کے دروازوں کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ "کیا وہ پبلک لفٹ ہیں؟"

مارگریٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب مسٹر فارلے کہاں ہیں؟"

"اپنے دفتر میں۔ پولیس کے آنے کے بعد وہ وہیں چلے گئے تھے۔"

لیفٹیننٹ جیفری ہال وے سے گزر کر اس کمرے تک پہنچ گیا جس کے باہر فارلے کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

"مسٹر فارلے، کیا اس معاملے کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

فارلے نے شانے اچکا دیے۔ "میں آج بھی معمول کے مطابق یہاں اسی وقت پہنچا تھا جب مسٹر پاورز یہاں پہنچے تھے۔ ہم ایک ساتھ عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے ایبٹ سے اخبار پکڑا، اپنی چابی کی مدد سے اپنی پرائیویٹ لفٹ میں داخل ہوئے اور اوپر جانے والا بٹن دبا دیا۔ میں ان کے برابر کی پبلک لفٹ میں سوار ہو گیا۔

"جب دسویں فلور پر پہنچنے کے بعد میری لفٹ کا دروازہ کھل رہا تھا تو مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ میں نے لفٹ سے باہر قدم رکھا تو مس مارگریٹ کو مسٹر بی جے پاورز کی پرائیویٹ لفٹ کے سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ وہ لفٹ کو حیرت سے منہ پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے یہ صورت حال دیکھی تو میں اسے اس کی میز تک لے گیا اور اسے اس کی کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر پولیس کو فون کر دیا۔"

"مسٹر پاورز کو کون مردہ دیکھنا چاہتا تھا؟"

"کون نہیں دیکھنا چاہتا تھا؟ وہ عورتوں کے بے حد رسیا تھے۔ اس شہر کے بیشتر شوہر ان کو چاقو گھونپنے کے خواہش مند تھے۔"

"تم سمیت؟"

"ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہاں۔ میری بھی یہی خواہش تھی۔ کمپنی کی ہر گیٹ ٹو گیدر پارٹی میں بی جے پاورز میری بیوی سے چپٹ جاتے تھے۔ تب آخرکار ہم نے ان پارٹیوں میں شریک ہونا بند کر دیا۔" فارلے نے بتایا۔

لیفٹیننٹ جیفری، فارلے کے دفتر سے نکل کر بی جے پاورز کی پرائیویٹ لفٹ میں داخل ہو گیا۔ اس نے نیچے جانے والا بٹن دبا دیا۔ لفٹ نیچے جانے لگی۔ وہ لفٹ کا جائزہ لینے لگا۔ صرف اس تھوڑے سے خون کے جو وہاں دکھائی دے رہا تھا جہاں بی جے پاورز گرا تھا، پوری لفٹ بے داغ تھی۔ اس کے داہنی جانب کی دیوار میں ایک ایمرجنسی دروازہ بنا ہوا تھا۔

جب نیچے پہنچ کر لفٹ کا دروازہ کھلا تو جیفری لابی میں آ گیا۔ وہ ٹہلتا ہوا نیوز اسٹینڈ کی جانب چلا گیا۔

"کیا تم ایبٹ ہو؟" اس نے اٹینڈنٹ سے پوچھا۔

"ایبٹ کراس۔ وہ میں ہی ہوں۔"

"کیا تم مسٹر بی جے پاورز کے آج صبح کے ایکشن کے بارے میں کچھ وضاحت کر سکتے ہو؟"

☆ شادی شدہ خواتین حسب ذوق زیورات اور گہنے پہنتی ہیں تا کہ دیکھنے والوں کو پتا چل جائے کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ مردوں کو ایسی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے چہرے کی ہر دکھی لکیر سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ شادی کر چکے ہیں۔

☆ مری کی برف باری اور خون جما دینے والی سردی میں پیار و محبت، چاند چہرہ، گھنیری زلفیں اور پیمانِ وفا بھی وہ لطف نہیں دیتا جو تازہ ابلا ہوا ایک انڈا!

☆ کزن سے شادی ہو جائے تو بلڈ کا رشتہ بلڈ پریشر کے رشتے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

☆ کابلی پٹھان سے سردار جی نے بادام خوری کے فائدے پوچھے۔ اس نے کہا۔ دماغ تیز ہوتا ہے پھر سردار سے پوچھا، بتاؤ تمہارے سر میں کتنے بال ہیں۔ سردار جی چکرا گئے، کبھی گنا ہی نہیں تھا۔ کابلی نے انہیں مفت میں تین بادام کھلائے پھر پوچھا ایک درجن میں کتنے کیلے ہوتے ہیں۔ سردار نے بتایا، بارہ۔ کابلی اچھل پڑا۔ دیکھا تمہارا دماغ تیز ہو گیا۔ سردار جی قائل ہو گئے۔ پانچ کلو بادام دگنے دام پر خرید لیے۔

☆ بیگم گاڑی لے کر موٹر وے پر نکلی تھیں کہ ذرا سی دیر میں شوہر کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا، ذرا سنبھل کر گاڑی چلانا۔ ابھی ٹی وی پر موٹر وے پولیس نے اعلان کیا ہے کہ کوئی احمق اور اناڑی ڈرائیور موٹر وے کے الٹے راستے میں گھس گیا ہے۔ بیگم نے جھٹ کہا، ایک کیا، یہاں تو سب احمق اور اناڑی ہیں۔ ساری گاڑیاں سامنے سے میری طرف چلی آ رہی ہیں۔

☆ اسکرپٹ میں شعر لکھا ہوا تھا:

گلہ کرتے ہیں نہ شکوہ کرتے ہیں
تم سلامت رہو، ہم دعا کرتے ہیں

بنگالی اداکار نے اس شعر کو یوں پڑھا: گیلا کورتا ہائے، نہ سوکھا کورتا ہائے۔ تم سالامت رہو، ہم دووا کورتا ہائے۔

کراچی سے دانیال عارف کی کمال ریزی

"کیوں نہیں۔ انہوں نے آج صبح بھی وہی کیا جو ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔ وہ آئے تو میں نے ان کا اخبار ان کی جانب بڑھایا۔ انہوں نے اخبار لے لیا اور اپنی پرائیویٹ لفٹ میں سوار ہو کر اوپر چلے گئے۔" ایبٹ نے بتایا۔

"انہوں نے اخبار کی قیمت ادا نہیں کی؟"

"وہ ہر پیر کو ہفتے بھر کے پیسے دے دیتے ہیں۔ لیکن کبھی کوئی ٹپ نہیں دی۔ بخیل، کتیا کا بچہ۔ مجھ سے توقع رکھتے تھے کہ میں اس طرح ان کا اخبار تہ کر کے انہیں دیا کروں ورنہ انہیں دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ وہ ہر روز اپنا اخبار سمیٹ کر اپنی راہ لے لیتے ہیں۔ کبھی مجھے 'گڈ مارننگ ایبٹ' بھی نہیں کہا۔"

جیفری نے افسردگی سے سر ہلا دیا۔

پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اس روز صبح بی جے پاورز اپنی نان اسٹاپ پرائیویٹ لفٹ میں تنہا سوار ہوئے تھے۔ جب دسویں فلور پر پہنچنے کے بعد لفٹ کا دروازہ کھلا تو وہ مر چکے تھے۔

اور صرف ایک ہی فرد ان کا قاتل ہو سکتا تھا۔

جیفری نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ بی جے پاورز کی ذاتی لفٹ کا فرش خون کے دھبوں کے سوا بالکل بے داغ تھا اور نہ ہی ان کی لفٹ کے دروازے کے سامنے دسویں منزل پر کوئی داغ دھبا دکھائی دیا تھا۔

بقول مارگریٹ کے وہ مسٹر بی جے پاورز کی ذاتی لفٹ کے سامنے کافی کا کپ لیے ان کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ لفٹ کا دروازہ کھلنے پر جب اس کی نگاہ لفٹ میں موجود بی جے پاورز کی لاش پر پڑی تو بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی تھی اور اسے شاک پہنچا تھا۔

تو پھر مارگریٹ کے ہاتھ سے کافی کا کپ کیوں نہیں چھوٹا تھا یا کپ میں سے کافی کیوں نہیں چھلک کر فرش پر گری تھی؟

اس کا مطلب تھا کہ جب لفٹ کا دروازہ کھلا تو مارگریٹ نے بڑھ کر اپنے بازو بی جے پاورز کے گرد لپیٹ لیے تھے اور اس کی پشت میں چاقو گھونپ دیا تھا۔ اس نے کافی کا کپ پہلے ہی نیچے رکھ دیا تھا۔

بی جے پاورز کو چاقو گھونپنے کے بعد اس نے کافی کا کپ ہاتھ میں اٹھا لیا تھا اور پھر چیخ ماری تھی!

مارگریٹ ہی بی جے پاورز کی قاتل تھی!

اذیت

محمد فاروق انجم

زندگی میں اگر دائمی رشتہ جوڑنا ہو تو اس کی اساس محبت اور صرف محبت پر ہونی چاہیے... خصوصاً میاں اور بیوی کے درمیان محبت کے بندھن جتنے مضبوط ہوں گے... آنے والی نسل کی بنیاد اتنی ہی پائیدار اور مستحکم ہوتی ہے... جو لوگ محبت کے بغیر اس رشتے کو نبھاتے ہیں... ان کی زندگی ہمیشہ خوشیوں... چاہتوں سے دور رہتی ہے... ایک ایسے ہی بدفطرت... کینہ پرور شخص کی حیات جو ہر لمحہ اپنے نفس کی تسکین چاہتا تھا... اس کا ہر عمل دوسروں کے لیے باعثِ اذیت تھا... مگر اس کے لیے دوسروں کی تکلیف... اور اذیتیں راحت کا سبب تھیں...

ایک ہی پلڑے میں سب کو تولنے والے شخص کی جفاؤں کا احوال

مہتاب احمد کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں اور وہ اپنی ٹائی کی گرہ ایسے کھول رہا تھا جیسے اس کے لیے اسکرین پر انہماک سے نگاہیں جمانا ضروری ہے۔ پچھلے پانچ منٹ سے وہ ٹائی کی گرہ پر انگلیوں کو محض ہلکے ہلکے حرکت دے رہا تھا۔ اسکرین پر معروف ٹی وی اداکارہ حریم کا انٹرویو آرہا تھا۔ مہتاب احمد اس کے حُسن میں کھویا ہوا تھا۔

مہتاب احمد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا

کوٹ اتار کر الماری میں لٹکایا اور پھر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی اسکرین روشن کر دی۔ اس کے بعد وہ ٹائی کی گرہ کھولنا بھول گیا۔ اس کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جم کے رہ گئی تھیں۔

اداکارہ حریم اس وقت ٹیلی وژن کی سب سے مقبول اور مصروف اداکارہ تھی۔ اس کی خوبصورتی ایسی تھی جیسے وہ کوئی جادو کی پری ہو جس پر کسی کی نظر پڑ جائے اور پھر وہ کچھ اور دیکھنا ہی بھول جائے۔ وہ انٹرویو دیتے ہوئے جب ہنستی تو ایسا لگتا جیسے وہ کسی کی جان لے کر ہی اپنی ہنسی روکے گی۔ اس کی آنکھیں اتنی خوبصورت تھیں کہ ان میں ڈوب جانے کو دل چاہتا تھا۔ وہ عجیب حسن کی مالک تھی کہ اپنا سحر بکھیر دیتی تھی۔ حریم کے انٹرویو کا وہ آخری حصہ چل رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اختتامی الفاظ ادا ہوئے اور پروگرام ختم ہو گیا۔

پروگرام کا ٹائٹل چل رہا تھا مگر مہتاب احمد کی نگاہیں ٹیلی وژن اسکرین پر ہی مرکوز تھیں۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور مہتاب احمد کی بیوی بلقیس بیگم داخل ہوئی۔ اُس نے ایک نظر دروازے پر رک کر مہتاب احمد کی طرف دیکھا اور پھر چلتی ہوئی بیڈ کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

بلقیس بیگم پچپن سال کی عورت تھی۔ اس کا رنگ سانولا اور تین نقش بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھے لیکن بلقیس بیگم کو دیکھ کر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایک عام شکل وصورت کی عورت ہے۔ اُس کا جسم فربہ مائل ہو گیا تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مہتاب احمد کی عمر تقریباً اُنچاس سال تھی اور وہ خوش لباس، پُرکشش اور اپنی عمر سے پانچ سال کم دکھائی دیتا تھا۔

مہتاب احمد اور بلقیس بیگم آپس میں کزن تھے۔ مہتاب احمد کے باپ نے تقریباً چھ سال بڑی بلقیس بیگم سے شادی مہتاب احمد کو مجبور کر کے کر دی تھی کہ بلقیس بیگم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور ساری جائیداد کی واحد مالکن تھی۔ اس کی ماں بہت پہلے فوت ہو چکی تھی اور باپ بھی موذی مرض میں مبتلا تھا۔ مہتاب احمد اور بلقیس بیگم کی شادی کے تین ماہ کے بعد بلقیس بیگم کا باپ بھی دنیا سے چلا گیا تھا۔ اس طرح ساری جائیداد مہتاب احمد کی جھولی میں تو گر گئی تھی لیکن مہتاب احمد اپنی اس شادی سے خوش نہیں تھا۔ وہ اس رشتے کو محض نبھا رہا تھا۔

مہتاب احمد کے خواب کچھ اور تھے۔ وہ اپنے سے بھی زیادہ خوبصورت اور پُرکشش لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ باپ کے مجبور کرنے اور جائیداد کے لالچ میں اس نے شادی تو کر لی تھی لیکن اپنے دل میں اس خیال کو زندہ رکھا تھا کہ وہ دوسری شادی ضرور کرے گا۔

قدرت نے انہیں ایک بیٹی سے نوازا تھا جس کا نام مہتاب احمد نے ماہین رکھا تھا۔ کاروباری مصروفیت اتنی بڑھیں کہ مہتاب احمد کو احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ماہین اس کے کندھوں کے برابر کھڑی ہو گئی ہے۔ مصروفیت اور دولت کمانے کی لگن نے شادی کرنے کا خیال دبا دیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس بہترین عملہ تھا اور اب اس کے لیے دوسری شادی کرنا کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا اس لیے کئی دنوں سے اس کے دل میں دوسری شادی کی خواہش پھر سے مچلنے لگی تھی۔

بلقیس بیگم نے بیس سالہ ازدواجی زندگی میں ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لی تھی کہ مہتاب احمد ایسا شخص ہے جو طنز کے تیر مار کر دوسروں کی پگڑی اُچھال کر اور بے عزتی کر کے شاید بہت لطف محسوس کرتا ہے۔ اُس کی اپنی زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب مہتاب احمد نے اسے بڑی عمر کا طعنہ اپنے طنز کے ان تیروں سے نہ مارا ہو جو ہر وقت زہر میں ڈوبے رہتے تھے۔ بلقیس بیگم شروع میں کسی بات کا جواب دے دیتی تھی لیکن اُسے پھر ایسی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ اس کا دل خون کے آنسو رو دیتا تھا۔ اب اس نے مہتاب احمد کی نشتر نما باتوں کا جواب دینے کے بجائے انہیں صبر کے گھونٹ کے ساتھ پینا سیکھ لیا تھا لیکن اُس کے اندر ہی اندر لاوا اُبلتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مہتاب احمد سے شدید نفرت کرنے لگتی تھی اور کچھ ایسا خطرناک سوچ لیتی تھی کہ بس اس پر عمل کرنا باقی رہ جاتا تھا۔

مہتاب احمد کے ترکش میں طنز کے تیر محض اس کی بیوی کے لیے ہی نہیں تھے بلکہ ہر اُس شخص کے لیے تھے جو اس کے نشانے کی زد پر آ جاتا تھا۔ وہ اپنی کمپنی کے جی ایم کو بھی بعض اوقات ایسی بات کہہ دیتا تھا کہ وہ ہاتھ ملتا رہ جاتا۔ مہتاب احمد کے مزاج کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اپنے عزیز دوست کو بھی کسی بات پر بے عزت کر کے رکھ دیتا تھا۔ اس کی اس عادت کی وجہ سے اس سے ملنے جلنے والے بہت نالاں رہتے تھے۔ لیکن مہتاب احمد کو کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی دولت کے زعم میں مخمور رہتا تھا۔

مہتاب احمد نے اپنی نگاہیں ٹی وی کی اسکرین سے ہٹا کر اپنی ٹائی کی گرہ کھولی تو بلقیس بیگم نے پوچھا۔

”آپ کے لیے چائے کا کہوں؟“

"کس سے کہو گی؟" مہتاب احمد نے متانت سے اپنی ٹائی الماری میں ایک طرف لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"ملازم سے کہوں گی۔" بلقیس بیگم نے جواب دیا۔

مہتاب احمد نے بلقیس بیگم کی طرف دیکھ کر اپنے چہرے پر وہ زہر آلو مسکراہٹ عیاں کی جو طنز کا تیر برسانے سے پہلے وہ ایسے سجاتا تھا جیسے کوئی نشانہ لیتا ہو۔ "لیکن آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم مجھے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاؤ۔"

"آپ چاہتے ہیں تو میں چائے بنا لاتی ہوں۔" بلقیس بیگم نے اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے نرمی سے کہا۔

"تم پوچھو گی نہیں کہ میں نے آج ایسا کیوں کہا کہ تم مجھے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے چائے بنا کر دو۔" مہتاب احمد کے چہرے پر ابھی تک وہ زہر آلود مسکراہٹ تھی اور اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"مجھے پوچھ کر کیا لینا ہے۔ میں پچاس سال سے زیادہ عمر کی عورت ہوں۔ میری ایک جوان بیٹی ہے، اب میں جوان تو رہی نہیں ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کی حقیقت معلوم ہے۔" بلقیس بیگم کا لہجہ نرم تھا۔

"جوان تو خیر تم کبھی بھی نہیں تھیں۔ پھر بھی میں بتا دیتا ہوں۔ ابھی ٹیلی وژن پر اداکارہ حریم کا انٹرویو آ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ کتنے گورے اور سفید تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہاتھ نہ ہوں بلکہ روئی کے گالے ہوں۔ نرم ملائم...."

"چائے آپ یہاں پئیں گے یا لان میں؟" بلقیس بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔

مہتاب احمد نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ "ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ جب تک میں اپنی بات مکمل نہ کرلوں، تم یہاں سے نہیں جاؤ گی۔"

"مجھے آپ اس لیے روکنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے منہ سے غیر عورتوں کی تعریف سنوں؟"

"تم سنو گی تو تمہیں احساس ہوگا کہ تم اُن جیسی نہیں ہو۔" مہتاب احمد جلدی سے تیز لہجے میں بولا۔

"مجھے اچھی طرح سے احساس ہے کہ میں اُن جیسی نہیں ہوں۔" بلقیس بیگم نے کہہ کر اپنی انگلی کا اشارہ ٹی وی کی طرف کرتے ہوئے پھر جملہ دہرایا۔ "اُن جیسی نہیں ہوں۔"

مہتاب احمد سمجھ گیا تھا کہ بلقیس بیگم کا اشارہ کیا کہہ رہا ہے لیکن مہتاب احمد اُس طرف جانے کے بجائے بولا۔

"کاش تم خوبصورت، اسمارٹ اور میری ہم عمر ہوتیں۔"

بلقیس بیگم نے مہتاب احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "شاید میں پھر بھی آپ کے دل کی غلاظت صاف نہ کرپاتی۔"

مہتاب احمد نے یہ بات سنی تو وہ سیخ پا ہو گیا اور اس نے دانت پیس کر بلقیس بیگم کے بال پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور بولا۔ "کیا کہا ہے تم نے.... میرے دل میں غلاظت ہے؟"

"مجھے چھوڑ دیں۔" بلقیس بیگم تکلیف دہ لہجے میں بولی۔

اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور تکلیف بھری آواز میں بلقیس بیگم نے جلدی سے کہا۔

"آجاؤ...."

اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور ان کی بیٹی ماہین کا چہرہ نمودار ہوا اور..... اس نے دیکھا کہ مہتاب احمد نے اس کی ماں کو بالوں سے پکڑ رکھا ہے اور اس کے چہرے پر قہر برس رہا ہے جبکہ اس کی ماں مظلومیت سے تکلیف میں مبتلا ہے۔ مہتاب احمد کو اس بات پر بھی غصہ آ گیا کہ دروازے پر دستک ہوتے ہی بلقیس بیگم نے اسے اندر آنے کی اجازت کیوں دی تھی۔

ماہین خوفزدہ اور حیرت سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ مہتاب احمد نے ایک جھٹکے سے بلقیس بیگم کو چھوڑتے ہوئے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔

"کیا ہوا مما.....؟" ماہین نے معصومیت سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اچھا ہوا کہ آج تم نے پہلی بار یہ بھی دیکھ لیا کہ.... تمہارے پپا مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔" بلقیس بیگم کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔ ماہین نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اُس کی ماں کے ساتھ اس کا باپ ایسا رویہ رکھتا ہے۔ اُس کے سامنے اس کے باپ کا ایک نیا روپ آ گیا تھا۔ اس کی دانست میں تو اس کے والدین خوش و خرم بہترین زندگی گزار رہے تھے۔ بلقیس بیگم نے کبھی بھی ماہین کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کس اذیت سے گزر کر مہتاب احمد کے ساتھ زندگی کا سفر کاٹ رہی ہے۔ اب شاید اس نے مناسب سمجھا تھا کہ ماہین اس کے باپ کا وہ روپ بھی دیکھ لے جو اس سے مخفی تھا۔

ماہین جانے لگی تو مہتاب احمد نے اسے روک لیا۔

"سنو۔"

ماہین اسی وقت رک گئی اور سوالیہ نگاہوں سے مہتاب احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ "تمہاری ماں جیسے جیسے ... بوڑھی ہوتی جارہی ہے، اس کا دماغ کام کرنا چھوڑتا جارہا ہے۔" مہتاب احمد کہنے کے بعد اپنی شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔

ماہین کھڑی سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید اس کا باپ اس سے کچھ کہے گا لیکن جب چند ثانیے خاموشی میں گزر گئے تو مہتاب احمد نے اچانک ماہین کی طرف دیکھا اور ماہین خوف سے چونک سی گئی۔ مہتاب احمد نے یکدم اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی ... اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ماہین میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تم میری بیٹی نہیں میرا دل ہو۔ میں تمہیں ہلکی سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتا اس لیے بیس سالوں سے میں تمہاری ماں کی جاہلیت کو برداشت بھی کرتا رہا اور تم سے چھپ کر اس کی سرزنش بھی کی تاکہ تم پر کوئی خوف کا اثر نہ ہو لیکن آج تم نے دیکھ لیا کہ تمہاری اس جاہل ماں نے تمہیں فوراً کمرے میں آنے کی اجازت دے دی تاکہ تمہارے سامنے وہ مظلوم اور میں ظالم بن جاؤں۔" مہتاب احمد اس کے پاس چلا آیا اور اپنا پیار بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم اپنی ماں کو سمجھاؤ کہ وہ عمر کے اس حصے میں سمجھ جائے۔"

مہتاب احمد نے یہ کہہ کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ ماہین جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے باپ سے خوف محسوس ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک عورت کو اذیت دے رہا تھا جو اس کی ماں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے لیکن وہ سادہ مزاج اور ایک نفیس خاتون ہے۔ جس کی ممتا میں اس نے ہمیشہ پیار اور اُنس ہی دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتی تھی۔ اس کے برعکس اس کا باپ ایک مصروف بزنس مین تھا جو وقت ملنے پر ہی ماہین کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتا تھا۔

ماہین سیدھی کچن میں چلی گئی۔ گھر میں ملازم ہونے کے باوجود بلقیس بیگم چائے تیار کررہی تھی۔ اس وقت کچن میں صرف بلقیس بیگم تھی۔ ماہین کچھ دیر دروازے میں کھڑی رہی اور پھر آگے بڑھ کر اس نے کہا۔

"ماما یہ معاملہ کب سے چل رہا ہے؟"

"کونسا معاملہ؟" بلقیس بیگم نے کپ نکالتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کی۔

"یہ جو آپ کے ساتھ ہورہا ہے۔ جو میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔" ماہین بولی۔

بلقیس بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کالج میں پڑھتی ہو، اب بڑی ہو چکی ہو اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تم جان لو کہ تمہارا باپ حقیقت میں کیا ہے۔ میری زندگی کا ایک حصہ بیت گیا ہے۔ میں نے ان کے طنز سنے ہیں اور .... اپنے چہرے پر تھپڑ بھی کھائے ہیں۔" بلقیس بیگم کہتی ہوئی رو دی۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا اور کپ میں چائے ڈالنے لگی۔

ماہین خاموش کھڑی رہی۔ اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ کچھ اور پوچھ سکے اور اپنی ماں کا چہرہ دیکھ سکے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کا چہرہ یقیناً آنسوؤں سے بھرا ہوگا۔ ماہین واپس چلی گئی اور اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

☆☆☆

ماہین کا چہرہ اُداسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے بیٹھا جنید ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ماہین کالج کے لیے جلدی نکل آئی تھی دراصل ہفتے میں دو، تین دن وہ کالج کے لیے جلدی ہی نکلتی تھی کیونکہ اسے نو بجے سے پہلے جنید کے ساتھ ملاقات کرنی ہوتی تھی۔

جنید اور ماہین کی دوستی اچانک پانچ، چھ ماہ قبل ان کے گھر میں منعقد ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ جنید، مہتاب احمد کی کمپنی میں شعبۂ مارکیٹنگ میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ مہتاب احمد کا ملازم تھا اور اس تقریب میں مہتاب احمد نے اپنی کمپنی کے کچھ قریبی ملازمین کو بھی مدعو کیا تھا۔

اس تقریب میں ہونے والی ملاقات دوستی میں اور پھر محبت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ ابھی اس بات کی بھنک مہتاب احمد کو نہیں پڑی تھی کہ اس کی بیٹی اس کے ملازم کے ساتھ پیار و عشق کی راہ پر دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہی ہے۔

ٹھیک نو بجے جنید کو آفس پہنچنا ہوتا تھا۔ اس سے قبل وہ دونوں کمپنی کے عقب میں واقع ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے، یا پھر جوس پینے کے ساتھ ساتھ بات چیت بھی کرلیتے تھے۔

خلافِ معمول ماہین پریشان تھی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا

تھا اور اس کے سامنے رکھا ہوا جوس اسی طرح پڑا تھا۔ جنید نے بات گھما پھرا کر اس خاموشی اور اُداسی کی وجہ جاننی چاہی تھی لیکن ماہین بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

جنید نے گھڑی پر وقت دیکھا تو بجنے میں بیس منٹ رہتے تھے۔ جنید نے اپنے جوس کے گلاس کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اپنا جوس ختم کرلو، میرا آفس ٹائم ہو رہا ہے۔''

''جنید..... میرے پپا کیسے باس ہیں؟'' اچانک ماہین نے سوال کیا۔

جنید نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''جیسا ایک باس ہوتا ہے، وہ ایسے ہی باس ہیں۔''

''مجھے گول مول جواب نہیں چاہیے۔ مجھے صاف لفظوں میں بتاؤ کہ وہ کیسے باس ہیں۔ کیا بہت سخت ہیں یا نرم مزاج ہیں؟'' ماہین نے اپنا سوال کچھ وضاحت سے دہرایا۔

جنید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اس سے پہلے تم نے کبھی ایسا سوال نہیں کیا، آج یہ سوال پوچھنے کی کیوں ضرورت پیش آگئی؟''

''اگر تم اسی طرح بات گھماتے رہے تو مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملے گا اور تمہارا آفس ٹائم ہو جائے گا۔''

جنید نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''سچ بتاؤں کہ جھوٹ؟''

''میں سچ سننا چاہتی ہوں۔''

''اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اُن کے بارے میں وہ الفاظ کہنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں ہیں۔''

''ہاں تم وہی الفاظ کہو۔ میں سننا اور جاننا چاہتی ہوں۔''

''وہ جلاد قسم کے باس ہیں۔ اپنے ملازموں کے لیے ان کے منہ میں زہر ہوتا ہے۔ وہ کسی کو بھی بے عزت کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کسے کیا کہہ رہے ہیں اور کون کون سن رہا ہے۔ ان کی پٹاری ہر وقت طنز کے ایسے پتھروں سے بھری رہتی ہے جو کسی بھی وقت کسی پر بھی برسا کر اسے گھائل کر دیتے ہیں اور پھر خوش ہوتے ہیں۔'' جنید کی زبان کی نوک پر جانے کب سے یہ الفاظ نکلنے کے لیے مچل رہے تھے۔ آج موقع ملا تو اس نے وہ الفاظ کہہ دیے۔

ماہین نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تمہارے آفس کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

ماہین کا چہرہ مزید اُتر گیا تھا اور اس نے کہتے ہی اپنا رخ موڑا اور ایک طرف تیزی سے چلنے لگی۔ جنید وہاں کھڑا حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جنید کو لگ رہا تھا جیسے وہ روتی ہوئی جا رہی ہو۔ اس کا جوس کا گلاس بھی اسی طرح رہ گیا تھا۔ جنید کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ماہین اس کی اپنے باپ کے بارے میں حقیقت سن کر غصے سے چلی گئی ہے، یا پھر معاملہ کچھ اور ہے؟

جنید کا اس جگہ رکنا مشکل تھا کیونکہ آفس ٹائم ہو رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ سے آفس تک کی مسافت محض پانچ منٹ پیدل کی تھی۔ اس کے پاس بائیک تھی۔

اس نے بل ادا کیا اور دو منٹ میں اپنے آفس کی عمارت میں پہنچ گیا۔ آفس میں نو بجے تک ہر ملازم اپنی اپنی سیٹ پر موجود ہوتا تھا۔ جنید ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ اپنے مخصوص دروازے سے مہتاب احمد داخل ہوا اور تمکنت سے اپنی گردن اکڑائے آفس میں چلا گیا۔ وہ کسی کو سلام بھی نہیں کرتا تھا۔

جنید دوپہر تک کام میں مصروف رہا لیکن اس کا دھیان مسلسل ماہین کی طرف ہی رہا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی دوڑ رہی تھی۔ جنید اپنی انگلیوں میں پنسل گھماتے ہوئے ماہین کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور مہتاب احمد کا ڈرائیور گھبرائے انداز میں تیزی سے داخل ہوا، اسی اثنا میں مہتاب احمد کے کمرے کا بھی دروازہ کھلا اور وہ بھی باہر نکل آیا۔ ڈرائیور کا رخ اسی کی طرف تھا۔ جنید نے اپنی انگلیوں میں گھومتی ہوئی پنسل کو روک لیا اور ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے لگا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

ڈرائیور جس کا نام نثار تھا، وہ مہتاب احمد کے پاس جاتے ہی معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''معافی چاہتا ہوں سر کہ مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔''

''تم مجھ سے کتنے وقت کے لیے چھٹی لے کر گئے تھے؟'' مہتاب احمد نے اطمینان سے سوال کیا۔

''دو گھنٹے کے لیے۔'' نثار گھبرایا ہوا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ اپنی بیوی کو اسپتال لے کر جانا ہے اور دو گھنٹے کے اندر واپس آجانا ہے۔ دو گھنٹے دس منٹ گزرنے کے بعد میں نے تمہیں کال کی کہ تم فوراً آفس پہنچو مجھے کہیں جانا ہے اور تم میری کال کرنے کے پینتیس منٹ کے بعد آ رہے ہو۔'' مہتاب احمد کا لہجہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔

''سر کچھ تو اسپتال میں دیر ہوگئی اور پھر واپسی پر ویگن نے دیر کر دی۔'' نثار کے لہجے میں ناچاری تھی۔

''رکشے میں آجاتے۔''

"سر سوری آئندہ دیر نہیں ہوگی....." نثار نے اپنی آنکھیں جھکائیں۔
"کتنے بچے ہیں تمہارے؟" مہتاب احمد نے سوال کیا۔
"جی... چار بچے ہیں۔" نثار نے جواب دیا۔
"اور اب جو دنیا میں آنے والا ہے، وہ تمہارا پانچواں بچہ ہوگا۔ تم نوکری کیوں کر رہے ہو؟ چھوڑ دو یہ نوکری اور گھر بیٹھ کر اطمینان سے بچے پیدا کرو۔ ایک کے بعد ایک اور۔" مہتاب احمد کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ عیاں ہوگئی تھی اور نثار چور نگاہوں سے دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا۔
مہتاب احمد پھر بولا۔ "تم جیسوں کی جیب سے رکشے کا کرایہ نکلتا نہیں ہے اور ہر سال اسپتال میں بیوی کو لے جانا اپنا فرض سمجھتے ہو۔ بہتر ہے کہ تم ابھی اپنا حساب لو اور میری جان چھوڑو۔"
"سوری سر آئندہ نہیں ہوگا۔" نثار نے مظلومیت سے کہا۔
"کس چیز کا وعدہ کر رہے ہو مجھ سے کہ کیا آئندہ تمہارے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوگا، یا تم آنے میں دیر نہیں کرو گے؟" مہتاب احمد کے چہرے پر وہی مخصوص تمسخرانہ مسکراہٹ تھی اور نثار چور نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے ندامت محسوس کر رہا تھا، وہاں پر موجود اسٹاف میں سے کوئی بھی ان کی باتوں پر خفیف مسکراہٹ بھی نہیں بکھیر رہا تھا سوائے ایک کے جس کا نام مظہر تھا اور وہ بڑے واضح انداز میں باچھیں کھول کر مسکرا رہا تھا۔ وہ مہتاب احمد کا چمچہ تھا۔ نثار کو سب کے سامنے ایسی باتیں سنتے ہوئے شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اُس کا قد مہتاب احمد کے قد سے دو، تین انچ اُونچا ہی تھا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ غلط لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے پر تل گیا تھا لیکن جلد ہی وہ اس دنیا سے واپس ہوگیا تھا اور اس نے ڈرائیور کی نوکری کر لی تھی۔ وہ جوش اب بھی اس کے اندر تھا جسے اس نے دفن کر دیا تھا لیکن ایک عرصے کے بعد وہ جوش پھر سے اس کے اندر تلاطم سا مچانے لگا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مہتاب احمد کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر باہر لے جائے اور ایسی درگت بنا دے کہ پھر کبھی وہ کسی کا تمسخر نہ اُڑا سکے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔
"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے؟" وہ پھر بولا۔ اسی وقت مہتاب احمد نے اپنے اکاؤنٹنٹ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ نثار کا حساب کر دے۔
"سر مجھے نوکری سے نہ نکالیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آفس ٹائم میں چھٹی لے کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے سر پیسوں کی ضرورت ہے۔ میری بیوی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے اس کے لیے خون کا انتظام کرنا ہے۔ مجھے نوکری سے نہ نکالیں سر بلکہ میری مدد کریں اور مجھے کچھ ایڈوانس پیسے دے دیں۔" نثار جیسا جوان آدمی کسی بچے کی طرح منتیں کرنے لگا۔
اس کی بات سن کر مہتاب احمد کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں ابھری اور وہ بولا۔ "بچے پیدا کرو تم اور خرچہ کروں میں؟ دفع ہو جاؤ اور خبردار جو تم نے اب کوئی منت کی۔ اپنے پیسے لو اور چلتے بنو۔"
"سر میری بیوی مر جائے گی۔" نثار یکدم ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔
"مر جائے۔" مہتاب احمد نے بے پروائی سے کہا۔
نثار چپ ہوگیا اور مہتاب احمد آگے بڑھ گیا۔ وہ چلتے ہوئے جنید کے پاس رکا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی کار کی چابی اس کے آگے پھینک کر تحکمانہ انداز میں بولا۔ "میرے ساتھ آؤ اور آج میرا ڈرائیور بن کر میری کار چلاؤ۔"
مہتاب احمد کہہ کر تیزی سے چلتا ہوا اس ہال سے باہر نکل گیا جبکہ جنید نے ایک نظر کار کی چابی کی طرف دیکھ کر سوالیہ نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا جیسے وہ ان سے پوچھ رہا ہو کہ میں اس کمپنی کا سیلز منیجر ہوں یا ڈرائیور؟ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کسی نے کندھے اچکائے اور کسی نے آنکھیں گھمائیں۔
جنید اپنے باس کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ اس لیے اس نے چابی پکڑی اور باہر جانے کے لیے چل پڑا، پیچھے سے اس کی سماعت سے نثار کی آواز ٹکرائی۔
"اس جیسے فرعونوں کا علاج میرے پاس ہے۔ میں اس کی اکڑی ہوئی گردن کاٹ کے رکھ دوں گا۔" نثار کا لہجہ خوفناک تھا کہ ایک لمحے کے لیے جنید کے قدم بھی رک سے گئے لیکن پھر وہ باہر نکل گیا۔
کار کے پاس مہتاب احمد کھڑا تھا۔ جنید کو دیکھتے ہی بولا۔ "کہاں رک گئے تھے؟"
"کہیں بھی نہیں سر۔" جنید نے کہتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مہتاب احمد کار کے پچھلے دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ جنید نے دیکھا اور پھر باہر نکلا۔

"آپ بیٹھ نہیں رہے سر؟"

"دروازہ تمہارا باپ کھولے گا۔" مہتاب احمد نے درشت لہجے میں دانت پیس کر کہا۔

ایک لمحے کے لیے تو جنید کا بھی دل چاہا کہ وہ اسی وقت کار کی چابی ایک طرف پھینک کر مہتاب احمد کو اپنے گھونسوں سے اس بات کا جواب ضرور دے کہ اس نے اپنی زبان سے اس کے باپ کا لفظ کیوں نکالا۔ لیکن پھر اسے ماہین کا خیال آگیا۔ وہ ماہین سے محبت کرتا تھا اور ماہین کو اپنانے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھا۔

طوعاً وکرہاً جنید نے کار کا دروازہ کھولا اور مہتاب احمد کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جنید نے ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مہتاب احمد نے جنید کو اُس جگہ کا نام ایسے بتایا جیسے وہ اپنے ڈرائیور کو بتاتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔

جنید نے کار آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر کے بعد مہتاب احمد بولنے لگا۔ "میرا جی ایم بھی میرے ہر حکم کا تابع ہے۔ اگر وہ بھی میری کار چلانے سے انکار کرے گا تو میں اسے ایک منٹ میں نوکری سے فارغ کر دوں گا۔ تم سب میرے معمولی ملازم ہو۔ میرا کام کرتے ہو اور مجھ سے تنخواہیں لیتے ہو، اس لیے میں تم سب کو کوئی بھی کام کہہ سکتا ہوں۔ کیا کہتے ہو تم؟" مہتاب احمد نے یہ کہہ کر اس کی رائے لینا چاہی۔

جنید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ کہہ دے جو اس کے دماغ میں اُبل رہا تھا یا پھر کوئی گول مول سا جواب دے کر اپنے اور ماہین تک جانے کا راستہ صاف رکھے۔

اس وقت وہ ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے جہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار کار نے ان کی کار کو عبور کیا اور آگے جا کر اس کار نے بریک لگائے اور ایسے ترچھی کھڑی ہو گئی کہ جنید کو بھی فوری بریک لگانے پڑے۔ ایک جھٹکا لگا اور مہتاب احمد نے غصے سے کہا۔

"کون بدتمیز اور گدھا ہے۔"

اسی اثنا میں اگلی کار سے ایک شخص باہر نکلا۔ اُس کا نام اشفاق حبیب تھا۔ وہ مہتاب احمد کی کار کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی کار سیدھی ہو کر سڑک کی ایک جانب کھڑی ہو گئی۔

"تو یہ گدھا ہے...." اس کی طرف دیکھتے ہوئے مہتاب احمد نے ناگواری سے انداز میں کہا۔

اشفاق چلتا ہوا اس کی کار کے پاس آیا۔ اس نے پہلے اپنی سیدھی انگلی کو ٹیڑھی کر کے شیشہ بجایا۔ مہتاب احمد نے شیشہ نیچا کیا تو اشفاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا میں دو منٹ کے لیے تمہارے برابر میں بیٹھ سکتا ہوں۔"

"تمہاری حیثیت تو نہیں ہے کہ تم میرے برابر میں بیٹھو لیکن بیٹھ جاؤ۔" مہتاب احمد نے ناگوار انداز میں کہا۔

اشفاق نے کار کا دروازہ کھولا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ جنید نے کار کو سڑک کے ایک جانب کھڑا کر دیا۔

اشفاق کی عمر مہتاب احمد کے لگ بھگ تھی۔ اس کا سر بالوں سے بہت حد تک مبرّا تھا۔ اس کی ناک پر نظر کا چشمہ ٹکا ہوا تھا۔

"یہ کونسا طریقہ ہے مجھ سے بات کرنے کا؟" مہتاب احمد نے کہا۔

"مجھے تمہاری گاڑی اچانک نظر آئی تو میں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں ہے لہٰذا تم اس گاڑی کو روکنے کے لیے کوئی طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"اور تمہارے ڈرائیور نے یہ طریقہ اختیار کر لیا۔ سچ کہا ہے کسی نے جیسا وہ خود ہو گا ویسے ہی اس کے نوکر چاکر ہوں گے۔"

"تمہاری اس بے ڈھنگی سی بات کا میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔" اشفاق نے اطمینان سے کہا۔

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" مہتاب احمد کو اس کی بات پر غصہ آگیا اس نے فوراً مطلب کی بات کی۔

"بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دو سال قبل ہم نے ایک مشترکہ کاروبار شروع کیا تھا۔ وہ کاروبار کامیابی کی طرف بڑھنے لگا تو تم نے اچانک مجھے اس کاروبار سے الگ کر دیا۔ مجھے کچھ رقم واپس کر دی اور ایک سال سے باقی سرمایہ واپس نہیں کیا۔" وہ بولا۔

"جب ہوں گے واپس کر دوں گا۔" مہتاب احمد بے پروائی سے بولا۔

"میں بھی صبر سے بیٹھا رہا تھا لیکن اب صبر ہو گا اور نہ انتظار ہو گا۔" اشفاق کے لہجے میں یکدم تغیر آگیا۔ مہتاب احمد نے اس کے بدلتے لہجے کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"بس اتنا کہ مجھے میری رقم واپس کر دو۔" اشفاق نے خشک لہجے میں کہا۔

"ابھی نہیں ہیں۔" مہتاب احمد نے بھی متانت سے انکار کر دیا۔

"تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ میں تمہیں ایک ہفتے

کا وقت دیتا ہوں مجھے میری رقم واپس کردو ورنہ ....." اشفاق کے لہجے میں درشتگی تھی۔

"ورنہ .... ؟" مہتاب احمد نے اس کے چہرے پر آنکھیں جمادیں۔

"میں اپنی رقم بھول جاؤں گا لیکن تمہیں انجام تک پہنچادوں گا۔" اشفاق سفاک انداز میں بولا۔

مہتاب احمد کچھ دیر اسے گھورتا رہا اور پھر غصے سے بولا۔ "گیٹ آؤٹ .... نکلو میری کار سے .... فوراً نکلو۔"

"میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہا۔ ایک ہفتے کے بعد تم میرے الفاظ کی حقیقت جان جاؤ گے۔" وہ اور بھی درشت لہجے میں بولا۔

"میں تمہاری ایک پائی بھی واپس نہیں کروں گا۔ جو کرسکتے ہو کرلینا۔ اب دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"

"جارہا ہوں۔ جو وقت دیا ہے اور اس کے بعد تم رقم دو گے، یا پھر اپنا انجام دیکھو گے۔" اشفاق نے مضبوط انداز میں کہا اور کار سے باہر نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ مہتاب احمد کی آنکھوں میں غصہ اُترا ہوا تھا اور اس کی سانسیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔

"چلو تم گاڑی چلاؤ۔" مہتاب احمد نے غصے سے جنید کو حکم دیا اور جنید اپنا غصہ پیتے ہوئے کار چلانے لگا۔

☆☆☆

آفس ٹائم ختم ہوا اور جنید گھر جانے کے لیے اپنی بائیک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ماہین کا فون آگیا۔

"کیا تم آفس سے نکل آئے ہو؟" ماہین نے پوچھا۔

"ہاں نکل آیا ہوں۔"

"میں اسی ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوں۔" ماہین نے کہہ کر فون بند کردیا۔ جنید نے بائیک نکالی اور اسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جو قریب ہی تھا۔

ماہین ایک میز پر براجمان تھی۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی اُداسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ جنید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شوخ و چنچل ماہین کو اچانک کیا ہوگیا کہ وہ چپ ہی ہوگئی ہے۔

جنید اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ماہین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آگئے تم ...."

"تم اب بھی بہت اداس ہو؟"

"تم کچھ کھانا چاہو گے؟"

"اگر تمہارا کچھ کھانے کا موڈ ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" جنید بولا۔

"تم چائے منگوا لو۔" ماہین نے کہا اور جنید نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر وہ ماہین کا اداس اور سوچوں میں ڈوبا چہرہ دیکھتا رہا، پھر پوچھا۔

"کیا بات ہے تم بہت اداس ہو؟"

"ایک ایسی حقیقت نے مجھے اداس ہی نہیں، دکھی بھی کردیا ہے۔" ماہین بولی۔

"کیسی حقیقت؟"

"میرے سامنے کل ایک حقیقت کھلی اور آج میں نے اپنی مما سے تفصیلی بات کی تو .... مجھے سب کچھ جان کر اپنے باپ سے نفرت سی ہونے لگی ہے۔"

"تم مجھے کھل کر بتانا چاہو گی۔"

"میں سمجھتی تھی کہ میرا باپ ایک اچھا انسان ہے جو میری ماں سے بہت پیار کرتا ہے ...... وہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں لیکن ...... میری ماں کو بیس سال سے اذیت دے رہے ہیں۔ وہ میری ماں پر ہاتھ بھی اُٹھاتے ہیں، ان کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے بھی ہیں اور طنز کے ایسے تیر بھی برساتے ہیں کہ وہ زندگی بے جان جسم کے ساتھ جی رہی ہیں۔" ماہین بے حد افسردہ تھی۔

"یہ حقیقت تم پر اب کھلی ہے ماہین؟"

"ہاں اسی لیے میں نے پوچھا تھا کہ میرے پپا کیسے باس ہیں۔" ماہین نے کہا۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ وہ صرف ہم پر ہی رعب ڈالتے ہیں لیکن وہ تمہاری مما کے ساتھ ہم سے بھی زیادہ برا سلوک کرتے ہیں۔ مجھے تو دکھ ہو رہا ہے۔"

آج جب میں اپنی مما سے کرید کرید کر پوچھ رہی تھی تو انہوں نے بہت سی باتیں بتانے کے بعد ایک عجیب اور خطرناک بات کہہ دی ...." ماہین چپ ہوگئی۔ اسی اثنا میں ویٹر چائے لے کر آگیا تھا۔ چائے رکھنے کے بعد ویٹر چلا گیا اور جنید نے چائے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ماہین نے روک دیا۔

"میرے لیے چائے مت نکالنا۔ بیٹھنے کے بہانے سے میں نے چائے منگوالی تھی۔ تم پینا چاہو تو اپنی چائے نکال لو۔"

"تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری مما نے کوئی عجیب اور

خطرناک بات کی تھی۔"

"ہاں .... میرے پپا کے ظلم اور اذیت کو بیان کرتے ہوئے مما نے کہا کہ اگر مجھے ایک خون معاف ہو تو میں اس شخص کا خون کردوں جس کے اندر انسانیت نام کی چیز نہیں ہے۔"

جنید نے سنا تو اس کو اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا، اس کا مطلب ہے کہ ماہین کی مما اپنے شوہر سے اس قدر بے زار ہے۔ ایسی بات کوئی تب ہی کہتا ہے جب ظلم اور اذیت برداشت سے باہر ہو جائے۔

ماہین بولی۔ "میری مما بہت صبر والی ہیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ پپا نے مما کو جانے کیسی کیسی اذیت سے دوچار کیا ہے کہ مما ایسا کہنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ مجھے پریشانی اس بات کی ہو رہی ہے کہ مما کی برداشت سے سب کچھ باہر ہو گیا ہے اور وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھالیں کہ ...." ماہین کہتے کہتے رک گئی۔

"تم فکر نہیں کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" جنید نے تسلی دی۔

"نہیں، مجھے سب کچھ بگڑتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔" ماہین نے کہا۔

"انسان کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر مایوس ہو کر نہیں سوچنا چاہیے۔ تم بھی اچھا سوچو۔" ایک بار پھر جنید نے اس کو تسلی دی۔

"بات یہ ہے کہ ...." ماہین کچھ نہیں کہہ سکی اور اس کی نظریں جنید کے کندھوں سے ہوتی ہوئیں اس کے عقب میں ٹھہر گئیں۔ اس کا چہرہ پریشان ہو گیا اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا گئے۔ جنید اس کا جائزہ لینے لگا اور بولا۔

"کیا ہوا.... ؟"

ماہین کی نظروں کے سامنے مہتاب احمد کھڑا تھا۔ جو اچانک اس ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں اُتر کر خارجی دروازے کی طرف جانے لگا تھا کہ اس کی نگاہ ماہین پر پڑ گئی اور وہ اسی جگہ رک گیا۔

مہتاب احمد آہستہ آہستہ چلتا ہوا ماہین کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک نظر بھی جنید کی طرف نہیں دیکھا اور بڑے پیار سے اس نے ماہین کا ہاتھ پکڑا اسے چوما اور شفیق لہجے میں بولا۔

"میری پیاری بیٹی ماہین بھی یہاں ہے؟ میری تو اچانک نظر پڑ گئی ورنہ میں چلا جاتا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اپنی گاڑی میں آئی ہو کہ ٹیکسی میں؟"

ماہین نے اپنے اندر کے خوف کو دباتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ٹیکسی میں آئی تھی۔"

"میں گھر ہی جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" مہتاب احمد کا لہجہ بہت ہی نرم اور پیار بھرا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ماہین کا ہاتھ چوما اور مسکرا کر خارجی دروازے کی طرف چلا گیا۔

مہتاب احمد نے جنید کو ایسے نظر انداز کیا تھا گویا وہ اس جگہ بیٹھا ہی نہیں ہے اور ماہین کے ساتھ ایسی شفقت سے پیش آیا تھا کہ اس جیسا شفیق باپ ہی نہیں ہے۔

ماہین خوف سے کھڑی ہو گئی۔ جنید بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ماہین کو حوصلہ دیا۔

"فکر نہیں کرو۔ ایک دن یہ حقیقت کھلنی ہی تھی۔"

"لیکن یہ حقیقت وقت سے پہلے کھل گئی ہے۔" ماہین کہہ کر جانے لگی تو جنید پھر بولا۔

"یہ بات اپنے دل میں رکھنا کہ حالات کیسے بھی ہوں، میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے لیکن پپا کا انداز بتاتا ہے کہ وہ طوفان سے پہلے کی خاموشی بنے ہوئے ہیں۔" ماہین کہہ کر تیزی سے خارجی دروازے کی طرف چلی گئی اور جنید وہاں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

وسیع لاؤنج کے خوبصورت صوفوں پر مہتاب احمد، بلقیس بیگم اور ماہین براجمان تھے۔ ماہین نے سر جھکایا ہوا تھا جبکہ بلقیس بیگم کے چہرے پر بھی پریشانی عیاں تھی۔ مہتاب احمد نے بڑے نرم لہجے میں جنید اور ماہین کی ملاقات کا تذکرہ دونوں کے سامنے کیا تھا اور اپنی بات ختم کرنے کے بعد اُس نے بڑے اطمینان سے دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ دونوں اپنی جگہ خاموش تھیں۔

"ماہین .... تم جنید کو کب سے جانتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ یہ ملاقاتوں کا سلسلہ کب سے جاری ہے؟" مہتاب احمد نے خاموشی توڑی۔

ماہین نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ "اُس وقت سے جب ہمارے گھر میں آپ کی سالگرہ کی تقریب ہوئی تھی۔"

"اوہ .... اس کا مطلب ہے کہ کافی وقت ہو گیا ہے۔" مہتاب احمد نے معنی خیز انداز میں اپنی گردن ہلائی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ وہ میری کمپنی کا ایک معمولی ملازم ہے؟"

"معمولی تو نہیں ہے۔ وہ آپ کے سیلز ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے اور اس کی اچھی سیلری ہے۔" ماہین بولی۔

"میرے کسی بھی ملازم کی کتنی بھی اچھی سیلری ہو، وہ ہے میرا ملازم ہی ہے۔ اچھی سیلری میں دیتا ہوں اور وہ میرا حکم ماننے کے پابند ہیں۔" مہتاب احمد کا لہجہ ابھی غصے کے زہر میں بجھا ہوا نہیں تھا۔

ماہین نے اپنے اندر ہمت جمع کی اور نتیجے کی پروا کیے بغیر کہا۔ "ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر بلقیس بیگم نے چونک کر ماہین کی طرف دیکھا جس نے ہمت ہی نہیں، جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے برعکس مہتاب احمد کے چہرے پر ماہین کی بات سن کر کوئی تاثر نہیں اُبھرا اور وہ بڑے اطمینان سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ماہین کا خیال تھا کہ اس کی بات سن کر وہ طوفان جو رکا ہوا ہے، یکدم برپا ہو جائے گا لیکن اسے حیرت ہوئی کہ مہتاب احمد نے اپنے اسی نرم اور شفیق لہجے میں کہا۔

"تم ابھی کم عمر ہو اور فیصلے کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح تمہاری ماں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کوئی اچھا فیصلہ کرنے کی ہمت اور عقل رکھتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم چند دن سوچنے میں لگا دو۔ خوب اچھی طرح سے سوچنے کے بعد پھر جب کسی نتیجے پر پہنچو تو مجھ سے بات کرنا۔" مہتاب احمد اپنی جگہ سے اٹھا اور جانے لگا تو ماہین نے ایک بار پھر ہمت سے کام لیا۔

"پپا.... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

مہتاب احمد رک گیا۔ اس نے ایک نظر ماہین کی طرف دیکھا اور پھر بلقیس بیگم سے مخاطب ہوا۔

"تم دیکھ رہی ہو کہ میں نے اپنا غصہ اپنے آپ پر غالب نہیں ہونے دیا۔ اس لیے ایک بار پھر نرمی سے کہتا ہوں کہ جنید کا خیال یہ اپنے دل اور دماغ سے نکال دے، میری آخری سانس تک ماہین کی یہ بے وقوفی پوری نہیں ہوگی۔" مہتاب احمد ایک بار پھر جانے کے لیے مڑا لیکن اس بار بلقیس بیگم اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"ماہین اگر جنید کو پسند کرتی ہے تو ہمیں ماہین کی پسند کا خیال کرنا چاہیے۔"

"تمہیں اس کی وکالت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کم عقل عورت۔" اس بار مہتاب احمد کا لہجہ بدل گیا اور وہ چیخا کہ گھر کے ملازموں کو بھی صاف سنائی دیا۔

"یہ وکالت نہیں ہے، ماہین کی زندگی کے فیصلے میں میری رضامندی ہے۔" بلقیس بیگم بولی۔

"تمہاری رضامندی کیا حیثیت رکھتی ہے۔" مہتاب احمد نے تمسخرانہ مسکراہٹ سے کہا اور اچانک مہتاب احمد کا فون بجا۔ اس نے ایک نظر فون کی اسکرین پر ڈال کر بلقیس بیگم اور ماہین کی طرف دیکھا اور پھر فون کان سے لگالیا۔

"زہے نصیب.... ! بڑے اچھے وقت پر فون کیا ہے....." مہتاب احمد کہتا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ فون کال سنتے ہوئے مہتاب احمد کا لہجہ پیار سے بھر گیا تھا۔

مہتاب احمد کے جاتے ہی ماہین بولی۔ "مما، جنید بہت اچھا لڑکا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"کیا آپ اس سے مل چکی ہیں۔"

"ابھی اس سے ملی تو نہیں ہوں۔"

"پھر آپ کیسے جانتی ہیں؟"

"جسے میری بیٹی پسند کرتی ہو، وہ اچھا کیوں نہیں ہوگا۔" بلقیس بیگم نے پیار سے اس کے گال کو چھوا۔ ماہین مسکرا دی۔

"لیکن پپا کو کون منائے گا؟"

"میں تمہاری زندگی کا فیصلہ تمہارے پپا کو نہیں کرنے دوں گی، چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔" بلقیس بیگم نے کہتے ہوئے ماہین کو گلے سے لگالیا اور بلقیس بیگم کا معنی خیز چہرہ ماہین دیکھ ہی نہیں سکی۔

رات ہو چکی تھی اور ماہین اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔ مہتاب احمد وہ فون سننے کے بعد اکیلا ہی گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔

بلقیس بیگم اپنے بستر پر لیٹ چکی تھی لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے دو، تین کروٹیں لیں اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کمرا روشن کیا اور دیوار پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

بلقیس بیگم اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلی اور فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈال کر اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ صاف عیاں تھا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے، یا پھر وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔

بلقیس بیگم نے پانی کا گلاس خالی کیا اور اسے ایک طرف رکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کچھ سوچ کر الماری کھولی اور اس کی اندرونی دراز کھولی تو اندر ایک ریوالور رکھا ہوا تھا۔

بلقیس بیگم نے ریوالور اُٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ ریوالور مہتاب احمد کا تھا۔ ریوالور خالی تھا۔

بلقیس بیگم نے دراز میں رکھی گولیاں اٹھائیں اور خالی چیمبر میں بھرنے لگی۔ گولیاں ڈالنے کے بعد اس نے ریوالور دروازے کی طرف تان لیا۔

بلقیس بیگم کا انداز ایسا تھا جیسے اس کے لیے گولی چلانا کوئی مسئلہ نہ ہو۔ کچھ دیر دروازے کا نشانہ لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر ریوالور خالی کیا اور اسی دراز میں رکھ کر الماری بند کردی۔

بلقیس بیگم نے کمرے کی لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے بلقیس بیگم کو نیند آنے لگی اور وہ یکدم نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔

ابھی بلقیس بیگم کچی نیند میں ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور مہتاب احمد داخل ہوا۔ اس نے نفرت آمیز نظروں سے بلقیس بیگم کی طرف دیکھا اور اپنا کوٹ اتار کر بلقیس بیگم پر پھینک دیا۔ یکدم بلقیس بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی کچی نیند ٹوٹ چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھیں اپنے سامنے مہتاب احمد کو کھڑا دیکھ سکتی تھیں۔

مہتاب احمد کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے بوٹ اتار کر کمرے میں ایک طرف پھینک دیا۔ پھر دوسرا بوٹ بھی اس نے اسی طرح پھینکا اور بے پروائی سے اپنی جرابیں اتار کر بلقیس بیگم کی طرف اچھال دیں۔

''جانتی ہو میں نے تجھے کیوں جگایا...؟''

''جانتی ہوں۔'' بلقیس بیگم نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا.... جانتی ہو؟ بتا کیوں جگایا میں نے تجھے؟'' اس کا جواب سن کر مہتاب احمد کو حیرت ہوئی۔

''آپ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ ایسا آپ نے آج پہلی بار نہیں کیا۔'' بلقیس بیگم نے کہا۔

مہتاب احمد ہنسا۔ ''لیکن آج میں نے کسی اور مقصد کے لیے جگایا ہے۔ تجھے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''کیا بتانا چاہتے ہیں؟''

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ میں شادی کرنے والا ہوں۔ شاید اگلے ہفتے میں شادی کرلوں۔''

''اب میں سو سکتی ہوں؟'' بلقیس بیگم نے اس کی بات سن کر اطمینان سے پوچھا۔

مہتاب احمد نے اسے گھور کر دیکھا جیسے اسے اس بات پر غصہ آگیا ہو کہ اس کی بات سن کر اس کی بیوی کے اندر تڑپ پیدا کیوں نہیں ہوئی۔

''میں سنجیدہ ہوں۔ بالکل سنجیدہ.... ایک خوبصورت اور جوان لڑکی سے شادی کررہا ہوں۔ ابھی اسی سے مل کر آرہا ہوں۔'' مہتاب احمد نے ایسے کہا جیسے وہ اسے چڑا رہا ہو لیکن اس کی اس بات کا بھی بلقیس بیگم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''مجھے پروا نہیں ہے کہ آپ دوسری شادی کریں، یا تیسری.... کیونکہ میری قسمت میں جو آپ کے ہاتھوں اذیت لکھی تھی، وہ مدت شاید میں پوری کرچکی ہوں۔'' بلقیس بیگم کہہ کر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ مہتاب احمد بیٹھا اس کے پُراسرار سے لہجے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے بولنے کا انداز اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔ پھر اس نے سر کو جھٹکا اور کمرے سے باہر نکل کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

☆☆☆

جنید کا خیال تھا کہ آج آفس میں اسے مہتاب احمد کی طرف سے سخت رویّے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن شام کو جب اس نے اپنا کام مکمل کیا اور آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد اپنی بائیک کی طرف بڑھا تو اس کے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ مہتاب احمد نے سارا دن اس کے ساتھ کسی طرح کا کوئی سخت رویّہ بھی نہیں رکھا تھا بلکہ کام کے دوران دو ملاقاتوں میں بھی مہتاب احمد کا لہجہ اس کے ساتھ نرم رہا تھا۔

جنید کے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مہتاب احمد نے ماہین کے ساتھ تعلق جاننے پر بھی کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا.... کیوں؟

اس نے بائیک پر بیٹھ کر ماہین کو فون کیا۔ رابطہ ہوا تو اس نے پوچھا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے پپا نے ہم دونوں کو دیکھ کر کیا ردِعمل ظاہر کیا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں بس مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ میں تمہارا خیال اپنے ذہن سے نکال دوں۔'' ماہین نے تفصیل بتانے کے بجائے محض لب لباب بتایا۔

''میرے لیے یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ انہوں نے سارا دن مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔'' جنید بولا۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' یہ سن کر ماہین کو بھی حیرت ہوئی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے مجھ سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے میری تذلیل ہوتی، جو ان کی عادت ہے بلکہ ان کا رویّہ میرے ساتھ بہت اچھا رہا۔''

''میں اپنے پپا کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔'' ماہین کی حیرت اور بھی دوچند ہوگئی۔

''بلکہ ان کے کچھ نہ کہنے پر میں پریشانی اور اذیت

میں آ گیا ہوں۔ اب تو دل یہ چاہتا ہے کہ وہ کچھ کہہ ہی دیتے تو ٹھیک تھا۔“

”شاید انہوں نے اس لیے کچھ نہ کہا ہو کیونکہ کل میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں جنید کو پسند کرتی ہوں۔“ ماہین بولی۔

”ہوسکتا ہے۔“ جنید نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

دوسرے دن آفس میں عجیب بات ہوگئی۔

مہتاب احمد نے فون کر کے اپنے آفس کے چپراسی کو ایک دن کی رخصت دے دی۔ اور جب مہتاب احمد آفس پہنچا تو چپراسی کا خالی اسٹول دیکھ کر استقبالیہ پر موجود لڑکی سے پوچھا۔

”چپراسی کہاں ہے؟“

”سر وہ آج آیا نہیں۔“ لڑکی نے بتایا۔

”اسے کیا ہو گیا ہے کہ وہ آیا نہیں ہے؟“

”سر اس نے اپنے نہ آنے کی کوئی اطلاع نہیں دی۔“ لڑکی مؤدب بولی۔

”تو اب اس کے نہ آنے سے جس کا دل چاہے گا منہ اٹھا کر اندر آجائے گا۔ یہاں کسی کو بٹھاؤ۔“ مہتاب احمد نے کہا۔

”سر.....“ لڑکی بھی سوالیہ انداز میں مہتاب احمد کا منہ دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ وہ اس جگہ کسے بٹھائے۔

مہتاب احمد آگے بڑھا اور پھر رک کر اس نے جنید کی طرف دیکھا اور چٹکی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اِدھر آؤ.....“

جنید کو بلانے کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور مہتاب احمد کے پاس چلا گیا۔ ”جی سر۔“

”آج چپراسی نہیں آیا۔۔۔ تم اس کی جگہ بیٹھ جاؤ اور آنے جانے پر نظر رکھو۔“ مہتاب احمد تحکمانہ انداز میں کہہ کر اپنے آفس کی طرف بڑھا تو جنید نے حیرت سے پوچھا۔

”میں بیٹھوں سر؟“

”ہاں میں نے تمہیں ہی کہا ہے۔“

”لیکن.....“ جنید نے کچھ کہنا چاہا۔

مہتاب احمد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن ویکن کچھ نہیں وہاں بیٹھ کر آج تم ڈیوٹی دو گے۔“

”میں اس آفس کا چپراسی نہیں ہوں سر۔ سیلز آفیسر ہوں۔“ جنید نے کہا۔

مہتاب احمد اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے حکم کو ماننے سے انکار کر رہے ہو؟“

”اس جگہ بیٹھنا میرا کام نہیں سر۔“

”جانتے ہو اس حکم عدولی کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟“

”شاید آپ مجھے نوکری سے نکال دیں۔“

”ہاں میرا حکم نہیں مانو گے تو..... میں تم کو نوکری سے نکال دوں گا۔“ مہتاب احمد غصے سے بولا۔ ہال میں موجود اپنی اپنی کرسی پر بیٹھا کمپنی کا عملہ بظاہر اپنا اپنا کام کر رہا تھا لیکن وہ چور نظروں سے دیکھ بھی رہے تھے اور ان کی توجہ بھی ان کی جانب تھی۔

”آپ شاید مجھے انتقام کا نشانہ بنا رہے ہیں؟“ جنید سمجھ گیا تھا کہ کل تک کی خاموشی اسی مقصد کے لیے تھی۔ ماہین نے ٹھیک کہا تھا کہ ان کی خاموشی طوفان کے آنے سے پہلے کی ہے۔

”میں ایسا کیوں کروں گا۔ بہرحال تم آج اس جگہ بیٹھ کر ڈیوٹی دو گے۔“

”میں اس جگہ نہیں بیٹھوں گا، میں نوکری چھوڑ دوں گا۔“

”تم تو جب چھوڑو گے چھوڑ گے ہی..... میں تمہیں ابھی اور اسی وقت نوکری سے نکالتا ہوں۔ اپنا حساب لو اور دفع ہو جاؤ۔“

”آپ میرا حساب کر دیں، میں چلا جاتا ہوں۔“ جنید بولا۔

”تمہیں اب اپنی کرسی پر یہاں کہیں اور بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب تک حساب نہیں ہوتا تم اس چپراسی کے اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرو گے۔“ مہتاب احمد دل ہی دل میں اس کی تذلیل کرتے ہوئے مسکرایا۔

”مجھے اس جگہ بیٹھ کر انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ جنید نے اپنی میز سے اپنا بیگ اُٹھا لیا۔

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ جنید کی تقریباً پورے مہینے کی سیلری بنتی تھی۔ اپنی سیلری چھوڑ کر وہ جا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ مہتاب احمد اُسے ماہین کے ساتھ تعلق کی سزا اس تذلیل کے ساتھ نوکری سے نکال کر دے رہا تھا۔

”بولو جانا چاہتے ہو یا اس اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنا چاہتے ہو کہ تمہارا حساب کتاب تیار ہو اور تمہیں میں چیک لکھ کر دوں۔“ مہتاب احمد مسکرایا۔ ”ویسے اس اسٹول پر بیٹھنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ کم از کم تمہیں اپنی اوقات یاد آجائے گی کہ تم کس جگہ کی مٹی ہو اور کیوں سنگِ مرمر کو چھونے کی کوشش کر رہے ہو۔“

جنید کی رگوں میں غصہ خون کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔

مہتاب احمد پھر بولا۔ ''گھر جاتے ہی اگر باپ پوچھے کہ تم اتنی جلدی کیوں آگئے ہو تو صاف کہہ دینا کہ تمہیں نوکری سے نکال دیا ہے۔ وجہ پوچھیں تو کہہ دینا کہ تم معمولی باپ کی اولاد ہو کر کچھ اونچا سوچنے لگے تھے۔ تمہارا باپ تمہاری بات سن کر سمجھائے گا کہ تمہاری اوقات کیا ہے اور یقیناً وہ تمہیں نصیحت کرے گا کہ آئندہ جہاں نوکری کرنا پہلے باپ اور پھر اپنی اوقات کو ضرور یاد رکھنا۔''

''آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔''

''اگر میں حد سے بڑھتا تو تمہیں ایسی باتیں کہتا کہ تم زمین میں دھنس جانا پسند کرتے۔''

''میں اپنے پیسے چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اپنے ان پیسوں کے عوض جس دن مجھے موقع ملا میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔'' جنید نے غصے سے کہا۔

اس سارے واقعے میں جسے سب سے زیادہ خوشی ہو رہی تھی، وہ مظہر تھا۔ مظہر کو جنید شروع سے ہی پسند نہیں تھا۔ وہ اس کا ماتحت تھا اور چاہتا تھا جنید کی جگہ وہ اس کی کرسی پر بیٹھے۔ اب جو یہ معاملہ چلا تو مظہر فوراً آگے بڑھا اور چاپلوسی کے انداز میں بولا۔

''سر میں بھی آپ کا ملازم ہوں۔ آپ مجھے حکم کریں میں چپراسی کی جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔''

مہتاب احمد نے یکدم گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ''ہاں یہ ہوئی نا بات..... کیوں نہ میں تمہیں اس کی جگہ بٹھادوں۔ جاؤ اور جنید کی کرسی پر بیٹھ جاؤ آج سے تم اس کرسی پر بیٹھ کر اس کی جگہ کام کرو گے۔'' مظہر خوشی سے جنید کی چھوڑی ہوئی کرسی کی طرف بڑھا اور سینہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

جنید جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا تو مہتاب احمد کی عقب سے آواز آئی۔ ''اور جس دن تم مجھے دکھائی دیے اس دن تمہیں اپاہج بنا کر کسی چوراہے پر بٹھا دوں گا۔''

جنید رک کر پلٹا اور غصے سے بولا۔ ''شاید اس دن کے آنے سے پہلے میں آپ کو اس قابل ہی نہ چھوڑوں۔''

جنید تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ وہ لفٹ کے بجائے سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے جارہا تھا۔ اپنی بائیک کے پاس پہنچ کر اس نے لمبے لمبے سانس لیے اور پھر اپنا موبائل فون نکال کر ماہین کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر کے بعد رابطہ ہوا تو جنید بولا۔

''ماہین ... !''

''ماہین کا باپ بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف اچانک مہتاب احمد کی آواز آئی۔ ''میں ماہین کا فون اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور اسے فون کرو گے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا ورنہ زبان نکال کر پھینک دوں گا کہ تم بولنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔''

مہتاب احمد نے فون بند کردیا اور جنید اسی جگہ کھڑا پیچ وتاب کھانے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اوپر جائے اور مہتاب احمد کے سینے میں گولیاں اتار دے۔

☆☆☆

اُسی رات تقریباً ڈیڑھ بجے جب ابھی تھوڑی دیر پہلے مہتاب احمد اپنی کار میں اپنے گھر آیا تھا، اچانک گیٹ پر دستک ہونے لگی۔ چوکیدار نے آواز سنی اور اپنی بندوق کو سنبھالتے ہوئے گیٹ میں لگی چھوٹی سی کھڑکی کھولی۔ چوکیدار چونکا، باہر مہتاب احمد کا ڈرائیور نثار کھڑا تھا۔

''نثار تم ..... اس وقت؟'' چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی پوچھا اور پھر مڑ کر عقب میں دیکھا کہ کہیں مہتاب احمد تو

نہیں کھڑا ہے۔
"تھوڑی دیر کے لیے گیٹ تو کھولو۔" نثار نے کہا۔
"نہیں، میں گیٹ نہیں کھول سکتا۔ تم جانتے ہو کہ مہتاب صاحب نے منع کیا ہے۔"
"تم میرے دوست بھی ہو اور میرے شہر کے بھی ہو۔ ایک ضروری کام ہے۔ تم گیٹ کھول کر مجھے اندر آنے دو۔"
"تم مجھے بتاؤ، کیا ضروری کام ہے؟"
"میں اس وقت بہت غمزدہ ہوں۔ میری بیوی دو دن پہلے مر گئی ہے۔ وہ اسپتال میں تھی۔ تمہارے سیٹھ نے مجھے نوکری سے نکال دیا جبکہ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔"
"بہت افسوس ہوا۔" چوکیدار نے تاسف سے کہا۔
"میرا سینہ چیر کر دیکھو، میں غم سے کس قدر نڈھال ہوں۔" نثار کے لہجے سے اس کے اندر کا غم عیاں تھا۔
"میں اس کا اندازہ کرسکتا ہوں۔"
"سچ بتانا یہ ظلم نہیں ہے کہ میری بیوی اسپتال میں ہے اور میں اس کے لیے خون کا انتظام کر رہا ہوں اور سیٹھ کا فون آجائے کہ فوراً آفس پہنچو۔ دیر ہوجائے تو ذلیل کر کے نوکری سے ہی نکال دیا جائے۔" نثار کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔
چوکیدار نے ایک نظر پھر اپنے عقب میں دیکھا اور بولا۔ "کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"
"مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور میری اس غلطی پر مجھے نوکری سے ہی نکال دیا۔ میری بیوی، میرے بچوں کی ماں مر گئی۔"
"اچھا.... بہت افسوس ہوا۔ لیکن تم اب جاؤ میں کسی دن تمہارے پاس آؤں گا۔" چوکیدار چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ مہتاب احمد اسے اس طرح گیٹ کے ساتھ لگا دیکھے، نثار یہاں سے چلا جائے۔
"ایک اور بات کا جواب دو۔"
"ہاں پوچھو۔" چوکیدار کا وہ دوست بھی تھا اور دونوں کا تعلق ایک شہر سے بھی تھا اس لیے وہ بے مروتی سے وہ چھوٹی سی کھڑکی بند نہیں کرسکتا تھا۔
"ایسا ظالم شخص جینے کے قابل ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔
"ہم مل بیٹھ کر بات کریں گے۔" چوکیدار نے ٹالنا چاہا۔
"نہیں، مجھے بتاؤ کہ ایسے شخص کو جینے کا حق ہے؟"
نثار اس سوال کا جواب جاننا چاہتا تھا۔
"تم اب جاؤ میں کسی دن تمہارے گھر آؤں گا۔" چوکیدار نے پھر ٹالا۔
"اگر تم میرا ساتھ دو اور مجھے اندر آنے دو تو میں تمہارے سیٹھ کا ابھی خون کر دوں۔ دیکھو میرے پاس پستول بھی ہے۔ مجھے اندر آنے دو۔ میں اسے مار دینا چاہتا ہوں۔" نثار کے دکھی لہجے میں سفاکی نے سر اٹھایا۔
چوکیدار خوفزدہ ہوگیا۔ "تم اس وقت بہت غمزدہ ہو اس لیے بہتر ہے کہ تم گھر جاؤ۔ ہم پھر بات کریں گے۔"
"میں جانتا ہوں کہ تم میری بات نہیں مانو گے لیکن میں اسے جان سے مار کر ہی دم لوں گا۔ اس کی لاش کو باہر سڑک پر پھینک دوں گا۔" نثار نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ کوئی آرہا ہے۔" چوکیدار نے بہانہ کیا اور وہ چھوٹی سی کھڑکی بند کر دی۔ چوکیدار ایک بہادر آدمی تھا لیکن نثار کی بات سن کر وہ خوفزدہ سا ہوگیا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور اپنے کیبن میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ مسلسل دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں نثار باؤنڈری وال پھلانگ کر نہ آجائے۔ اس رات وہ سویا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر وہ تینوں ہی بیٹھے تھے۔ مہتاب احمد اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے اچانک اخبار ایک طرف رکھا اور پاس پڑا دوسرا اخبار دیکھا اور پھر اس نے متلاشی نگاہیں دائیں بائیں گھما کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "آج پھر وہ دو اخبار دے گیا ہے....." مہتاب احمد نے جوس کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور بولا۔
"کل میرا چپراسی نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کی جگہ اپنے ملازم جنید کو بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا اور نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔" مہتاب احمد کہہ کر ماہین کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ماہین یہ سن کر چونکی۔ کل سے اس کا جنید سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ مہتاب احمد نے گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں رہنے دی تھی جس سے اس چار دیواری سے باہر رابطہ کیا جاسکے۔
"میں کمپنی کا مالک ہوں۔ وہاں کام کرنے والے سب میرے نوکر ہیں۔ میں کسی کو کوئی بھی کام کرنے کو کہہ سکتا ہوں۔" مہتاب احمد کے لہجے میں غرور تھا۔
"کل آپ نے ایسا کیا تھا؟" بلقیس بیگم نے پوچھا۔
"ہاں میں نے ایسا ہی کیا تھا۔" مہتاب احمد نے یہ

کہہ کر ایک بار پھر خوب صورت گلاس سے جوس کا ایک گھونٹ بھرا۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" بلقیس بیگم متانت سے بولی۔

"تمہیں میرے معاملے میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کچن کا کام نہیں کرسکتیں میرے بزنس کے معاملے میں بولتے ہوئے مجھے کہہ رہی ہو کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مہتاب احمد نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹ دیا۔

"وہ ہماری بیٹی کی پسند ہے۔" بلقیس بیگم بولی۔

"ماہین کسی بھی ایرے غیرے کو پسند کرلے گی تو کیا ہم اس کی پسند کے آگے سر جھکا دیں گے؟ جنید میرا ملازم ہے۔ وہ میرا داماد نہیں بن سکتا۔ فی الحال یہ کالج نہیں جائے گی۔ اور تب تک یہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گی جب تک میں نہیں چاہوں گا۔" مہتاب احمد نے غصے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ہماری زندگی کی یہ اذیت کی رات جانے کب گزرے گی؟" بلقیس بیگم نے دھیرے لہجے میں کہا۔

"جب تم مرجاؤ گی۔" مہتاب احمد اطمینان سے بولا۔ بلقیس بیگم تکٹکی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اس کے دل پر جانے کیا گزر رہی تھی لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ جبکہ ماہین حیرت کی تصویر بنی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد مہتاب احمد نے چوکیدار کو حکم دیا تھا کہ اس گھر سے کوئی باہر اور باہر سے کوئی اندر نہ آئے، حکم عدولی کی صورت میں اسے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

مہتاب احمد دفتر چلا گیا تھا اور دونوں ماں بیٹی بڑے سے گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ ماہین سوچ رہی تھی کہ جنید کو جس طرح سے تذلیل کرکے نوکری سے نکالا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ اب تو وہ خود اس کے ساتھ بات اور سامنا کرنے سے ڈرنے لگی تھی۔ اُسے یہ سوچ سوچ کر ندامت ہورہی تھی۔

بلقیس بیگم کے چہرے پر پوری زندگی ایسی سنجیدگی نہیں آئی تھی جیسی اس وقت اس کے چہرے پر طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر کسی طوفان سے لڑ رہی ہو۔ وہ ٹیرس پر ٹہلتی رہی پھر نیچے آگئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بلقیس بیگم نے ٹیلی وژن آن کردیا۔ کوئی فلم آرہی تھی اور ایک عورت کسی کو فون کرکے کہہ رہی تھی۔

"مجھے ایک خون کروانا ہے۔ اس طرح کام ہوجائے کہ کوئی ثبوت نہ ملے۔"

فون سے دوسری طرف سے مردانہ اور پُراسرار سی آواز آئی۔ "ہم پیسے لے کر کوئی بھی کام کرسکتے ہیں۔ جیسا آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

اچانک بلقیس بیگم نے ٹی وی بند کردیا اور سوچنے لگی اور پھر اس نے دراز سے ایک کاپی نکالی اور کوئی نمبر تلاش کرنے لگی۔ پھر اس نے ایک نمبر پر انگلی رکھی، کچھ سوچا اور کاپی پھر دراز میں رکھ دی۔

وہ بے چین ہوگئی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں کھڑی سوچتی رہی اور پھر اس نے الماری کھولی اور دراز میں سے ریوالور نکال کر اس کو گولیوں سے بھرا اور الماری بند کرنے کے بعد کمرے میں متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بلقیس بیگم کچھ سوچنے کے بعد اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھی اور ریوالور اس کی دراز میں رکھ دیا۔ کچھ دیر وہ اسی جگہ براجمان رہی پھر وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

جنید نے نوکری چھوڑ دی تھی لیکن اس کا دل غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی ایک وجہ وہ تذلیل تھی جو مہتاب احمد نے اس کی کی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مہتاب احمد نے اس کی سیلری بھی نہیں دی تھی اور وہ سیلری لینے کے لیے آفس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان دونوں چیزوں کا غم اس کے اندر آگ بھڑکا رہا تھا۔

جنید مضطرب تھا اور اس کی سوچ کا محور اس وقت مہتاب احمد تھا۔ اس نے ماہین سے دوبارہ رابطہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ مہتاب احمد اس کا موبائل فون اپنے پاس لیے پھر رہا تھا۔

اسی کشمکش میں جنید گھر سے باہر نکل کر چلتے چلتے گھر سے کچھ دور نکل آیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سامنے ایک گراؤنڈ ہے اور وہاں کرکٹ میچ ہورہا ہے۔ جنید کچھ دیر خالی نظروں سے ان لڑکوں کو کھیلتا ہوا دیکھتا رہا۔ لیکن اس کے اندر کا اُبال کسی صورت بھی کم نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں اضافہ ہوگیا تھا۔

پھر جانے کیا ہوا کہ جنید کا جسم جوش سے بھر گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ مہتاب احمد سے بدلہ لے کر رہے گا۔ چاہے اسے اس کا خون کرکے جیل ہی کیوں نا جانا پڑے۔ یہ خیال طوفانی انداز میں اس کے اندر پیدا ہوا تھا اور اس خیال نے جنید کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ کچھ

بھی ہو وہ مہتاب احمد کو جان سے مار دے گا۔
گراؤنڈ کی اس طرف جنید کھڑا یہ سوچ رہا تھا تو دوسری طرف غم میں ڈوبا اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ نثار کھڑا تھا جو اس اضطراب میں تھا کہ اسے کب مہتاب احمد ملتا ہے اور کب وہ اس کو موت کی نیند سلاتا ہے۔ نثار کو اپنی بیوی کا غم بے چین کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی بادلوں نے آسمان کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ ہوائیں چلنے لگی تھیں اور بارش کی آمد آمد تھی۔
رات نو بجے جب مہتاب احمد اپنے آفس سے باہر نکلا تو بارش کے چند قطرے زمین پر گرنا شروع ہو گئے۔ مہتاب احمد نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا تو اس کے موبائل فون پر پیغام آنے کی ٹون نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنا قیمتی موبائل فون نکال کر پیغام پڑھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمایاں ہو گئی اور چہرے کی سرخی بڑھ گئی۔
اس نے ایک مختصر سا پیغام جواب میں بھیجا اور اپنی کار میں بیٹھ کر خود ہی کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔
مہتاب احمد ابھی راستے میں ہی تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ مہتاب احمد کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا اور وہ مناسب رفتار سے کار چلا رہا تھا۔
اس کی کار اپنی سوسائٹی میں داخل ہوئی تو بارش بدستور موسلا دھار ہو رہی تھی۔ مہتاب احمد کے گھر سے دو گز کے فاصلے پر اچانک اسے ایک شخص سڑک کنارے کھڑا دکھائی دیا۔ اس وقت اس سڑک پر... مہتاب احمد کی کار اور اس شخص کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔
سڑک کنارے کھڑا شخص واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے برساتی پہنی ہوئی تھی اور اس کے کالر کھڑے تھے۔ مہتاب احمد اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تیز بارش اور اندھیرے میں اس کا چہرہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔
سڑک کنارے کھڑے شخص نے کار روکنے کا اشارہ کیا۔ مہتاب احمد کی کار کی رفتار پہلے ہی بہت آہستہ تھی اس لیے وہ کار اس شخص کے قریب لے گیا۔ اس شخص کا چہرہ واضح ہو گیا تھا۔ مہتاب احمد کو حیرت ہوئی کہ وہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے۔ اس نے اس کے سامنے کار روکتے ہی اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا تو وہ شخص اس کی طرف جھکا۔
''تم....'' مہتاب احمد کے منہ سے بس یہ ہی نکل سکا اور اس شخص نے یکدم اپنا ہاتھ نکالا جس میں ایک ریوالور تھا اور بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اس نے یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیے۔ دونوں فائر مہتاب احمد کے سینے پر لگے۔ تیز بارش کی وجہ سے گولیوں کی آواز بہت حد تک دب گئی تھی۔ مہتاب احمد کا سینہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ ایک طرف ڈھلک کر بے جان ہو گیا۔
اس شخص نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور ایک جیب سے اس کا موبائل فون نکال کر تیزی سے ایک طرف چلنے لگا اور پھر دوڑتے ہوئے وہ گلی کے بائیں جانب مڑ گیا۔
جس جگہ مہتاب احمد کی کار کھڑی تھی وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی کے اندر موجود چوکیدار نے اچانک اس وقت گیٹ کی چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکا تھا جب وہ شخص مہتاب احمد کی جیب سے موبائل فون نکال کر ایک طرف چل پڑا تھا۔ اس وقت ... چوکیدار کو اس شخص کے ہاتھ میں ریوالور بھی دکھائی دیا تھا اور گولی کی جو آواز اس کی سماعت تک پہنچی تھی، اس سے اسے لگا تھا کہ اس جگہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔
چوکیدار نے فوراً اپنے مالک کو اطلاع کر دی۔

☆☆☆

اس جگہ پولیس پہنچ گئی تھی۔ بارش بوندا باندی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ارد گرد کے گھروں سے بھی لوگ باہر نکل کر آ چکے تھے۔ اس جگہ رہنے والوں نے مہتاب احمد کو پہچان لیا تھا۔
پولیس اس دوران میں جائے وقوعہ کا اچھی طرح سے معائنہ کر چکی تھی۔ عینی شاہد تو کوئی نہیں تھا البتہ اس چوکیدار نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس نے بتا دیا تھا۔
''مہتاب احمد۔'' چوکیدار نے جب مہتاب احمد کی شکل دیکھ کر اس کا نام بتایا تو انسپکٹر جانباز خان نے وہ نام زیرِ لب دہرایا۔
انسپکٹر جانباز خان پینتیس سال کا دراز قد اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور بڑی ہی مشکل سے اس کی ترقی ہوئی تھی۔ دراصل اس نے اب تک جو بھی کیس حل کیے، اس کے بڑے افسروں نے وہ حل شدہ کیس اپنے نام کر کے اسے پس پشت ڈال دیا تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ ایک ایماندار آفسر آ گیا۔ ان ہی دنوں جانباز خان نے ایک کیس حل کیا اور ایک طرف ہو کے بیٹھ گیا کہ اس کیس کا بھی سہرا اس کا آفسر اپنے سر پر سجا لے گا لیکن اس کی سوچ کے برعکس اس آفسر نے بہ بانگ دہل کہا کہ اس کی کامیابی کا سہرا جانباز خان کے سر جاتا ہے اور یوں جانباز خان انسپکٹر بن گیا۔

جانباز خان کی طبیعت بڑی عجیب تھی۔ اس کا پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ سنجیدہ کب ہو جاتا ہے اور کب اس کی حس مزاح پھڑک اُٹھتی ہے۔ اور یہ بھی ایک معما ہی رہتا تھا کہ اس کی حس مزاح میں کتنی سنجیدگی پوشیدہ ہے۔ انتہائی نازک حالات میں بھی جانباز خان کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکل جاتا تھا کہ سننے والا مسکرا اُٹھتا تھا۔ سونے پہ سہاگا اس کا اسسٹنٹ نصیرالدین بھی اس سے ملتی جلتی طبیعت کا مالک تھا۔ دراصل دونوں پرانے دوست ایک ہی کالج میں پڑھے تھے۔ ڈیوٹی کے دوران وہ انسپکٹر جانباز خان کو 'سرجی' کہتا تھا اور ڈیوٹی کے بعد وہ بھول جاتا تھا کہ انسپکٹر جانباز خان کون ہے۔

انسپکٹر جانباز نے لاش کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ اس کی تیز نظروں نے لاش کے آس پاس کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے گھر پر بھی اطلاع کردی گئی تھی۔

ملازم نے بلقیس بیگم کے کمرے کا دروازہ ہولے سے بجایا۔ کچھ دیر بعد بلقیس بیگم کی آواز آئی۔ "آجاؤ۔" ملازم نے دروازہ کھولا تو سامنے بلقیس بیگم آرام کرسی پر براجمان آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔

"بیگم صاحبہ... باہر پولیس والا آیا ہے۔" ملازم گھبرایا ہوا تھا۔

"پولیس والا...؟" بلقیس بیگم نے چونک کر پوچھا اور اس کی جھولتی ہوئی کرسی رک گئی۔ "کیوں آیا ہے؟"

"بیگم صاحبہ... گھر سے کچھ فاصلے پر صاحب جی کو..." ملازم کہتا کہتا رک گیا۔

"کیا ہوا صاحب جی کو؟" بلقیس بیگم کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"انہیں کسی نے گولی ماردی ہے۔" ملازم نے بتایا۔

ایک لمحے کے لیے بلقیس بیگم سکتے کے عالم میں آگئی۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نہیں نکلا اور پھر یکدم وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ تیزی سے گھر سے باہر نکلی تو کچھ دور لوگ جمع تھے اور وہاں پولیس بھی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش مکمل تھم گئی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی۔

بلقیس بیگم تیز تیز قدم اُٹھاتی وہاں تک پہنچی اس نے بھیڑ میں سے راستہ بنا کر دیکھا تو مہتاب احمد کی لاش اسٹریچر پر رکھی تھی اور پوسٹ مارٹم کے لیے ایمبولینس لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

مہتاب احمد کے جسم پر جو سفید چادر ڈالی تھی وہ بھی خون آلود ہوگئی تھی۔ بلقیس بیگم نے ایک نظر مہتاب احمد کی طرف دیکھا اور سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کس نے کیا ہے یہ... کس نے مارا ہے مہتاب احمد کو...؟"

انسپکٹر جانباز نے پہلے تو بلقیس بیگم کا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ کر بولا۔ "میرا نام انسپکٹر جانباز ہے..."

"یہ میرے شوہر تھے۔ کس نے کیا ہے یہ؟" بلقیس بیگم کی آواز میں کرب آگیا اور آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا۔

"ابھی تو یہ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جارہی ہے۔ ان کا قتل کس نے کیا اور کیسے ہوا، اس کے لیے مجھے آپ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔"

بلقیس بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ مہتاب احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ جبکہ انسپکٹر جانباز مسلسل بلقیس بیگم کا جائزہ لے رہا تھا۔

☆☆☆

گھر کے ہر فرد کا چہرہ افسردہ تھا یا پھر انہوں نے اپنے چہروں پر افسردگی طاری کرلی تھی۔ سمجھنا مشکل تھا۔ بلقیس بیگم اور ماہین نے جتنا رونا تھا وہ آنسو بہا چکی تھیں اور اب ان کے چہروں پر متانت، افسردگی اور اُداسی تھی۔

انسپکٹر جانباز خان کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ ایک کال سن کر فون بند کرتا تھا تو دوسری کال آجاتی۔ یہ ساری کالز اس کے افسران اور شہر کے بڑے کاروباری لوگوں کی تھیں جو اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ مہتاب احمد کے قاتل کو چوبیس گھنٹوں میں گرفتار کر کے پیش کرو۔

انسپکٹر جانباز فون سن سن کر اُکتا گیا تھا۔ اس نے نصیرالدین سے کہا۔ "دل چاہتا ہے کہ میں اپنا موبائل فون کہیں پھینک دوں۔"

"سر آپ موبائل فون میری جیب میں پھینک دیں۔" نصیرالدین نے بھی سرگوشی کی۔

"میں نے کہا تھا کہ اسے گندے نالے میں پھینک دوں۔ تمہاری جیب گندا نالا ہے۔"

"سر آپ نے گندے نالے کا نام بھی نہیں لیا تھا۔"

"میں کچھ باتیں اپنے دل میں کہتا ہوں۔" انسپکٹر جانباز نے کہہ کر گھر کا جائزہ لیا اور بولا۔ "گھر بڑا بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔"

"سر مرنے والا بڑا بزنس مین تھا؟"

''تم نے یہ مجھے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔'' انسپکٹر جانباز نے پھر سرگوشی کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ملازم سے کہا تھا کہ وہ مہتاب احمد کی بیوہ اور اس کی اولاد سے ملنا چاہتا ہے۔ ملازم نے بتایا تھا کہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے۔ چنانچہ جانباز خان نے کہا وہ ان دونوں سے ملنا چاہتا ہے۔

ملازم نے آکر بتایا۔ ''جی وہ کچھ دیر میں آتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' انسپکٹر جانباز نے کہا اور جیسے ہی ملازم جانے لگا تو انسپکٹر جانباز نے اسے روک لیا۔ ''تم کب سے یہاں ملازم ہو؟''

''جی مجھے دو سال ہو گئے ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''اس گھر میں کیا کام کرتے ہو۔'' انسپکٹر جانباز نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''جی میں اور میری بیوی اس گھر کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''اچھا تمہاری بیوی بھی ہے۔'' انسپکٹر جانباز کے منہ سے برجستہ نکلا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''جی وہ بیگم صاحبہ کے پاس ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ گھر کا ماحول کیسا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ سب ہنسی خوشی اور اتفاق سے رہتے تھے ناں۔''

''جی ہاں بس صاحب جی ذرا غصے کے تیز تھے.....'' ملازم شاید یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے جملہ ادا ہو گیا اور پھر جیسے اسے احساس ہوا کہ وہ پولیس کے سامنے کھڑا ہے اس لیے اسے سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے۔

اسی اثنا میں بلقیس بیگم، ماہین اور ملازمہ لاؤنج میں آ گئے۔ بلقیس بیگم صوفے پر بیٹھ گئی، اس کے ساتھ ہی ماہین بھی براجمان ہو گئی جبکہ ملازمہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ دونوں ماں بیٹی کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔

''مجھے بہت افسوس ہے کہ مہتاب احمد کو کسی نے قتل کر دیا اور آپ کو اس غم سے گزرنا پڑ رہا ہے لیکن آپ یقین کریں کہ میں قاتل کو جلد گرفتار کر لوں گا۔ بس مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' انسپکٹر جانباز بھی اُن کے قریب بیٹھ گیا جبکہ نصیرالدین بیان لکھنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

''ہم آپ کے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔'' بلقیس بیگم نے غمزدہ لہجے میں جواب دیا۔

''بہت شکریہ..... کیا آپ مجھے یہ بتا سکتی ہیں کہ ان کی کوئی دشمنی تھی کسی سے؟'' انسپکٹر جانباز نے پوچھا۔

''خاندان میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی بزنس کے لین دین کے حوالے سے میں کچھ نہیں جانتی۔'' بلقیس بیگم نے جواب دیا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ اس وقت غم سے نڈھال ہیں اور بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فی الحال میں اس کیس کی تفتیش اپنے انداز سے شروع کرتا ہوں، آپ سے میں بعد میں ملاقات کروں گا۔'' انسپکٹر جانباز نے جان بوجھ کر یہ بات کہی تھی تاکہ وہ یہ اندازہ کر سکے کہ بلقیس بیگم واقعی ذہنی طور پر اس کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار ہے کہ نہیں۔

بلقیس بیگم بولی۔ ''آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں..... میں بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''آپ ایک باہمت خاتون ہیں۔ کیا یہ سچ ہے کہ مہتاب احمد ایک سخت مزاج انسان تھے؟'' انسپکٹر جانباز نے بات کا آغاز اس بات سے کیا جو ابھی اس کی آمد سے قبل ملازم نے بتائی تھی۔ جب انسپکٹر جانباز نے یہ سوال کیا تھا تو ملازم ہچکچا کر دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا تھا شاید وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس نے خوامخواہ یہ بات کہہ دی۔

''جی ہاں۔'' بلقیس بیگم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ان کی سخت مزاجی ملازموں تک ہی محدود تھی کہ آپ ماں بیٹی بھی ان کی زد میں تھیں۔''

''میرے ساتھ ان کا رویہ وہی تھا جو ایک شوہر کا بیوی کے ساتھ ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنی بیٹی ماہین سے بہت پیار کرتے تھے۔''

''کوئی ایسی بات بتانا چاہیں گی جو آپ نے غیر معمولی طور پر محسوس کی ہو۔ مثلاً ان کے رویے میں تبدیلی، چڑچڑاپن، کوئی ایسی پریشانی جس کی وجہ سے وہ گم صم رہنے لگے ہوں؟'' انسپکٹر جانباز خان کا سوال بیچ میں ہی رہ گیا کیونکہ اس وقت ان کے کچھ عزیز رشتے دار آ گئے اور انسپکٹر جانباز کو فی الحال اپنی تفتیش چھوڑ کر باہر آنا پڑا۔

''کیا بات ہے سر آپ باہر آ گئے؟'' باہر آتے ہی نصیرالدین نے پوچھا۔

''تو کیا اُن کے ساتھ اندر بیٹھا رہتا۔''

''ان ہی باتوں سے آپ مار کھاتے ہیں۔''

''کن باتوں سے؟''

''یہ جو آپ تفتیش کی رفتار بڑی مدھم رکھتے ہیں۔ آپ ایک پولیس والے ہیں۔ آپ سارے رشتے داروں کو ایک طرف بٹھا کر اپنے سوال جواب جاری رکھتے۔

نصیرالدین نے گویا ایسے بتایا جیسے وہ انسپکٹر جانباز خان کی کلاس لے رہا ہو۔

''جو موٹی موٹی باتیں مجھے پوچھنی تھیں وہ میں نے پوچھ لی ہیں، کچھ باتوں کا میں نے اندازہ لگالیا ہے اور باقی باتیں میں اطمینان سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ویسے مجھے لگتا ہے کہ یہ قتل کسی ڈاکو نے کیا ہے۔''

''نصیرالدین تم اپنی ننھی سی عقل پر اتنا بوجھ نہ ڈالا کرو۔'' انسپکٹر جانباز چلتا ہوا چوکیدار کے پاس پہنچ گیا تھا۔ چوکیدار یکدم سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جانباز خان نے اس کے پاس جاتے ہی کہا۔

''ہاں بھئی کون تھا جو انہیں قتل کی دھمکیاں دے رہا تھا؟''

انسپکٹر جانباز خان کا سوال سنتے ہی چوکیدار گڑبڑا گیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوچنے لگا کہ ان کو کیسے پتا چلا کہ مہتاب احمد کو مارنے کی بات نثار نے کی تھی۔

''تم مجھے بتا نہیں رہے؟'' انسپکٹر جانباز خان نے پھر پوچھا۔

''جی وہ نثار آیا تھا وہ کہہ رہا تھا.....'' چوکیدار نے یکدم انکشاف کر دیا۔ انسپکٹر جانباز خان نے تو چلتے چلتے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو اس کی عادت تھی۔ ایسے تیر کئی بار نشانے پر لگے تھے، اس بار بھی ایسا ہی ہو گیا تھا اور نصیرالدین بھی اس نشانے پر چونک گیا تھا۔

''نثار کون؟'' انسپکٹر جانباز خان نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نثار..... صاحب جی کا ڈرائیور تھا۔''

''اب مجھے ساری بات تفصیل سے بتاؤ، یاد رکھنا اگر تم نے کچھ چھپایا اور وہ بات بعد میں سامنے آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔'' انسپکٹر جانباز نے کہا تو چوکیدار نے ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔ انسپکٹر جانباز خان اور نصیرالدین بڑے غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔ نصیرالدین اس کا سارا بیان لکھ بھی رہا تھا۔ جب اس نے سب کچھ بتا دیا تو انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔

''اس کے گھر کا پتا بتاؤ۔'' اس کے جواب میں چوکیدار نے اس کا پتا بھی دیا۔ انسپکٹر جانباز خان نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور پھر بولا۔

''مہتاب احمد کا اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟''

چوکیدار نے ایک لمحے کے لیے دائیں جانب دیکھا اور پھر بولا۔ ''جی ان کا رویہ بیگم صاحبہ کے ساتھ کافی سخت تھا۔ آج صبح انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ بیگم صاحبہ اور چھوٹی بی بی کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر جنید گھر میں آنا چاہے تو اسے اندر جانے نہ دیا جائے اور فوراً انہیں اطلاع دی جائے۔''

''جنید کون ہے؟'' انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔

''جی وہ ان کی کمپنی میں کام کرتے ہیں؟'' چوکیدار نے بتایا۔

''جنید کا گھر میں آنا جانا تھا؟''

''بس ایک بار وہ ایک تقریب میں آئے تھے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''کوئی چھ، سات ماہ پہلے کی بات ہے۔''

''پھر اس کا گھر میں داخلہ کیوں بند ہوا...؟''

انسپکٹر جانباز خان ایک ذہین شخص تھا، وہ سمجھ تو گیا تھا کہ بیٹی کو گھر سے باہر نہ جانے کی اور جنید کو گھر میں داخل نہ ہونے کی اجازت کے پیچھے محبت کا کھیل لگتا ہے، پھر بھی اس نے پوچھا۔

چوکیدار نے کچھ توقف کے بعد بتانا شروع کیا۔ ''اس گھر میں تین اخبار آتے ہیں۔ اخبار والا دو اخبار دے گیا تھا اور ایک اخبار کا کہہ رہا تھا کہ وہ لیٹ ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ تیسرا اخبار بھی دے گیا۔ جو میں اندر دینے جارہا تھا کہ ناشتے کے وقت میں نے سنا کہ مہتاب احمد غصے سے کہہ رہے تھے..... چھوٹی بی بی اور جنید صاحب..... بس مجھے سمجھ نہیں آئی اور میں صاحب جی کا غصہ دیکھ کر ہی واپس پلٹ آیا تھا۔'' چوکیدار کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

انسپکٹر جانباز خان کے لیے اتنا جاننا ہی کافی تھا۔ مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے انسپکٹر جانباز خان نے... فی الحال وہاں سے جانا ہی بہتر سمجھا کیونکہ اسے کیس کے تعاقب میں جانے کے لیے بہت کچھ مل گیا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر جانباز خان نے سب سے پہلے چوکیدار کے بتائے ہوئے پتے پر دو سادہ لباس پولیس والے بھیجے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ نثار کے گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ وہ گھر اس نے کرائے پر لیا تھا۔ وہ دو دن قبل وہ گھر خالی کر کے کہیں چلا گیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

انسپکٹر جانباز خان بڑبڑایا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ

ایسے لوگ بھاگ کیوں جاتے ہیں جو ایسے کیس کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔''
نصیر الدین پاس ہی بیٹھا تھا، وہ فوراً بولا۔ ''تو کیا سر جی وہ انتظار کیا کریں کہ پولیس والے آئیں اور ان سے سوال جواب کریں اگر وہ قصور وار ہیں تو آرام سے پکڑ کر لے جائیں؟''
''پھر بھی ان کو خیال کرنا چاہیے کہ ہم بھی بیوی بچوں والے ہیں ہمیں بھی کام ختم کر کے گھر جانا ہوتا ہے۔ انہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔''
''سر جی آپ کی تو شادی ہی نہیں ہوئی۔''
''اگر میں کنوارا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے پولیس والے ہی کنوارے ہوتے ہیں۔ میں نے تم سب کی نمائندگی کی ہے۔'' انسپکٹر جانباز خان بولا۔
''سر جی میں بھی کنوارا ہی ہوں۔'' نصیر الدین کا منہ لٹک گیا۔
''تمہاری تو مجھے سمجھ آتی ہے کہ تم کیوں کنوارے ہو، مجھے میری سمجھ نہیں آرہی ہے کہ میں کیوں کنوارا ہوں؟'' انسپکٹر جانباز خان سوچنے لگا۔
''سر جی میں کیوں کنوارا ہوں؟'' لگے ہاتھ نصیر الدین نے مناسب سمجھا کہ جو اسے سمجھ آچکی ہے، اس کے بارے میں وہ پوچھ لے۔
''مجھے لگتا ہے کہ تم جلدی ہی شہید ہو جاؤ گے اس لیے تمہاری ہونے والی بیوی کو تم سے دور رکھ کر اسے تحفظ مل رہا ہے۔''
نصیر الدین نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''سر جی ایسی باتیں تو نہ کریں۔ پولیس مقابلہ تو آپ بھی کرتے ہو۔''
''لیکن پہلے گولی چلانے کا حکم میں تجھے ہی دیتا ہوں۔ اچھا پہلے سے یاد آیا کہ نثار تو ابھی ملا نہیں ہے۔ کیوں نہ جنید سے پوچھ گچھ کر لی جائے۔ اس کے لیے ہمیں مہتاب احمد کے آفس جانا پڑے گا۔''
نصیر الدین نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔
''رات کے ساڑھے تین بج چکے ہیں اس وقت ان کا آفس بند ہوگا۔''
''میں نے کل جانے کی بات کی ہے۔ مہتاب احمد کی کل تدفین ہے، وہاں اس سے ملاقات ہوگی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جنید اور ماہین ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور مہتاب احمد اس میں رکاوٹ تھے۔ جبکہ دونوں ماں بیٹی ایک طرف تھیں۔ مہتاب احمد کا رویہ بھی سخت تھا۔ راستے کا پتھر ہٹانے کے لیے کوئی بھی سنگین فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''
انسپکٹر جانباز خان نے تانا بانا ملایا۔
''بلقیس بیگم، ماہین اور جنید.... سر جی یہ تکون بن گئی ہے۔'' نصیر الدین بولا۔
''اس تکون میں یہ مت بھولو کہ چوتھا کردار نثار ڈرائیور کا بھی ہے جو اسے مارنے کے لیے باقاعدہ اس کے گھر آیا تھا اور چوکیدار سے کہہ رہا تھا کہ وہ ایک بار اسے اندر جانے کی اجازت دے دے۔ چوکیدار نے اسے اجازت نہیں دی اور رات کو راستے میں نثار نے مہتاب احمد کو مار دیا ہو؟''
''ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن سر جی آپ نے چوکیدار سے یہ سوال نہیں پوچھا کہ جب نثار قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا اور وہ گھر کے اندر جانا چاہتا تھا تو چوکیدار نے اس کا تذکرہ مہتاب احمد سے کیوں نہیں کیا؟'' نصیر الدین نے نکتہ اُٹھایا۔
''میں نے اس کے علاوہ بھی چوکیدار سے کچھ ضروری سوال نہیں کیے۔ میں ابھی اسے مشکل سوالات میں الجھانا نہیں چاہتا کیونکہ وہ پرانا چوکیدار ہے اور گھر کا بھیدی ہے۔ آسان سوال پوچھوں گا تو وہ گھبرائے گا نہیں۔ آئندہ بھی کچھ بتانے کے لیے تیار ہو جائے گا اگر میں نے ایسے سوالات کرنا شروع کر دیے تو وہ الرٹ ہو جائے گا۔ اور سوچنے لگے گا کہ اُسے کس سوال کا جواب دینا ہے اور کس کا نہیں۔''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔''
''اب تم تیار رہنا۔ ہمیں کل بہت سے لوگوں سے ملنا ہے۔'' انسپکٹر جانباز خان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

☆☆☆

مہتاب احمد کی تدفین کے موقع پر وہاں ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ انسپکٹر جانباز خان اور نصیر الدین ایک طرف کھڑے تھے۔ لوگ باہر نکل رہے تھے اور انسپکٹر جانباز خان کی نظریں سب کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اچانک مظہر اس کے پاس آکر رک گیا۔
''مجھے مظہر عباس کہتے ہیں اور میں مہتاب احمد کی کمپنی میں مارکیٹنگ منیجر ہوں۔''
''آپ سے مل کر اچھا لگا۔'' انسپکٹر جانباز خان نے اس سے مصافحہ کیا۔
''اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہے تو میں کچھ باتیں آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

"میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہا اور وہ تینوں ایک طرف چل دیے۔

مظہر ان دونوں کو قریب ہی ایک چائے کے ہوٹل پر لے گیا۔ اس نے تین کپ چائے کا آرڈر دیا اور بولا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ دراصل میرے پاس کچھ ایسی باتیں ہیں جن کی مدد سے آپ شاید قاتل تک پہنچ جائیں۔"

"آپ مجھے وہ باتیں جلدی سے بتادیں تاکہ میں کچھ اور لوگوں سے بھی مل سکوں۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہا۔

مظہر نے دائیں بائیں نظر دوڑائی اور پھر کہا۔ "مجھے مہتاب صاحب کے قتل کے پیچھے جنید کا ہاتھ لگتا ہے۔"

"جنید کون ہے؟" انسپکٹر جانباز خان نے جان بوجھ کر ایسے سوال کیا جیسے اس نے اس سے پہلے جنید کا نام نہ سنا ہو۔

"جنید ہماری کمپنی میں ملازم تھا۔ چند دن پہلے جنید اور مہتاب صاحب کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ جنید نے مہتاب صاحب سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کردیا تھا۔ مہتاب صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جنید تو جیسے غصے کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ کام نہیں کرے گا۔ مہتاب صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں اکاؤنٹنٹ کو بلا کر تمہارا حساب کردیتا ہوں۔ جنید بضد ہوگیا کہ وہ ابھی اپنا حساب لے گا۔ مہتاب صاحب نے کہا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹا انتظار کرلے لیکن جنید کہاں ماننے والا تھا، وہ تلخ ہوگیا۔ غصے میں مہتاب صاحب نے کچھ سخت الفاظ کہہ دیے اور جنید نے مہتاب صاحب کو دھمکی دے دی۔" مظہر نے اس دن ہونے والی بات کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

"کیا دھمکی دی؟"

"قتل کی دھمکی دے دی تھی۔" مظہر نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیا کہا تھا؟"

"یہ کہ اب میں ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا اور تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ جان سے ماردوں گا۔" مظہر نے الفاظ چباتے ہوئے بتایا۔

"جنید نے اس طرح واضح کہا تھا۔" انسپکٹر جانباز خان بولا۔

"ہا....ں شاید کچھ لفظ دائیں بائیں ہوگئے ہوں مجھ سے۔" مظہر نے کہا۔

اس دوران میں تین کپ چائے کے آگئے۔ ویٹر رکھ کر گیا تو انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔

"میرا نہیں خیال کہ اتنی سی بات پر جنید اچانک قتل کی دھمکی دے دے۔ کوئی تو ایسی بات ہوئی ہوگی کہ معاملہ بگڑا اور پھر جنید نے ایسی سنگین بات کی ہو؟" انسپکٹر جانباز خان نے کہا۔

"جنید غصے کا تیز ہے اور بدتمیز بھی۔ پتا نہیں اُسے کس چیز کا گھمنڈ ہے۔"

"اور مہتاب احمد کا مزاج کیسا ہوتا تھا؟" انسپکٹر جانباز خان نے چینی ڈالنے کے لیے چمچ اُٹھالیا۔

"وہ تو بہت اچھے اور نرم مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ ہم سب کا بہت خیال رکھنے والے تھے۔" مظہر نے فوراً سارا بوجھ جنید پر ڈالنے کے لیے کہا تو انسپکٹر جانباز خان نے ہاتھ میں پکڑا چمچ اس کی نظروں کے سامنے کردیا اور پھر چمچ نیچے رکھ کر کھڑا ہوگیا۔

"سر آپ چائے نہیں پئیں گے؟" مظہر نے پوچھا۔

"نہیں جلدی ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہماری مدد کی۔ برائے مہربانی مجھے جنید کا کوئی پتا دے دیں۔" مظہر نے فوراً کاغذ نکال کر اس پر جنید کے گھر کا پتا لکھا اور وہ کاغذ انسپکٹر جانباز خان کے حوالے کردیا۔ انسپکٹر جانباز خان اور نصیرالدین وہاں سے چل پڑے۔

"سر جی چائے تو پی لینے دیتے۔" نصیرالدین نے کہا۔

"تم نے اُن کی باتیں سنی ہیں؟" انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔

"اس کی باتیں ہی سن رہا تھا سر۔"

"کیا محسوس کیا؟"

"وہی جو آپ نے محسوس کیا؟"

"مثلاً....؟" انسپکٹر جانباز خان نے جاننا چاہا۔

"چمچہ گیری.... اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مہتاب احمد کی زندگی میں بھی اس کا چمچہ تھا اور موت کے بعد بھی اپنی چمچہ گیری کا حق ادا کررہا ہے۔"

"یہ بات اپنی جگہ لیکن ہم یہ بات نظر انداز نہیں کرسکتے کہ قتل کی اس واردات میں جنید کا بھی اہم ہاتھ ہوسکتا ہے۔"

"اور اُن کے ڈرائیور شار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اسے تلاش کرنا بھی بہت ضروری ہے۔" انسپکٹر

جانباز خان کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر جانباز خان سیدھا مہتاب احمد کے گھر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے کچھ معلومات نثار کے بارے میں مزید لی اور اس کا حلیہ پوچھا۔ چوکیدار اس کا حلیہ بتانے لگا اور اس کام میں ماہر شخص کی انگلیاں کاغذ پر چلنے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد جب نثار کا خاکہ تیار ہو گیا تو انسپکٹر جانباز خان نے دیکھنے کے بعد وہ خاکہ، چوکیدار کے سامنے کر دیا۔ چوکیدار نے مزید کچھ تبدیلی کرائی اور پھر وہ خاکہ بالکل نثار جیسا بن گیا۔

انسپکٹر جانباز خان نے اس تصویری خاکے کو غور سے دیکھنے کے بعد وہاں موجود اہلکار کو کچھ ہدایت دی اور وہ تصویری خاکہ اس کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد وہ بلقیس بیگم کے پاس چلے گئے۔ بلقیس بیگم اپنے بیڈروم میں بیٹھی تھی اور ماہین بھی ساتھ ہی افسردہ موجود تھی۔

''میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک بار پھر تکلیف دی۔ مجھے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داری نبھاتے ہوئے آپ سے ملاقات کرنی ضروری تھی۔''

''کوئی بات نہیں آپ تشریف رکھیں۔'' بلقیس بیگم نے کہا۔

''میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر جانباز خان نے ایک کرسی سنبھال لی۔

''آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھ لیں۔'' بلقیس بیگم کے چہرے پر متانت تھی۔

''مہتاب احمد کا اپنے آفس کے ملازمین کے ساتھ بھی رویہ بہت سخت تھا؟''

''میں اس بارے میں نہیں جانتی کیونکہ یہ اُن کا دفتری معاملہ ہوتا تھا۔'' بلقیس بیگم نے جواب دیا۔

''گھر میں ان دنوں کوئی کشیدگی چل رہی تھی؟'' انسپکٹر جانباز خان نے اگلا سوال کیا۔

''بالکل بھی نہیں۔'' بلقیس بیگم نے صاف جھوٹ بول دیا۔

''کیا ایسا نہیں تھا کہ مہتاب احمد صاحب، اپنی بیٹی ماہین پر بہت ناراض تھے؟'' انسپکٹر جانباز خان کے سوال نے بلقیس بیگم کو چونکا دیا۔

''کس بات پر ناراض تھے؟'' جواب دینے کے بجائے بلقیس بیگم نے سوال کر دیا۔

''یہ تو آپ ہی بہتر بتا سکتی ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں تھی۔''

''جنید کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' جانباز خان نے یہ سوال کر کے ایک بار پھر بلقیس بیگم کے چہرے کے تاثرات میں تغیر پیدا کر دیا۔

''کیا جنید سے آپ کی ملاقات ہو چکی ہے؟'' بلقیس بیگم نے پوچھا۔

''اگر سوال کرنے کا حق صرف آپ مجھے دیں تو میرا خیال ہے کہ مجھے قاتل تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

''میں بتاتی ہوں۔'' اچانک ماہین بولی اور بلقیس بیگم نے اس کی طرف عجیب سی نظروں کے ساتھ دیکھا۔

''جنید اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ بات پاپا کو پسند نہیں تھی اور وہ ناراض ہو گئے تھے۔'' ماہین نے جنید کے بارے میں انکشاف کیا۔

''اور کیا یہ اسی ناراضی کی وجہ تھی کہ انہوں نے جنید کو آفس سے نکال دیا؟''

''شاید......''

''یا پھر جنید خود ہی چلا گیا؟''

''جنید کے ساتھ انہوں نے پورے آفس میں اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔''

''مثلاً اس کے ساتھ کیا بُرا سلوک ہوا تھا؟''

''ہم نہیں جانتے لیکن کچھ ایسا ہوا تھا کہ وہ آفس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔'' بلقیس بیگم نے فوراً مداخلت کی۔

''اور اسی غصے میں جنید نے انہیں مارنے کی دھمکی دے دی تھی۔'' انسپکٹر جانباز خان نے کہا۔

''دھمکی...؟ نہیں جنید نے ان کو کوئی ایسی دھمکی نہیں دی تھی۔'' ماہین فوراً بولی۔

''ایک دھمکی ان کو جنید نے دی تھی تو دوسرا آپ کا سابق ڈرائیور نثار ان کو مارنے کے لیے اس گھر کے گیٹ تک بھی آیا تھا۔'' انسپکٹر جانباز خان نے انکشاف کرنے کے بعد دونوں کے تاثرات لیے۔ ماہین تو حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ بلقیس بیگم کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' بلقیس بیگم آخر بولی۔

''نثار کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی کا انتقال مہتاب احمد کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسے اس بات کا غصہ تھا۔'' انسپکٹر جانباز خان بولا۔

"یہ آپ عجیب بات مجھے بتا رہے ہیں۔" بلقیس بیگم بولی۔

"اور کوئی ایسی بات آپ مجھے بتانا چاہیں کہ جس سے ہمیں یہ کیس حل کرنے میں مدد مل سکے؟" انسپکٹر جانباز خان نے کہہ کر سوالیہ نگاہیں بلقیس بیگم کے چہرے پر مرکوز کردیں۔

"آپ جو پوچھنا چاہیں، پوچھ لیں۔" بلقیس بیگم نے اپنی طرف سے کچھ بتانے کے بجائے کہا۔

"جنید ایک اچھا پڑھا لکھا لڑکا ہے وہ پپا کو نہ تو دھمکی دے سکتا ہے اور نہ ایسا کچھ کرسکتا ہے۔" ماہین نے ایک بار پھر جنید کی صفائی پیش کی۔

"پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگ بھی اچانک قاتل بن جاتے ہیں۔" انسپکٹر جانباز خان بولا۔

"آپ کا جنید پر شک فضول ہے۔" ماہین کا ردِعمل کچھ سخت تھا۔

"ابھی میں نے شک تو کیا ہی نہیں ہے۔ میں تو ابھی تفتیش کررہا ہوں۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہا۔

"پپا کے باہر جانے کیا معاملات تھے، ان کی کسی کے ساتھ دشمنی چل رہی تھی، یا کیا تھا ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے۔" ماہین کا لہجہ ایسا تھا کہ جیسے اب وہ چاہتی ہو کہ انسپکٹر جانباز خان یہاں سے چلا جائے۔

"بیگم صاحبہ ایک سوال پوچھنے کی اجازت ہے اگر آپ ناراض نہ ہوں تو؟"

"جی پوچھیں۔"

"مہتاب احمد اور آپ کی عمر میں کتنا فرق ہے۔" انسپکٹر جانباز خان نے اچانک سوال کیا۔

"میں اُن سے چھ سال بڑی ہوں شاید۔"

"بے تحاشا دولت کے بعد انسان کے اندر دوسری شادی کی بھی کبھی کبھی خواہش پیدا ہوجاتی ہے۔ ؟ اور پھر ایسے حالات میں جب انسان کو اپنی دولت کے بل بوتے پر یقین ہو کہ اسے خوبصورت اور کم عمر بیوی مل سکتی ہے۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہہ کر دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ بلقیس بیگم چپ رہی اور اس نے کوئی تاثر نہیں دیا البتہ ماہین بار بار اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے انتظار ہو کہ اس کی ماں اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھا دے کہ وہ دوسری شادی کے خواہش مند تھے۔ جب بلقیس بیگم کچھ نہ بولی تو ماہین نے کہا۔

"پپا دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔"

بیش بہا

کچھ رشتے ٹام اینڈ جیری کی طرح ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کو اذیت دیتے ہیں لڑتے جھگڑتے ہیں.... ایک دوسرے کو مارتے ہیں مگر ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس دنیا میں کروڑوں لوگ ہیں پھر آپ کے پیدا ہونے کی وجہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ" آپ سے اس چیز کی توقع کررہا ہے جو کروڑوں لوگوں سے ممکن نہیں۔

☆☆☆

ایک بہرے نے دورانِ سفر ٹرین میں دوسرے بہرے سے پوچھا۔ "بھائی صاحب اب کون سا اسٹیشن آئے گا؟" دوسرے بہرے نے فوراً جواب دیا۔

"جی آج جمعرات ہے؟"

پہلے بہرے نے کہا۔ "جی آج میں بھی یہیں اُتروں گا۔"

مرحا گل درابن کلاں سے

"میرے اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر کس قدر نشانے پر لگ جاتے ہیں۔" انسپکٹر جانباز خان نے اپنا منہ نصیرالدین کے کان کے پاس لے جا کر سرگوشی کی۔

"آپ کی تکے بازی بہت کامیاب ہے سر۔" نصیرالدین نے بھی جلدی سے کہا۔

انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔ "کس سے دوسری شادی کرنا چاہتے تھے وہ؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔" ماہین نے کہا۔

"بیگم صاحبہ آپ کو تو پتا ہوگا۔" انسپکٹر جانباز خان نے اپنا رخ بلقیس بیگم کی طرف موڑ لیا۔

"کوئی تھی۔" بلقیس بیگم نے مختصر جواب دیا۔

"اتنے بڑے شہر میں کوئی کو کیسے تلاش کروں؟" ایک بار پھر انسپکٹر جانباز خان نے نصیرالدین کے پاس منہ لے کر سرگوشی کی۔

"اگر آپ کے لیے کوئی کو تلاش کرنا آسان ہوتا تو آپ اب تک کنوارے ہوتے؟" نصیرالدین بھی جملہ خالی نہیں جانے دیتا تھا۔ انسپکٹر جانباز خان سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

"بیگم صاحبہ کیا آپ میری مدد کرسکیں گی کہ وہ کون تھی

جس سے وہ شادی کرنا چاہتے تھے؟"
"مجھے معلوم نہیں ہے لیکن وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔" بلقیس بیگم نے جواب دیا۔
انسپکٹر جانباز خان چپ ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا اور پھر اس نے اجازت چاہی۔ ابھی وہ دروازے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ وہ پلٹا اور بولا۔
"کیا میں اُن کی ذاتی چیزوں کی تلاشی لے سکتا ہوں۔ ویسے پورے گھر کی تلاشی کا وارنٹ میرے پاس ہے۔"
بلقیس بیگم نے ملازم کو آواز دی اور اسے کہا کہ وہ انسپکٹر جانباز خان کو صاحب کے کمرے میں لے جائے۔
انسپکٹر جانباز خان اور نصیرالدین اس کے ساتھ مہتاب احمد کے کمرے میں چلے گئے۔ انسپکٹر جانباز خان نے جہاں سے چاہا کمرے کی تلاشی لینی شروع کردی اور پھر وہ الماری کی طرف بڑھا، کپڑوں کو دیکھنے کے بعد اس نے دراز کھولی اور وہاں پر موجود چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔
انسپکٹر جانباز خان اور نصیرالدین ابھی گیٹ بھی عبور نہیں کر پائے تھے کہ ایک کار اندر داخل ہوئی۔ کار گیراج میں کھڑی ہوئی اور اندر سے جنید باہر نکلا۔ اسی اثنا میں ماہین بھی مین دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ جنید اس کی طرف بڑھا اور ماہین اسے جلدی سے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔
انسپکٹر جانباز خان گیٹ کے پاس کھڑا اپنا موبائل فون ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم نمبر تلاش کر رہا ہو۔ بظاہر وہ کوئی نمبر ہی تلاش کر رہا تھا لیکن اس کی چور نظریں اُن دونوں پر ہی تھیں۔
انسپکٹر جانباز خان نے نصیرالدین سے کہا۔ "چوکیدار سے مہتاب احمد کا موبائل نمبر لے لو۔"
چوکیدار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے مہتاب احمد کا نمبر دینا چاہیے یا نہیں۔ اس تذبذب میں اس نے مہتاب احمد کا وہ موبائل فون نمبر دے ہی دیا جو اس کے زیرِ استعمال رہتا تھا۔
"تم بہت اچھے انسان ہو اور ایک وفادار آدمی بھی ہو۔" انسپکٹر جانباز خان نے اس کی تعریف کی۔
"جی شکریہ صاحب جی۔" چوکیدار خوش ہوگیا۔
"ویسے یہ جو ابھی گاڑی اندر گئی تھی اور اندر سے جو نوجوان نکلا تھا، یہ کون ہے؟"
"یہ جنید صاحب ہیں جی۔ صاحب نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ میں انہیں گھر میں داخل نہ ہونے دوں اور اسی دن ان کا قتل ہوگیا اور آج چھوٹی بی بی جی نے مجھے حکم دیا کہ جنید صاحب آ رہے ہیں ان کو روکا نہ جائے۔ ہم تو نوکر ہیں جی..... حکم کے بندے....." چوکیدار جواب میں ہی سب کچھ بتا گیا۔
انسپکٹر جانباز خان نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا اور مصافحہ کر کے رخصت ہوگیا۔
☆☆☆
"سر جی آپ کا شک کس طرف جاتا ہے؟" نصیرالدین نے پوچھا۔ اس وقت وہ پولیس اسٹیشن میں بیٹھے تھے۔ مہتاب احمد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر جانباز خان نے فائل ابھی بند کی تھی۔
انسپکٹر جانباز خان سوچتے ہوئے بولا۔ "ڈار کی جگہ جگہ تلاش جاری ہے اور وہ کہیں مل نہیں رہا ہے۔ جنید کو ابھی میرے اہلکار پولیس اسٹیشن لے آئیں گے اور ایک شک مجھے یہ بھی ہے....."
نصیرالدین سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر جانباز خان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مضطرب تھا کہ انسپکٹر جانباز خان جلدی سے بتا دے کہ اب انہیں تیسرا شک کس پر ہے۔
انسپکٹر جانباز خان جب کچھ نہ بولا تو نصیرالدین نے کہا۔ "سر جی اگر بتانے میں کچھ دیر ہے تو میں روٹی پانی کھا آؤں؟"
"تم پانی کیسے کھاتے ہو؟" انسپکٹر جانباز خان نے یکدم چونک کر اس سے پوچھا۔
"پانی تو پیتا ہوں۔"
"تم نے ابھی کہا کہ میں روٹی پانی کھا آؤں؟"
"وہ تو جذبات میں کہہ دیا تھا۔" نصیرالدین مسکرایا۔
"جذبات میں انسان کچھ بھی کرسکتا ہے اور کہہ سکتا ہے؟" انسپکٹر جانباز خان بولا۔
"ایسا اکثر ہوجاتا ہے۔"
"جیسے مہتاب احمد نے ماہین اور جنید پر پابندی عائد کردی اور وہ خود دوسری شادی کرنے چل پڑے۔ اب یہاں جذبات کی روانی شروع ہوتی ہے۔ جنید اور ماہین کو اپنی جوان محبت کی فکر۔ اس فکر نے انہیں اکسایا ہو کہ جو اُن کے ملنے میں دیوار ہے اس دیوار کو ہٹا دیا جائے اور بیوی اس لیے جذباتی کہ اس کا شوہر دوسری بیوی لا رہا ہے۔ دوسری بیوی آئے گی تو جانے وہ اس کا کیا حال کرے گی۔ اتنی وسیع

جائداد کی وہ مالکن بن جائے اور جس نے زندگی کے کئی سال اپنے شوہر کو دیے، عمر کے اس حصے میں اسے ایسے نکال دیا جائے جیسے دودھ میں پڑی مکھی ہو۔" ایک بار پھر انسپکٹر جانباز خان تانا بانا بننے لگا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ مہتاب احمد کا قتل ماہین اور جنید بھی مل کر کر سکتے ہیں اور ان کی پہلی بیوی بھی یہ قدم اُٹھا سکتی ہے؟"

"یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تینوں ایک ہوں۔ تینوں نے مل کر مہتاب احمد کو راستے سے ہٹا دیا ہو۔ کیونکہ تینوں ہی مہتاب احمد کی وجہ سے اذیت میں مبتلا تھے۔"

"تو پھر اس میں نثار کی تو گنجائش نہیں نکلتی..... لیکن پھر وہ فرار کیوں ہے؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تینوں کا سرغنہ ہو؟" انسپکٹر جانباز خان نے خیال پیش کیا۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ ان تینوں نے نثار سے مہتاب احمد کا قتل کرایا ہو؟" نصیر الدین نے اپنی گردن ہلائی۔

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہا۔

"آپ کی بات میں تو دم ہے۔ کیونکہ مہتاب احمد کے مرتے ہی جنید کے لیے اس گھر کا بند دروازہ کھل گیا۔"

"اب سارا کاروبار جنید کے ہاتھ میں ہوگا۔ جنید کی شادی ماہین سے ہوگی اور جنید، بلقیس بیگم کا داماد ہوگا۔ دولت باہر نہیں جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں جنید کے بارے میں معلومات دینے والا منظر ہماری مدد کیوں کر رہا تھا؟" انسپکٹر جانباز خان نے سوالیہ نگاہوں سے نصیر الدین کی طرف دیکھا۔

"کیوں کر رہا تھا سر؟" نصیر الدین نے بھولے پن سے پوچھا۔

"وہ یہ بات جان گیا تھا کہ مہتاب احمد کے جانے کے بعد اب جنید پھر اس آفس میں آئے گا..... لیکن کسی ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ مالک بن کر۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی، وہ سچ پر مبنی نہیں تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ہمیں بتاتے ہوئے خود بھی گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ جنید کو ہم پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیں۔ تین چار سال تک کیس لگا رہے گا اور تب تک بہت کچھ بدل جائے گا۔" انسپکٹر جانباز نے بتایا۔

"سر آپ کتنے سمجھ دار اور باریک بین ہیں۔"

نصیر الدین نے مسکا لگایا۔ "ویسے سر جو آپ نے چوکیدار سے مہتاب احمد کا موبائل فون نمبر لیا ہے، آپ کو مہتاب احمد کو کال کرنی ہے؟"

"مجھے اکثر تم سے ایسے سوالوں کی اُمید رہتی ہے۔"

"شکریہ سر۔"

"ایسے سوال جن کو بے وقوفی کا تڑکا لگا ہوتا ہے۔"

جب انسپکٹر جانباز خان نے اگلا جملہ مکمل کیا تو نصیر الدین پیچھے ہٹ گیا۔ اسی اثنا میں دو پولیس اہلکار جنید کو اندر لے آئے۔ انسپکٹر نے دونوں کو جانے کا اشارہ کر دیا اور جنید سے مخاطب ہوا۔

"میں نے سادہ وردی میں آپ کی طرف بندے بھیجے تھے تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ آپ کو کون اور کیوں لے جا رہا ہے۔"

"آپ نے مجھے پولیس اسٹیشن کیوں بلایا ہے؟" جنید نے پوچھا۔

"کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ آپ تشریف رکھیں۔" انسپکٹر جانباز نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

جنید چند ثانیے کھڑا رہنے کے بعد سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔

"کیا لیں گے آپ..... چائے یا پانی؟"

جنید تمسخر سے مسکرایا۔ "کیا یہ پولیس اسٹیشن ہی ہے جو میرے ساتھ اتنی عزت سے پیش آیا جا رہا ہے؟"

"آپ اس بات کا یقین کرلیں کہ پولیس میں اب بہت اچھے لوگ بھی آ گئے ہیں۔"

"اور وہ بہت اچھے لوگ بمشکل ہی دکھائی دیتے ہیں۔" جنید بولا۔

"چلیں اس بات پر ہم پھر کسی دن طویل بحث کریں گے آج آپ کو میرے چند سوالوں کے جواب دینے ہیں۔" انسپکٹر جانباز نے اس موضوع کو سمیٹا۔

"جی پوچھیں۔" جنید نے کہا۔

"مہتاب احمد اور آپ کے درمیان جب تلخ کلامی ہوئی تھی تو آپ نے ان کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی اور پھر انہیں گولی مار کر مار دیا گیا۔" انسپکٹر جانباز خان کی نگاہیں جنید کے چہرے پر تھیں۔

"اس دن انہوں نے میری تذلیل کی تھی۔ میں نے غصے میں اتنا کہا تھا کہ میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"اور آپ نے اُن کو نہیں چھوڑا۔"

"وہ بات محض غصے میں کہی تھی۔ عملی طور پر میں نے

کچھ نہیں کیا۔" جنید کچھ گھبرا سا گیا۔
"مہتاب احمد کی بیٹی ماہین اور آپ کے درمیان جو تعلق ہے اس کا علم جب مہتاب احمد کو ہوا تو انہوں نے آپ دونوں پر ایک دوسرے سے ملنے پر سختی سے پابندی عائد کردی تھی نہ عاشق بڑے جذباتی ہوتے ہیں، اور جذبات میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی کہ قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہہ کر اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھے۔
"یہ ٹھیک ہے کہ ان کو ہمارا تعلق پسند نہیں تھا لیکن انہیں جان سے مار دینے کا خیال ہی مجھ جیسے شریف انسان کے لیے خوفناک ہے۔"
"یہ خوف اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب انسان کو بار بار اپنی بے عزتی یاد آتی ہے۔"
"آپ مجھ پر ہی ان کے قتل کا کیوں شک کر رہے ہیں، آپ اس بارے میں اشفاق صاحب سے کیوں پوچھ گچھ نہیں کرتے۔" جنید نے تیز لہجے میں کہا تو انسپکٹر جانباز خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔
"یہ اشفاق صاحب کون ہیں؟"
"یہ ان کے سابقہ بزنس پارٹنر تھے۔ قتل سے چند دن پہلے میں اور مہتاب صاحب گاڑی میں کہیں جا رہے تھے کہ اچانک اشفاق صاحب کی گاڑی نے ہماری گاڑی کو روکا اور وہ ہماری کار میں آ گئے۔ جب سے ان کی پارٹنر شپ الگ ہوئی ہے تب سے مہتاب احمد نے ان کے چار کروڑ روپے دینے ہیں جو وہ نہیں دے رہے تھے۔ میرے سامنے اشفاق صاحب نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ دونوں میں کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی اور پھر اشفاق صاحب نے ان کو ایک ہفتے کا وقت دیا اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے ان کے پیسے نہ لوٹائے تو وہ ان کا برا حال کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد مہتاب احمد قتل ہوئے ہیں۔" جنید نے انسپکٹر جانباز خان کے سامنے ایک نئے کردار کا تذکرہ کر دیا تھا۔
جنید کی بات سن کر انسپکٹر جانباز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "ہم تو شک کا گھوڑا آپ تک دوڑا رہے تھے اور آپ نے ہمارے گھوڑے کا رخ ہی بدل دیا۔"
"جو واقعہ میرے سامنے آیا تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ میں اپنی صفائی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا کام کرنے کے بارے میں۔۔۔ سوچ بھی نہیں سکتا۔"
"خیر ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ آپ کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری تفتیش جاری ہے اور میں جلد قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر جانباز خان نے متانت سے کہا اور چند سوالات مزید پوچھنے کے بعد انسپکٹر جانباز خان نے اسے یہ تاکید کر کے جانے دیا کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر شہر سے باہر نہیں جائے گا۔ اور ساتھ ہی انسپکٹر جانباز نے جنید سے اشفاق کے آفس کا پتا لے لیا۔
جنید چلا گیا اور جانباز سوچتے ہوئے بولا۔ "ہم جس سے بھی تفتیش کے لیے سوال جواب کرتے ہیں وہ ہمیں اگلے بندے کا بتا کر خود کو بچانے کی کوشش کر لیتا ہے۔ نصیر الدین ذرا سوچ کر بتاؤ کہ جب ہم اشفاق صاحب کے پاس جائیں گے تو وہ ہمیں آگے کس کے پاس بھیجے گا؟"
"سر مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"
"کوئی چار، پانچ سال کا وقت دے دوں سوچنے کے لیے؟" انسپکٹر جانباز نے اس کی طرف دیکھا۔
"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں سر جی۔" نصیر الدین کھسیانی ہنسی ہنسا۔
"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں کہ میں تمہیں شرمندہ کر رہا ہوں حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" انسپکٹر جانباز نے کہا اور اسی اثنا میں ایک اہلکار اندر آیا اور ایک فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ انسپکٹر جانباز نے فائل کے اندر چند کاغذات کو غور سے دیکھا اور اہلکار کو جانے کا کہہ دیا۔ اس کے جاتے ہی نصیر الدین نے پوچھا۔
"سر جی یہ کس چیز کی فائل ہے۔"
"اس میں شادی نہ کرنے کے کچھ فوائد لکھے ہوئے ہیں اور اتفاق دیکھو کہ شادی نہ کر کے وہ فوائد مجھے آج تک نہیں مل سکے۔ بہرحال چلنے کی تیاری کرو ہمیں ابھی اشفاق صاحب سے ان کے آفس میں ملاقات کرنی ہے۔" انسپکٹر جانباز نے فائل اپنی دراز میں رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

انسپکٹر جانباز خان اور نصیر الدین اسی وقت اشفاق کے آفس پہنچ گئے۔ ان کے باقی اہلکار باہر کھڑے تھے۔ اشفاق پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ اس نے دونوں کو اپنے آفس میں بٹھایا اور رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ خشک کرتے ہوئے پوچھا۔ "خیریت ہے آپ میرے آفس آئے ہیں۔"
انسپکٹر جانباز بولا۔ "آپ جانتے ہیں کہ مہتاب احمد کا قتل ہو گیا ہے؟"

’’جی میں جانتا ہوں۔ مجھے دلی افسوس ہوا ہے۔‘‘ اشفاق کے چہرے پر گھبراہٹ عیاں تھی۔

’’افسوس اس چیز کا ہوا ہے کہ اب آپ کی وہ رقم بالکل بھی نہیں ملے گا جو آپ نے مہتاب احمد سے لینا تھی۔‘‘

’’مجھے اس بات کا افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ میں ان کی بیگم صاحبہ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ رقم مجھے دے دیں گی۔‘‘ اشفاق نے بتایا۔

’’اچھا تو اسی لیے آپ نے ان کو مارنے کی دھمکی دی تھی تاکہ وہ مرے اور آپ آسانی سے ان کی بیگم صاحبہ سے اپنی رقم وصول کر سکیں۔ آپ کی اس آسانی میں مہتاب احمد کی زندگی رکاوٹ تھی؟‘‘ انسپکٹر جانباز خان نے فوراً کہا۔

’’میں نے اُن کو کبھی کوئی دھمکی نہیں دی۔‘‘ اشفاق نے کہتے ہی دو گھونٹ پانی پینے کے بعد اپنا حلق تر کیا۔

’’آپ بھول رہے ہیں جبکہ مجھے یاد ہے کہ آپ نے ان کو سنگین نتائج کی دھمکی ان کی کار کو روک کر ان کی کار میں بیٹھ کر دی تھی۔‘‘ انسپکٹر جانباز خان نے اسے یاد دلایا۔

اشفاق نے ایک بار پھر اپنے ماتھے سے رومال کے ساتھ پسینا صاف کیا اور بولا۔ ’’غصے میں بندہ ایسی بات کہہ ہی دیتا ہے لیکن سنگین الفاظ میں، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔‘‘

’’کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو گرفتار کر کے یہاں سے لے جاؤں؟‘‘

’’دیکھیں سر میں ایک باعزت بزنس مین ہوں جی میں نے غصے میں ان کو ایسا کہا تھا لیکن یقین کریں میں نے تو کبھی مکھی بھی نہیں ماری۔‘‘ اشفاق کی گھبراہٹ اور خوف دوچند ہو گیا۔

’’یہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ بندہ زندگی میں دو چار مکھیاں تو مار ہی دیتا ہے۔ بہرحال آپ شام کو پولیس اسٹیشن آئیں گے۔‘‘ انسپکٹر جانباز کھڑا ہو گیا۔

’’سر آپ میرا یقین کریں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔‘‘

’’آپ سے تفصیلی بات چیت ہو گی تو پھر میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ یاد رکھنا اگر آپ شام چھ بجے پولیس اسٹیشن میں نہ ہوئے تو پھر میں آپ کو گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کروں گا۔‘‘ انسپکٹر جانباز نے سخت لہجے میں کہا۔ اشفاق کی سانس رک گئی۔

انسپکٹر جانباز اور نصیرالدین وہاں سے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے دس منٹ بعد جیسے اشفاق کے جسم میں جان آئی تھی۔ اس نے فوراً فون اُٹھا کر کانپتے ہاتھوں سے ایک نمبر ملایا اور بے چینی سے دوسری طرف سے فون اُٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

’’مہتاب احمد نے اپنے مخالفین اتنے پیدا کیے تھے کہ کسی ایک پر شک کرنا مشکل ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ قاتل کہیں باہر سے نہیں آیا تھا۔‘‘ انسپکٹر جانباز نے کہا۔ اس وقت وہ نصیرالدین کے ساتھ اپنی کار سڑک کنارے کھڑی کیے اس سے بات کر رہا تھا۔

’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر جی۔‘‘

’’بلقیس بیگم، ماہین اور جنید۔ دوسرا اشارہ جو ابھی تک فرار ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے، تیسرا یہ اشفاق اور چوتھا...‘‘ انسپکٹر جانباز سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے مرکوز تھیں۔

’’چوتھا کون ہے سر جی؟‘‘ نصیرالدین نے جلدی سے پوچھا۔

’’نصیرالدین... وہ اداکارہ حریم ہی ہے ناں۔‘‘ انسپکٹر جانباز نے سامنے اشارہ کیا۔

ان سے کچھ فاصلے پر اوپر ایک بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔ اداکارہ حریم کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ وہ کسی کمپنی کے اشتہار کا بورڈ تھا۔ حریم کا خوبصورت اور چمکتا ہوا چہرہ انسپکٹر جانباز خان کو متاثر کر رہا تھا۔

’’جی سر جی وہ حریم ہی ہے۔‘‘

’’بڑی خوبصورت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے ملوں۔ میرا کلاس فیلو افضال بھی تو ٹیلی وژن ڈرامے ہی بناتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کے کسی سیریل میں کام کر رہی ہے۔ اس سے رابطہ کرتے ہیں اگر شوٹنگ ہو رہی ہوئی تو اس کی شوٹنگ دیکھتے ہیں۔‘‘ انسپکٹر جانباز یکدم تیار ہو گیا۔

’’سر جی ہم ایک کیس حل کر رہے ہیں؟‘‘ نصیرالدین نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

’’ہم بھی انسان ہیں۔ تفریح کرنا ہمارا بھی حق ہے۔‘‘ انسپکٹر جانباز خان نے اپنا موبائل فون نکالا اور کال کرنے لگا۔

جیسے ہی رابطہ ہوا۔ پہلے تو وہ ایک دوسرے سے نہ ملنے کے شکوے کرتے رہے اور پھر جب انسپکٹر جانباز خان نے پوچھا۔ ’’اس وقت کہاں ہو؟‘‘

’’سیٹ پر ہوں۔ بڑی مشکل سے حریم کی طبیعت آج

ٹھیک ہوگئی ہے۔ وہ دس منٹ میں سیٹ پر پہنچ رہی ہے۔ دعا کرو کہ وہ سیٹ پر آجائے۔"

"مجھے بھی شوٹنگ دیکھنی ہے۔ مجھے پتا بتاؤ۔"

افضال اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ انسپکٹر جانباز اور نصیر الدین پندرہ منٹ میں اس کوٹھی میں پہنچ گئے جہاں شوٹنگ کے لیے سیٹ لگا ہوا تھا۔ ان کے آنے سے دس منٹ پہلے ہی حریم پہنچی تھی۔ انسپکٹر جانباز خان تو اسی کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

"بس کرو اسے دیکھ دیکھ کر نظر لگانی ہے۔" افضال نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"میرے دیکھنے سے اس کی نظر اتر رہی ہے۔"

"پہلے ہی وہ بڑی مشکل سے تین دن کے بعد شوٹنگ پر آئی ہے۔ ان کے نخرے ہی نہیں سنبھالے جاتے۔" افضال اکتایا ہوا تھا۔

اچانک انسپکٹر جانباز خان کی نظر ایک طرف کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص پر چلی گئی۔ اس کا رنگ گندمی اور بال گھنگریالے تھے۔ وہ کرسی پر بڑے رعب سے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تمکنت تھی۔

"یہ اس ڈرامے کا ولن ہے؟" انسپکٹر جانباز نے پوچھا۔

"یہ اس ڈرامے کا ہی نہیں ہر ڈرامے کا ولن ہوتا ہے۔" افضال نے برا سا منہ بنایا۔

"اچھا اتنا بڑا فنکار ہے؟" انسپکٹر جانباز نے کہا۔

"ارے نہیں .... یہ حریم کا باپ ہے۔" افضال کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ ابھی حریم کے باپ کو مار آئے گا۔

"شکل سے تو کمینہ لگ رہا ہے مجھے۔" انسپکٹر جانباز نے کہا۔

"یہ بات اس کے کان تک نہ چلی جائے ورنہ ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا۔" افضال نے کہا۔ افضال کے اسسٹنٹ نے بتایا کہ شارٹ تیار ہے۔ حریم کیمرے کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔ افضال نے انسپکٹر جانباز سے خاموش رہنے کا کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

اچانک اردگرد کی روشنیاں بند ہوگئیں اور صرف اس جگہ کی روشنیاں جل رہی تھیں جہاں شارٹ فلمانا تھا۔ شوٹنگ شروع ہوگئی تھی۔ ری ٹیک ہونے لگے۔ سمجھایا جانے لگا اور آدھے گھنٹے کے بعد شارٹ او کے ہوا۔ اتنا وقت حریم نے لیا تھا۔ وہ ٹھیک سے کام نہیں کرپارہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر کہیں اور ہو۔

اچانک ساری روشنیاں جل اٹھیں۔ انسپکٹر جانباز نے افضال کے پاس جاکر اجازت لی اور سیٹ سے باہر جانے لگا تو حریم کی آواز آئی، وہ پوچھ رہی تھی۔

"پپا جی کہاں ہیں؟"

"جی وہ اٹھ کر باہر گئے تھے ....." کسی نے بتایا۔ وہاں اگلے شارٹ کی تیاری ہونے لگی تھی۔ اچانک انسپکٹر جانباز کا موبائل فون بجا۔ اس نے موبائل فون کان سے لگایا تو ایک مردانہ آواز ابھری۔

"ہم نے نثار کو گرفتار کرلیا ہے سر۔"

"بہت خوب ....!" انسپکٹر جانباز نے چہرے پر مسکراہٹ لاکر موبائل فون بند کردیا۔

☆☆☆

بلقیس بیگم چاہتی تھی کہ ماہین اور جنید کی سادگی سے شادی ہوجائے۔ کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے جنید کا وہاں موجود ہونا بہت ضروری تھا۔ بلقیس بیگم کی یہ بھی خواہش تھی کہ اب جب جنید اس آفس میں قدم رکھے تو وہ مہتاب احمد مرحوم کے داماد کی حیثیت سے داخل ہو۔

اسی لیے بلقیس بیگم نے جنید کو گھر بلایا تھا۔ وہ تینوں بیٹھے ابھی ادھر ادھر کی باتیں ہی کررہے تھے کہ ملازم نے اطلاع دی کہ انسپکٹر جانباز خان آیا ہے۔ اس کا نام سن کر تینوں کے چہروں پر ہی ناگوار سا تاثر ابھرا۔ بادل ناخواستہ بلقیس بیگم نے انسپکٹر جانباز خان کو آنے کی اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر کے بعد انسپکٹر جانباز خان اور نصیر الدین داخل ہوئے۔ نصیر الدین کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

"آپ کی محفل میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں لیکن میں جو کچھ بھی کررہا ہوں، وہ آپ لوگوں کے لیے ہی ہے۔" انسپکٹر جانباز نے کہا۔

"جی ہم جانتے ہیں کہ ہمارے لیے ہی آپ بھاگ دوڑ کررہے ہیں۔" بلقیس بیگم نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ عیاں کی۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے مہتاب احمد کا قاتل گرفتار کرلیا ہے۔" انسپکٹر جانباز نے انکشاف کیا۔

انسپکٹر جانباز کی بات پر وہ تینوں ہی چونکے۔ تینوں اس کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے وہ اندر سے اس لیے بے چین ہوں کہ انسپکٹر جانباز اب ان کو جلدی سے قاتل کا نام بتادے۔

"کون ہے وہ؟" بلقیس بیگم نے پوچھا۔

"پہلے تو وہ مان نہیں رہا تھا اور اپنے جرم سے انکاری تھا لیکن پھر اسے اقرارِ جرم کرنا ہی پڑا۔" انسپکٹر جانباز نے بلقیس بیگم کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مزید بتایا۔

"وہ ہے کون؟" اس بار جنید نے سوال کیا۔

"میں نے پوری کوشش کی کہ تفتیش کے دوران کوئی بے گناہ نہ پکڑا جائے۔ اس لیے میں ہر چیز کا باریک بینی سے جائزہ لیتا رہا۔ میں نے اس گھر کے چوکیدار سے جو ملاقاتیں آپ کے سامنے کیں، وہ کی ہی تھیں، میں دو بار اس سے خفیہ طور بھی ملا تھا۔"

"سر جی آپ نے یہ بات مجھے بتائی ہی نہیں۔" نصیر الدین نے دبے لفظوں میں شکوہ کر دیا۔

"بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر سے بہت نالاں تھیں۔ آپ کی بیٹی کو بھی اس چیز کا غم تھا کہ اس کا باپ اسے جنید سے ملنے کیوں نہیں دیتا اور جنید کو اس بات کا غصہ تھا انہوں نے ان کی تذلیل کی تھی۔ اور پھر ان کا سابق پارٹنر اشفاق وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ آپ کا ڈرائیور شار تو بہت ہی دکھی تھا۔ سب سے زیادہ وہ دکھ میں تھا کہ اس کی بیوی، مہتاب احمد کی وجہ سے مری تھی۔"

"میں مانتی ہوں کہ مہتاب احمد کا رویہ ہم سب کے ساتھ بہت سخت تھا۔" بلقیس بیگم نے کہا۔

"آپ پانچوں ہی میری نظر میں قاتل تھے۔ لیکن قتل ایک نے کیا تھا۔" انسپکٹر جانباز نے کہا تو تینوں نے ہی اپنی اپنی نظریں چرا لیں۔

انسپکٹر جانباز دو قدم آگے بڑھ کر بلقیس بیگم کے پاس گیا اور بولا۔ "میں نے مہتاب احمد کے ٹیلی فون کی مکمل تفصیل نکالی۔ قتل والے دن ایک نمبر سے سب سے زیادہ فون آئے اور اسی نمبر پر سب سے زیادہ فون کیے گئے تھے۔"

"کس کا نمبر تھا وہ؟" بلقیس بیگم نے پوچھا۔

"لیکن ایک ایسا نمبر بھی تھا جس پر سے صرف ایک کال آئی تھی۔ اور وہ نمبر مجھے قاتل تک لے گیا۔" انسپکٹر جانباز بولا۔

تینوں چپ تھے۔ بلقیس بیگم کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ ساکت ایک طرف خالی خالی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اچانک جانباز بولا۔

"مہتاب احمد دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بارے میں آپ نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ جانتی ہیں وہ کون تھی؟" انسپکٹر جانباز نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" بلقیس بیگم نے پُرتجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ حریم تھی۔ اداکارہ حریم ...." انسپکٹر جانباز کے اس انکشاف نے تینوں کے ساتھ ساتھ نصیر الدین کو بھی چونکا دیا۔ "اُس دن مہتاب احمد کے کمرے کی تلاشی کے دوران مجھے دبئی کے دو ٹکٹ ملے تھے۔ ایک مہتاب احمد کے نام کا تھا اور دوسرا حریم کے نام پر تھا۔ شاید وہ ہنی مون کے لیے دبئی جانا چاہتے تھے۔" انسپکٹر جانباز نے رک کر اُن تینوں کی طرف دیکھا۔ بلقیس بیگم سے زیادہ حیرت میں ماہین تھی۔

کچھ توقف کے بعد انسپکٹر جانباز نے کہا۔ "اس شادی کا سب سے بڑا مخالف حریم کا باپ تھا۔ وہ سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے مہتاب احمد کو سمجھایا کہ وہ اس سے شادی نہ کرے۔ حریم پر بھی اس نے سختی کی لیکن دونوں بضد تھے۔ اس قصے کو ختم کرنے کے لیے بارش والی رات حریم کے باپ نے مہتاب احمد کو گولیاں مار دیں۔ اس دن کی مہتاب احمد کے فون کی لسٹ میں وہ نمبر حریم کے باپ کا تھا۔ جسے میں نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے شوٹنگ کے دوران اُٹھوایا اور اقرارِ جرم بھی کروا لیا۔"

انسپکٹر جانباز نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھا اور تینوں بھی اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ بلقیس بیگم نے انسپکٹر جانباز کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر کے بعد انسپکٹر جانباز اور نصیر الدین وہاں سے باہر آ گئے۔ نصیر الدین کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

"تمہارا چہرہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟"

"سر جی سارا دن میں آپ کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ کیا کرنے والے ہوتے ہیں، مجھے بھی نہیں پتا چلنے دیتے۔ حریم کے ابا کو آپ نے کب اور کیسے وہاں سے اٹھوایا، مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔ کم از کم مجھے تو بتا دیا کریں۔"

"اچھا آئندہ بتا دیا کروں گا.... لیکن کیس حل کرنے کے بعد۔" انسپکٹر جانباز خان نے کہا اور ہنستا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

زہرآلود سناٹا

سلیم فاروقی

ہماری ہلچل زدہ زندگی میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے... بظاہر ہمدرد... غمگسار اور دوست نظر آنے والے موقع پاتے ہی جان لینے سے دریغ نہیں کرتے... جرم کی منصوبہ بندی کرنے والے ایک ایسے ہی گروہ کی حیلہ سازیاں... ہر محاذ پر ان کی بدفطرتی اور عیاری عروج پر پہنچی ہوئی تھی...

جرم و سزا کے مراحل سے گزرتی ایک عبرت اثر تحریر سرورق پر ایک زہریلی کہانی...

"کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔" شہزاد نے گرج دار آواز میں کہا۔ "سب لوگ اوندھے منہ زمین پر لیٹ جائیں۔"

بینک میں اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ خواتین کی دبی دبی چیخیں نکل گئیں لیکن وہ سب پھرتی سے اوندھے منہ لیٹ گئے۔

شہزاد پھرتی سے کیشیئر کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی اکمل نے بینک منیجر اور دیگر اسٹاف کو باتھ روم کی طرف ہانک کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس سے پہلے وہ ان سب سے سیل فون لینا نہیں بھولا تھا۔

شہزاد نے بڑا سا کینوس کا ایک بیگ کیشیئر کی طرف بڑھایا اور کیشیئر کے پاس موجود تمام نوٹ اس تھیلے میں بھر لیے۔ اس دوران میں اکمل نے وہاں موجود افراد کے پرس اور موبائل چھین کر ایک تھیلے میں بھر لیے پھر شہزاد نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے گرج کر کہا۔ "پانچ منٹ تک سب اسی طرح پڑے رہیں۔ کسی نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

دوپہر کا وقت تھا، اس کے باوجود اس کاروباری علاقے میں خاصی رونق تھی۔ بینک میں صارفین کی تعداد بھی خاصی تھی اس کے باوجود ریوالور کی دہشت

ایسی ہوتی ہے کہ کسی نے ذرا چوں وچرا نہیں کی۔
بینک سے باہر ان کا تیسرا ساتھی رشید سفید رنگ کی ایک آلٹو میں موجود تھا۔ اس نے یہ آلٹو کچھ دیر پہلے ایک شاپنگ پلازا کے باہر سے چرائی تھی اور اس کی نمبر پلیٹس تبدیل کردی تھیں۔
شہزاد اور اکمل کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی برق رفتاری سے نکالی اور اسے گولی کی سی رفتار سے دوڑانے لگا۔
"سب سے پہلے تو ہمیں اس گاڑی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔" رشید نے کہا۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ تیز طرار اور ذہین تھا۔
"یار! وہ گارڈ پتا نہیں مر گیا یا زندہ ہے؟" شہزاد نے کہا۔ "میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے اس کے سر پر پڑا تھا۔"
"مر گیا تو مر گیا۔" رشید نے کہا۔ "اس وقت تمہاری شکل تو کسی نے نہیں دیکھی نا؟"
اس نے ایک شاپنگ پلازا کے سامنے گاڑی روکی۔ وہ تینوں گاڑی سے اُترے اور رقم کا بیگ لے کر ٹہلنے کے انداز میں ایک طرف چل دیے۔
کچھ ہی فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ رشید نے ٹیکسی ڈرائیور سے فیڈرل بی ایریا چلنے کو کہا اور وہ تینوں اس میں سوار ہو گئے۔ پھر وہاں سے وہ مختلف رکشا اور ٹیکسیاں بدلتے ہوئے گلستانِ جوہر کے ایک فلیٹ پر پہنچے۔
وہاں پہنچ کر رشید نے دروازہ اندر سے بولٹ کیا۔ پنکھا چلایا اور تکیے کے سہارے کارپٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ چند لمحے تک لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ وہ فلیٹ رشید کے کسی دوست کا تھا جو ان دنوں لاہور گیا ہوا تھا۔ فلیٹ میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔
رشید نے اکمل سے کہا۔ "فریج سے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں نکال لاؤ۔ پھر رقم گنتے ہیں۔"
کولڈ ڈرنکس پینے کے بعد رشید نے ایک مرتبہ پھر باہر کا جائزہ لیا۔ کوریڈور بالکل سنسان تھا۔ اس نے دوبارہ دروازہ بولٹ کیا اور شہزاد سے بولا۔ "رقم کا بیگ کارپٹ پر اُلٹ دو۔"
شہزاد نے بیگ کارپیٹ پر اُلٹ دیا۔ کمرے میں ہزار ہزار اور پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں بکھر گئیں۔ ان میں بہت سے سو اور پچاس روپے کے نوٹ بھی تھے۔ اس بیگ میں لوگوں سے چھینے ہوئے پرس اور موبائل فون بھی موجود تھے۔
اچانک اس میں سے دو تین موبائل فون بجنے لگے۔
"یہ موبائل فون کا پنگا تم لوگوں نے کیوں لیا؟ میرے ساتھ کام کر رہے ہو لیکن ابھی تک اُچکا پن نہیں گیا۔ ہمیشہ بڑا ہاتھ مارو بڑا۔ ان سیل فونز کو آف کرو اور ایک طرف پھینک دو۔"
اکمل اور شہزاد نے باری باری تمام سیل فونز آف کیے اور ایک طرف رکھ دیے۔ رشید اس دوران میں رقم گننے میں مصروف تھا۔ وہ سر اٹھا کر بولا۔ "یہ تقریباً پینتیس لاکھ روپے ہیں۔ تقریباً اس لیے کہ ان میں بارہ تیرہ ہزار والے اور سو سو روپے کے کئی نوٹ الگ سے بھی موجود ہیں۔ اب اس رقم کا حصہ کرلو۔ میں پندرہ لاکھ روپے لوں گا۔ باقی دس دس لاکھ

روپے تم لوگوں کے۔ اس کے علاوہ جو فاضل رقم ہے وہ بھی تم لوگ لے لینا۔"

"حصہ تو برابر ہونا چاہیے رشید بھائی۔" شہزاد نے کہا۔ وہ اکمل کے مقابلے میں کچھ زیادہ تند مزاج تھا۔

رشید نے گھور کے اسے دیکھا اور بولا۔ "یہ پلان کس کا تھا؟ ایک ہفتے تک بینک کے معمولات پر نظر کس نے رکھی۔ تمہیں وہاں سے نکال کر کون لایا؟ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے نا؟ میرا اتنا حق تو بنتا ہے۔"

"رشید بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اکمل نے کہا۔ "پلان تو انہی کا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" شہزاد نے دانت بھینچ کر کہا۔

رشید نے اپنے حصے کے پیسے الگ کیے، انہیں بڑے سے ایک بریف کیس میں رکھا اور بولا۔ "تم لوگ اپنے حصے کے پیسے گن لو۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "ہاں تم دونوں کو کچھ روز بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ فوراً ہی پیسے خرچ مت کرنا ورنہ فضول میں دوسروں کو شک ہوگا۔ میں آج شام کی فلائٹ سے دبئی جا رہا ہوں لیکن اس فلیٹ سے ہم ابھی نکلیں گے۔ تم لوگوں کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا ہے؟"

"ہاں گلشنِ اقبال میں میری ایک بیوہ خالہ رہتی ہیں۔ وہ اکثر مجھے اپنے گھر بلاتی بھی رہتی ہیں۔ میں کچھ دن تک ان ہی کے ساتھ رہوں گا۔"

"اور تم؟" رشید نے اکمل سے پوچھا۔

"اکمل بھی میرے ساتھ ہی رہے گا۔ میں خالہ سے کہوں گا کہ اکمل میرا دوست ہے اور لاہور سے کاروبار کے سلسلے میں کراچی آیا ہے۔"

رشید نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "تمہارے خیال میں اگر وہ محفوظ ٹھکانا ہے تو ٹھیک ہے، چلو اب نکلنے کی تیاری کرو۔"

وہ لوگ تازہ دم ہو کر ایک مرتبہ پھر اس فلیٹ سے نکلے۔ رشید نے فلیٹ کی چابی فلیٹ کے باہر رکھے ہوئے بڑے سے گملے کے نیچے چھپائی اور وہ تینوں بڑے سکون سے باہر نکل آئے۔

رشید نے ان دونوں سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ دبئی نہیں بلکہ سنگاپور جا رہا تھا۔ پانچ بجے اس کی فلائٹ تھی۔ اسے وہاں سے سیدھا ائرپورٹ پہنچنا تھا۔

مین روڈ پر آ کر رشید نے ایک مرتبہ پھر ان دونوں سے محتاط رہنے کو کہا اور ان سے الوداعی ملاقات کر کے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

شہزاد اور اکمل کے پاس وہی بیگ تھا جس میں وہ بینک سے لوٹی ہوئی رقم لائے تھے۔ شہزاد نے ایک رکشا روکا اور اس سے گلشنِ اقبال چلنے کو کہا۔

شہزاد کی خالہ اسے دیکھ کر نہال ہوگئیں اور بولیں۔ "چل تجھے اپنی بیوہ خالہ کی یاد تو آئی۔"

"یہ بات نہیں خالہ۔" شہزاد نے کہا۔ "میں تو بہت کوشش کرتا ہوں لیکن اتنا وقت ہی نہیں ملتا۔ اب لاہور سے میرا ایک دوست آیا ہے تو میں نے آفس سے چند دنوں کی چھٹی لے لی۔ ابو کی عادت تو آپ جانتی ہیں پھر ہمارے گھر میں اتنی گنجائش کہاں ہے کہ کسی مہمان کو بھی ٹھہرایا جائے۔"

"ارے تو یہ گھر بھی تو تیرا ہے۔ کہاں ہے تیرا دوست؟"

"وہ باہر کھڑا ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"باہر کھڑا ہے؟" خالہ نے گھورا۔ "تو اتنا بداخلاق کب سے ہوگیا۔ تیرا دوست بھی کیا سوچتا ہوگا کہ شہزاد کی خالہ کس قسم کی عورت ہے؟ ارے اسے اندر ڈرائنگ روم میں بٹھا۔ میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

خالہ کا ڈرائنگ روم صاف ستھرا اور خاصا آراستہ تھا۔

"شہزاد! تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری یہ خالہ بیوہ ہیں پھر یہ تمام اخراجات...؟"

"خالہ کی اچھی خاصی جائداد ہے۔ گلستانِ جوہر میں دو فلیٹ ہیں، گلشنِ اقبال میں چار دکانیں ہیں اور اس کمپلیکس میں بھی ان کا ایک فلیٹ ہے۔ ان سب کا کرایہ آتا ہے اور خالہ عیش کرتی ہیں۔"

"خالہ کی کوئی بیٹی یا بیٹا نہیں ہے؟" اکمل نے پوچھا۔

"خالہ کی ایک ہی بیٹی ہے شمسہ۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے دس سال پہلے کیوں پیدا ہوگئی؟ جب تک میں نے ہوش سنبھالا، اس کی شادی ہو چکی تھی ورنہ..." شہزاد اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا اور دونوں ہنسنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد خالہ نے ان کے لیے ایک کمرا بھی تیار کر دیا۔ کمرے سے ملحق ایک باتھ روم بھی تھا اور وہاں اسپلٹ بھی تھا۔

وہ دونوں نہا دھو کر بیڈ روم میں اسپلٹ کی خنکی میں بیٹھے مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ شہزاد نے کہا۔ "اب ہم کوئی بڑا ہاتھ ماریں گے تو کسی تیسرے کو شامل نہیں کریں گے۔ ساری محنت ہم نے کی، اپنی جان داؤ پر ہم نے لگائی اور لوٹی ہوئی رقم کا بڑا حصہ وہ رشید لے گیا۔ اگر ہم

وہاں پھنس جاتے تو رشید تو وہاں سے رفو چکر ہو جاتا اور بعد میں ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" اکمل نے کہا پھر چونک کر بولا۔ "یار! سب سے پہلے تو ہمیں اس بیگ، موبائل فونز اور لوگوں کے پرس ٹھکانے لگانے چاہئیں۔ رشید نے کہا تھا نا کہ ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"پرس تو ہم خالی کر کے کسی گندے نالے یا کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔" شہزاد نے کہا۔ "لیکن ان موبائل فونز کا کیا کریں؟ ان میں سے کئی تو بہت قیمتی ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کے تو ہوں گے۔"

"زیادہ لالچ مت کرو شہزاد!" اکمل نے کہا۔ "اس وقت تو میں نے جوش میں آ کر ان لوگوں کے پرس اور موبائل فون چھین لیے تھے لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ایسا کرتے ہیں آج رات ہی یہ بیگ اور دوسری تمام چیزیں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ واپسی پر ایک نیا بریف کیس اور بیگ خرید لیں گے۔"

شام کو شہزاد نے بیگ کی تمام رقم نکال کر ایک تکیے کے غلاف میں بھری اور اسے کپڑوں کی الماری میں چھپانے کے بعد اس میں تالا بھی لگا دیا۔

شام کو پُرتکلف چائے پینے کے بعد شہزاد نے لوٹی ہوئی رقم کا بیگ اور دیگر چیزیں ایک شاپر میں بھریں اور خالہ سے بولا۔ "خالہ! میں ذرا اپنے دوست کو کراچی کی سیر کرا دوں۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔"

"بیٹا! میں کھانا تیار رکھوں گی۔ تو جب بھی آئے گا میں... کھانا دے دوں گی۔"

"خالہ! کھانا تو ہم باہر ہی کھائیں گے۔ اکمل کو کراچی، برنس روڈ کے کھانوں کا بہت شوق ہے۔"

"چلو آج سہی۔" خالہ نے کہا۔ "لیکن روز ایسا نہیں ہوگا۔"

"خالہ! میں تو آپ کے ہاتھ کے کھانے بہت شوق سے کھاتا ہوں۔ مگر روز ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

پھر وہ دونوں فلیٹ سے باہر آ گئے۔ پہلے انہوں نے تمام چیزوں کو گندے نالوں اور کھلے مین ہولز میں ٹھکانے لگایا اور وہاں سے صدر کا رخ کیا۔ وہاں سے دو دو جوڑی کپڑے، چپلیں، ٹوتھ برش، بریف کیس اور بیگ خریدا اور برنس روڈ کا رخ کیا۔

وہاں انہوں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا، کھانا بھی اعلیٰ قسم کا۔ پھر کھیر کے دو دو پیالے کھانے کے بعد انہوں نے ہاضمے کے طور پر سیون اَپ کی ایک ایک بوتل پی اور ایک ایک پیکٹ امپورٹڈ اور مہنگی ترین سگریٹ کا پیکیٹ خریدا۔

"یار! اکمل!" شہزاد نے سگریٹ کا گہرا کش لگانے کے بعد کہا۔ "رشید نے کہا تھا کہ ہم کچھ دن تک بالکل باہر نہ نکلیں اور ہم ابھی سے عیاشی کرتے پھر رہے ہیں؟"

"یار! یہ تو ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "چلو اب واپس چلیں۔ میں خالہ سے بہانہ بنا دوں گا کہ اکمل کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اس لیے یہ بیچارہ تو اب کہیں گھومنے پھرنے کے قابل ہی نہیں رہا ہے۔"

وہ دونوں خلافِ معمول جلدی گھر پہنچے تو خالہ نے حیرت سے کہا۔ "شہزاد! تم نے مجھے بھی کھانا بنانے سے روک دیا اور..."

"آپ پریشان نہ ہوں خالہ۔" شہزاد نے کہا۔ "کھانا تو ہم نے کھا لیا ہے۔ اکمل کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اس لیے ہمیں جلدی واپس آنا پڑا۔ میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے ہمیں ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ اس نے کہا کہ اکمل کو انجائنا کا معمولی سا اٹیک ہوا ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے دوائیں دے دی ہیں اور اکمل کو ایک ہفتے تک مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اس حالت میں یہ بے چارہ گھر بھی نہیں جا سکتا۔"

"تو اسے گھر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ بھی تو گھر ہی ہے۔ یہاں آرام کرے۔ اپنے گھر والوں کو اطلاع دے دے کہ میں ابھی کچھ دن کراچی میں رہوں گا۔ انہیں بیماری کے بارے میں مت بتانا ورنہ فضول میں وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔" خالہ نے کہا۔ "اب تم آرام کرو۔ میں تم لوگوں کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں خالہ! بالکل گنجائش نہیں ہے۔ اصل میں ہم لوگوں نے وہاں کچھ زیادہ ہی کھا لیا ہے۔ اب ہم آرام کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے شہزاد نے اکمل کو آنکھ ماری۔

خالہ کے جانے کے بعد شہزاد نے الماری میں رکھی ہوئی رقم نکالی اور اسے بیگ میں منتقل کر رہا تھا کہ اکمل نے ٹی وی... آن کر دیا۔

کسی چینل سے ٹاک شو آ رہا تھا اور اینکر پرسن اختتامیہ کلمات ادا کر رہا تھا۔

"یار! اسے تو بند کر۔" شہزاد نے کہا۔ "وہی باتیں، وہی بک بک، اب تو یہ لوگ باقاعدہ لڑا کا عورتوں کی طرح

لڑنے بھی لگے ہیں۔''

''خبروں کا بلیٹن شروع ہونے والا ہے۔'' اکمل نے کہا۔ ''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بینک کا گارڈ مر گیا یا تمہاری ضرب سے صرف بے ہوش ہوا تھا۔''

نیوز بلیٹن شروع ہو گیا۔ دو تین ملکی اور بین الاقوامی خبروں کے بعد نیوز کاسٹر نے کہا۔ ''آج کراچی کے جس کاروباری علاقے میں ڈکیتی کی سنگین واردات ہوئی تھی، اس واردات میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں زخمی ہونے والے گارڈ کی حالت تشویش ناک ہے اور اسے انتہائی نگہداشت (ICU) کے شعبے میں رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ گارڈ کے سر پر کسی وزنی چیز سے وار کیا گیا ہے۔ آئندہ بارہ گھنٹے میں اگر اسے ہوش نہ آیا تو اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکو بینک سے چھیالیس لاکھ کی رقم لوٹ کر فرار ہو گئے۔ اس کے علاوہ تقریباً ستر ہزار روپے ان افراد کے بھی ہیں جو بینک سے کیش لے کر جانے والے تھے۔ سی سی ٹی وی کیمرے میں ڈاکوؤں کی فوٹیج تو ہیں لیکن ان کے چہروں پر نقاب تھے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ڈاکو جینز اور ٹی شرٹس میں ملبوس تھے اور اپنے لباس اور چال ڈھال سے پڑھے لکھے لگ رہے تھے۔''

''یار! یہ رشید تو ہمیں بھی چونا لگا گیا۔'' شہزاد نے کہا۔ ''اس کمینے نے ہمیں دس دس لاکھ دے کر ٹرخا دیا اور خود تقریباً ستائیس لاکھ روپے کی رقم لے اڑا۔''

''الو کا پٹھا!'' اکمل نے کہا۔ ''کہیں میرے ہاتھ لگ گیا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

شہزاد اس کی بات سن کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''بس اب سو جاؤ۔'' اس نے لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

صبح پُرتکلف ناشتا کرنے کے بعد وہ دونوں پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے۔ خالہ خاصی سوشل تھیں۔ وہ کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔

اچانک کال بیل کی آواز گونجی تو شہزاد چونک اٹھا اور تشویش سے بولا۔ ''یہ کون آ گیا؟''

''یار! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' اکمل نے کہا۔ ''تمہاری خالہ ہی ہوں گی۔''

''خالہ کے پاس ان کی اپنی چابی ہے۔ وہ کبھی اطلاعی گھنٹی بجا کر اندر نہیں آتیں۔'' شہزاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دوسری مرتبہ نہ صرف اطلاعی گھنٹی بجی بلکہ کسی نے انتہائی غیر مہذب انداز میں دروازے پر دستک بھی دی۔ اب اکمل بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا اور بولا۔

''شہزاد! مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ وہ الو کا پٹھا رشید جاتے ہوئے ہم سے ہماری پستولیں بھی لے گیا۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' شہزاد نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''

جواب میں باہر سے کوئی کرخت آواز میں بولا۔ ''پولیس! دروازہ کھولو۔''

اس کے پیچھے پیچھے اکمل بھی دروازے تک آ گیا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''دروازہ کھولتے ہو یا میں دروازہ توڑ دوں؟'' باہر سے پھر وہی گرجدار آواز سنائی دی۔

اب کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ فلیٹ سے نکاسی کا وہی واحد راستہ تھا۔ شہزاد نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی پولیس کا ایک انسپکٹر اور دو سپاہی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ پولیس انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ان دونوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

''تم لوگوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔'' پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ ''گرفتار کر لو انہیں۔''

سپاہی ہتھکڑیاں لے کر ان کی طرف بڑھے تو شہزاد نے تھوک نگل کر ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیے آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں اور...''

''بینک ڈکیتیاں کرتے ہیں۔'' انسپکٹر نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''بب... بینک ڈکیتی؟'' شہزاد نے کہا۔ ''کیسی... باتیں کر رہے ہیں آفیسر... ہم اور...''

''ہاں تم لوگوں نے کل بینک ڈکیتی کی ایک واردات میں چھیالیس لاکھ سے زیادہ رقم لوٹی ہے۔''

''انسپکٹر صاحب! یہ میری خالہ کا گھر ہے۔ وہ بیوہ خاتون ہیں اور دل کی مریض بھی ہیں۔ آپ نے ان کے سامنے ہم پر بینک ڈکیتی کا الزام لگایا تو انہیں دل کا دورہ بھی پڑ سکتا ہے، حرکت قلب بند بھی ہو سکتی ہے۔''

''یہ سب کچھ تو تم لوگوں کو ڈکیتی سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' پھر انسپکٹر نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ وہ سیکیورٹی گارڈ اسپتال میں آج دم توڑ گیا جسے تم نے زخمی کیا تھا۔''

''وس... سیکو... ر... ٹی... گارڈ۔'' شہزاد نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''لیکن ہم... کسی سیکیورٹی گارڈ کو نہیں جانتے۔''

''ابھی جان جاؤ گے۔'' انسپکٹر نے درشت لہجے میں

کہا۔ ”پہلے تو میں یہاں کی تلاشی لوں گا۔“
”لیکن... تلاشی... کے لیے تو... سرچ وارنٹ... کی... ضرورت ہوتی ہے۔“
جواب میں انسپکٹر کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔
”ہمیں قانون سکھاتا ہے، الو کا پٹھا! مسروقہ رقم تو خود دے گا تو فائدے میں رہے گا۔ ہمارا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا ورنہ رقم تو میں برآمد کر ہی لوں گا۔“
”اچھا ایک درخواست ہے۔“ شہزاد نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔ ”میں مسروقہ رقم بھی دے دوں گا لیکن آپ لوگ مجھے یہاں سے ہتھکڑی لگا کر نہ لے جائیں ورنہ خالہ کا...“
”ہارٹ فیل ہو جائے گا۔“ انسپکٹر نے جملہ پورا کر دیا۔ ”چل تو بھی کیا یاد کرے گا۔“ اس نے کہا۔ ”ابراہیم!“ اس نے ایک سپاہی کو مخاطب کیا۔ ”ان کی ہتھکڑیاں کھول دو اور اگر یہ فرار کی کوشش کریں تو انہیں بلا جھجک گولی مار دینا۔ پیر میں نہیں بلکہ کھوپڑی میں۔“
ابراہیم نے ان دونوں کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔
شہزاد انہیں اوپر کے کمرے میں لے گیا اور رقم سے بھرا ہوا بریف کیس اس کے حوالے کر دیا۔ بریف کیس لاک نہیں تھا۔ انسپکٹر نے اسے کھول کر اس کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”رقم تو میں پولیس اسٹیشن میں جا کر گن لوں گا اور پائی پائی ان کے حلق سے نکال لوں گا۔“
اسی وقت خالہ کی آواز آئی۔ ”شہزاد بیٹا! اوپر کچھ مہمان آئے ہیں کیا؟“
”جی خالہ! میرے دوست ہیں۔ یہ لوگ بہت جلدی میں ہیں۔ ہمیں ابھی ان کے ساتھ ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“
وہ لوگ نیچے آئے تو خالہ انسپکٹر کو دیکھ کر چونک اٹھیں لیکن انسپکٹر کے چہرے پر اس وقت مسکراہٹ تھی۔ خالہ نے بہت چاہا کہ وہ لوگ کم سے کم چائے ہی پی کر جائیں لیکن انسپکٹر راضی نہ ہوا اور بولا۔ ”مجھے ابھی ایک ضروری جگہ جانا ہے، یہ دونوں بھی میرے ساتھ جا رہے ہیں۔“
وہ خالہ کو ہکا بکا چھوڑ کر گھر سے باہر نکل گئے۔ بلڈنگ کے مین گیٹ کے پاس جدید ماڈل کی ایک ڈبل کیبن پک اپ کھڑی تھی۔ پولیس کے دو آدمی اس میں بھی موجود تھے لیکن وہ وردی کے بجائے سادہ لباس میں تھے۔ غالباً وہ سی آئی ڈی کے آدمی تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور دوسرا اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔

انسپکٹر نے شہزاد اور اکمل کو گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھایا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔
چند کلومیٹر چلنے کے بعد انسپکٹر نے اچانک شہزاد کی آنکھوں پر بلائنڈ فولڈر باندھا تو اس نے ہلکا سا احتجاج کیا لیکن ریوالور کی نال اپنی کمر پر محسوس کر کے وہ خاموش ہو گیا۔ اکمل نے پہلے ہی ریوالور کی جھلک دیکھ لی تھی اس لیے وہ بھی خاموش رہا۔
”انسپکٹر صاحب!“ شہزاد نے کچھ دیر بعد زبان کھولی۔ ”آپ ہمیں کس پولیس اسٹیشن میں لے جا رہے ہیں؟“
جواب میں اس کے منہ پر انسپکٹر کا بھرپور تھپڑ پڑا اور بولا۔ ”خاموشی سے بیٹھا رہ۔“
پھر شہزاد یا اکمل میں سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔
گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ اب گاڑی پختہ اور ہموار سڑک کے بجائے کچے راستے پر چل رہی تھی۔ دس منٹ بعد گاڑی ایک جگہ رک گئی اور ڈرائیور نے مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔ شہزاد کے کانوں میں کسی آہنی گیٹ کے کھلنے کی آواز آئی اور ان کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ شہزاد نے گیٹ بند ہونے کی آواز سنی۔
پھر گاڑی ایک جگہ رک گئی اور شہزاد اور اکمل کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا گیا۔ پھر کسی نے شہزاد کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندھوں کی طرح ایک طرف لے چلا۔
ایک جگہ پہنچ کر انسپکٹر نے ان کی آنکھوں کی پٹیاں کھول دیں۔ کمرے میں ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی تھی اس لیے ان دونوں کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ چند سیکنڈ بعد جب وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوئے تو انہیں وہی انسپکٹر نظر آیا۔
”یہ پولیس کا لاک اپ تو نہیں ہے۔“ شہزاد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کے کسی بھی سوال کا جواب تھپڑ کی صورت میں موصول ہوگا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ انسپکٹر مسکرا کر بولا۔
”یہ واقعی لاک اپ نہیں ہے لیکن تم اسے لاک اپ ہی سمجھو۔“
ابھی اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ کمرے میں ایک خوب رو جوان داخل ہوا۔ اس کا جسم کسرتی اور قد دراز تھا۔ اس نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ کے نیچے سے شہزاد کو اس کی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی گن نظر آ رہی تھی۔
نوجوان کے پیچھے پیچھے کمرے میں ادھیڑ عمر کا ایک

شخص داخل ہوا۔ اس کا جسم بھاری بھرکم تھا لیکن بے ڈول نہیں تھا پھر کمرے میں ایک لڑکی داخل ہوئی۔ شہزاد کو ایسا لگا جیسے کمرے میں چاند نکل آیا ہو۔ وہ لڑکی انتہائی خوب صورت تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور بال براؤن اور جلد کی رنگت میدے کی طرح سفید تھی۔ اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان میں ایک خوب صورتی تھی۔ انہیں اتنی خوب صورتی سے تراشا گیا تھا کہ لڑکی کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ لڑکی نے ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پر چست جینز پہن رکھی اور اس کے پیروں میں لانگ شوز تھے۔

''باس! میں نے آخرکار ان لوگوں کو تلاش کر ہی لیا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''مسروقہ رقم کہاں ہے؟'' باس نے پوچھا۔

انسپکٹر نے وہ بریف کیس آگے کر دیا جس میں رقم بھری ہوئی تھی۔

''رقم دیکھو طاہر!'' ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''پوری ہے یا اس کا کچھ حصہ ان لوگوں نے کہیں چھپا دیا ہے؟''

خوب رو نوجوان کا نام طاہر تھا۔ وہ رقم گننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ رقم گن کر بولا۔ ''زمان صاحب! اس میں تقریباً چھبیس لاکھ کم ہیں۔''

پھر وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''نادر خان! تم نے ان کے گھر کی اچھی طرح تلاشی تو لی تھی نا؟''

نادر گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''یس باس! میں نے ان کے گھر کی بہت اچھی طرح تلاشی لی تھی۔'' یہ کہہ کر نادر کمرے سے نکل گیا۔

''شمو ڈارلنگ!'' طاہر نے کہا۔ ''اب تم ہی ان لوگوں سے پوچھو کہ بقیہ رقم ان لوگوں نے کہاں چھپائی ہے؟''

''ہم نے وہ رقم کہیں نہیں چھپائی ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ وہ مردانہ وجاہت کے لحاظ سے کسی بھی طور طاہر سے کم نہیں تھا۔ ''اگر آپ ہمارے بارے میں جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارا ایک ساتھی اور بھی تھا۔ واردات کے بعد رقم بھی اسی نے گنی تھی اور ہمیں بتایا تھا کہ یہ تقریباً پینتیس لاکھ روپے ہیں۔ وہ اس منصوبے کا ماسٹر مائنڈ تھا اس لیے اس نے کہا کہ پندرہ لاکھ روپے میں لوں گا اور دس دس لاکھ تم دونوں کو دوں گا۔ ہم نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور اس نے دس دس لاکھ روپے ہمیں دے کر بقیہ رقم خود رکھ کر یہاں سے رفوچکر ہو گیا۔''

طاہر نے کہا۔ ''ہاں، اس حد تک تو یہ درست کہہ رہا ہے کہ ان کا ایک تیسرا ساتھی بھی تھا۔''

''اس کا ایڈریس یا کسی ٹھکانے کا پتا ہے؟'' لڑکی نے پہلی دفعہ اپنی زبان کھولی۔ اس کی آواز بھی اس کے پُرکشش چہرے اور جسم کی طرح بہت خوب صورت تھی۔

''اس نے ہم سے کہا تھا کہ میں شام کی فلائٹ سے دبئی جا رہا ہوں۔ اب تک تو وہ دبئی میں کہیں گم ہو چکا ہوگا۔''

''اس کا نام کیا ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''اس کا نام رشید ہے۔''

''شائلہ!'' زمان نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، ان کی یہ کہانی سچی ہے؟''

''بظاہر تو سچی ہی لگ رہی ہے۔'' شائلہ نے کہا۔

''یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ رشید تم دونوں کو چھوڑ کر کہاں گیا۔'' طاہر نے کہا۔ ''بینک کے باہر ہمارے جو آدمی تھے انہوں نے رشید کو پہچان لیا تھا۔ وہ گاڑی بھی چوری کی تھی جس میں تم لوگوں نے واردات کی ہے۔''

''ہاں، وہ بھی رشید ہی کہیں سے اٹھا کر لایا تھا۔''

''دیکھو شہزاد!'' زمان نے رسان سے کہا۔ ''ہماری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ پرابلم یہ ہے کہ وہ بینک ہمارا ٹارگٹ تھا۔ اسے لوٹنے کے سارے انتظامات مکمل تھے کہ بیچ میں تم لوگ کود پڑے۔''

''تو کیا آپ کا تعلق پولیس سے نہیں ہے؟'' شہزاد نے جان بوجھ کر خود کو انجان اور احمق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

اس کی بات پر شائلہ نے ایک مترنم قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''رشید اگر تم لوگوں کو ڈبل کراس کر گیا ہے تو اس میں اس کا قصور نہیں بلکہ تمہارا ہے۔ سارا رسک تم نے اٹھایا اور حلوہ وہ کھا گیا۔'' شائلہ کے لہجے میں تضحیک تھی۔ ''تم اب تک ہمیں پولیس والا ہی سمجھ رہے ہو۔ تمہیں تو اسی وقت اندازہ ہو جانا چاہیے تھا جب تم راستے میں تھے۔''

''ارے، تم لوگ ابھی تک کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہارے دوست ہیں، دشمن نہیں ہیں۔'' طاہر نے کہا۔

''دوست، پولیس کے بھیس میں دوستوں کو گرفتار کر کے نہیں لاتے۔'' شہزاد کا لہجہ تلخ تھا۔

''اسے ہماری مجبوری سمجھ کر معاف کر دو۔'' طاہر نے کہا۔ ''شریفانہ طریقے سے تو تم لوگ آتے بھی نہیں۔''

''مجھے ایک بات بتائیں۔'' شہزاد نے سرد لہجے میں پوچھا۔ اس کا اعتماد اب پوری طرح بحال ہو چکا تھا۔ ''ہم پر آخر اتنی مہربانی کیوں؟''

''اصل میں ہم خود بھی ایک بہت بڑا ہاتھ مارنے کا

پلان بنا رہے ہیں۔'' زمان نے کہا۔ ''اتنا بڑا پلان کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں تم ہی جیسے جی دار اور نڈر لوگوں کی ضرورت ہے۔''

''تمہارے پاس ایسے لوگوں کی کمی ہے کیا؟'' شہزاد آپ سے تم پر آ گیا۔

''حقیقت بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی کمی ہے۔'' زمان نے گویا اعتراف کیا۔

''اور اگر ہم کام کرنے سے انکار کر دیں تو؟'' شہزاد نے کہا۔

''تو کچھ نہیں۔'' طاہر نے کہا۔ ''پھر تمہیں بینک ڈکیتی کے ساتھ ساتھ گارڈ کے قتل کا کیس بھی بھگتنا ہوگا۔''

شہزاد کے مقابلے میں اکمل خاصا ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن موقع دیکھ کر کاری وار کرنے کا عادی تھا۔ اس کے برعکس شہزاد بہت جلد طیش میں آ جانے والا تُند خو جوان تھا۔ اکمل اب تک خاموش تھا۔ وہ بہت غور سے ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان لوگوں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

''شمو ڈارلنگ۔'' طاہر نے ہنس کر کہا۔ ''تم اتنی بداخلاق کب سے ہو گئیں؟ یہ ہمارے مہمان ہیں، کچھ چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔''

اس کے جانے کے بعد شہزاد نے کہا۔ ''مسٹر طاہر! یہ مس شائلہ کیا ہمیشہ یونہی سبز لال بنی رہتی ہیں؟''

''شائلہ ابھی ایک ضروری کام سے جا رہی تھی لیکن تم لوگوں کی وجہ سے رک گئی۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''لوگ اسے نرم و نازک سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں۔ شائلہ مارشل آرٹ میں ماہر ہے۔''

''اونہہ۔'' شہزاد نے کہا۔ ''آج کل تو بچہ بچہ منہ سے ''او، آ'' کی آوازیں نکال کر خود کو مارشل آرٹ کا ماہر سمجھتا ہے۔''

''لگتا ہے تم خود بھی مارشل آرٹ کے ماہر ہو؟'' طاہر ہنس کر بولا۔

''میں ماہر تو نہیں کہوں گا لیکن حلق سے بے معنی آوازیں نکالنے اور بندر جیسے پوز بنانے والوں سے بہرحال بہت زیادہ جانتا ہوں۔''

''اور تم؟'' اس نے اکمل سے پوچھا۔

''میں بھی مارشل آرٹ اتنا ہی جانتا ہوں جتنا شہزاد جانتا ہے۔'' اکمل نے کہا۔

اس وقت ایک پولیس والا چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس وقت اس کے جسم پر شلوار سوٹ تھا لیکن چہرے پر وہی مکروہ مسکراہٹ تھی جو شہزاد کو وردی میں نظر آئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے شائلہ بھی اٹھلاتی ہوئی آ گئی۔ اس کے پیروں میں اب بھی لانگ شوز تھے۔ جینز کی جگہ البتہ اس نے اسکرٹ اور بلاؤز پہن لیا تھا۔

''چائے لیں، پلیز۔'' طاہر نے کہا۔

شہزاد نے چائے کی پیالی اٹھالی۔ زمان ان لوگوں کی طرف سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ شہزاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زمان کے کردار کو کہاں فٹ کرے۔

''اب تم سوچ رہے ہو گے کہ تمہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' طاہر نے کہا۔

شہزاد نے بے نیازی سے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دو تو ہمارا یہ ٹھکانا تمہارے علم میں نہ آئے۔'' طاہر نے کہا۔

''تم نے بتایا ہے کہ جس وقت ہم یہ واردات کر رہے تھے تمہارے آدمی ہماری نگرانی کر رہے تھے؟'' شہزاد نے الجھ کر پوچھا۔

''ہاں، ہمارے آدمی وہاں موجود تھے۔'' طاہر نے کہا۔

''تو پھر ان لوگوں نے اس وقت ہمیں کیوں نہیں روکا، پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''ہم اپنے ہم پیشہ لوگوں سے خود نمٹتے ہیں، پولیس کے کندھے پر بندوق رکھ کر نہیں چلاتے۔ یہ ہمارا اصول ہے۔''

''اچھا فرض کرو، ہم راضی ہو جائیں۔'' اکمل نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس میں تمہیں کروڑوں کا فائدہ ہوگا اور تمہاری رقم تو تمہیں واپس مل ہی جائے گی۔''

''کروڑوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''اس آپریشن کے بعد تمہیں اور تمہارے ساتھی کو دو دو کروڑ ملیں گے۔''

''دو دو کروڑ؟'' شہزاد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''اتنی بڑی رقم صرف اسٹیٹ بینک میں ہی ہوتی ہے۔''

''ہاں، لیکن ہمارا بینک لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' طاہر نے کہا۔

''تو پھر تمہارا کیا پلان ہے؟ کیا اغوا برائے تاوان؟''

"اگر تم ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو تمہیں تفصیلات بھی بتادی جائیں گی۔ دوسری صورت میں تمہاری رقم دے کر تمہیں یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا پھر تم جانو اور پولیس جانے۔ تم بار بار بھول جاتے ہو کہ اب اس ڈکیتی کی واردات میں ایک قتل کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔"

اکمل نے غیر محسوس طریقے پر شہزاد کو آنکھ ماری کہ ان کی پیشکش قبول کر لو۔

"ہمیں کچھ سوچنے کی مہلت تو دو۔" شہزاد نے کہا۔

"ہاں ہاں، اچھی طرح سوچ لو۔ میں اور شائلہ یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ زمان صاحب کو بھی لے جائیں گے۔ تم اکیلے میں اچھی طرح مشورہ کرو، سوچو، پھر اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔"

وہ لوگ ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں شہزاد اور اکمل تھے۔

"کیا خیال ہے اکمل؟" شہزاد نے کہا۔ "ہم تو خود ہی کوئی لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں ہیں۔ اب ان لوگوں کا ساتھ دینے میں ہمیں اگر ایک معقول رقم مل رہی ہے تو ہم..."

"لیکن کام کی نوعیت اہم ہے۔" اکمل نے کہا۔ "ممکن ہے وہ لوگ کوئی اغوا برائے تاوان کا منصوبہ بنا رہے ہوں، ممکن ہے وہ اسلحے کی اسمگلنگ کا کوئی کام کرنا چاہ رہے ہوں؟" اکمل نے کچھ توقف کیا پھر بولا۔ "تم یہ سارے کام کرنے کو تیار ہو؟"

"دیکھو اکمل بینک ڈکیتی بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں بھی ہر لمحہ موت کا خطرہ رہتا ہے۔ خطرے میں گھرا ہوا انسان یا تو مار دیتا ہے یا خود مارا جاتا ہے، پھر یہ کون سا نیک اور جائز کام ہے؟"

"اگر تم راضی ہو تو ٹھیک ہے، میں بھی یہ خطرہ مول لوں گا۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد شائلہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "تم لوگوں نے یقیناً اب تک کوئی فیصلہ کر لیا ہو گا؟"

"ہاں، لیکن وہ طاہر صاحب اور زمان صاحب کہاں ہیں؟" شہزاد نے پوچھا۔

"وہ بھی آرہے ہیں۔" شائلہ نے جواب دیا۔

اسی وقت طاہر اور زمان کمرے میں داخل ہوئے۔ طاہر، شہزاد اور اکمل کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے کوئی بہتر فیصلہ کیا ہے۔"

"لیکن ہمیں کام کی نوعیت کا علم تو ہونا چاہیے۔" شہزاد نے کہا۔ "اور ہمیں کس کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ اس ٹیم کا ہیڈ کون ہے؟"

"دیکھو، ہماری ٹیم میں کل پانچ آدمی ہیں۔ تم دونوں بھی اگر اس میں شامل ہو جاؤ گے تو ہم سات ہو جائیں گے۔ زمان صاحب بہت تجربہ کار بیرسٹر ہیں۔ یہ اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں لیکن ان کا دماغ آج بھی اسی طرح کام کرتا ہے۔ سارا منصوبہ انہی کا ہے۔ رہی بات ٹیم لیڈری کی تو میں اس ٹیم کا لیڈر ہوں۔ ہماری ٹیم میں شائلہ، نادر اور غفور شامل ہیں۔"

"تم نے یہ تو بتا دیا کہ زمان صاحب وکیل ہیں لیکن بقیہ لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" شہزاد نے کہا۔

"بقیہ لوگ وہی کام کرتے ہیں جو تم لوگ کرتے ہو۔" طاہر مسکرا کر بولا۔ "تم لوگ پہلے اپنے بارے میں بتاؤ؟"

"ہم لوگ کیا بتائیں؟" اکمل نے کہا۔ "تم تو پہلے ہی سب کچھ جانتے ہو۔"

"ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ تم لوگوں نے بینک ڈکیتی کی ہے اور بس..."

"ہم لوگ کوئی باقاعدہ جرائم پیشہ نہیں ہیں۔" شہزاد نے کہا۔ "مجبوری میں دو چار وارداتیں کی ہیں۔ میں یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں۔ اکمل بھی میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ گزشتہ تین سال سے ہم ملازمت کے لیے دھکے کھا رہے تھے۔ پھر جب نوبت فاقوں تک آ گئی تو تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق ہمیں ایسا کرنا پڑا۔"

"لیکن پڑھے لکھے شریف لڑکے ایسے نہیں ہوتے۔" زمان صاحب نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

"اب ایسے ہی ہوتے ہیں۔" اکمل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ہم دوسروں سے ذرا مختلف اس لیے ہیں کہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں مارشل آرٹ کی تھوڑی سدھ بدھ حاصل کر لی تھی۔ وہ بھی محض شوقیہ۔ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں آزاد قبائل کا ایک لڑکا بھی رہتا تھا۔ اس سے دوستی ہوئی تو کچھ ہتھیار وغیرہ چلانا سیکھ لیے۔"

"تم لوگوں کا نشانہ کیسا ہے؟" زمان نے پوچھا۔

"بس واجبی سا ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"اب تم کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ؟" اکمل نے طاہر سے کہا۔

"میری کہانی بھی تم لوگوں سے مختلف نہیں ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ میں نے غربت اور مفلسی نہیں دیکھی بلکہ میرے کروڑپتی باپ نے مجھے دھکے مار کے اپنے گھر سے

نکال دیا۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے باپ کو کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ پھر میری ملاقات وکیل صاحب سے ہو گئی۔ شمائلہ اور غفور ان کے ساتھ پہلے سے کام کرتے تھے۔ نادر میرے بعد آیا ہے۔ شمائلہ ہے تو نرم و نازک سی لڑکی لیکن وہ مارشل آرٹ کے ساتھ ساتھ نشانے بازی اور ڈرائیونگ میں بھی ماہر ہے۔ انگلش سمیت کئی مقامی زبانیں وہ فراٹے سے بولتی ہے۔ غفور اور نادر خان کا ریکارڈ بھی ایسا ہی ہے۔''

''یعنی وہ بھی شمائلہ کی طرح...'' شہزاد نے کہا۔

''نہیں، میرا مطلب ہے کہ انہیں زمان صاحب نے مختلف مقدمات میں جیل سے بچایا ہے۔''

''اچھا، یہ تو تعارف ہو گیا۔'' شہزاد نے کہا۔ ''اب ذرا کام کی بات بھی ہو جائے۔''

''کام کی بات زمان صاحب سمجھائیں گے۔'' طاہر نے کہا۔

زمان صاحب، ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''تم لوگ میرے نزدیک آجاؤ۔''

جب شہزاد اور اکمل زمان اس کے نزدیک جا کر بیٹھے تو اس نے سگار سلگایا اور گہرا کش لے کر بولا۔ ''دیکھو، کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے لیکن آسان بھی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ نڈر اور بے باک لوگ ہو اس لیے گھبراؤ گے نہیں۔''

''زمان صاحب!'' شہزاد نے کہا۔ ''تمہید باندھنے کے بجائے اصل بات پر آئیں۔ ہر غیر قانونی کام میں خطرات تو ہوتے ہیں۔''

زمان نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور اس کا خوشبودار دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ماریہ کا نام سنا ہے... ماریہ موتی والا؟''

''ماریہ موتی والا؟'' شہزاد نے کہا۔ ''ہاں، میں نے صرف نام ہی سنا ہے۔ آج تک کبھی دیکھا نہیں ہے لیکن اس کا یہاں کیا تذکرہ؟''

''وہ ملک کے ایک ارب پتی بزنس مین کی بیٹی ہے۔'' زمان نے کہا۔ ''اس کا باپ نہ صرف ملک میں کئی ملز کا مالک ہے بلکہ اس کی خاصی بڑی شپنگ کمپنی بھی ہے۔ تم نے سیٹھ نظام دین موتی والا کا نام تو سنا ہوگا؟''

''اس کی تصویریں بھی اخبارات میں دیکھی ہیں اور وہ اکثر ٹی وی کے ٹاک شوز میں بھی دکھائی دیتا ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''ماریہ، سیٹھ موتی والا کی اکلوتی بیٹی ہے۔'' زمان نے پھر سگار کا ایک کش لینے کے بعد کہا۔

''یار! صاف صاف بات کرو۔'' شہزاد نے جھنجلا کر کہا۔ ''مجھے ماریہ یا سیٹھ موتی والا کا شجرہ کیوں بتا رہے ہو؟''

''اس لیے کہ ہم اسی ماریہ کو تاوان کے لیے اغوا کرنے والے ہیں۔'' زمان نے اطمینان سے کہا۔

شہزاد نے بے اختیار کہا۔ ''کیا... کیا تم لوگ ماریہ کو اغوا کرنے والے ہو؟'' اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے زمان نے اس کے سر پر لٹھ ماردی ہو۔

''تمہارا چہرہ زرد کیوں پڑ گیا؟'' زمان ہنس کر بولا۔

''میں خوف زدہ نہیں ہوں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''بینک ڈکیتی سے زیادہ پولیس اور انٹیلی جنس ایجنسیز کی توجہ اغوا برائے تاوان پر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بڑے اور صاحب اقتدار لوگ ہی اس کا شکار ہوتے ہیں۔''

''اسی میں تو مزہ ہے۔'' زمان نے کہا۔ ''بینک لوٹنا یا کسی بنگلے میں ڈکیتی کرنا کوئی کمال نہیں ہے۔''

شہزاد نے سوچا۔ 'تم تو یہاں بیٹھے بیٹھے محض سگار پھونکتے رہو گے۔ مشکل حالات سے تو ہم گزریں گے۔'

''کیا سوچنے لگے؟'' زمان نے کہا۔ ''کیا تمہیں اس پلان پر کوئی اعتراض ہے یا...''

''میں ایک دفعہ زبان دے دوں تو پھر اس سے پھرتا نہیں ہوں۔''

''تم کیا کہتے ہو؟'' زمان نے اکمل سے پوچھا۔

''مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اکمل نے کہا۔ ''جب شہزاد نے ہامی بھر لی تو سمجھو کہ میں بھی راضی ہوں۔''

''گویا یہ بات طے ہو گئی کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو؟'' زمان بولا۔

''اب یہ تو بتا دو کہ ہم لوگ اس وقت شہر کے کس حصے میں ہیں؟'' اکمل نے پوچھا۔

''یہ بھی بتا دیں گے۔'' زمان نے سگار کا دھواں حلق سے خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم لوگوں کو ہماری ایک بات ماننا ہوگی۔''

''یار! اب تک تمہاری باتیں ہی تو مان رہے ہیں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''ابھی مزید کوئی بات ہے؟''

''ہاں۔'' طاہر نے کہا۔ ''جب تک یہ آپریشن مکمل نہیں ہو جاتا، تم لوگ یہاں سے باہر نہیں جاؤ گے۔''

''وہاٹ؟'' شہزاد نے بپھر کر کہا۔ ''ہم پر اتنی ہی

بداعتمادی ہے تو یہ گاڑی کیسے چلے گی؟"

"جذباتی مت بنو شہزاد۔" طاہر نے کہا۔ "بات بداعتمادی کی نہیں بلکہ یہ احتیاط ہے۔"

"یہ احتیاط تم بھی تو کرو۔" اکمل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس وقت تک باہر جانے کی اجازت نہیں ہو گی جب تک ہمارا آپریشن مکمل..." طاہر کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اکمل نے بالکل اچانک اس پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پسٹل نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا تھا۔ "تو کیا سمجھتا ہے؟" وہ بپھر کر بولا۔ "ہمیں یہاں قید کر لے گا؟"

اسی وقت شہزاد نے کافی کا کپ اٹھا کر شائلہ کی کلائی پر مار دیا۔ اس نے بہت پھرتی سے پسٹل نکالا تھا اور اکمل پر فائر کرنا چاہتی تھی۔ اس کے منہ سے سریلی سی ایک چیخ نما آواز نکلی اور پسٹل ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شہزاد نے جھپٹ کر وہ پسٹل اٹھالیا۔

"ہمیں اتنا ہلکا مت لو طاہر صاحب۔" اکمل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں اگر رشید نے بے وقوف بنا دیا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم موم کے بنے ہوئے ہیں۔"

"تم ہمیں یہاں قیدی بنا کر رکھو گے؟" شہزاد نے زمان سے پوچھا۔ "اس سے پہلے ہی ہم تم سب کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیں گے۔" شہزاد نے شائلہ کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

"تم لوگوں کو شاید اپنی جان پیاری نہیں ہے۔" زمان نے سگار ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا لیکن اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"مجھے اپنی جان پیاری ہے یا نہیں لیکن اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے کے بجائے انہیں سر پر رکھ لو ورنہ مجھے تمہاری جان ہرگز پیاری نہیں ہے۔"

سگار ہاتھ سے رکھنے کے بعد زمان بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا رہا تھا۔ شہزاد کی دھمکی سن کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔

"تم لوگوں کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔" طاہر نے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم لوگ یہاں قیدی ہو۔ میں تو صرف احتیاطاً ایسا کہہ رہا تھا۔"

"ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ "آپریشن" کی تکمیل تک تم لوگ کم سے کم لوگوں کی نظروں میں آؤ۔" زمان نے کہا۔ "تم لوگ ابھی ضروری کام کے لیے جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ ہماری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔"

"اگر یہ تمہاری کوئی چال ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "تو یاد رکھنا، میں مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن اپنے ساتھ کم سے کم تین آدمیوں کو تو لے مروں گا۔"

"اور تمہارا سارا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔" اکمل نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے دوستو۔" زمان نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "اگر ہمارے دل میں ذرا بھی کھوٹ ہوتا یا بدنیتی ہوتی تو ہم کبھی تمہیں اپنے منصوبے سے آگاہ نہ کرتے۔ جو ساتھی کسی منصوبے میں شریک ہوں، انہیں بھلا قید رکھا جا سکتا ہے؟"

شہزاد نے پسٹل والا ہاتھ جھکا لیا۔ اکمل نے بھی طاہر کو آزاد کر دیا۔

شائلہ ابھی تک فرش پر پڑی تھی۔ شہزاد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا تو وہ برا سا منہ بنا کر اٹھ گئی۔ اس کے خوب صورت ہونٹ پھٹ گئے تھے اور منہ سے خون بہہ کر دائیں جانب گردن کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ وہاں رکی نہیں بلکہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

"تم لوگوں نے ثابت کر دیا کہ ہم نے غلط لوگوں کا انتخاب نہیں کیا ہے۔"

"اب ذرا اس آپریشن پر بھی بات ہو جائے جو ہم کرنے جا رہے ہیں۔" شہزاد نے کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" طاہر نے کہا۔ "ہمارے چند ساتھی بھی آجائیں تو..."

"لیکن مجھے جلدی ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "میری خالہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ تو ذرا سی دیر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔"

"تو پھر ایسا کرو کہ تم اپنی خالہ سے مل آؤ۔ ان سے کہنا کہ تم ایک، دو ہفتے کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہو۔" زمان نے کہا۔ "آنے جانے میں تمہیں مشکل سے ایک گھنٹا لگے گا۔"

"ایک گھنٹا؟" شہزاد چونک کر بولا۔

"ہاں، ہم اس وقت نارتھ ناظم آباد کے بلاک اے میں ہیں۔ تمہیں یہاں لاتے وقت ہم نے جان بوجھ کر گاڑی کو اتنے چکر دیے اور اتنی دیر تک چلایا کہ تم دھوکا کھا گئے۔"

شہزاد اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو پھر میں ابھی خالہ سے مل کر آتا ہوں۔" وہ اکمل سے مخاطب ہوا۔ "چلو اکمل۔"

"غفور تمہیں گاڑی سے لے جائے گا۔" زمان نے

کہا۔

وہ کمرے سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ شائلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اس وقت بھی جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی، پیروں میں جوگرز تھے۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

اس نے گھور کے شہزاد کو دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، شائلہ نے اچھل کر ایک فلائنگ کک اس کے سینے پر مارنے کی کوشش کی جو شہزاد کے غیر شعوری طور پر بچنے کی وجہ سے اس کے شانے پر پڑی۔ وہ لات اتنی زوردار تھی کہ شہزاد الٹ کر پیچھے کی طرف گر گیا۔

اکمل اور طاہر نے درمیان میں آنے کی کوشش کی لیکن شائلہ نے چیخ کر کہا۔ ''کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔ اس کی اتنی جرأت کہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ اسے ابھی اندازہ نہیں ہے کہ شائلہ کس بلا کا نام ہے۔ تم لوگ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔''

شہزاد اس وقت تک کھڑا ہو چکا تھا لیکن دائیں بازو میں اسے شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اس دھان پان سی لڑکی کی لات، بہت زوردار تھی۔

شائلہ نے دوبارہ اچھل کر شہزاد کو لات مارنے کی کوشش کی لیکن اب وہ ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے اس نے جھکائی دے کر خود کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کا پیر بھی پکڑ لیا۔ شائلہ نے حیرت انگیز پھرتی سے اپنے دوسرے پیر سے کام لیا اور شہزاد کو ایک مرتبہ پھر زمین چاٹنا پڑی۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ شائلہ واقعی مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔

پھر شہزاد کے اٹھنے سے پہلے ہی شائلہ نے اچھل کر اس کے سینے پر پوری قوت سے لات مارنے کی کوشش کی لیکن شہزاد بھی پھرتی سے قلابازی کھا گیا اور اس نے لیٹے ہی لیٹے شائلہ کی دونوں پنڈلیوں کو نشانہ بنایا۔ وہ سر کے بل فرش پر گری تو شہزاد نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اپنی کہنی سے اس کے سینے پر زوردار ضرب لگائی۔

شائلہ کے حلق سے ایک مرتبہ پھر سریلی سی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ پھر شہزاد نے اس کے خوب صورت چہرے پر زوردار گھونسا مارنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور اسے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا؟'' زمان نے کہا۔ ''کہ تم مارشل آرٹ میں سدھ بدھ رکھتے ہو؟''

''میں نے جھوٹ نہیں بولا۔'' شہزاد نے کہا۔ ''میں اب بھی یہی کہوں گا کہ مجھے مارشل آرٹ میں مہارت حاصل نہیں ہے۔ ہاں، شائلہ واقعی اس آرٹ میں ماہر ہے پر بس اتفاق ہے کہ یہ مجھے بالکل اناڑی سمجھ کر مار کھا گئی ورنہ اس وقت اس کی جگہ میں فرش پر پڑا ہوتا۔'' شہزاد نے ایک مرتبہ پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔

چلتے وقت شہزاد نے کہا۔ ''کیا غفور کا ہمارے ساتھ جانا ضروری ہے؟''

''ایسا ضروری بھی نہیں ہے۔'' طاہر کے بجائے زمان نے جواب دیا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد زمان نے طاہر سے کہا۔ ''غفور سے کہو کہ ان دونوں کی نگرانی کرے لیکن انہیں شبہ تک نہ ہو۔''

طاہر اسی وقت باہر نکل گیا۔ وہ غفور کو ہدایات دے کر واپس آیا تو زمان اپنا سگار سلگا رہا تھا۔ اس نے زمان سے کہا۔ ''میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آخر ان دونوں لڑکوں کو ٹیم میں شامل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ میں مانتا ہوں کہ دونوں بہت جی دار ہیں، ذہین بھی ہیں لیکن ان سے ہمیں فائدہ کیا پہنچے گا؟''

''تم ابھی میری چالوں کو سمجھ نہیں سکو گے۔'' زمان نے سگار کا ایک کش لے کر دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اتنے بڑے منصوبے کے لیے مزید لوگوں کی ضرورت تو پڑے گی نا، یہ دونوں قابل اعتماد بھی ہیں اور خطرات میں بے دھڑک کود جانے والے بھی۔ کیا تمہیں کرائے پر ایسے لوگ مل سکتے ہیں؟''

اس کی بات پر طاہر خاموش ہو گیا۔

شہزاد سے مار کھانے کے بعد شائلہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ واپس آئی تو اس کی حالت ابتر تھی۔ وہ چہرے سے بیمار نظر آ رہی تھی۔ اس نے میک اپ کے ذریعے اپنی حالت کسی قدر چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

''طاہر!'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اگر شہزاد ہمارے ساتھ کام کرے گا تو میں تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔''

''او کے، کم آن بے بی۔'' زمان نے کہا۔ ''یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ بات موقع کی ہے۔ اگر تمہیں موقع ملتا تو کیا تم اسے چھوڑتیں؟''

''پھر پہل بھی تو تم ہی نے کی تھی۔'' طاہر نے کہا۔ ''تم اتنی سی بات کے لیے اپنا کروڑوں کا نقصان کر لوگی؟'' پھر وہ

مسکرا کر بولا۔ ''پیسے کی بات بھی چھوڑو، کیا تم مجھے چھوڑو گی؟''

''اس نے تمہارے ہی سامنے تو میری یہ درگت بنائی ہے۔تم نے اس کا کیا بگاڑ لیا؟''

''ٹیک اٹ ایزی بے بی۔'' طاہر نے کہا۔ ''میں شہزاد کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ بس اس وقت ہمیں مصلحت سے کام لینا ہے۔ ایک دفعہ ہمارا کام ہو جائے پھر تم دیکھنا میں اس ''چیمپئن'' کا کیا حشر کرتا ہوں۔''

''تم ایسا کرو۔'' زمان نے کہا۔ ''نادر سے کہو کہ ہمیں ذرا اچھی سی کافی پلا دے اور تم بھی کوئی پین کلر لے لو۔''

نادر بہترین کک بھی تھا۔ وہ جتنی مہارت سے ہتھیار چلاتا تھا، اتنی ہی مہارت سے کھانا بھی پکاتا تھا۔

وہ لوگ ابھی کافی پی رہے تھے کہ شہزاد اور اکمل لوٹ آئے۔ شہزاد مسکرا کر بولا۔ ''اوہو، ہم بہت اچھے وقت پر آگئے۔ اس وقت واقعی کافی پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔'' پھر وہ شمائلہ سے مخاطب ہوا۔ ''مس شمائلہ! کیا ہمیں بھی کافی مل سکتی ہے؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' شمائلہ سے پہلے طاہر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد نادر گرما گرم کافی کے دو کپ اور کچھ بسکٹ اور سینڈوچ وغیرہ لے کر آ گیا۔

کافی پیتے ہوئے شہزاد نے طنزیہ لہجے میں طاہر سے کہا۔ ''یار! اگر ہماری نگرانی ہی کرانا تھی تو کسی ڈھنگ کے آدمی کو بھیجتے، غفور کو تو اس کام کا سرے سے سلیقہ ہی نہیں ہے۔''

''تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ذہین ہو۔'' زمان نے شہزاد سے کہا۔ ''ورنہ غفور ایسا کچا کام نہیں کرتا۔''

''خام خیالی ہے آپ کی۔'' شہزاد نے منہ بنا کر کہا۔ ''اب اسے کوئی اہم ذمے داری مت دیجیے گا۔'' پھر وہ کافی کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر بولا۔ ''ہاں، اب ذرا آپ کے اس پلان کی بات ہو جائے۔''

''سیٹھ موتی والا کا نام تو تم نے سن رکھا ہے؟''

''میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں نے اخبارات میں اس کی تصویریں بھی دیکھی ہیں اور ٹی وی کے کئی پروگراموں میں اسے دیکھا بھی ہے۔ ہاں، اس کی بیٹی ماریہ کا صرف نام سنا ہے، ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔''

''سیٹھ موتی والا ملک کے چند امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بے شمار بزنس ہیں۔ جیولرز تو وہ خاندانی ہیں۔ اس لیے اس کے نام کے ساتھ موتی والا لگا ہوا ہے۔''

''مجھے یہ سب تفصیل بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' شہزاد نے کہا۔

''یہ سب کچھ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں اس کی دولت کا اندازہ ہو جائے۔ وہ ڈالرز میں ارب پتی ہے اور ماریہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔'' زمان چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''لیکن سیٹھ موتی والا نے اپنے ساتھ ساتھ ماریہ کی سیکیورٹی کا فول پروف بندوبست کر رکھا ہے۔''

''اس ملک میں کچھ بھی فول پروف نہیں ہوتا ہے زمان صاحب۔'' شہزاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں سوچا۔'' زمان نے سگار کا کش لے کر کہا۔ ''صرف ماریہ کے معمولات پر نظر رکھنی ہے۔ وہ کس وقت یونیورسٹی جاتی ہے۔ واپسی کب ہوتی ہے۔ شام کو وہ ٹینس کھیلتی ہے۔ اس کے لیے اسے کہیں باہر نہیں جانا پڑتا بلکہ اس کے وسیع و عریض بنگلے ہی میں ایک شاندار ٹینس کورٹ ہے۔'' زمان نے کہا۔

''وہ کبھی شاپنگ یا کسی دوسرے کام کے لیے تو باہر نکلتی ہوگی؟''

''ہاں، وہ ہر ہفتے کو شاپنگ کے لیے جاتی ہے لیکن اس وقت اس کے اردگرد اور آگے پیچھے سیکیورٹی گارڈز ہوتے ہیں۔ وہ کوئی عام گارڈز نہیں ہیں بلکہ آرمی کے سابق کمانڈوز ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسے بھی ہیں جو عام آدمی کی طرح اس سے کچھ فاصلے پر رہ کر اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ ہاں، ماریہ بہترین تیراک ہے۔ اس کے بنگلے میں ایک بہت بڑا اور جہازی سوئمنگ پول بھی ہے۔ وہ اکثر اپنے بنگلے میں سوئمنگ کے مقابلے بھی کرتی ہے اور ٹینس کے میچ بھی کھیلتی ہے۔''

''یہ سب تفصیل فضول ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''اسے صرف اسی وقت اغوا کیا جا سکتا ہے جب وہ یونیورسٹی جا رہی

اخلاق

محمد بن موسیٰ الخوارزمی جو حساب اور الجبرا کے بانی تھے۔ انہوں نے انسان کے بارے میں انوکھا حساب کیا، وہ کہتے ہیں کہ انسان کے پاس اخلاق ہے تو 1 نمبر دو۔ اگر خوب صورتی بھی ہو تو اس کے ساتھ صفر لگا دو، یہ ہو گئے 10۔ اگر دولت بھی ہو تو ایک اور صفر لگا دو یہ بن گئے 100۔ اگر حسب و نسب ہو تو ایک اور صفر لگا دو اور یہ ہو گئے 1000۔ اگر اس میں سے اخلاق کا ایک (1) ہٹا دو تو وہ بندہ "000" رہ جائے گا۔

ہو یا وہاں سے واپس آرہی ہو یا پھر وہ شاپنگ کے لیے باہر نکلی ہو۔"

"تم شاید بھول گئے کہ جب وہ باہر جاتی ہے تو اس کے ساتھ گارڈز کی ایک فوج ہوتی ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔" شہزاد نے بے نیازی سے کہا۔

"اس کے گارڈز سابق آرمی کمانڈوز ہیں اور وہ ہر لحہ چوکس رہتے ہیں۔"

"اس کے باوجود تم یہ کہہ رہے ہو کہ..."

"ہاں۔" شہزاد نے زمان کی بات کاٹ دی۔ "اس کے گارڈز کوئی آسمانی مخلوق یا آہنی انسان نہیں ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں، ریوالور یا رائفل کی گولی ان کی کھوپڑیاں بھی توڑ سکتی ہے۔ بس ذرا سی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

"ذرا سی ہمت اور حوصلہ؟" زمان نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ماریہ کی گاڑی کے پیچھے گارڈز کی ڈبل کیبن پک اپ ہوتی ہے۔ ڈرائیور سمیت ان کی تعداد بارہ اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس آپریشن پر عمل کرنے کا اس سے بہتر کوئی منصوبہ تمہارے ذہن میں ہے تو بتاؤ۔"

"تم نے میرا منصوبہ ابھی سنا ہی کہاں ہے۔" زمان نے ترش لہجے میں کہا۔ "تم تو اس اغوا کو بچوں کا کھیل سمجھ رہے ہو۔"

"تو تم بڑوں کا کھیل بتا دو۔" شہزاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

زمان نے بُرا مانے بغیر کہا۔ "شمائلہ ٹینس کی بہترین کھلاڑی اور بہت ماہر سوئمر ہے۔"

"تو پھر؟" شہزاد نے پوچھا۔ اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"شمائلہ اسی بہانے سے ماریہ سے ملے گی، اس سے تعلقات بڑھائے گی اور اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گی۔ شمائلہ میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ یہ کر سکتی ہے۔"

"چلو، یہ سب بھی ہو گیا پھر..."

"تم بات پوری سننے سے پہلے ہی بیچ میں بول اٹھتے ہو۔" زمان نے کہا۔ "موتی والا کے بنگلے میں عقبی طرف جو پارک ہے، وہاں ایک خفیہ دروازہ ہے۔ اس دروازے کا علم کسی کو بھی نہیں ہے۔" زمان نے کہا۔ "وہ عام دروازہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کے میکنزم سے دیوار کا ایک حصہ سلائڈنگ ڈور کی طرح ایک طرف کھسک جاتا ہے۔ شمائلہ، ماریہ کو بے ہوش کرنے کے بعد اسی دروازے سے باہر لے آئے گی۔ مجھے بھی بس اتفاق سے اس دروازے کا علم ہو گیا۔"

اس کی بات سن کر شہزاد بہت طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"بیرسٹر صاحب! آپ ان کمانڈوز کو کیوں بھول رہے ہیں جو ماریہ کی حفاظت پر مامور ہیں۔ وہ ماریہ پر ہر لحہ نظر رکھتے ہوں گے۔ میں نے موتی والا کا بنگلا دیکھا تو نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں نے پورے بنگلے کی نگرانی کے لیے کسی اونچی جگہ چوکیاں بنائی ہوں گی۔ ممکن ہے وہ سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد سے ماریہ کی نقل و حرکت مانیٹر بھی کرتے ہوں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ بنگلے کے کسی ایسے گوشے میں ہو۔"

شہزاد کی بات سن کر زمان کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔

"ہاں، گارڈز نے بنگلے کی مخالف سمت میں دیوار پر خاصی اونچی پوسٹیں بنا رکھی ہیں۔ وہ وہاں سے ہر لحہ پورے بنگلے کی نگرانی کرتے ہیں۔ سی سی ٹی وی کیمروں کا ہونا بھی ناممکن نہیں ہے۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ پھر وہ بولا۔ "تمہارا کیا پلان ہے؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ اس ڈیل میں ہمیں کیا ملے گا؟ اور یہ کہ تم موتی والا سے کتنی رقم کا مطالبہ کرو گے؟"

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" زمان نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم دونوں کو میں ایک ایک کروڑ دوں گا۔"

"تو پھر پلاننگ بھی خود ہی کرو۔" شہزاد نے سرد لہجے میں کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" زمان نے پوچھا۔

"ففٹی ففٹی۔" شہزاد نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اب چاہے تم موتی والا سے بیس کروڑ وصول کرو یا پچیس کروڑ۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟" طاہر نے درشت لہجے میں کہا "تم جیسے اچکے اب ہم سے ففٹی ففٹی کا مطالبہ کریں گے؟" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ "تم نے ایک بینک لوٹا اور لوٹ کا مال بھی تمہیں نہیں ملا۔ وہ تمہارا ساتھی لے کر فرار ہو گیا۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ رشید کہاں ملے گا، میں اس سے دگنی رقم وصول کر لوں گا۔ میں بھی اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں کہ رشید جیسا جاہل آدمی ہمیں ڈاج دے جائے۔ تم اپنی بات کرو۔"

’’پھر رقم بھی موتی والا سے تم لوگ ہی وصول کرو گے؟‘‘

’’چلو، مجھے یہ بھی منظور ہے۔‘‘ شہزاد نے کہا۔ ’’لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس سے کتنی رقم کا مطالبہ کرو گے؟‘‘

’’پچاس کروڑ۔‘‘ زمان نے یوں کہا جیسے پچاس ہزار کی بات کی ہو۔

’’ہمیں کم سے کم ایک ارب کا مطالبہ کرنا ہوگا، تب کہیں جا کر موتی والا پچاس کروڑ پر آئے گا۔‘‘ شہزاد نے بے نیازی سے کہا۔ ’’تم نے تو بتایا ہے کہ موتی والا ڈالرز میں کروڑ پتی ہے اور اسے خود اپنی دولت کا اندازہ نہیں ہے۔ اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کے لیے ممکن ہے وہ سودے بازی بھی نہ کرے۔‘‘

’’چلو ففٹی ففٹی ہی سہی۔‘‘ زمان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ’’اب میں بھی تو سنوں کہ تمہارے پاس کیا پلان ہے؟‘‘

’’پلان کوئی پیچیدہ نہیں ہے۔‘‘ شہزاد نے کہا۔ ’’اس کے لیے ہمیں ایک قابلِ اعتماد اور ماہر ٹرک ڈرائیور کی ضرورت پڑے گی۔‘‘

’’ٹرک ڈرائیور؟‘‘ زمان نے کہا۔

’’اب تم مجھے ٹوک رہے ہو۔‘‘ شہزاد نے کہا۔ ’’پہلے خاموشی سے میری بات سن لو۔‘‘

’’ماہر ٹرک ڈرائیور تو بہت مل جائیں گے لیکن ان کا قابلِ اعتماد ہونا بھی ضروری ہے۔ میں مزید لوگوں کو اس پلان میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کام ہم غفور سے بھی لے سکتے ہیں۔ وہ بہت ماہر ڈرائیور ہے۔ ٹرک بھی مل جائے گا۔‘‘

’’گڈ!‘‘ شہزاد نے کہا۔ ’’یونیورسٹی سے ماریہ کی واپسی پر وہ ٹرک کسی مناسب مقام پر گارڈز کی پک اپ کو پوری قوت سے ہٹ کرے گا، ممکن ہے اس چکر میں کچھ دوسری گاڑیاں بھی ٹرک کی زد میں آجائیں لیکن مجبوری ہے۔‘‘ شہزاد نے کچھ توقف کے بعد بولنا شروع کیا۔ ’’جب دھماکا ہوگا تو ماریہ کا ڈرائیور صورتِ حال جاننے کے لیے گاڑی ضرور روکے گا۔ اس نے گاڑی نہ روکی تو ہم اسے رکنے پر مجبور کر دیں گے۔ بے آواز ریوالور سے فائر کر کے اس کا ایک ٹائر فلیٹ کر دیں گے۔‘‘

’’تم شاید بھول رہے ہو کہ ماریہ کے ڈرائیور کے ساتھ بھی ایک گارڈ پسنجر سیٹ پر بیٹھتا ہے۔‘‘

’’گاڑی رکنے کے بعد وہ بیٹھا نہیں رہے گا بلکہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے گاڑی سے نیچے اترے گا۔ بقول تمہارے شائلہ کا نشانہ بہترین ہے۔ اس کے اترتے ہی وہ نہ صرف گارڈ کو نشانہ بنائے گی بلکہ ڈرائیور کو بھی ختم کر دے گی۔ اس وقت اکمل اسموک بم پھاڑے گا۔ دھوئیں کی آڑ میں ہم ماریہ کو گاڑی سے کھینچ کر باہر نکالیں گے اور اسے بے ہوش کر دیں گے۔ پھر اسے وہاں سے لے کر فرار ہونا کیا مشکل ہے؟‘‘

زمان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور شہزاد کے لیے توصیف تھی۔ اس نے کہا۔ ’’تم وہ نہیں ہو، جو نظر آتے ہو۔‘‘

’’یہ بتاؤ، ماریہ کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے کر جانا ہوگا؟‘‘ شہزاد نے کہا۔

’’میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔‘‘ زمان نے کہا۔ ’’کل تم غفور کے ساتھ جا کر وہ جگہ دیکھ لینا۔ ملیر میں میمن گوٹھ کے نزدیک بہت سے فارم ہاؤس ہیں۔ انہی میں سے ایک فارم ہاؤس میں ماریہ کو رکھنا ہوگا۔‘‘

’’لیکن معاملہ جلد از جلد طے کرنے کی کوشش کرنا۔ ملک بھر کی خفیہ ایجنسیاں اور پولیس ماریہ کی تلاش میں ہوں گی۔ کسی خفیہ ایجنسی یا پولیس کا کوئی ذہین افسر ماریہ تک پہنچ سکتا ہے۔‘‘ شہزاد نے کہا۔

’’موتی والا تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ٹوٹ جائے گا۔‘‘ زمان نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ’’اسے اپنی بیٹی سے اتنی شدید محبت ہے۔‘‘

’’ہم لوگ کچھ شاپنگ کر لیں؟‘‘ شہزاد نے کہا۔ ’’لیکن اس مرتبہ غفور یا نادر کو ہمارے پیچھے بھیجنے کی حماقت مت کرنا ورنہ میں ان کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تعاقب کرنے والے دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔‘‘

’’تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟‘‘ زمان درشت لہجے میں بولا۔

’’میں تمہیں پہلے سے خبردار کر رہا ہوں۔‘‘ شہزاد نے کہا۔ ’’ہاں، شاپنگ کے لیے ہمیں کچھ رقم اور گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔‘‘

طاہر نے بریف کیس کھول کر اس میں سے ہزار ہزار نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر شہزاد کے حوالے کر دی، پھر ہنس کر بولا۔ ’’تمہارا دوست کیا گونگا ہے؟ یہ تو کسی بات میں دلچسپی ہی نہیں لیتا۔‘‘

’’میں باتوں سے زیادہ عملی آدمی ہوں۔‘‘ اکمل نے کہا۔ ’’وقت آنے پر یہ ثابت بھی کر دوں گا۔‘‘

شہزاد نے رقم اور گاڑی کی چابی لی اور اکمل کے ساتھ

باہر نکل گیا۔
"میں اس مرتبہ شمائلہ کو ان کے پیچھے بھیجتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ۔۔۔" طاہر نے کہا۔
"حماقت کی باتیں مت کرو۔ ہمیں ابھی شمائلہ کی ضرورت بھی ہے اور ان دونوں لڑکوں کی بھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں شاپنگ کر کے لوٹ آئیں گے۔ تم جا کر کسی ٹرک کا بندوبست کرو۔" زمان نے کہا۔
"ضروری تو نہیں ہے کہ ہم ٹرک ہی استعمال کریں۔" طاہر نے کہا۔ "کسی طاقت ور انجن والی کوسٹر یا ہائی ایس سے بھی کام چل سکتا ہے۔"
"نہیں۔" زمان نے کہا۔ "میں ماریہ کے کمانڈوز کو بچ نکلنے کا ایک فیصد چانس بھی نہیں دے سکتا، اگر ان میں سے ایک بھی بچ گیا تو ہمارا منصوبہ ناکامی کا شکار ہو سکتا ہے۔ ٹرک ان کی مضبوط باڈی اور طاقتور انجن والی ڈبل کیبن پک اپ کو پوری قوت سے ٹکر مارے گا۔ تبھی ہمارا کام بن سکتا ہے۔"
"نو پرابلم۔" طاہر نے کہا۔ "میں ابھی غفور سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ کسی ٹرک کا بندوبست کر لے۔"

☆☆☆

شہزاد اور اکمل نے اپنے لیے کچھ کپڑوں کی شاپنگ کی، ان میں جینز اور جیکٹ بھی شامل تھی۔ پھر کچھ مخصوص ہتھیار خریدے۔
تمام ضروری سامان خریدنے کے بعد وہ بوٹ بیسن کی طرف نکل گئے اور دیر تک سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ پھر ان لوگوں نے وہیں ایک معروف ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا اور کئی گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد وہ دونوں واپس زمان کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔
رات خاصی بیت چکی تھی لیکن ان دونوں کے انتظار میں سبھی جاگ رہے تھے۔ غفور گیٹ پر چوکیداری کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ ان کی گاڑی دیکھتے ہی اس نے گیٹ کھول دیا۔ شہزاد گاڑی کو سیدھا پورچ میں لے گیا۔
زمان برآمدے میں موجود تھا اور سگار کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔
"بہت دیر لگا دی تم نے؟" وہ شہزاد سے بولا۔
"میں نے واپسی کا کوئی وقت نہیں دیا تھا۔" شہزاد نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال تھا کہ ہم یہاں سے فرار ہو گئے؟"
وہ باتیں کرتے ہوئے اندر آئے۔ شہزاد اور اکمل صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔
"اب ذرا کام کی بات ہو جائے؟" زمان نے کہا۔
"کام کب کرنا ہے؟" اکمل نے پوچھا۔ شہزاد اس دوران میں بے نیازی سے شمائلہ کو گھور رہا تھا۔ وہ بھی جوابی طور پر اسے گھور رہی تھی۔
"کل یونیورسٹی کی چھٹی ہے۔ ہم پرسوں اپنا کام کریں گے۔" طاہر نے کہا۔
"تم ابھی یا کل کسی وقت ہمیں وہ فارم ہاؤس تو دکھا دو جہاں ماریہ کو رکھا جائے گا۔" شہزاد نے کہا۔
"کل صبح تم غفور کے ساتھ جا کر وہ فارم ہاؤس دیکھ لینا۔"
"سب کچھ نادر اور غفور ہی کرتے ہیں۔ یہ طاہر کس مرض کی دوا ہے؟" اکمل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"میں اس ٹیم کا لیڈر ہوں۔" طاہر نے کہا۔ "تمام کاموں کا بندوبست میری ذمے داری ہے۔ اس فارم ہاؤس کا بندوبست بھی میں نے کیا ہے اور موتی والا سے بعد میں ڈیلنگ بھی میں ہی کروں گا۔"
"او کے۔" شہزاد نے کہا۔ "ماریہ کو اس فارم ہاؤس تک پہنچانے کے بعد ہماری ذمے داری ختم ہو جائے گی؟"
"بس ماریہ کی نگرانی تم لوگوں کے ذمے ہو گی۔ موتی والا سے رقم کی وصولی طاہر اور نادر کریں گے۔"
"اور ہمیں ہمارا حصہ کب ملے گا؟" اکمل نے پوچھا۔
"ظاہر ہے، موتی والا سے رقم کی وصولی کے بعد ہی ملے گا۔"
"ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ تم نے موتی والا سے کتنی رقم وصول کی؟" شہزاد نے کہا۔
"اس سے ڈیلنگ تمہارے سامنے ہی ہو گی۔" زمان نے کہا۔
"ٹھیک ہے، پھر کل فارم ہاؤس دیکھنے کے بعد ہم اس آپریشن کو فائنل کر دیں گے۔" یہ کہہ کر شہزاد اٹھ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو اسے دیا گیا تھا۔ اکمل بھی اس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆

قومی شاہراہ سے تقریباً بیس کلومیٹر اندر جا کر میمن گوٹھ کے علاقے میں وہ فارم ہاؤس تھا جہاں ماریہ کو لے جانا تھا۔ وہاں بہت سے دوسرے فارم ہاؤس بھی تھے لیکن ان کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اس فارم ہاؤس کے بوسیدہ سے گیٹ سے ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر "جبران فارم

ہاؤس'' سندھی میں لکھا ہوا تھا لیکن اس کے حروف بھی جگہ جگہ سے اُڑ گئے تھے۔ بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی کوئی وہ نام پڑھ سکتا تھا۔

وہاں مخبوط الحواس سا ایک چوکیدار بھی موجود تھا۔ اس نے پہلے تو گیٹ کھولنے سے انکار کیا اور سندھی میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔

''میری بات سنو۔'' طاہر نے کہا۔ ''ہم وڈیرے رحیم بخش کے مہمان ہیں اور کچھ دن یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔''

وڈیرے رحیم بخش کا نام سن کر چوکیدار کے لب و لہجے میں نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ اس نے اپنی بوسیدہ سی قمیص کی جیب سے پرانا سا ایک سیل فون نکالا۔ سیٹ کا پچھلا کور موجود نہیں تھا۔ سیل فون کی بیٹری کو روکنے کے لیے ربر بینڈ استعمال کیا گیا تھا۔

اس نے موبائل پر کوئی نمبر ملایا اور سندھی میں کچھ بولنے لگا۔ شہزاد کی سمجھ میں صرف ''جی سائیں اور حاضر سائیں'' کے الفاظ آئے۔

پھر اس نے سیل فون طاہر کی طرف بڑھا دیا۔ طاہر نے سیل فون لے کر کہا۔ ''ہیلو... ہاں سائیں، ہم پہنچ گئے ہیں... بس ایک ہی پریشانی ہے... تمہارا چوکیدار سندھی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا... اچھا ٹھیک ہے... نہیں، ابھی تو ہم صرف لوکیشن دیکھنے آئے ہیں، ڈرامے کی شوٹنگ تو بعد میں کریں گے... ضرور سائیں... آپ کو شوٹنگ کے وقت ضرور بلائیں گے...'' وہ تھوڑی دیر وڈیرے سے بات کرتا رہا.... اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون چوکیدار کو واپس کر دیا، پھر طاہر نے کچھ سوچ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا پرس نکال کر سو سو کے کئی نوٹ چوکیدار کے حوالے کر دیے۔

اس نے حیرت سے نوٹوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، پھر اس نے جھجکتے ہوئے نوٹ طاہر سے لے لیے۔

وہ فارم ہاؤس کیا، خودرو جھاڑیوں سے اٹا ہوا ایک جنگل تھا۔ اسی خودرو گھاس اور جھاڑیوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سی اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ اس راستے سے ایک وقت میں صرف ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔ عمارت مین گیٹ سے خاصے فاصلے پر تھی۔ عمارت کیا تھی، سال خوردہ سے دو تین کمرے تھے، ایک برآمدہ تھا اور وہاں سے کچھ فاصلے پر چوکیدار کے لیے ایک کوٹھری سی بنی ہوئی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ دن میں بھی یہاں اتنا سکوت تھا کہ عجیب سا خوف محسوس ہوتا تھا۔

ان لوگوں نے اندر سے مکان کا جائزہ لیا۔ اندر چار کمرے تھے۔ دو دو کمرے آمنے سامنے تھے۔ آگے جا کر وہ راہداری دائیں طرف گھوم جاتی تھی۔ وہاں ایک کچن بھی تھا۔ کمروں کے ساتھ ملحقہ باتھ روم تھے اور ہر کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جس پر باہر کی جانب سے مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔

''آئیڈیل جگہ ہے۔'' طاہر نے کہا۔ ''ان لوگوں کو تین دن تو کیا تین مہینے میں بھی اس جگہ کا سراغ نہ مل سکے گا۔''

طاہر جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز سُن کر چونک اٹھا۔

وہ پرانی سی ایک جیپ تھی۔ اس میں سے دو آدمی اُترے۔ دونوں نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر اتنی بڑی بڑی

عظیم لوگ عظیم باتیں

☆...... بے وقوف اور مردے اپنی رائے تبدیل نہیں کرتے، ورنہ زندوں کی دنیا تو تغیر و تبدل سے بھرپور ہوتی ہے۔ جیمز رسل۔

☆...... سزائے موت سنانے کے بعد سقراط کو جب زہر کا پیالہ پینے کے لیے دیا گیا تو اس کے شاگرد زار و قطار رونے لگے۔ سقراط نے ان سے پوچھا۔ ''کیوں رو رہے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''اب بے گناہ مارے جا رہے ہیں۔'' سقراط بولا۔ ''تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں گناہ کرتا ہوا مارا جاؤں؟''

☆...... میں پُرامن غلامی کے بجائے خطروں سے گھری ہوئی آزادی کو ترجیح دیتا ہوں۔ روسو

☆...... آپ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اگر آپ راستے میں بھونکنے والے ہر کتے کو پتھر ماریں گے۔ ونسٹن چرچل۔

☆...... انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مڈل کلاس طبقہ بنتا ہے۔ ان کی نظریں آسمان پر اور پیر کیچڑ میں ہوتے ہیں۔ کارل مارکس

☆...... لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بحث کو نہیں چھوڑتے۔ واصف علی واصف

سرگودھا سے اسد عباس کا انتخاب

مونچھیں تھیں کہ اس کا پورا دہانہ چھپ گیا تھا۔ اس کا قد درمیانہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ دوسرا شخص دراز قد تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور ہاتھ پیر خاصے مضبوط تھے۔ اس کے چہرے پر مونچھوں کے ساتھ ساتھ داڑھی بھی تھی۔ پیشانی کشادہ تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

داڑھی والا نزدیک پہنچ کر اردو میں بولا۔ ''طاہر صاحب آپ ہیں؟'' اس کا رخ شہزاد کی طرف تھا۔ اس کا لب ولہجہ سندھی تھا۔

''جی میں ہوں طاہر۔'' طاہر نے کہا۔

''طاہر صاحب! میں مراد خان ہوں، سائیں رحیم بخش کا کم دار۔''

''کم دار؟'' طاہر نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''آپ انگریزی میں اسے منیجر کہہ لو۔ سائیں کی تمام زمینوں اور باغوں کا حساب کتاب میری ذمے داری ہے۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی مراد صاحب۔'' طاہر نے کہا۔ ''یہ میرا ساتھی ہے شہزاد۔'' اس نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اکمل ہے۔'' اس نے اکمل کا تعارف کرایا۔ ''یہ بھی ہماری ٹیم میں شامل ہیں۔''

''طاہر صاحب! اس ڈرامے کے پروڈیوسر آپ ہو؟'' مراد نے پوچھا۔ اپنی گفتگو سے وہ پڑھا لکھا بھی لگ رہا تھا۔

''میں پروڈیوسر نہیں بلکہ ڈائریکٹر ہوں۔'' طاہر نے کہا۔ ''شہزاد صاحب اس ڈرامے کے رائٹر ہیں۔''

''سائیں! جب بھی ڈرامے کی شوٹنگ شروع ہو، مجھے ضرور بلانا۔ مجھے شوٹنگ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''طاہر صاحب! آپ کی شوٹنگ کب تک چلے گی؟''

''ایک مہینا بھی لگ سکتا ہے اور دو مہینے بھی۔'' طاہر نے جواب دیا۔ ''یہ بڑے آرٹسٹ ڈیٹس بہت مشکل سے دیتے ہیں۔''

''اگر آپ کو کھانے پینے کی چیزوں یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں۔ ویسے آپ چاہیں تو ہمارا یہ آدمی آپ کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے۔'' اس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں مراد صاحب! بہت شکریہ۔ ہمیں یہاں رہنا تو ہے نہیں۔ ہم شوٹنگ کے وقت آئیں گے تو ہمارے ساتھ پوری ٹیم ہوگی اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہوگی۔''

''جیسے آپ کی مرضی طاہر صاحب!'' مراد خان نے کہا۔ ''میرا سیل نمبر لے لیں۔ اگر کبھی ضرورت پڑے تو آپ مجھ سے اس پر رابطہ کر سکتے ہیں۔''

طاہر نے وہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کیا تو شہزاد نے بھی اسے ذہن نشین کر لیا۔

''اچھا سائیں پھر اجازت۔'' مراد خان نے کہا۔ ''مجھے سائیں کے ایک ضروری کام سے ابھی یہاں ایک دو لوگوں سے ملنا ہے۔ شوٹنگ کے موقع پر ملاقات ہوگی۔''

شہزاد نے بھی اپنا سیل فون نکالا اور مراد خان کا نمبر محفوظ کر لیا۔

''اب کل اصل مرحلہ شروع ہوگا۔'' طاہر نے کہا۔ ''تم نے اس کے لیے تیاری کر لی ہے؟''

''تیاری تو تمہیں کرنی ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ٹرک کا انتظام تمہیں کرنا ہے اور اس گاڑی کا بندوبست بھی جس میں اغوا کے بعد ماریہ کو لے جایا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور گاڑی ہوگی جس میں نادر اور شائلہ سوار ہوں گے۔''

''وہ سب انتظام میں نے کر لیا ہے۔ ٹرک کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔ ماریہ کو ڈبل کیبن پک اپ میں فارم ہاؤس تک پہنچایا جائے گا۔ اس گاڑی کا انجن اور باڈی دونوں بہت مضبوط ہیں۔''

☆☆☆

شہزاد سفاری پارک کے پاس گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ڈبل کیبن پک اپ میں اس کے ساتھ اکمل اور شائلہ تھی۔ عین موقع پر شائلہ نے شہزاد کے ساتھ رہنے پر اصرار کیا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی میں نادر موجود تھا۔ اس کا کام ماریہ کی گاڑی پر اسموک بم پھینکنا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک کے بجائے تین بم رکھے تھے تاکہ اگر ایک بم کا اثر ختم ہو تو دوسرا بم استعمال کیا جائے۔

اچانک دور سے انہیں ماریہ کی بلٹ پروف گاڑی دکھائی دی۔ اس سے کچھ فاصلے پر گارڈز کی پک اپ تھی۔ دوپہر کا وقت تھا اس لیے سڑک پر ٹریفک اتنا نہیں تھا جتنا صبح یا شام کے اوقات میں ہوتا ہے۔

شہزاد نے وہ ٹرک بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر غفور موجود تھا۔ غفور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر کوئی اور شخص بیٹھا تھا۔ شہزاد اسے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ شخص شہزاد کے لیے اجنبی تھا اور منصوبے میں شامل بھی نہیں تھا۔ کسی نئے فرد کی شمولیت کی وجہ سے پورا پلان ناکام بھی ہو سکتا تھا۔

شہزاد کے اعصاب تن گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شائلہ تھی۔ طاہر اور زمان کا دعویٰ تھا کہ شائلہ بہت ماہر

ڈرائیور ہے۔ پسنجر سیٹ پر اکمل تھا اور گاڑی کی عقبی نشست پر شہزاد تھا۔ شہزاد کی ہدایت کے مطابق شائلہ نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ رکھا تھا۔

اب محض چند منٹ کی بات تھی۔ غفور کا ٹرک اس زاویے سے کھڑا تھا کہ اسے یونیورسٹی کی طرف سے آنے والا ٹریفک واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ بس ایک، ڈیڑھ منٹ کی بات تھی۔

پھر جونہی ماریہ کی گاڑی غفور کے ٹرک سے آگے نکلی، اس نے ایک دم ٹرک آگے بڑھا دیا۔ فوراً ہی ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کی آوازیں سنائی دیں اور ہر طرف ایک ہڑبونگ مچ گئی۔

اب ماریہ کی گاڑی شہزاد کی گاڑی کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق دھماکے کی آواز سن کر ماریہ کی گاڑی رک گئی۔ فوراً ہی پسنجر سیٹ کا شیشہ نیچے اترا اور ماریہ کے گارڈ نے محتاط انداز میں سر باہر نکال کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

شائلہ نے اپنی گود میں رکھی ہوئی گن اٹھائی اور گارڈ کے سر کا نشانہ لے کر فوراً ہی فائر کر دیا۔ گارڈ اچھل کر پیچھے گرا۔ اس وقت تک اکمل نے بھی گاڑی کے ایک ٹائر کو نشانہ بنایا تھا۔ اچانک فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ کیونکہ نادر اسموک بم پھینک چکا تھا۔ ٹریفک رک چکا تھا کیونکہ کئی گاڑی والوں نے عجلت میں وہاں سے نکلنا چاہا تھا۔ اسی وجہ سے ٹریفک جام ہو گیا تھا۔

فضا میں دھواں پھیلتے ہی شہزاد بہت تیزی سے آگے بڑھا اور اندازے سے پلک جھپکتے میں ماریہ کی گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے کھلی ہوئی کھڑکی سے ہاتھ اندر ڈال کر دروازے کا لاک کھولا۔ مرنے والا گارڈ الٹ کے ڈرائیور پر گرا تھا۔ اس کے باوجود ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی فائر کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی شہزاد نے اس کی کلائی پر ریوالور کا دستہ مار کے اس کی گن گرا دی۔ پھر اس نے ڈرائیور کی کنپٹی پر وار کیا۔ وہ اسٹیئرنگ پر اوندھا ہو گیا۔

ماریہ بری طرح چیخ رہی تھی، اسموک بم کے دھوئیں کی وجہ سے شہزاد کو ماریہ کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے عقبی دروازے کا لاک کھولا اور ماریہ کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی اور بری طرح کانپ رہی تھی۔

اسی وقت فضا ایک مرتبہ پھر دھواں دھواں ہو گئی۔

شاید نادر نے دوسرا اسموک بم بھی پھینک دیا تھا۔

شہزاد نے ماریہ کو اپنی ڈبل کیبن پک اپ کی طرف گھسیٹا اور اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ اس تھپڑ سے اس کا چیخنا بند ہو گیا۔ اس نے کھینچ کے اسے عقبی سیٹ پر بٹھایا اور خود بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف اکمل پہلے سے موجود تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی شائلہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شائلہ نے بہت مہارت سے اپنی گاڑی وہاں سے نکالی اور اطمینان سے نیپا تک پہنچ گئی۔ وہاں سے بائیں جانب مڑ گئی اور راشد منہاس روڈ پر آتے ہی اس نے گاڑی کو برق رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

شاہراہ فیصل پر پہنچنے کے بعد شہزاد نے شائلہ سے کہا۔ ''اب تم گاڑی روک کر پیچھے آ جاؤ۔ ہم خطرے کی حدود سے نکل چکے ہیں۔ تم تو واقعی بہت ماہر ڈرائیور ہو...''

''کیوں، ایسا کیا ہو گیا؟'' شائلہ نے پوچھا۔

''بس اب اتنی تیز رفتاری کی ضرورت نہیں ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''پھر تمہیں اس فارم ہاؤس کا علم بھی نہیں ہے۔ وہاں کا راستہ صرف مجھے معلوم ہے۔''

ماریہ نے دانت بھینچ کر گاڑی روک دی۔ شہزاد پھرتی سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور شائلہ کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا، ماریہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

شہزاد نے اکمل سے کہا۔ ''اگر یہ ہوش میں آنے لگے تو اسے تھوڑی دیر کے لیے پھر بے ہوش کر دینا۔''

''میرے پاس کلوروفارم ہے۔'' شائلہ نے کہا۔ ''میں وہی اسے سنگھا دیتی ہوں۔ پھر یہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔''

اس نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کلوروفارم کی چھوٹی شیشی نکالی اور رومال نکال کر اس پر چھڑکنے لگی۔

شہزاد گاڑی زیادہ تیز رفتاری سے نہیں چلا رہا تھا کہ مبادا تیز رفتاری کے باعث کوئی ٹریفک سارجنٹ اسے روک لے۔

کچھ دیر بعد وہ ملیر کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ پھر آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ میمن گوٹھ کے علاقے میں داخل ہو گئے۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر زمان کا نام تھا۔

''ہیلو!'' اس نے کہا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"مجھے اس وقت کہاں ہونا چاہیے؟" شہزاد نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "ظاہر ہے، میں فارم ہاؤس کی طرف جا رہا ہوں۔ دس منٹ بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"ماریہ کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔" پھر سخت لہجے میں بولا۔ "میں اس وقت ڈرائیونگ کر رہا ہوں، میں دس منٹ بعد بات کروں گا۔" اس نے زمان کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

دس، بارہ منٹ بعد وہ مطلوبہ فارم ہاؤس کے گیٹ پر پہنچے تو اس مخبوط الحواس چوکیدار کے بجائے گیٹ کھولنے والا کوئی اجنبی تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر سرحدی علاقوں میں پہنی جانے والی ٹوپی تھی۔ اس کا قد درمیانہ لیکن جسم گٹھا ہوا تھا۔ اس کے شانے پر ایک کلاشنکوف بھی جھول رہی تھی۔

"ادھر کیوں ٹیر گیا صاب، اندر جاؤ۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"تم کون ہو؟" شہزاد نے ایک مرتبہ پھر سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔

"ام کو ادر طاہر صاب لایا ہے۔"

"اب آگے بھی بڑھو گے یا یہیں کھڑے ہو کر اس کا انٹرویو لیتے رہو گے؟" شمائلہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"زمان تو ہمارے علاوہ کسی بھی آٹھویں آدمی کو اس پلان میں شامل کرنے کا سختی سے مخالف تھا۔" شہزاد نے کہا۔ "پھر یہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟"

"اس کا جواب بھی زمان صاحب ہی دے سکیں گے۔" شمائلہ نے کہا۔

شہزاد نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دوسرا دھچکا اسے اس وقت لگا جب اسے برآمدے کے سامنے دو گاڑیاں دکھائی دیں اور برآمدے میں دو اجنبی افراد بھی تھے جو اپنے حلیوں اور حرکات و سکنات سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" اکمل نے پُرتشویش لہجے میں شمائلہ سے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔" شمائلہ کے لہجے میں بھی حیرت تھی۔

شہزاد نے ان گاڑیوں سے کچھ فاصلے پر اپنی گاڑی روک دی۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک آگے بڑھا اور ڈبل کیبن پک اپ کے عقبی حصے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اکمل نے اندر سے لاک کر رکھا تھا۔

اس نے شہزاد سے کہا۔ "اپنے ساتھی سے کہو کہ دروازہ کھول دے۔"

"تم لوگ ہو کون اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" شہزاد نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں جب تک طاہر یا زمان سے بات نہیں کر لوں گا، دروازہ نہیں کھلے گا۔"

"اچھا۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میرا نام آفتاب ہے اور بڑے بڑے سورما میرے نام سے کانپتے ہیں۔"

"کانپتے ہوں گے۔" شہزاد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم شرافت کی زبان نہیں سمجھتے ہو؟ تمہارا کام لڑکی کو یہاں تک پہنچانا تھا۔ تم نے وہ کام کر دیا۔ اب تمہارا کام ختم اور ہمارا شروع ہوگا۔" یہ کہتے ہی اس نے اچانک اپنی جیب سے پسٹل نکال لیا۔ "چلو نیچے اترو۔"

"شمائلہ! مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی دوسرے گینگ کے آدمی ہیں اور ہماری محنت کا پھل خود کھانا چاہتے ہیں۔" شہزاد نے آہستگی سے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور گاڑی سے دور ہٹ جاؤ۔"

شہزاد نے پسٹل وہیں پھینک دیا اور گاڑی سے چند قدم دور ہٹ گیا۔

شہزاد نے برق سرعت سے شمائلہ کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ وہ ان لوگوں کی مخالف سمت میں تھی اس لیے فوری طور پر وہ لوگ اسے نہ دیکھ سکے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ شہزاد کو مزید کوئی حکم دیتے، دو بے آواز فائر ہوئے اور وہ دونوں کرب ناک انداز میں چیختے ہوئے زمین پر گر پڑے۔ پسٹل ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور وہ بری طرح تڑپنے لگے۔

ان میں سے ایک شخص کی گردن سے گولی آر پار ہو گئی تھی اور دوسرا آدمی جو خود کو آفتاب کہہ رہا تھا، اس کے سینے سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔

کچھ دیر تڑپنے کے بعد وہ دونوں ساکت ہو گئے۔

"یہ تم نے کیا کر دیا؟" شہزاد نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں اپنی محنت کا پھل اتنی آسانی سے کسی کی جھولی

میں نہیں ڈالتی، جان جوکھوں میں ڈال کر مارے کو اغوا ہم نے کیا اور یہ لوگ آ گئے دعوے دار بن کر۔ اونہہ!''

''ممکن ہے اندر بھی ان کا کوئی ساتھی موجود ہو۔ تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں اندر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' اکمل نے کہا۔

''اگر اندر کوئی خطرہ...''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اندر سے زمان اور طاہر برآمد ہوئے تھے۔

انہیں دیکھ کر شہزاد بھی بری طرح چونک اٹھا۔ زمان نے ایک نظر شہزاد اور شائلہ کو دیکھا، پھر اچانک اس کی نظر زمین پر پڑی ہوئی لاشوں پر گئی۔ وہ وحشت زدہ ہو کر بولا۔

''انہیں کس نے مارا؟''

''انہیں ہم نے نہیں بلکہ شائلہ نے مارا ہے۔''

''شائلہ نے؟'' زمان حیران ہو کر بولا۔ ''شائلہ ایسا کیوں کرنے لگی؟''

جواب میں شائلہ ہی نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''تم انتہائی احمق لڑکی ہو۔'' زمان غصے سے بولا۔ ''بے وقوف، یہ ہمارے ساتھی تھے۔ انہیں میں نے ہی بلایا تھا۔''

''لیکن ہمارے پلان میں یہ لوگ شامل تھے نہ گیٹ پر کھڑا ہوا وہ مسلح گارڈ۔'' شہزاد نے کہا۔

''پلان میں کون شامل تھا اور کون نہیں، اس کا فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو؟'' زمان سخت لہجے میں بولا۔

''اس کا فیصلہ میں ایسے کر سکتا ہوں کہ یہ پورا منصوبہ ہی میرا بنایا ہوا تھا۔'' شہزاد بھی درشت لہجے میں بولا۔ ''آخر تم نے ہم سے یہ بات کیوں چھپائی کہ ہمارے ساتھ مزید چار افراد شامل ہوں گے۔''

''چار افراد؟'' زمان نے تشویش سے پوچھا۔ ''دو تو یہ تھے، تیسرا گیٹ پر کھڑا ہے۔ چوتھا کون ہے؟''

''چوتھے شخص کو میں نے ٹرک میں غفور کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ بھی میرے لیے اجنبی تھا۔'' شہزاد نے کہا۔

''اس ٹیم کا لیڈر میں ہوں۔'' زمان نے کہا۔ ''میں کسی کو بھی شامل کر سکتا ہوں۔''

''اس ٹیم کے لیڈر تم ہو؟'' شہزاد نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''اب تک تو میں طاہر کو ٹیم کا لیڈر سمجھ رہا تھا۔''

''میں اس پورے منصوبے کا ماسٹر مائنڈ ہوں۔'' زمان نے کہا۔

''لیکن تمہارے پاس تو سرے سے کوئی منصوبہ ہی نہیں تھا۔ یہ منصوبہ تو میرا تھا۔'' شہزاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''بہرحال لیڈر کوئی بھی تھا، ہم لوگوں کو یہ تو بتانا چاہیے تھا کہ ہم سات افراد کے علاوہ بھی اس ٹیم میں مزید افراد شامل ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا تو یہ لوگ اپنی جان سے کیوں جاتے؟ ان لوگوں نے مجھ سے گن پوائنٹ پر گاڑی کا دروازہ کھلوایا تھا اور انہیں میں نے نہیں، شائلہ نے مارا ہے۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ہمارے ساتھی ہیں۔''

''اب اس لڑکی کو اٹھا کر اندر لے چلو۔'' زمان نے کہا۔ ''اسے ہوش آ رہا ہے۔ میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا کیونکہ یہ مجھے اچھی طرح پہچانتی ہے۔''

اکمل نے آگے بڑھ کر لڑکی کو گاڑی سے نکال کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ شہزاد نے جھک کر اپنا پسٹل اٹھایا اور اسے جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ زمان سے مخاطب ہوا۔ ''تم ان لاشوں کا کیا کرو گے؟''

''ابھی نادر اور غفور سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تم فکر مت کرو، وہ ان لاشوں کو ٹھکانے لگا دیں گے۔''

شہزاد نے اندر کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کے ساتھ ساتھ شائلہ بھی تھی۔

''اور تم!'' زمان نے شائلہ سے تند لہجے میں کہا۔ ''اپنے دونوں پسٹل میرے حوالے کر دو۔''

شائلہ چلتے چلتے رک گئی اور سیخ پا ہو کے بولی۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم کسی کو بھی نشانہ بنا سکتی ہو۔'' زمان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرا ذہنی توازن ابھی برقرار ہے۔'' شائلہ نے کہا۔

''ہاں، ایک بات اور بتا دو۔'' شہزاد نے کہا۔ ''کیا اب بھی ہمارے علاوہ مزید کچھ لوگ اس پلان میں شامل ہیں؟''

''نہیں، بس اب کوئی اور شامل نہیں ہے۔ صرف خان اور صابر خان شامل ہیں۔'' زمان نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے وہ آدمی جو گیٹ پر کھڑا ہے اور دلاور خان وہ شخص ہے جسے تم نے ٹرک میں غفور کے ساتھ دیکھا تھا۔''

''ان دونوں کو تو میں اچھی طرح پہچان گیا ہوں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''ان کے علاوہ کوئی شخص بھی میرے راستے

میں آئے گا، میں بھی بلا جھجک اسے گولی ماردوں گا۔''
وہ اس کمرے تک پہنچ گئے تھے جس میں ماریہ کو رکھا گیا تھا۔ کمرے سے اکمل باہر نکلا اور اس نے بتایا کہ ماریہ ابھی تک بے ہوش ہے۔
اسی وقت غفور اور نادر بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جس کا تعارف زمان نے دلاور خان کے نام سے کرایا تھا۔
''ہمارا ساتھی دلاور خان۔'' زمان نے شہزاد اور اکمل سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
''یہ آفتاب اور مظفر کو کیا ہوا ہے؟'' غفور نے پوچھا۔
''انہیں کس نے ہلاک کر دیا؟''
''تم لوگ پہلے ان کی لاشیں ٹھکانے لگا دو لیکن دھیان رکھنا، کسی کی نظر ان پر نہ پڑے۔''
نادر اور غفور کے ساتھ دلاور خان بھی چلا گیا۔
غفور کی بات پر شہزاد چونکا تھا۔ گویا وہ جانتا تھا کہ دونوں مرنے والے بھی ہمارے ساتھی تھے۔
''لڑکی کے ہاتھ پیر باندھ دو اور کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دو۔'' اس نے اکمل سے کہا۔
''میں نے یہ کام پہلے ہی کر دیا ہے۔'' اکمل نے کہا اور دروازہ لاک کر دیا۔
اس کمرے کے ساتھ دوسرا کمرا تھا۔ اسے بھی عجلت میں استعمال کے قابل بنا لیا گیا تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ اور کئی کرسیاں پڑی تھیں۔ زمان اسی کمرے میں بیڈ پر جا بیٹھا اور جیب سے سگار نکال کر سلگانے لگا۔
شہزاد اور اکمل بھی اس کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شہزاد نے کہا۔ ''حیرت کی بات یہ ہے کہ اس تمام کارروائی کے باوجود ٹیم کا لیڈر غائب ہے۔''
''طاہر حالات کا جائزہ لینے گیا ہے۔'' زمان نے کہا۔ ''وہ بس آنے ہی والا ہو گا۔'' پھر زمان نے اپنی جیب سے سیل فون میں استعمال ہونے والی کئی سمیں نکالیں اور بولا۔ ''ہم ان سمز کے ذریعے موتی والا سے بات کریں گے۔ یہ سمیں کسی کے نام سے رجسٹرڈ نہیں ہیں۔''
''اب کرنا کیا ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔
''میں موتی والا سے بھی بات نہیں کروں گا۔ وہ میری آواز پہچانتا ہے۔ طاہر نے بھی کئی سال اس کے دفتر میں ملازمت کی ہے۔ وہ چہرے اور آواز سے طاہر کو بھی جانتا ہے۔
دن میں وہ بے شمار لوگوں سے بات کرتا ہو گا۔''
شہزاد نے کہا۔ ''کیا وہ طاہر کی یا تمہاری آواز پہچان لے گا؟''
''ہاں۔'' زمان نے جواب دیا۔ ''کاروبار میں کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اس کا حافظہ بہت زبردست ہے۔ وہ ایک مرتبہ کسی گاڑی کا نمبر دیکھ لے، کسی کا ٹیلی فون نمبر دیکھ لے یا کسی شخص سے ایک دفعہ بھی ملاقات کر لے، وہ اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتا ہے۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اس سے تمام ڈیل تم لوگ کرو گے۔ خود کو کسی بین الاقوامی گینگ کا ممبر ظاہر کرو گے۔''
''یہ انتہائی خطرناک کام ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' اکمل نے کہا۔ ''ہم موتی والا سے بات کر لیں گے لیکن رقم کی وصولی کون کرے گا؟''
''یہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔'' زمان نے کہا۔
''لیکن یہ اسی وقت طے ہو جائے تو اچھا ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''تاکہ بعد میں کسی بھی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔''
''یہ کام بھی تم لوگوں کو کرنا پڑے گا۔'' زمان نے کہا۔ ''میرے آدمی تم لوگوں کی حفاظت کے لیے موجود ہوں گے۔''
''اوکے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''پھر بات سکسٹی اور فورٹی پر ہو گی۔ تاوان کی رقم میں سے ساٹھ فیصد ہمارا، چالیس فیصد تمہارا ہو گا۔''
''وہاٹ؟'' زمان بپھر کر بولا۔ ''میں نے اتنی محنت کیا صرف اس لیے کی ہے کہ مجھے صرف چالیس فیصد ملے؟''
''تو پھر ہمارے درمیان جو معاملات پہلے طے ہوئے تھے، وہی چلنے دو۔''
کمرے میں شائلہ بھی موجود تھی لیکن وہ بالکل خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اچانک بولی۔ ''زمان صاحب! اگر دیکھا جائے تو سارے خطرات ان لوگوں نے مول لیے ہیں۔ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ...''
''تم خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔'' زمان بپھر کر بولا۔
باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی تو زمان خاموش ہو گیا۔ چند منٹ بعد طاہر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ چہرے سے بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی پسینے میں تر تھا حالانکہ موسم تو خاصا خنک تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔
''موتی والا سے بات ہوئی؟'' طاہر نے پوچھا۔
''شہر میں تو ایک کہرام مچا ہوا ہے۔ پاکستان کا ہر ٹی وی چینل

اس خبر کو بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کر رہا ہے کہ ملک کے معروف صنعت کار موتی والا کی بیٹی کا اغوا۔ حملہ آور انتہے تربیت یافتہ تھے کہ انہوں نے پہلے ماریہ کے گارڈز کا راستہ روکا، پھر انتہائی منظم انداز میں ماریہ کو اغوا کر لیا۔ ماریہ کا ڈرائیور شدید زخمی ہے اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا گارڈ اغوا کرنے والوں کے ہاتھوں مارا گیا۔''

''ابھی موتی والا کو میڈیا اور پولیس نے گھیر رکھا ہوگا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد ہم موتی والا سے بات کریں گے۔'' زمان نے کہا۔ ''یار! یہ ماریہ کچھ زیادہ ہی شور کر رہی ہے۔ اسے تو خاموش کراؤ۔''

وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے، ماریہ واقعی بُری طرح چیخ رہی تھی۔

''دیکھو۔'' طاہر نے کہا۔ ''میں تو ماریہ کے سامنے جاؤں گا نہیں۔ تم اندر جا کر اسے خاموش کراؤ۔'' اس نے شہزاد کی طرف دیکھا۔

''میں بھی اس کے سامنے جا سکتی ہوں۔'' شائلہ نے کہا۔ ''وہ مجھے تو نہیں پہچانتی ہے۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' طاہر نے درشت لہجے میں کہا۔

''اس کی ضرورت ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''ماریہ جب کسی لڑکی کو دیکھے گی تو اس کا خوف آدھا رہ جائے گا۔''

''مجھے ایک بات بتاؤ؟'' شائلہ نے طاہر سے کہا۔ ''تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ ہم لوگوں کے علاوہ ٹیم میں کچھ لوگ اور بھی ہیں؟''

''زمان صاحب نے ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔''

''پھر اس کا انجام بھی دیکھ لیا۔'' شائلہ نے تلخی سے کہا۔ ''وہ دونوں آدمی فضول میں میرے ہاتھوں مارے گئے۔''

''اب ایسی کوئی حماقت مت کرنا۔'' طاہر نے کہا۔

''اب بھی اگر کوئی ایسا آدمی ہے جو ہمارے لیے اجنبی ہے تو بتا دو۔'' شہزاد نے کہا۔ ''ورنہ یہ حماقت آئندہ مجھ سے یا اکمل سے بھی ہو سکتی ہے۔''

''دلاور خان ہے۔'' طاہر نے جواب دیا۔ ''اب تم اندر جا کر ذرا ماریہ کو خاموش کراؤ لیکن اس پر ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا۔ وہ ذرا سی بھی تکلیف کی عادی نہیں ہے۔''

اکمل نے دروازہ کھولا اور شائلہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ طاہر انہیں وہاں چھوڑ کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

شائلہ کے جانے کے بعد شہزاد اور اکمل نے چند منٹ تک انتظار کیا، پھر وہ دونوں بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔

انہیں دیکھ کر ماریہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ اکمل نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ڈرو مت، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' ماریہ نے روتے ہوئے کہا۔ اس کا جملہ آدھے سے زیادہ انگلش میں تھا۔

''میں نے کہا نا کہ ڈرو مت۔'' اکمل نے کہا۔ ''ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے بس تمہارے پاپا سے کچھ حساب بے باق کرنا ہے۔''

''ڈیڈ سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' ماریہ نے پوچھا۔

''ان کے ہاتھ پیر کھول دو۔'' شہزاد نے اکمل سے کہا۔ ''تاکہ یہ آرام سے بیٹھ سکیں۔''

اکمل نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پیر کھول دیے۔

اسے اکمل نے اس کے دوپٹے سے باندھا تھا اور بہت نرمی سے باندھا تھا اس کے باوجود اس کی کلائیوں اور ٹخنوں پر نیل پڑ گئے تھے۔

''شائستہ!'' شہزاد نے جان بوجھ کر شائلہ کا نام غلط لیا۔ ''انہیں پانی پلاؤ، اگر یہ کچھ کھانا چاہیں تو وہ بھی لے آؤ۔''

شائلہ نے آگے بڑھ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور ماریہ کی طرف بڑھایا۔

ماریہ نے ہاتھ مار کے پانی پھینک دیا اور چیخ کر بولی۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے یہاں سے جانے دو... یو...'' اس نے انگلش میں شائلہ کو گالی دی۔

شائلہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ماریہ کو تھپڑ یا گھونسا مارتی، شہزاد درمیان میں آ گیا اور قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ تمہیں ہماری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی لیکن تم اگر ہمارے ساتھ بھی اپنے گھریلو ملازمین کی طرح برتاؤ کرو گی تو پچھتاؤ گی۔''

''مجھے یہاں سے جانے دو باسٹرڈ!'' وہ چیخ کر بولی۔

''شٹ اپ!'' شہزاد نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ یہ تمہارے باپ کا محل نہیں ہے۔ اب اگر تم نے بکواس کی تو میں بھی رعایت نہیں کروں گا۔''

”تم لوگ چاہتے کیا ہو؟“ ماریہ بُری طرح رونے لگی۔ وہ اس قسم کے لہجے کی کب عادی تھی۔ وہ تو اب تک صرف حکم چلاتی آئی تھی۔

”تمہارے باپ نے میرے کچھ پیسے ہضم کر لیے ہیں اور مجھے اپنی رقم چاہیے۔“

”اوہو، اب سمجھی۔“ ماریہ نے اپنے آنسو ہتھیلی کی پشت سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤ، کتنی رقم چاہیے؟“

”جتنی تمہارے باپ نے ہڑپ کی ہے۔“ شہزاد نے کہا۔

”اتنی رقم تو میرے اکاؤنٹ میں بھی ہوگی۔ میرے ہینڈ بیگ میں چیک بک بھی ہے، میں تمہیں چیک دے دیتی ہوں۔“ ماریہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”پھر تو تم مجھے جانے دو گے؟“

”تمہارا ہینڈ بیگ تو تمہاری گاڑی ہی میں رہ گیا؟“ شہزاد نے کہا۔ ”اور تمہارے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہوگی بھی نہیں۔“

”تم مجھے کنگال سمجھتے ہو؟“ ماریہ نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ”میں سیٹھ موتی والا کی بیٹی ہوں، کسی کمپنی کے جنرل منیجر یا کلرک کی بیٹی نہیں ہوں۔ بتاؤ تمہیں کتنی رقم چاہیے۔ پانچ لاکھ، دس لاکھ یا ایک کروڑ؟“

”ہمیں بیس لاکھ چاہئیں۔“ شہزاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہیں تمہارے اکاؤنٹ میں؟“

”بس، بیس لاکھ؟“ ماریہ نے یوں کہا جیسے بیس روپے کا تذکرہ کر رہی ہو۔

”ہاں، بیس لاکھ ڈالرز۔“ شہزاد نے سرد لہجے میں کہا۔

”بیس... لاکھ ڈالرز؟“ ماریہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں، بیس لاکھ ڈالرز۔“ شہزاد نے کہا۔ ”اب تم آرام سے بیٹھو اور کافی پیو۔ شائستہ بہت اچھی کافی بناتی ہے۔ ممکن ہے وہ کافی تمہارے شیف کی کافی سے اچھی نہ ہو لیکن تمہیں اس وقت کافی کی ضرورت ہے۔“ وہ شائستہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”شائستہ! ذرا گرما گرم کافی بنا لاؤ۔ مجھے بھی کافی کی طلب ہو رہی ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ ماریہ نے چیخ کر کہا۔ ”بس، مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم جتنی بھی رقم کہو گے میں ڈیڈ سے لے کر تمہیں دے دوں گی۔ ڈیڈ میری خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”اس وقت تک جب تک تم ہمارے پاس ہو۔ اس کے بعد تو ان کی جیب سے بیس روپے بھی نہیں نکلیں گے۔“

شائستہ چار مگ کافی کے لے آئی۔

پھر اس نے ٹرے میں سے ایک ایک مگ اکمل اور شہزاد کو دیا اور تیسرا مگ اپنے لیے چھوڑ کر چوتھا ماریہ کی طرف بڑھایا۔ وہ کافی کے ساتھ کچھ سینڈوچز اور بسکٹ بھی لائی تھی۔

اس نے ٹرے ماریہ کی طرف بڑھائی۔ ماریہ نے پھر کر اسے دیکھا اور بولی۔ ”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ پھر اس نے اچانک ٹرے پر لات ماردی۔ گرم گرم کافی چھلک کر کچھ شائستہ کے جسم پر پڑی اور مگ اس کے جسم سے ٹکرا کر فرش پر گر کے ٹوٹ گیا۔ کمرے میں بسکٹ اور سینڈوچز بھی بکھر گئے۔

شائستہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ماریہ کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ماریہ ہکا بکا رہ گئی۔ شائستہ نے غصے میں آکر دوسرا تھپڑ رسید کیا تو ماریہ الٹ کر بیڈ پر گر گئی۔ ”تجھے عزت راس نہیں آئی یو بچ۔“ پھر وہ اکمل سے بولی۔ ”اس کتیا کے ہاتھ پیر دوبارہ باندھو۔ یہ ہماری نرمی سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔“ شائستہ نے آگے بڑھ کر ماریہ کے بال پکڑ کر کھینچے اور اس کے منہ پر ایک اور تھپڑ رسید کر دیا۔

”شائستہ!“ شہزاد چیخ کر بولا۔ ”بس کرو۔ اسے بھوکا مرنے دو۔“ وہ اکمل سے مخاطب ہوا۔ ”اس کے ہاتھ پیر دوبارہ باندھ دو۔“

ماریہ سہم کر رہ گئی۔ وہ پہلے تو خوف زدہ انداز میں شہزاد کو دیکھتی رہی، پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

”اب تم نے آواز نکالی تو میں تمہارا چہرہ بگاڑ دوں گی۔“ شائستہ نے اپنی جیب سے چمک دار پھل کا ایک چاقو نکال کر اسے کھولتے ہوئے کہا۔

ماریہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اکمل نے دوبارہ اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ ماریہ ضدی، خودسر اور مغرور لڑکی تھی اور ان لوگوں کو بھی اپنا گھریلو ملازم سمجھ رہی تھی جو گالیاں کھا کے بھی خاموش رہتے ہوں گے۔

”شائستہ! تم یہیں ٹھہرو۔ ہم باس سے بات کر کے آتے ہیں۔“

شہزاد اور اکمل کمرے سے نکل گئے۔ ان کا رخ زمان کے کمرے کی طرف تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو زمان نے چونک کر انہیں دیکھا۔ طاہر بھی وہیں موجود تھا۔ وہ شہزاد اور اکمل کو دیکھ کر خاموش ہوگئے۔

"کیا حال ہے ماریہ کا؟" زمان نے پوچھا۔

"وہ بہت زیادہ ڈری اور سہمی ہوئی ہے۔ اسے شائلہ نے بہت مشکل سے قابو میں کیا ہے۔" پھر وہ سرد لہجے میں بولا۔ "اب اس معاملے کو زیادہ طول مت دو ورنہ ہمارے لیے بہت مشکل ہوجائے گی۔"

زمان نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔ اس میں سیل فون کی مختلف سمز موجود تھیں۔ اس نے جیب سے سستا سا ایک سیل فون نکالا اور اس میں سم لگا کر شہزاد کے حوالے کر دیا۔ "لو، اب تم موتی والا سے بات کرو۔"

"اس سے کتنی رقم کی ڈیمانڈ کرنا ہے؟" طاہر نے شہزاد سے پوچھا۔ "یاد ہے نا؟"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "لیکن اب ہم رقم پاکستانی کرنسی میں نہیں بلکہ ڈالرز میں وصول کریں گے۔"

"وہاٹ؟" زمان چونک کر بولا۔ "پاکستانی کرنسی میں کیوں نہیں؟"

"اس کے دو فائدے ہیں۔" شہزاد نے کہا۔ "ایک تو ہمیں رقم کے سوٹ کیس ڈھونے میں آسانی ہوگی۔ دوسرا یہ کہ آج کل ڈالر کی قیمت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس سے بھی فائدہ ہوگا۔"

"تمہارا تعلق کس گینگ سے ہے؟" زمان نے اسے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے شاید پہلے بھی کئی مرتبہ وضاحت کی ہے کہ میرا تعلق کسی گینگ سے نہیں ہے۔ میں تو چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا تھا۔ پہلی دفعہ بینک ڈکیتی کی تو تم لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔"

"لیکن اپنی باتوں سے تو تم منجھے ہوئے جرائم پیشہ لگتے ہو۔ تم نے ماریہ کو اغوا کرنے کا جو پلان بنایا تھا وہ بھی تمہاری مہارت کا ثبوت ہے۔"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "میں نے اصل میں انگلش کے تھرل، ایکشن اور جاسوسی ناول بہت پڑھے ہیں۔" پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ "میں موتی والا سے پانچ لاکھ ڈالرز کی ڈیمانڈ کروں گا۔"

"تم بات کرو۔" زمان نے کہا۔ "موتی والا کے نمبرز اس کاپی میں لکھے ہیں۔" اس نے کاپی کا ایک صفحہ شہزاد کو دے

☆...... بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلاوجہ چڑتے ہیں حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔ مشتاق احمد یوسفی

دیا۔

اس صفحے پر موتی والا کے کئی نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ کچھ نمبروں سے پہلے ٹک مارک لگے ہوئے تھے۔ گویا وہ نمبر زیادہ اہم تھے۔

شہزاد نے پہلا نمبر دیکھا اور زمان کے دیے ہوئے سیل فون پر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"سیٹھ موتی والا صاحب؟" شہزاد نے پوچھا۔

"بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کون بول رہا ہے؟" آواز میں پریشانی اور افسردگی تھی۔

"میرے نام کو چھوڑو سیٹھ، میری بات غور سے سنو! تمہاری بیٹی ماریہ ہمارے قبضے میں ہے۔"

"کک... کون بول رہے ہو تم... ماریہ کہاں ہے... وہ... ٹھیک تو ہے؟"

"ابھی تک تو وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اگر..." شہزاد نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ اس کا لہجہ بھی حیرت انگیز طور پر درشت اور بدلا ہوا تھا۔ "اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بتاؤ... مجھے کیا کرنا ہے؟" موتی والا نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بس اس معاملے میں پولیس کو ملوث مت کرنا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ نہ صرف سلسلہ منقطع کیا بلکہ سیل فون بھی آف کر دیا۔

"ویری گڈ!" زمان نے توصیفی لہجے میں کہا۔ "تمہارے انداز سے تو نہیں لگتا کہ تم نے اغوا برائے تاوان کے لیے یہ پہلی واردات کی ہے۔"

"تم ان باتوں کو چھوڑو۔" شہزاد نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ کہ یہ سم کس کے نام پر رجسٹرڈ ہے، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہماری بات چیت ریکارڈ ہو رہی ہو۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ انہیں قیامت تک اس سم کا ریکارڈ نہیں ملے گا۔" زمان نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "دوسری کال دوسری سم سے ایک گھنٹے بعد کرنا۔"

شہزاد جواب میں کوئی تلخ جملہ بولنے والا تھا لیکن وہ زمان کو صرف گھور کر رہ گیا۔

اچانک کمرے سے ماریہ کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ زمان بوکھلا کر بولا۔ "اب یہ کیوں چیخ رہی ہے؟"

اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی شہزاد وہاں پہنچ گیا۔

ماریہ کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور اکمل، شائلہ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو ماریہ کی طرف جھپٹ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" شہزاد نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"یہ پاگل ہو گئی ہے۔" اکمل نے کہا۔

"میں پاگل ہو گئی ہوں؟" شائلہ بپھر کر بولی۔ "اس نواب زادی کی زبان کیسے چل رہی ہے... یہ مجھے گالیاں دے رہی ہے... اور..."

شہزاد نے کہا۔ "شائستہ کو چھوڑ دو۔"

اکمل نے شائلہ کو چھوڑ دیا، اس مرتبہ شائلہ نے ماریہ پر جھپٹنے کی کوشش نہیں کی لیکن بپھر کر بولی۔ "میں اس کمینی کے منہ میں تکیے کا پورا غلاف ٹھونس دوں گی۔ پھر دیکھوں گی کیسے اس کی آواز نکلتی ہے اور اس کے خوب صورت بالوں پر ابھی استرا پھیر دوں گی۔ اسے اپنے خوب صورت بالوں پر بہت ناز ہے نا؟"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔" شہزاد نے کہا۔ "جو کچھ کرنا ہوگا میں خود کروں گا۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے سر پر استرا پھیر دوں۔"

"نہیں۔" ماریہ نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔" شہزاد نے درشت لہجے میں کہا۔ "شائستہ دیکھنے میں جتنی خوب صورت ہے، اندر سے اتنی ہی سفاک ہے۔ اگر اسے موقع ملا تو یہ تمہارے حلق پہ چھری بھی پھیر سکتی ہے۔" شہزاد نے جان بوجھ کر یہ سب کچھ کہا۔ اس سے ماریہ بھی دہشت زدہ ہو گئی اور شائلہ کے چہرے کا تناؤ بھی دور ہو گیا۔

"مجھے... پانی... پلا دو پلیز۔" ماریہ نے کہا۔

"اب آئی عقل ٹھکانے پر۔" شائلہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

شہزاد نے اکمل سے کہا۔ "ماریہ کو پانی پلاؤ اور اسے کچھ کھانے کو بھی دو۔ یہ صبح سے بھوکی ہوگی۔" پھر وہ شائلہ سے مخاطب ہوا۔ "شائستہ! تم میرے ساتھ آؤ۔"

شائلہ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل گئی۔

شہزاد، شائلہ کو دوسرے کمرے میں لے گیا پھر بولا۔ "شائلہ! وہ لڑکی ہمارے لیے کروڑوں کا چیک ہے۔ تم اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔" شائلہ نے کہا۔ "وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کے باوجود ہمیں اپنا گھریلو ملازم سمجھ رہی ہے۔"

"تم نے میری خاطر دو آدمیوں کو ہلاک کر دیا۔" شہزاد نے کہا۔ "اس وقت سے میرے دل میں تمہاری قدر بہت بڑھ گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ زمان یا اس کا کوئی آدمی تمہیں نقصان پہنچائے۔"

شائلہ نے ایسی نظروں سے شہزاد کو دیکھا کہ وہ گھبرا گیا۔ وہ لڑکیوں کی ایسی نظروں کو خوب پہچانتا تھا۔ شائلہ آہستہ سے بولی۔ "ظاہر ہے اچھے تو تم ہو۔ اس نے تو کبھی میری حمایت نہیں کی۔"

"تم ان لوگوں کے ساتھ کب سے ہو؟" شہزاد نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ میری کہانی بہت طویل ہے، کبھی فرصت سے تمہیں سناؤں گی۔ پہلے میں ایک لڑکے کے ساتھ مل کر چھوٹی موٹی وارداتیں کرتی تھی پھر وہ لڑکا ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا اور مجھے طاہر مل گیا۔ یہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ میں نے یہاں بھی طاہر کے ساتھ مل کر کئی وارداتیں کیں پھر طاہر نے کہا کہ وہ ایک بڑا ہاتھ مارنے کے بعد اس راستے کو چھوڑ دے گا اور مجھ سے شادی کر کے امریکا یا کینیڈا منتقل ہو جائے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ تم سے شادی کرے گا؟" شہزاد نے پوچھا۔

"اب میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔" شائلہ نے کہا۔ "وہ کبھی میرے ساتھ مخلص تھا ہی نہیں۔ اس کیس میں بھی ان لوگوں نے مجھے اس لیے شامل کیا تھا کہ میں بہت اچھی سوئمر ہوں۔ ان کا پلان تو بہت لمبا چوڑا تھا۔ وہ تو تم نے ان کا کام آسان کر دیا۔ اب میں اپنا حصہ لے کر خاموشی سے الگ ہو جاؤں گی۔"

"لیکن اب ماریہ پر ہاتھ مت اٹھانا۔" شہزاد نے

کہا۔ ”وہ ہمارے لیے کروڑوں روپے کا بیرر چیک ہے۔“

☆☆☆

سیٹھ موتی والا کو اس وقت اس کے دوستوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ سب اس کی دل جوئی کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے اسے شہزاد کی کال موصول ہوئی تھی تو اسے کچھ اطمینان ہوا تھا کہ ماریہ کی زندگی محفوظ ہے۔ اسے اغوا کرنے والے تاوان کا مطالبہ کریں گے۔ وہ ماریہ کے لیے بڑی سے بڑی رقم دے سکتا تھا۔ بس اسے ایک بات کا خطرہ تھا کہ اس معاملے میں پولیس بھی ملوث ہو چکی تھی بلکہ اس نے خود سیکریٹری داخلہ کو ٹیلی فون کر کے ماریہ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا۔ اب نہ صرف اس کے بنگلے کے چاروں طرف پولیس کے سادہ لباس اہلکار موجود تھے بلکہ بنگلے کے ایک کمرے میں پولیس نے اپنا مانیٹرنگ سیل بھی بنا رکھا تھا۔ کرائم برانچ کا ایس پی علی اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ وہ پولیس کے ان افسروں میں سے تھا جو اپنی ڈیوٹی کو فرض سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ وہ انتہائی ذہین افسر تھا اور اب تک بے شمار پیچیدہ کیس حل کر چکا تھا اور مجرموں کو سلاخوں کے پیچھے بھیج چکا تھا۔

شہزاد کی کال آئی تو وہ پہلے سے ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے بیٹھا تھا۔ موتی والا کے تمام ٹیلی فون نمبرز آبزرویشن پر تھے اور ان پر آنے والی ہر کال ریکارڈ ہو رہی تھی۔

شہزاد کی کال موصول ہوتے ہی ایس پی علی متحرک ہو گیا۔ اس نے پندرہ منٹ کے اندر اندر معلوم کر لیا کہ جس نمبر سے کال موصول ہوئی ہے، وہ کسی فرضی نام پر رجسٹرڈ ہے۔

وہ اپنے عارضی مانیٹرنگ روم سے سیٹھ موتی والا کے پاس آ گیا اور اس سے پوچھا۔ ”جس شخص نے ابھی کال کی تھی اس کی آواز آپ کے لیے اجنبی تھی یا کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی؟“

”وہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔“ موتی والا نے جواب دیا۔

”لیکن وہ جو کوئی بھی تھا، بہت ہوشیار تھا۔ اس نے زیادہ طویل بات ہی نہیں کی ورنہ اغوا کرنے والے عموماً لواحقین کو خوف ناک دھمکیاں دیتے ہیں۔ انہیں پولیس کے پاس جانے سے روکتے ہیں لیکن اس نے تو ایسی کوئی دھمکی بھی نہیں دی۔ اس نے سیل فون بھی آف کر دیا ہے۔ اس لیے کال کرنے والے کے ٹھکانے کی بھی بالکل نشاندہی نہیں ہو رہی ہے۔“ ایس پی علی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ”اب اس کی کال آئے تو اسے باتوں میں الجھا کر رکھیں تا کہ ہم اس کے موجودہ ٹھکانے کا سراغ لگا سکیں۔“

”اب وہ کال کرنے کے لیے کوئی دوسری سم استعمال کرے تو؟“

”سم سے بھی فرق پڑتا ہے لیکن ہم اس سیل فون کے ذریعے اس کے ٹھکانے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔“

”کچھ کریں، ایس پی صاحب۔“ موتی والا نے کہا۔ ”ہر قیمت پر مجھے اپنی بیٹی چاہیے، صحیح سلامت۔“

”آپ پریشان نہ ہوں سر!“ ایس پی علی نے کہا۔ ”میں آئندہ بارہ گھنٹے کے اندر اندر مجرموں تک پہنچ جاؤں گا۔“ پھر وہ جاتے جاتے بولا۔ ”پلیز! پریس کو کیس کے بارے میں کچھ بھی مت بتایئے گا۔“

☆☆☆

شہزاد کے سمجھانے بجھانے پر اب ماریہ کی حالت کچھ بہتر تھی لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ شہزاد نے اسے ڈرا دھمکا کر کھانے پینے پر بھی راضی کر لیا تھا۔ اس نے کچھ سینڈوچز کافی کے ساتھ کھا لیے تھے لیکن ایک ہی دن میں وہ گویا مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس کا کمرا باہر سے لاک کر کے وہ اکمل کے ساتھ ٹہلتا ہوا اس گوشے میں چلا گیا جہاں وہ کچھ دیر پہلے شائلہ کے ساتھ آیا تھا۔

”یار اکمل!“ اس نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اس ٹیم کا لیڈر میں ہوں۔ زمان نے سب کچھ میرے ہاتھوں میں دے دیا ہے، ماریہ کا اغوا، موتی والا سے تاوان کی سودے بازی اور رقم کی وصولی۔ تمہیں یہ سب کچھ عجیب نہیں لگ رہا ہے۔“

”میں تو اسی دن سے کھٹک گیا تھا جب اس نے ہمارے پلان پر عمل کرنے کی ہامی بھری تھی۔“ اکمل نے کہا۔

”اب ذرا سوچو، رقم کی وصولی کے بعد ہم لوگ وہ رقم لے کر رفوچکر ہو جائیں تو زمان یا اس کے آدمی ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔“ شہزاد نے کہا۔

”یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے یار!“ اکمل نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، تاوان کی رقم کے لیے کیا وہ ہم پر اعتبار کر لے گا؟ اس کے کچھ آدمی ہماری نگرانی کر رہے ہوں گے۔ وہ آدمی جو ہمارے لیے اجنبی ہوں گے۔ اب

فرض کرو۔ ہم لوگ جونہی تاوان کی رقم وصول کریں، زمان کے کچھ ثنا نے یار ہمیں گولی ماردیں تو؟''

شہزاد مسکرایا۔ ''اگر وہ ایسا سوچ رہا ہے تو اس سے بڑا احمق کوئی نہیں ہے۔ رقم کی وصولی کی جگہ ہم طے کریں گے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''اور میں ایسی جگہ کا انتخاب کروں گا کہ انہوں نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔'' پھر وہ ٹھہر کر بولا۔ ''ہاں، اب موتی والا سے بات کرنے کے لیے ہمیں اپنی سم لانا پڑیں گی اور سستے سے دو چار سیل فون بھی۔ یہ دونوں چیزیں ہمیں ملیر ہی کے کسی بازار سے مل جائیں گی۔ ملیر کا آباد علاقہ یہاں سے دو تین کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے بلکہ میں تو ایک دفعہ موتی والا سے بات کرنے کے بعد اسے کال بھی یہاں کے بجائے مختلف جگہوں سے کروں گا۔ پولیس لاکھ ٹریکنگ کرے، وہ قیامت تک ہمارا سراغ نہیں لگا سکے گی۔ یوں بھی چائنا کے سستے موبائل پی ٹی اے کے پاس رجسٹرڈ نہیں ہوتے۔'' شہزاد نے ہنس کر کہا۔ ''چلو، اب ذرا ہم نزدیکی مارکیٹ کا ایک چکر لگالیں۔''

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے واپس آئے تو زمان برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ شہزاد اور اکمل کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''تم لوگ کہاں غائب ہو؟ موتی والا کو کال کیے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' شہزاد نے جواب دیا۔ ''اس مرتبہ بات کرنے کے لیے مجھے دوسرا سیل فون سیٹ اور دوسری سم دو ورنہ پولیس ٹریکنگ کے ذریعے ہمارا سراغ لگا لے گی۔''

لمحے بھر کو زمان کے چہرے کا رنگ اڑا پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ''میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ ایک ہی سم اور ایک ہی سیٹ استعمال کروں گا۔''

وہ زمان کے کمرے کی طرف بڑھے تو ایک کمرے سے انہیں نادر اور غفور کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ لوگ لاشیں ٹھکانے لگانے کے بعد واپس آ گئے تھے۔ شہزاد اور اکمل، زمان کے کمرے میں پہنچے۔

اس نے جیب سے چھوٹی سی وہی ڈبیا نکالی اور اس مرتبہ ایک دوسری سم نکال کر ایک اور سیٹ میں لگائی اور بولا۔ ''اس مرتبہ اس سے رقم کی ڈیمانڈ کرنا۔''

شہزاد نے موتی والا کا نمبر ڈائل کیا تو فوراً ہی اس نے کال ریسیو کرلی۔

''سیٹھ موتی والا۔'' شہزاد نے آواز اور لہجہ بدل کر کہا۔

''بول رہا ہوں۔'' موتی والا جلدی سے بولا۔ ''بتاؤ تمہیں کتنی رقم چاہیے۔ میری بیٹی تو ٹھیک ہے؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''اس سے میری بات کرادو پلیز۔''

''ابھی کراتا ہوں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم نے پولیس سے بھی رابطہ کرلیا ہے لیکن اگر پولیس ہمارے درمیان آئی تو تمہاری بیٹی تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔''

''پولیس تو صرف رسمی کارروائی کے لیے آئی تھی۔ میں اب پولیس سے بالکل رابطے میں نہیں ہوں، پلیز ماریہ سے میری بات کرادو۔'' موتی والا نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

''ذرا صبر کرو۔'' شہزاد نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے زمان سے ایک اور سم لی اور سیل فون لے کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں ان لوگوں نے ماریہ کو رکھا تھا۔

ماریہ کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے شہزاد کو دیکھتے ہی کہا۔ ''پلیز، مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ... تم جتنی بھی رقم چاہتے ہو... میں تمہیں دوں گی۔''

''تم پہلے اپنے ڈیڈ سے بات کرلو۔'' شہزاد نے کہا۔ ''تاکہ انہیں یقین آجائے کہ تم ابھی تک زندہ ہو لیکن انہیں بتادینا کہ اگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہیں ذبح کردیں گے۔'' شہزاد نے سفاک لہجے میں کہا اور موتی والا کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے پہلی ہی گھنٹی پر موتی والا نے کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو!''

''لو اپنی بیٹی سے بات کرو۔'' شہزاد نے سیل فون ماریہ کے کان سے لگا دیا۔

''ہیلو ڈیڈ!'' ماریہ بری طرح سسکنے لگی۔ ''پلیز! مجھے ان لوگوں سے چھڑوائیں ورنہ یہ لوگ مجھے ماردیں گے... ہاں ڈیڈ! یہ لوگ بہت ظالم ہیں... مجھے ذبح کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں... پلیز... ڈیڈ... میں...'' ماریہ نے یہ تمام باتیں انگلش میں کی تھیں۔

شہزاد نے اچانک سیل فون اس کے کان سے ہٹا دیا۔ موتی والا کہہ رہا تھا۔ ''بیٹی! تم فکر مت کرو... میں ان الو کے پٹھوں کو چھوڑوں گا نہیں۔''

''الو کے پٹھے تو تم ہو سیٹھ!'' شہزاد نے کہا۔ ''تمہاری

اس گالی پر میں نے تاوان کی رقم میں اضافہ کردیا ہے۔"
"وہ... دراصل... میں..."
"بکومت۔" شہزاد دہاڑا۔ "اب میں تم سے دس لاکھ لوں گا۔"
"میں دینے کو تیار ہوں، بتاؤ رقم کہاں پہنچاؤں؟"
"تم پہلے رقم کا بندوبست تو کرلو۔" شہزاد نے کہا۔
"دس لاکھ میرے لیے بڑی رقم نہیں ہے۔"
"تو پھر کل صبح تک دس لاکھ ڈالرز کا بندوبست کرلو۔ وقت اور جگہ میں تمہیں کل صبح بتاؤں گا۔"
"دس لاکھ ڈالرز؟" موتی والا کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی تھی۔ "اتنی رقم..."
شہزاد کے اشارے پر اکمل نے اچانک چاقو نکال لیا اور ماریہ کی طرف یوں جھپٹا جیسے اسے ذبح کرنے والا ہو۔ ماریہ کے حلق سے خوف میں ڈوبی ہوئی فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔
"یہ... یہ... ماریہ کیوں اتنی بُری طرح چیخ رہی ہے؟" موتی والا بوکھلا کر بولا۔
"میرے ساتھی نے اس کے بازو پر ہلکی سی لکیر کھینچ دی ہے۔" شہزاد نے درشت لہجے میں کہا۔
"مجھے بچالیں ڈیڈ... یہ لوگ... مجھے مار دیں گے۔" ماریہ ہسٹریائی انداز میں چیخ کر بولی۔
شہزاد نے سیل فون اس کے چہرے کے نزدیک کر دیا تھا۔
"میری بیٹی کو تکلیف مت پہنچاؤ۔ میں کل دوپہر تک رقم کا بندوبست کرلوں گا۔" موتی والا نے کہا۔
"پھر تم سے کل ہی بات ہوگی۔" یہ کہہ کر شہزاد نے سلسلہ منقطع کردیا اور فوراً ہی سیل فون آف کردیا۔

☆☆☆

"شٹ!" ایس پی علی نے کہا۔ "اس مرتبہ بھی ہم ان کے ٹھکانے کا سراغ نہیں لگا سکے۔"
"تو پھر تم یہاں کیا کررہے ہو آفیسر؟" موتی والا غصے سے بولا۔ "اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"
علی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا، پھر وہ ضبط کر کے بولا۔ "سر! ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہم نے کئی لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن ابھی میں اس سلسلے میں آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ مجھے اتنا معلوم ہوگیا ہے کہ ماریہ کی جگہ [illegible] مضافات میں مشرق کی طرف کہیں ہے۔ اغوا کرنے والے جس کمپنی کی سم سے کال کررہے ہیں۔ اس کی رینج زیادہ نہیں ہے۔ وہ علاقہ ملیر، لانڈھی یا کورنگی کا ہوسکتا ہے۔"
"یہ کوئی چھوٹے علاقے نہیں ہیں۔ کیا تم ان علاقوں میں گھر گھر تلاشی لوگے؟" موتی والا بپھر کر بولا۔
"پلیز، مجھے اپنا کام کرنے دیں۔" علی نے کہا۔
"مجھے پولیس کی مدد نہیں چاہیے۔" موتی والا نے کہا۔ "میں رقم کا بندوبست کر کے اپنی بیٹی کو لے آؤں گا۔ ان لوگوں نے نہ جانے اسے کس حال میں رکھا ہوگا۔ اسے تو اے سی کے بغیر نیند بھی نہیں آتی۔"
"آپ ہمارے ساتھ اتنا تعاون تو کر ہی سکتے ہیں کہ جب آپ تاوان کی رقم ادا کرنے جائیں تو ہمیں اطلاع دے دیں۔"
"آپ لوگ جائیں پلیز۔" موتی والا نے کہا۔ "میں ابھی ہوم سیکریٹری سے بات کرتا ہوں۔"
"اوکے۔" علی نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے چلا جاتا ہوں لیکن میرے آدمیوں کو مجرموں کی کالز تو ریکارڈ کرنے دیں۔"
"نہیں۔" موتی والا نے کہا۔ "میں اب کسی بھی پولیس والے کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔"
"اوکے۔" علی نے کہا اور اپنے ایک ماتحت کو بُلا کر کہا۔ "اپنا تمام سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو، ہم یہاں سے جارہے ہیں۔"
"اوکے سر!" اس کے ماتحت نے کہا۔

☆☆☆

ایس پی علی وہاں سے باہر نکلا تو شدید غصے میں تھا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے پہلے ڈی آئی جی کرائمز کو اس صورتِ حال کی اطلاع دی پھر آئی جی صاحب سے بات کرنے لگا۔
"سیٹھ صاحب اگر تعاون نہیں کریں گے تو کیا تم پیچھے ہٹ جاؤ گے؟"
"نو سر!" علی نے کہا۔ "میں اپنی کوشش کرتا رہوں گا۔"
"اوکے، وش یو بیسٹ آف لک۔"
علی، آئی جی سے بات کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا ایک ماتحت انسپکٹر جمیل اس کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ "سر! موتی والا کے گارڈز کو جس ٹرک نے ہٹ کیا تھا، اس ٹرک کا سراغ مل گیا ہے۔"

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ٹرک کے ذریعے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔'' علی نے کہا۔

''سر! سیٹھ صاحب کے ایک گارڈ نے ٹرک ڈرائیور کو بھی پہچان لیا ہے۔''

''ٹرک ڈرائیور کو پہچان لیا ہے؟'' علی نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''جی سر! جو شخص ٹرک چلا رہا تھا، وہ اس گارڈ کے گاؤں کا تھا۔''

''ویری گڈ۔'' علی نے کہا۔ ''چلو اس گارڈ سے میں خود پوچھ گچھ کرتا ہوں۔''

''سر! اس گارڈ نے بتایا ہے کہ ٹرک ڈرائیور اسی کے گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کا نام غفور ہے۔''

''ویری گڈ!'' علی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

☆☆☆

موتی والا کے گارڈ کو خاصی چوٹیں آئی تھیں لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ایس پی علی اسپتال پہنچا تو ڈاکٹر نے اسے گارڈ سے ملنے کی اجازت دے دی۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' علی نے پوچھا۔

''اب تو بہت بہتر ہے سر!'' گارڈ نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو۔'' علی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''امیر علی سر!'' اس نے جواب دیا۔

''امیر علی! غفور تمہارے گاؤں کا رہنے والا ہے تو وہ تم سے اکثر ملتا بھی ہوگا؟''

''نہیں سر!'' گارڈ نے جواب دیا۔ ''آرمی سے ریٹائر ہونے کے بعد جب میں ملازمت کی تلاش میں کراچی آیا تھا تو اس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔''

''کیوں بھئی؟'' علی نے پوچھا۔

''سر! وہ کافی عرصے سے کراچی میں ہے۔ خوب پیسا کما لیا ہے۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ میں اس پر بوجھ بن جاؤں گا۔''

''وہ کیا کام کرتا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''وہ کوئی بزنس کرتا ہے لیکن اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ کیا بزنس کرتا ہے۔ ہاں وہ اکثر شیریں جناح کالونی کے ایک ہوٹل میں آتا ہے۔ ہوٹل والا بھی ہمارے گاؤں کا ہے۔''

''اس ہوٹل کا نام بتاؤ؟''

''وہ کوئی بڑا ہوٹل نہیں ہے سر!'' امیر علی نے کہا۔ ''چائے کا چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اس کا نام بھی اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ میں اس کا پتا بتا سکتا ہوں۔''

اس قسم کے ہوٹل پورے شہر میں موجود ہیں۔ ان کے نام بھی لگ بھگ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ علی نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور امیر علی اسے پتا سمجھانے لگا۔

''امیر علی! تمہارا مشاہدہ تو غضب کا ہے۔'' علی نے توصیفی انداز میں کہا۔

''فوجی ملازمت کے دوران میں ہمیں ''میپ ریڈنگ'' بھی سکھائی جاتی ہے۔ اس کا باقاعدہ ٹیسٹ ہوتا ہے۔ اس میں صرف نقشوں اور لکیروں کی مدد سے یہ بتایا جاتا ہے کہ ریلوے لائن کہاں ہے، نہر یا دریا کتنے فاصلے پر ہے۔ مسجد کس طرف ہے اور کنواں کہاں ہے؟ بس اسی کو آپ میرا مشاہدہ کہہ لیں۔''

''شکریہ امیر علی۔'' ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ بات کسی کو بتانا نہیں کہ تم نے غفور کو پہچان لیا ہے اور وہ تمہارے گاؤں کا رہنے والا ہے۔''

ایس پی وہاں سے باہر نکلا تو اس نے اپنے ماتحت انسپکٹر سے کہا۔ ''شیریں جناح کالونی چلو۔''

☆☆☆

اکمل اور شہزاد ایک مرتبہ پھر زمان کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ زمان نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے موتی والا کو صبح تک مہلت کیوں دی؟''

''فوری طور پر کوئی بھی بزنس مین اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔'' شہزاد نے کہا۔ ''ان کا سارا سرمایہ تو بینکوں میں ہوتا ہے اور کوئی بینک رات کے وقت نہیں کھلتا۔ اس کے پاس کچھ بینکوں کے اے ٹی ایم کارڈز بھی ہوتے تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں بہت زیادہ رقم نہیں نکلوا سکتے۔''

''پہلے ہمیں یہ بھی تو طے کرنا پڑے گا کہ اس سے رقم کہاں اور کیسے وصول کرنا ہے؟'' اکمل نے کہا۔ ''اس کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ تو ہوگا؟''

''ہاں۔'' زمان نے کہا۔ ''اس سے کہنا کہ رقم کا سوٹ کیس لے کر قومی شاہراہ کی طرف روانہ ہو جائے۔ ہم سیل فون پر اس سے رابطے میں رہیں گے۔ اسے بالکل تنہا آنا ہوگا۔ گاڑی بھی وہ خود ہی ڈرائیو کرے گا۔''

''اس کے آگے پیچھے پولیس بھی تو ہو سکتی ہے؟''

شہزاد نے کہا۔
”اسی لیے تو اسے قومی شاہراہ پر بُلا رہا ہوں تاکہ سڑک پر کوئی دوسری گاڑی ہو تو نظروں میں آجائے۔ کسی مناسب جگہ پر ہم اس سے رقم لے لیں گے اور اسے بے ہوش کر کے چھوڑ دیں گے۔“
”میں ذرا اس پلان پر غور کرلوں، پھر بات کرتے ہیں۔“ شہزاد نے کہا۔ ”یہ پلان آسان تو ہے لیکن اس میں رسک بھی بہت زیادہ ہے۔“
”جتنا بڑا فائدہ، اتنا ہی بڑا خطرہ۔“ زمان نے مکاری سے ہنس کر جواب دیا۔
شہزاد اور اکمل وہاں سے باہر نکل آئے۔ ماریہ کی دیکھ بھال شائلہ کررہی تھی۔ اب ماریہ نے بھی گویا حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ شہزاد ٹہلتا ہوا عمارت کی پشت پر کافی دور تک چلا گیا۔
”کہاں جارہے ہو؟“ اکمل نے پوچھا۔
”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس فارم ہاؤس کی باؤنڈری وال کہاں ہے اور اس کی پشت پر کیا ہے؟“ شہزاد نے کہا۔ ”اگر ہمیں اچانک باہر نکلنا پڑے تو فرار کے لیے کوئی راستہ بھی ہے یا نہیں؟“
”یہ بات تو میرے ذہن میں بھی تھی۔“ اکمل نے کہا۔ ”اگر ہم ان کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکلنا چاہیں تو کہاں سے نکل سکتے ہیں؟“
فارم ہاؤس ایکڑوں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہاں خودرو گھاس اور کانٹے دار جھاڑیوں کا ایک جنگل سا اُگ آیا تھا۔ بعض جگہ تو وہ خودرو گھاس شہزاد کی کمر سے بھی اونچی تھی۔ ان جھاڑیوں میں سانپ بھی ہوسکتے تھے۔
وہ دونوں جھاڑیوں سے بچتے بچاتے آخر فارم ہاؤس کی عقبی دیوار تک پہنچ ہی گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے نیم کے درخت لگے ہوئے تھے۔ شہزاد ان میں سے ایک درخت پر چڑھا اور وہاں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ چودہ پندرہ فٹ کی باؤنڈری وال کے دوسری طرف بھی اسی طرح کی خودرو جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں سے خاصے فاصلے پر ایک دوسرا فارم ہاؤس تھا جو قدرے بہتر حالت میں تھا۔
شہزاد درخت کی مضبوط شاخ کے ذریعے دیوار تک پہنچا اور اردگرد کا جائزہ لے کر بولا۔ ”باہر کی طرف کسی رسی یا سیڑھی کے بغیر اترنا مشکل ہے کیونکہ دوسری طرف کی زمین بہت نیچی ہے۔ چلو، اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرلیں گے۔“
وہ درخت سے اُترا تو اکمل نے کہا۔ ”ضروری نہیں ہے کہ یہاں سے اس طرح نکلنے کی نوبت آئے لیکن ایک فیصد امکان کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔“
ان کے جسموں پر جینز اور جیکٹ تھی اس لیے وہ خاردار جھاڑیوں سے محفوظ رہے تھے صرف ان کے ہاتھوں پر کچھ خراشیں آگئی تھیں۔
”چلو، میں زمان سے ایک مرتبہ پھر بات کرلوں۔“ شہزاد نے کہا۔
وہ دونوں اس مرتبہ دوسری جانب سے عمارت کی طرف پہنچے تھے۔ اسی طرف زمان کا کمرا تھا۔۔ اور راستہ آگے سے گھوم کر برآمدے کی طرف جارہا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور فرش سے خاصی اونچی تھی۔
وہ دونوں کھڑکی کے پاس پہنچے تو شہزاد اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔ زمان کہہ رہا تھا۔ ”شہزاد کو تو شائلہ ہی ٹھکانے لگا دے گی۔“
”نہیں زمان صاحب!“ طاہر نے کہا۔ ”شائلہ کو ان کے ساتھ مت بھیجیں۔ شہزاد اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”رقم لینے کے بعد دلاور پہلے موتی والا کو ٹھکانے لگائے گا۔ پھر شہزاد اور اکمل کو گولی مار دے گا اور رقم لے کر چپ چاپ واپس آجائے گا۔ ماریہ کو میں کہیں دور لے جا کر خود گولی ماروں گا۔“
”لیکن وہ آپ کو پہچانتی ہے۔“ طاہر نے کہا۔
”وہ۔۔۔“
”اسے میں زندہ ہی کب چھوڑوں گا کہ وہ کسی کو میرے بارے میں کچھ بتائے۔“ زمان کے لہجے میں سفاکی تھی۔
”ویسے ان دو احمقوں کی وجہ سے ہمارا کام بہت آسان ہوگیا۔“ طاہر نے کہا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ اکمل اور شہزاد اتنے کام کے آدمی ثابت ہوں گے۔“
”اسی لیے تو ان کام کے آدمیوں کا صفایا بھی ضروری ہے۔“ زمان نے ”کام“ پر زور دے کر کہا۔
شہزاد کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اکمل کا چہرہ بھی غصے سے مسخ ہوگیا۔ اس نے سوچا، گویا ان الو کے پٹھوں نے ہمیں استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد پیسے کا حصول نہیں کچھ اور ہے۔ ورنہ موتی والا اور ماریہ کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
اکمل نے شہزاد کا ہاتھ پکڑا اور دبے پاؤں وہاں سے

واپس ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ غصے کی شدت سے شہزاد کا جسم کانپ رہا ہے۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر شہزاد نے کہا۔ ”میں ان ذلیلوں کو چھوڑوں گا نہیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف ہمارے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہے بلکہ اسی بندوق سے ہمیں بھی مارنا چاہتے ہیں۔“

وہ گھوم کر دوبارہ برآمدے کی طرف جا ہی رہے تھے کہ انہیں ایک سے زیادہ گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک گاڑی میں سے وڈیرے کا کم دار مراد خان اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اترا۔ اس کے پیچھے بھی ایک گاڑی تھی۔ اس میں بھی پانچ چھ مسلح آدمی تھے۔ شہزاد اور اکمل وہیں ڈبک گئے۔

گاڑیوں کی آواز سن کر زمان اور طاہر بھی کمرے سے باہر آ گئے تھے۔

”کیا بات ہے مراد خان؟“ زمان نے پوچھا۔

”سائیں نے کہا ہے کہ اس لڑکی کو گوٹھ پہنچاؤ جسے تم لوگوں نے اٹھایا ہے۔“

”کون سی لڑکی؟“ زمان نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہارے سائیں کو اس فارم ہاؤس کا کرایہ دیا ہے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دیا ہے۔“

”بابا، اتنے بے خبر تو ہم بھی نہیں ہیں۔“ مراد خان مکاری سے مسکرایا۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ وہ سیٹھ موتی والا کی بیٹی ہے۔ تم سیٹھ سے کروڑوں روپے وصول کرو گے اور ہمیں صرف پچاس ہزار؟“ مراد خان نے کہا۔ ”سائیں نے کہا ہے کہ اس لڑکی کو لے کر فوراً گوٹھ پہنچو۔“

”دیکھو مراد! تم سے صرف اس فارم ہاؤس کی بات ہوئی تھی۔ اس کا کرایہ ہم دے چکے ہیں۔ لڑکی کو تم نہیں لے جا سکتے۔“

”بابا، ہمیں کون روکے گا؟“ مراد خان نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم یا تمہارے وہ بھاڑے کے ٹٹو؟“ وہ اپنے ایک آدمی کی طرف گھوما۔ ”ولی محمد! چھوکری کو لے کر آ۔“ اس نے سندھی میں کہا۔

اچانک کہیں سے ایک بے آواز فائر ہوا اور گولی اس شخص کے سینے میں پیوست ہو گئی جسے مراد خان نے ولی محمد کے نام سے پکارا تھا۔ اس کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

”اپنے ہتھیار پھینک دو مراد خان۔“ شائلہ کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ ”ورنہ اس مرتبہ میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گی، جلدی کرو۔“

شائلہ کے لہجے میں ایسی بات تھی کہ مراد خان کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل وہیں پر پھینک دی۔

فائر ہوتے ہی جوابی فائرنگ سے بچنے کے لیے زمان اور طاہر زمین پر لیٹ گئے تھے۔ نادر، غفور اور دلاور شاید وہاں موجود نہیں تھے۔

”اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ بھی ہتھیار پھینک دیں، اور زمین پر اوندھے منہ لیٹ جائیں۔“ شائلہ نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”تم بھی زمین پر لیٹ جاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے شائلہ نے ایک اور بے آواز فائر کیا جو اس کے ایک اور ساتھی کی گردن کے آر پار ہو گیا۔

اپنے ساتھی کو گرتا دیکھ کر ان سب نے اپنی رائفلیں پھینک دیں اور اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔ ان میں مراد خان بھی شامل تھا۔

اسی وقت شہزاد اور اکمل برق رفتاری سے ماریہ کے کمرے تک پہنچے۔

دروازے کے عقب میں شائلہ کھڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پسٹل تھے اور ان کی نال پر سائلنسر لگے ہوئے تھے۔

”تم ان لوگوں کا راستہ روکو شائلہ۔“ شہزاد نے کہا۔ ”ہم ماریہ کو یہاں سے لے کر نکلتے ہیں۔ یہاں اس کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اگر یہ ان لوگوں سے بچ گئی تو اسے زمان اور طاہر مار دیں گے۔“

ماریہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ خوف کے باعث اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

”چلو ماریہ۔“ شہزاد نے کہا۔

وہ یوں ہی سکتے کے عالم میں شہزاد کو تکتی رہی۔

شہزاد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ گویا ہوش میں آ گئی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور باہر نکلنا چاہا۔

”ٹھہرو ماریہ۔“ شائلہ نے کہا۔ ”تم میرے جوتے پہن لو۔ باہر کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں پچھلی طرف سے گزرنا پڑے۔“

ماریہ نے پھرتی سے شائلہ کے جوتے پہن لیے اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

شائلہ کی پوری توجہ مراد خان اور اس کے ساتھیوں کی طرف تھی۔ ان لوگوں کو بھی شاید احساس ہو گیا تھا کہ یہ جنونی لڑکی کسی کو بھی بلا جھجک مار دے گی۔

شہزاد، ماریہ کو لے کر باہر نکلا تو زمان اور طاہر زمین سے اُٹھ رہے تھے۔

''تم دونوں بھی اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔'' شمائلہ نے چیخ کر کہا۔ ''ورنہ تمہاری کھوپڑیاں بھی اڑا دوں گی۔'' پھر وہ سرگوشی میں شہزاد سے بولی۔ ''تم لوگ ماریہ کو لے کر مین گیٹ کی طرف چلو، میں کوئی گاڑی لے کر گیٹ کی طرف آتی ہوں۔''

شہزاد نے ماریہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اس عمارت کی عقبی سمت کی طرف بڑھا۔ پھر وہ جھاڑیوں میں جھکے جھکے اس عمارت کا چکر کاٹ کر مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

بھاگتے ہوئے ماریہ بے حال ہو گئی۔ جوتے پہننے سے اس کے پیر محفوظ ہو گئے تھے لیکن کانٹے دار جھاڑیوں میں اُلجھ کر اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور اس کی کلائیوں، گردن اور جسم کے دوسرے حصوں پر خراشیں پڑ گئی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ تک بھاگنے کے بعد ماریہ نڈھال ہو کر گر گئی اور بولی۔ ''اب... مجھ سے... نہیں بھاگا... جاتا۔'' اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

''اٹھو ہمت کرو ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔''

اسی وقت انہیں کچھ کربناک چیخیں سنائی دیں، پھر یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے۔

شہزاد نے زمین پر پڑی ہوئی ماریہ کو کندھے پر اٹھایا اور مین گیٹ کی طرف دوڑنے لگا۔

اسی وقت اسے پشت سے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ ماریہ کو لے کر تیزی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا پسٹل پہلے ہی نکال رکھا تھا۔

وہ گاڑی لینڈ کروزر تھی۔ اس گاڑی میں مراد خان وہاں آیا تھا۔ جسے اب شمائلہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تاکہ شمائلہ اسے دیکھ لے، شمائلہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی اور خود اسٹیئرنگ پر سر ٹکا دیا۔

شہزاد نے ماریہ کو گاڑی میں بٹھایا۔ اکمل بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شہزاد پسنجر سیٹ کی طرف بڑھا تو شمائلہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''شہزاد! ڈرائیونگ... تم کرو... میں... زخمی ہو گئی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ بمشکل تمام پسنجر سیٹ پر کھسک گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر خون پھیلا ہوا تھا۔ سیٹ پر بھی کچھ خون تھا۔ خون کی پروا کیے بغیر شہزاد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے اکمل سے کہا۔ ''اگر گیٹ پر کھڑا ہوا گارڈ مزاحمت کی کوشش کرے تو اسے اڑا دینا۔''

ان کی گاڑی گیٹ کے نزدیک پہنچی تو مزاحمت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ مراد خان اور اس کے آدمیوں نے گارڈ کو پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا تھا اور دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ شہزاد نے برق رفتاری سے گاڑی وہاں سے نکالی اور سڑک پر آ کر رفتار مزید بڑھا دی۔ اسے شمائلہ کی طرف سے بھی تشویش تھی۔

☆☆☆

ایس پی علی کافی دیر سے اس ہوٹل پر بیٹھا ہوا تھا جس کے بارے میں موتی والا کے گارڈ نے اطلاع دی تھی۔ اسے غفور کا انتظار تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اس کے دو مستعد ماتحت بھی بیٹھے تھے۔ وہ لوگ سادہ لباس میں تھے بلکہ علی نے تو ملگجا سا ایک شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہوٹل کے مالک کو ان لوگوں نے پہلے ہی ڈرا دھمکا کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ پولیس سے تعاون کرے۔ دوسری صورت میں اسے بھی اغوا کرنے والوں کا ساتھی سمجھا جائے گا اور پولیس اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گی۔

اچانک ہوٹل میں دو آدمی داخل ہوئے اور سیدھے کاؤنٹر کی طرف بڑھے۔ کاؤنٹر کیا وہ سیمنٹ کا اونچا سا چبوترا تھا جس پر گیس کے چولہے لگے ہوئے تھے۔ ہوٹل والے نے غیر محسوس انداز میں اشارہ کیا۔ گویا ان دونوں میں سے کوئی غفور تھا۔ ہوٹل والے سے بات چیت کرنے کے بعد وہ دونوں قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

علی نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا اور خود ان دونوں کے سر پر جا پہنچا۔

وہ دونوں اسے دیکھ کر چونکے۔ ان میں سے ایک شخص نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن علی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تم دونوں اپنے ہاتھ میز پر رکھو اور بالکل حرکت مت کرنا ورنہ...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر انہیں اپنے ریوالور کی جھلک دکھائی۔ ''تم میں سے غفور کون ہے؟'' علی نے سختی سے پوچھا۔

''م... میں... ہوں غفور۔'' ان میں سے ایک گھبرا کر بولا۔ ''لیکن... تم... تم کون ہو؟''

''تم ہمیں موت کا فرشتہ سمجھو۔'' ایس پی علی نے دبے لہجے میں کہا۔

اس کے ماتحتوں نے بہت مہارت سے ان دونوں کی تلاشی لی اور ان کے پسٹلز اپنے قبضے میں لے لیے۔

"پولیس موبائل کو بلاؤ۔" علی نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔

"پولیس وین باہر موجود ہے سر۔" اس کے ماتحت نے جواب دیا۔ "میں نے پولیس موبائل کو پہلے ہی بلا لیا تھا۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر علی نے غفور اور اس کے ساتھی نادر سے سب کچھ اگلوا لیا۔ اس نے فوری طور پر پولیس کے کمانڈوز پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دی اور آناً فاناً اس فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ماریہ کو رکھا گیا تھا۔

☆☆☆

شہزاد بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اسے شائلہ کی فکر تھی۔ اسی تیز رفتاری کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ خوفناک حادثوں سے دوچار ہوتے ہوتے بچا۔

وہ جلد از جلد قومی شاہراہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اچانک اس کی نظر پولیس کی تین گاڑیوں پر پڑی جو بہت تیز رفتاری سے اسی طرف جا رہی تھیں جہاں سے شہزاد آیا تھا۔ ایک گاڑی میں اسے ایس پی علی کی جھلک بھی دکھائی دی۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ "یہ علی بھی بلا کا ذہین ہے۔ اس نے یقیناً اس فارم ہاؤس کا سراغ لگا لیا ہے۔"

اس نے قومی شاہراہ پر واقع دو تین اسپتالوں کو دیکھا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ شائلہ کو انہی میں سے کہیں لے جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور شاہراہِ فیصل پر پہنچ کر اس نے گاڑی کا رخ آغا خان اسپتال کی طرف موڑ دیا۔

قومی شاہراہ پر پہنچنے کے بعد مشکل سے پندرہ منٹ میں شہزاد آغا خان اسپتال پہنچ گیا۔

"یار! یہاں کیوں آئے ہو؟" اکمل نے کہا۔ "یہاں تو ہم فوری پکڑے جائیں گے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں شائلہ کو اسپتال کی ایمرجنسی میں لے جاؤں گا۔ تم یہ گاڑی یہیں پارکنگ میں چھوڑ دینا اور ماریہ کو لے کر میرے ڈیفنس والے فلیٹ پر چلے جانا اور میری واپسی تک وہیں رہنا۔" پھر وہ ماریہ سے مخاطب ہوا۔ "تم بھی بھاگنے دوڑنے کی کوشش مت کرنا ورنہ فضول میں جان سے جاؤ گی۔"

وہ گاڑی سے اترا اور دوسری طرف سے شائلہ کو اتارنے کی کوشش کی جو بے ہوش ہو چکی تھی۔

اسے دیکھ کر اسپتال کا عملہ ان کی طرف دوڑ پڑا۔ ان

لوگوں نے فوراً ہی شائلہ کو اسٹریچر پر لٹایا اور ایمرجنسی کی طرف بھاگنے لگے۔

ڈیوٹی ڈاکٹر نے شائلہ کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''انہیں تو گولی لگی ہے۔ یہ تو پولیس کیس ہے سر!''

''ہاں تو؟'' شہزاد نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''آپ پہلے... پولیس کو... انفارم کریں... پھر...''

شہزاد مسکرا کر بولا۔ ''پولیس کو انفارم! میں خود پولیس ہوں اور یہ میری ساتھی ہے۔ ایک پولیس مقابلے میں زخمی ہوگئی۔ اب زیادہ سوال جواب مت کریں۔''

فوراً ہی وہاں کئی ڈاکٹرز آگئے۔ ان میں سرجن فرخ بھی تھا۔ اس نے شائلہ کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر لے جانے کو کہا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر فرخ باہر نکلا اور شہزاد کو بتایا کہ شائلہ کی پشت میں دائیں جانب گولی لگی ہے لیکن اس سے شائلہ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ گولی اس کی پسلیوں میں اٹک گئی ہے۔ بس اس کا خون بہت زیادہ ضائع ہوگیا ہے اور آپریشن کے دوران میں اسے مزید خون کی ضرورت پڑے گی۔

''میں بلڈ کا بندوبست کرتا ہوں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''اس کا بلڈ گروپ کیا ہے؟''

''اے بی پازیٹو۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ سارا بندوبست تو ہم کرلیں گے۔ آپ صرف پیسوں کا بندوبست کریں۔''

''اوہ ڈاکٹر!'' شہزاد نے کہا۔ ''میں ایک گھنٹے کے اندر اندر پیسے لے کر آتا ہوں۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ایس پی علی نے اس فارم ہاؤس پر چھاپا مارا تو زمان، طاہر، مراد خان اور اس کے دو ساتھی اس کے ہاتھ لگے۔ وہاں تین افراد کی لاشیں بھی تھیں اور ایک آدمی بُری طرح زخمی تھا۔ پھر علی نے اس فارم ہاؤس کی اچھی طرح تلاشی لی لیکن اسے ماریہ وہاں نہیں ملی۔ اس نے تمام گرفتار ملزمان کو ہتھکڑیاں لگائیں اور اپنے چار آدمی وہاں نگرانی کے لیے چھوڑ کر واپس روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

تقریباً دو گھنٹے بعد شہزاد اپنے ڈیفنس والے فلیٹ میں داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم میں اکمل اور ماریہ موجود تھے۔ ماریہ اب خاصی پُرسکون تھی اور وہ دونوں کافی پی رہے تھے۔ شہزاد ایک صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔

''اب کیسی ہے شائلہ؟'' اکمل نے پوچھا۔

''اس کی حالت... خطرے سے باہر ہے۔'' شہزاد نے طویل سانس لے کر کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''یار! ذرا ٹی وی تو کھولو۔ ممکن ہے اس کیس کے بارے میں کوئی خبر ہو۔ میں نے ایس پی علی کو پولیس پارٹی کے ساتھ اس فارم ہاؤس کی طرف جاتے دیکھا تھا۔''

''ٹی وی آن نہیں ہورہا ہے۔'' اکمل نے جواب دیا۔

''اس میں کوئی خرابی ہوگئی ہے۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''شائلہ کو گولی لگی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس سلسلے میں تو پوچھ گچھ کی ہوگی؟''

''میں نے فوری طور پر انہیں مطمئن کرنے کو کہہ دیا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور شائلہ بھی میری ساتھی ہے۔ وہ ایک پولیس مقابلے میں زخمی ہوئی ہے۔''

''اور ڈاکٹروں نے تمہاری بات مان لی؟''

''کوئی بھی بات پُراعتماد طریقے سے کی جائے تو فوری طور پر سب مان لیتے ہیں۔ فوری طور پر شائلہ کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ وہ اسے مل چکی ہے۔'' پھر وہ اٹھ کر ٹی وی تک گیا اور اسے آن کرنے کی کوشش کی۔ اچانک وہ ہنس کر بولا۔ ''اس کا تو سوئچ ہی آف ہے، کرنٹ کیا خاک آئے گا۔'' اس نے ٹی وی کا سوئچ آن کیا اور ریموٹ لے کر بیٹھ گیا۔

وہ نیوز بلیٹن کا وقت نہیں تھا لیکن اس وقت بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ ''معروف صنعت کار اور مختلف گروپ آف کمپنیز کے مالک سیٹھ موتی والا کی بیٹی ماریہ کے اغوا کنندگان گرفتار۔ پولیس نے میمن گوٹھ کے ایک فارم ہاؤس پر چھاپا مار کے پانچ ملزمان کو حراست میں لے لیا۔ پولیس ابھی تک مغویہ کو بازیاب نہیں کراسکی ہے۔ یہ کارروائی ایس پی علی کی سرکردگی میں ہوئی۔ پولیس نے ابھی ملزمان کے نام بتانے سے گریز کیا ہے۔ ماریہ کے بارے میں ملزمان نے بتایا کہ اسے ان کے دو ساتھی اپنے ساتھ لے کر فرار ہوگئے۔ ان دونوں کی گرفتاری کے لیے پولیس نے کئی جگہ چھاپے مارے ہیں۔''

''ماریہ!'' شہزاد نے کہا۔ ''چلو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔''

''آ... آپ... مجھے... گھر چھوڑیں گے؟'' ماریہ کے لہجے میں غیر یقینی تھی۔

''تم پہلے نہا کر کپڑے بدل لو۔ ان کپڑوں پر شائلہ کا خون لگا ہوا ہے جو اب تک جم چکا ہے۔'' اکمل نے کہا۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شہزاد نے جواب دیا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا آپ لوگ واقعی... مجھے... ڈیڈ... کے پاس پہنچا دیں گے؟" ماریہ نے گویا پھر تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اکمل نے کہا۔ "تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟"

ماریہ خاموش ہو گئی لیکن اس کے انداز میں اضطراب تھا۔

چند منٹ بعد شہزاد بیڈ روم سے نکلا تو خاصا نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر وہی جینز اور جیکٹ ہی تھی۔

"ماریہ کو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ ہم اسے گھر پہنچائیں گے۔" اکمل نے ہنس کر کہا۔

"اور... وہ رقم... جس کی تم ڈیمانڈ... کر رہے تھے؟" ماریہ نے کہا۔

"اب اس رقم کو بھول جاؤ۔ چلو میرے ساتھ۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن چلنے سے پہلے تم اپنا حلیہ درست کرلو۔" پھر وہ اکمل سے بولا۔ "تم کوئی گاڑی لے آؤ۔"

اکمل فوراً فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

ماریہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو وہ بھی خاصی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے منہ دھو کر بال سنوار لیے تھے۔ گھر جانے کے نام سے اس کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔

اکمل گاڑی بہت شاندار لایا تھا۔ وہ جدید ماڈل کی لینڈ کروزر تھی۔

"یہ گاڑی کہاں سے...؟"

"میں نے رینٹ اے کار سے لی ہے۔" اکمل نے جواب دیا۔

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اکمل بیٹھا۔ عقبی نشست پر ماریہ کے ساتھ شہزاد بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی کوئی حماقت کرسکتی تھی۔

"اگر آپ واقعی مجھے گھر لے جا رہے ہیں تو آپ کو ڈیڈ سے رقم میں دلواؤں گی۔"

"اس رقم کو بھول جاؤ بے بی۔" شہزاد نے کہا۔

"میں بے بی نہیں ہوں۔" ماریہ نے ہنس کر کہا۔ "اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔"

☆☆☆

ماریہ کو دیکھ کر مسلح گارڈ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ماریہ کو دیکھ کر کچھ ٹھٹکا ضرور تھا۔ اکمل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پورچ میں اس سے پہلے بھی کئی گاڑیاں اور پولیس کی ایک ہارڈ ٹاپ ٹویوٹا جیپ موجود تھی۔ برآمدے میں پولیس کے دو کانسٹیبل اور موتی والا کے کئی گن مین موجود تھے۔

شہزاد، ماریہ کو لے کر گاڑی سے اترا اور برآمدے کی طرف بڑھا تو سیٹھ موتی والا کا ایک گارڈ چیخ کر بولا۔

"ہالٹ!"

شہزاد نے اس کی پروا کیے بغیر قدم آگے بڑھائے تو گارڈ نے اپنی رائفل کا رخ شہزاد کی طرف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے فائر کا دھماکا ہوا اور گولی شہزاد کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

شہزاد الٹ کر گرا۔ گارڈ اس پر دوسرا فائر کرنا چاہتا تھا کہ ماریہ چیخ کر بولی۔ "نو، فائر مت کرنا۔"

"گولی کی آواز سن کر اندر سے سیٹھ موتی والا اس کے کئی دوست اور ایس پی علی باہر نکل آیا۔

ماریہ دوڑ کر سیٹھ موتی والا سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ ایس پی علی، شہزاد کی طرف بڑھ گیا جو اس وقت تک بے ہوش ہو چکا تھا۔

اسے گرتا دیکھ کر اکمل بھی دوڑ کر وہاں پہنچ گیا اور چیخ کر بولا۔ "تم نے اپنی اس نیکی کی بہت بھاری قیمت چکا دی۔"

شہزاد کو زمین پر گرا دیکھ کر ماریہ بھی اس طرف آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ان کا کیا قصور تھا ڈیڈ؟ یہ تو اپنی جان داؤ پر لگا کر مجھے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔"

اسی وقت وہاں ایمبولینس کا سائرن گونجا۔ شاید علی نے ایمبولینس کے لیے کال کی تھی۔ شہزاد بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ اسے فوراً ایمبولینس وہاں سے اسپتال لے گئی۔ اکمل بھی اس کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گیا تھا۔

"سیٹھ صاحب!" علی نے سرد لہجے میں کہا۔ "آپ کو بیٹی مبارک ہو۔ اب میں بتا دیتا ہوں کہ اسے کن لوگوں نے اغوا کیا تھا۔ میں تمام معلوم کر چکا ہوں۔ اس اغوا کا ماسٹر مائنڈ آپ کا اپنا سگا بھائی عدنان موتی والا اور اس کا بیٹا اشرف ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو آفیسر؟" موتی والا نے بے یقینی سے کہا۔

"ان دونوں کو میں نے اسی فارم ہاؤس سے گرفتار کیا ہے۔" علی نے کہا۔ "ان کا پلان تھا کہ وہ رقم لینے کے بعد آپ کو بھی ہلاک کر دیں گے اور ماریہ کو بھی۔ یوں آپ کا اربوں روپے کا بزنس ان کا ہو جائے گا۔ اغوا برائے تاوان تو محض ایک ڈراما تھا۔ اس سے وہ یہ فائدہ اٹھانا چاہتے تھے

کہ آپ اور آپ کی بیٹی کا قتل ان لوگوں کے کھاتے میں لکھوایا جائے جو اس موقع پر گرفتار ہوتے۔ پھر عدنان اور اشرف اسکرین سے غائب ہو جاتے۔ گرفتار ہونے والے چیختے رہتے کہ انہوں نے یہ سب کچھ زمان اور طاہر کے کہنے پر کیا ہے لیکن ان کی بات کا کوئی یقین نہ کرتا کہ پھر ان کا کوئی وجود ہی نہ ہوتا۔ عدنان نے خود کو بیرسٹر زمان کے روپ میں پیش کیا تھا اور اشرف، طاہر تھا۔" ایس پی نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ "لیکن شہزاد اور اکمل نے ان کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔"

☆☆☆

"شہزاد اور علی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ محض شوق میں انہوں نے رائفل شوٹنگ کلب میں ایڈمیشن لیا۔ جہاں نہ صرف نشانے بازی سیکھی بلکہ کئی انعامات بھی حاصل کیے۔ پھر یونیورسٹی کے دور میں ان دونوں نے شوقیہ طور پر مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد یہ لوگ ملازمت کے چکر میں پڑ گئے۔

ان کی ساتھی شائلہ بھی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ وہ بھی نشانے بازی اور مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہترین تیراک ہے۔ وہ اس معاملے میں بہت جنونی تھی اور سوئمنگ کی اولمپک چیمپئن بننا چاہتی تھی۔ اس صلاحیت کی وجہ سے یہ عدنان اور اشرف کی نظروں میں آئی۔

میرے پاس ان سب کے ماضی کا بس اتنا ہی ریکارڈ ہے۔ ان لوگوں نے چھوٹی موٹی وارداتیں بھی کی ہوں گی جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

شائلہ اس وقت شدید زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ شہزاد بھی شدید زخمی ہے۔ اب اگر شائلہ وعدہ معاف گواہ بن جائے تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ماریہ کے کیس میں شہزاد اور اکمل نے تو آپ کی بیٹی کی جان بھی بچائی ہے۔"

"اس کی آپ فکر مت کریں۔ میرے وکیل اور میں سب کچھ سنبھال لیں گے، ابھی تو آپ شہزاد کی فکر کریں۔"

وہ اس اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ گولی شہزاد کے سینے میں لگ کر اس کی پسلیوں میں پھنس گئی تھی۔ اسے کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا ہے۔ البتہ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ ویسے اب شہزاد کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

☆☆☆

دو مہینے بعد شہزاد اور شائلہ صحت یاب ہو کر اسپتال سے آ گئے۔ پولیس نے ان کا کیس عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ ان کے لیے موتی والا نے شہر کے بہترین وکیلوں کی ایک فوج کھڑی کر دی تھی۔ انہوں نے شائلہ کو سلطانی گواہ بنایا اور اسے صاف بچا لیا۔ وکیلوں کے داؤ پیچ نے شہزاد اور اکمل کو بھی بری کرا لیا۔ وہ لوگ سیٹھ موتی والا کا شکریہ ادا کرنے اس کے بنگلے پر پہنچے تو سیٹھ صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ ماریہ نے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ اس وقت سیٹھ صاحب بھی آ گئے۔ وہ بھی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

انہوں نے چیک بک نکالی اور ایک کروڑ روپے کا چیک لکھ کر شہزاد کو دیا اور بولے یہ تو تمہارا انعام ہے۔ میں شائلہ اور اکمل کے لیے بھی اتنی ہی رقم کا چیک لکھ رہا ہوں۔

"سوری سیٹھ صاحب! ہم نے یہ کام کسی انعام کے لیے نہیں کیا۔"

"تو پھر میری ایک آفر ہے۔" موتی والا نے کہا۔ "میرے دفتر میں دو آسامیاں خالی ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ روپے تنخواہ، گاڑی اور دیگر الاؤنسز۔"

"ہمیں آپ کی یہ آفر قبول ہے۔" شہزاد نے ہنس کر کہا۔ "اب میں اور شائلہ سکون سے شادی کر سکیں گے۔"

"تم... تم شائلہ... سے شادی کرو گے؟" ماریہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" شہزاد مسکرایا۔ "سیٹھ صاحب میری شادی میں شرکت کا وعدہ کریں تو میں اگلے ہفتے ہی شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

"میں تمہاری شادی میں شرکت بھی کروں گا اور اس پر جتنے اخراجات آئیں گے وہ بھی دوں گا۔" سیٹھ صاحب ہنس کر بولے۔

ان کے جانے کے بعد ماریہ بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ سیٹھ صاحب کے سینے سے لگی کہہ رہی تھی۔ "ڈیڈی! آخر شائلہ میں کیا خوبی ہے جو شہزاد اس سے شادی کر رہا ہے؟ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی لڑکے کو چاہا تو وہ بھی کسی دوسرے کا ہو گیا۔ ڈیڈی... آپ کچھ کریں پلیز۔"

"بیٹا! شہزاد کوئی چیز نہیں ہے کہ میں اسے بازار سے تیرے لیے منہ مانگے دام دے کر خرید لوں۔"

ماریہ سسکتی رہی۔ پھر اس کی سسکیاں بھی تھم گئیں۔ سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور کمرے میں صرف سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جس میں دم گھٹنے لگتا ہے۔